فقہی، فکری و اصلاحی

مقالات و مضامین

پسند فرمودہ

خادمِ کتاب وسنت، حضرت مولانا **غلام محمد** صاحب وستانوی دامت برکاتہم

رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندربار

تقریظ

حضرت مولانا **محمد حذیفہ** صاحب وستانوی

ناظم تعلیمات و معتمد جامعہ

تصنیف وتالیف

مفتی **محمد جعفر** ملی رحمانی

صدر دار الافتاء جامعہ اکل کوا

ناشر جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، ضلع نندربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

فقہی، فکری و اصلاحی

مقالات ومضامین

پسند فرمودہ :

خادمِ کتاب وسنت، حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی دامت برکاتہم

رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندربار

تقریظ :

حضرت مولانا محمد حذیفہ صاحب وستانوی

ناظم تعلیمات ومعتمد جامعہ

تصنیف وتالیف :

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی

صدر دارالافتاء جامعہ اکل کوا

ناشر:

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵

تقسیم کار

نام کتاب : فقہی فکری واصلاحی مقالات ومضامین

مصنف : حضرت مولانا مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی

کمپیوٹر کتابت وسیٹنگ: عبدالمتین اشاعتی کانڑگانوی

طبع اول : ۱۴۳۸ھ/۲۰۱۷ء

صفحات : ۶۴۲

قیمت :

باہتمام : ابوحمزہ وستانوی

ناشر : جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

ملنے کا پتہ

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا ضلع نندربار مہاراشٹر

Phone & Fax: 02567,252556

E-mail jafarmilly@gmail.com

fatawaakkalkuwa@gmail.com

http://jamiyaakkalkuwa.com/fatawa/

فہرست عناوین

ابتدائیہ

(مفتی محمد جعفر ملی رحمانی صدر دارالافتاء، جامعہ اکل کوا)

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين . قال الله تبارك وتعالى : ﴿اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينًا﴾ . (سورة المائدة :۳)

وقال رسول الله ﷺ : " تركتكم على البيضاء ليلها كنهارها ، لا يزيغ عنها بعدي إلا هالك " . - ''میں نے تم کو ایک ایسی روشن شریعت پر چھوڑا کہ اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح ہے، اور میرے بعد اس سے وہی شخص انحراف کرے گا، جو تباہ و برباد ہوگا۔'' (اتحاف السادة:۱/۱۸۲)

محترم قارئین! اللہ پاک کا بے انتہا فضل واحسان ہے کہ اس نے ہمیں دین اسلام جیسی دولت سے سرفراز کیا، اسی دین کو ہمارے لیے پسندیدہ قرار دیا، اور اسی کو ہماری نجات کا ذریعہ بنایا۔

دین اسلام درحقیقت ایک عمل، ایک پیغام، ایک دعوت اور ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جس کے مطابق حیاتِ انسانی کا ہونا فرض ہے، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو مان لے، اور بس، بلکہ وہ ایک پریکٹیکلی اور عملی دین ہے، اس نے اپنے تمام احکام روزِ روشن کی طرح کھول کھول کر بیان کیے، اور لوگوں کو ان پر عمل کی دعوت دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں ایک ایسی شریعت پر چھوڑ رہا ہوں، کہ اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے، اور میرے بعد اس سے وہی لوگ رُوگردانی کریں گے، جو ہلاک ہونے والے ہیں۔

دنیا کے احوال وکوائف جس تیزی سے بدل رہے ہیں، اسی رفتار سے زندگی کے مختلف میدانوں میں نئے نئے فقہی مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں، جن کا تعلق ہماری عبادتوں سے بھی ہے، اور معاشی، معاشرتی، طبی، سیاسی اور عائلی وخاندانی شعبوں سے بھی، ظاہر ہے حالات کی جو نوعیت آج ہے عہد رسالت میں نہیں تھی کہ ان کے بارے میں تفصیلی احکام وجزئیات کتاب وسنت میں بیان کیے جاتے، لیکن قرآنِ کریم کے متعلق ارشادِ ربانی ہے: ﴿تبيانًا لكل شيء﴾ کہ اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے، یعنی قیامت تک جتنے مسائل بنی نوعِ انسان کو درپیش ہوں گے، ان سب کے حل کے

لیے قرآن کریم میں ہدایات واصول موجود ہیں۔ کچھ اصول صراحۃً موجود ہیں، تو کچھ اشارۃً، کچھ دلالۃً تو کچھ اقتضاءً ورُوح کے انداز میں، ان تمام اصولوں اور ہدایتوں کی ضروری تفصیل وتشریح احادیثِ مبارکہ میں اس حد تک وارد ہوئی ہے، کہ اسی کو بنیاد بنا کر فقہائے کرام نے اپنے اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں نئے پیش آمدہ مسائل کے جزئی وتفصیلی احکام بیان کیے ہیں، اور آج بھی حضراتِ علمائے کرام وفقہائے عظام اس فرض کو انجام دے رہے ہیں۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج نئے نئے مسائل جس تیزی کے ساتھ رونما ہورہے ہیں، اسی تیزی کے ساتھ انہیں حل کرنے کے لیے جس قدر قوِی ومضبوط قوٰی اور علمی صلاحیتوں کے حامل افراد درکار ہیں، وہ دن بدن کم ہورہے ہیں، اب مدارسِ دینیہ ومراکزِ علمیہ سے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل رحمہم اللہ اور ان کے شاگردوں جیسے علماء وفقہاء پیدا نہیں ہورہے ہیں، یہ دور، دورِ انحطاط ہے، اس لیے نئے مسائل کا حل کسی ایک فرد کے بس کا نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ایک ایسی باصلاحیت ومتدین جماعتِ علماء کی ضرورت ہے، جو متقدمین فقہاء وعلماء کے اجتہادات وتحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے، نئے مسائل کی صورتوں اور کیفیتوں کو اُن کے ماہرین سے معلوم کرکے اُن پر احکامِ شرعیہ کا انطباق کریں۔

الحمد للہ! مختلف ملکوں میں ہماری علماء برادری اپنی اِس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے اپنے علاقوں اور ملکوں میں ''مجامعِ فقہیہ'' کو قائم کرکے امت کو نئے مسائل کا حل پیش کررہی ہے۔

ملکِ عزیز ہندوستان میں بھی اس قسم کی کاوشیں کی گئیں، مختلف مجالس ومباحثِ فقہیہ وجود میں آئیں، اور انہوں نے نئے مسائل پر غور وفکر کرکے بعض اہم وضروری مسائل کا حل امت کے سامنے پیش کیا۔لیکن یہ کوششیں محدود تھیں، اور حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ ملک گیر سطح پر اہلِ علم واہلِ فتوٰی کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے، علماء وفقہائے عصر؛ جدید عصری مسائل پر ایک دوسرے کی آراء سے استفادہ کرکے کوئی متفقہ حکم امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کریں، کہ یہ اتفاق واتحادِ امت کی کلید وکنجی ہے۔

حضرت الاستاذ فقیہ عصر، نباضِ وقت، مجاہد قوم وملت، بے لوث وبے غرض خادمِ دین، قاضی القضاۃ؛ مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی رحمہ اللہ نے اس تقاضے کو بروقت محسوس فرمایا، اور ۱۹۸۹ء میں ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کی بنیاد رکھی، جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس

نے پورے ملک میں علمی شوق، تحقیقی ذوق، فکری اعتدال اور فقہی تحریک کو نہ صرف وجود بخشا، بلکہ انہیں پروان چڑھانے اور نوخیز علماء کو اس راہ پر ڈالنے کے لیے سمیناروں کو منعقد کرکے اپنے اکابرین سے علمی استفادہ، اسلوبِ تحقیق اور تعلیم وتربیتِ تطبیقِ احکام کے بہترین وسنہرے مواقع میسر کیے، جو یقیناً حضرت الاستاذ کے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔

بندۂ ناچیز کو (جس وقت وہ امارتِ شرعیہ میں شعبۂ افتا میں زیرِ تربیت تھا) حضرت رحمہ اللہ کی خصوصی نظرکرم وعنایت حاصل رہی، آپ رحمہ اللہ کی طبیعت چوں کہ افراد سازی کی تھی، اس لیے آپ چاہتے تھے کہ جو لوگ بھی میرے دامن سے وابستہ ہیں انہیں میں کسی کام کا بنادوں، اور ان میں بھی اپنی یہ فکر منتقل کردوں، تاکہ یہ فکر زندہ وتابندہ رہے، اور امتِ مسلمہ کی ایک اہم دینی وشرعی ضرورت پوری ہوتی رہے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ۱۹۹۰ء میں بندے کو اپنی اس اکیڈمی کا مندوب بنایا، اور اکیڈمی کے ذریعے جاری ہونے والے سوال نامے پر مقالہ تحریر کرنے کا حکم فرمایا، اس وقت سے آج تک، آپ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی الحمد للہ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری وذمہ داران ہر سمینار کے موقع پر جدید مسائل پر مشتمل سوال نامہ اِرسال کیا کرتے ہیں اور دعوتِ شرکت بھی دیتے ہیں۔فجزاہم اللہ خیرالجزاء!

زیرِنظر کتاب ''فقہی، فکری واصلاحی مقالات ومضامین'' انہی مقالات کا مجموعہ ہے جو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے لیے لکھے گئے، تمام مقالات چوں کہ جدید وعصری مسائل کے جوابات پر مشتمل ہیں، اور ان مسائل پر ملک کے دیگر فقہاء وعلماء کے مقالات وآراء موجود ہیں، جن میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، لیکن اکیڈمی کا طریقۂ کار یہ ہے کہ اولاً وہ تمام مقالات کی تلخیص کرتی ہے، پھر ہونے والے سمینار میں بصورتِ عرضِ مسئلہ اُسے تمام شرکائے سمینار کے سامنے پیش کرتی ہے، اور مباحثہ ومناقشہ کے بعد جس رائے وحکم پر اتفاق ہوتا ہے، اسے بصورتِ تجویز امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ (کتاب ''نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے'' انہی تجاویز کا مجموعہ ہے) اس لیے یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ نئے مسائل سے متعلق بندے کی رائے وہی ہے جو اکیڈمی کی تجاویز ہیں، کیوں کہ وہ اجتماعی رائے ہے، اور اجتماعی رائے کے مقابلے میں انفرادی رائے بہرحال کم درجے کی ہوتی ہے، جب کہ عمل قولِ راجح پر ہوتا ہے، نہ کہ مرجوح پر، اس لیے مقالات میں موجود رائے اگر اکیڈمی کی تجاویز کے موافق ہو، تو اس پر عمل کرلیا جائے، ورنہ اکیڈمی

کی تجاویز ہی معمول بہا ہوں گی۔

یہ مقالات گرچہ اکیڈمی کے مجلّات میں شائع ہو چکے ہیں،لیکن ان کی علیحدہ ومستقل طباعت سے مقصود یہ ہے کہ تمام مقالات یک جا ہو جائیں، اور طلبۂ عزیز کے لیے ان سے استفادہ سہل وآسان ہو جائے، اور اُنہیں یہ معلوم ہو کہ جدید مسائل اور اُن کی صورتیں کیا ہیں؟ دلائلِ اربعہ؛ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاس کی روشنی میں انہیں کس اسلوب وطریقۂ استدلال واستشہاد سے حل کیا جاتا ہے؟ فروع واصول کے مابین اُمورِ جامعہ (علل) کیا ہیں؟ اور کس طرح اُصول پر فروع کو قیاس کر کے، اُصول میں موجود احکام کو فروع میں ظاہر کیا جاتا ہے؟ کہ اصل تعلیم وتربیت اور فنِ افراد سازی یہی ہے، جو اللہ پاک نے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ میں ودیعت فرمائی تھی، اور آپ نے اس ودیعت وامانت کا حق ادا کیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً! اللہ پاک بندے کے تمام علمی کاموں کو آپ رحمہ اللہ اور تمام ہی اساتذۂ کرام کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین!

میں ممنون ہوں اپنے مربی وسرپرست، خادمِ کتاب وسنت، حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی دامت برکاتہم کا کہ آپ نے ابتدائی تدریس سے لے کر آج تک بندۂ ناچیز کی بھرپور سرپرستی وحوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ، زندگی کے ہر موڑ پر نہ صرف رہنمائی ورہبری فرمائی، بلکہ بے پناہ شفقتوں، عنایتوں اور محبتوں سے نواز کر، آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ بخشا۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء!

میں مشکور ہوں ہر دل عزیز، حاملِ فکرِ سدید، خلف الرشید، ناظمِ تعلیمات ومعتمد جامعہ؛ مولانا حذیفہ صاحب وستانوی زید مجدہٗ وفضلہٗ کا، جو نہ صرف علم دوست ہیں بلکہ اہلِ علم کے قدرداں بھی، کہ آپ ہی کے اِیما واشارے پر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں انتہائی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں عزیزم مولانا مفتی عبد المتین صاحب کانڑگانوی زید علمہٗ وعملہٗ کی اُن تمام محنتوں اور کاوشوں کو جو انہوں نے ان مقالات ومضامین کے جمع کرنے، اور ان کی تنقیح وتہذیب میں صرف کی۔ اللہ پاک میرے ان تمام محسنین ومعاونین کو دنیا وآخرت میں بہترین بدلہ وصلہ عطا فرمائے، اور اس فقہی، فکری واِصلاحی مجموعے کو میری نجات کا ذریعہ بنائے۔

آمین یارب العالمین!

محمد جعفر ملی رحمانی

۷/۳/۱۴۳۸ھ

تقریظ

(حضرت مولانا حذیفہ وستانوی صاحب حفظہ اللہ ورعاہ؛ ناظم تعلیمات ومعتمد جامعہ اکل کوا)

زبان وقلم انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے، اور یہ دو نعمتیں جب اللہ تعالیٰ کسی عالم، فاضل ومفتی کو عطا فرمادے، اور خلوص سے بھی نواز دے، تو نورٌ علیٰ نور، اور سونے پر سہاگہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اللہ رب العزت نے مفتی صاحب کو دونوں میدانوں میں یدطولیٰ سے نوازا ہے، آپ بہترین مقرر اور خطیب بھی ہیں، اور عمدہ اُسلوب میں تحریر کا مَلَکہ بھی رکھتے ہیں۔

آپ قارئین کی خدمت میں اس وقت جو تحریری کاوش، تحقیق اور علمی لبادہ سے مزین ہے، وہ میرے استاذ محترم، رفیق تدریس؛ حضرت مولانا مفتی محمد جعفر صاحب مدظلہ العالی کی ہے، اللہ رب العزت نے واقعۃً مفتی صاحب کو علمی ذوق سے نوازا ہے، احقر بچپن ہی سے آپ سے واقف ہی نہیں بلکہ والہانہ تعلق رکھتا ہے، ابتدائی نحو وصرف کی متعدد کتابیں، اس کے بعد درجاتِ عالیہ میں فقہ اور اصولِ فقہ کی بیشتر کتابیں مفتی صاحب سے کسبِ فیض کر چکا ہے، آپ کا درس بہت ہی مؤثر ہوتا تھا، سمجھانے کا انداز بڑا نرالا اور طبیعت میں ظرافت اس پر مستزاد۔ آج بھی آپ کا درس طلبہ میں بہت مقبول ہے، اللہ حضرت کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، کہ آپ جیسے اساتذہ کی محنت، توجہ، دعاؤں اور عنایتوں سے ٹوٹی پھوٹی کچھ تھوڑی سی صلاحیت بنی، اور کچھ لکھنے پڑھنے کا ذوق بنا۔ میرے استاذ ہونے کے ناطے میں نے بہت معذرت کی، مگر مفتی صاحب نے اصرار کیا، تو حکم کی تعمیل میں چند سطریں لکھنے پر مجبور ہوں۔

مفتی صاحب سے بندے کو شاگردی کے ساتھ ساتھ بے تکلفانہ تعلقات بھی ہیں، تو میں ہمیشہ آپ سے کہتا رہتا ہوں کہ ''محقق ومدلل'' آپ کا نشانِ امتیاز اور سیمبول ہوگیا، اس لیے کہ ماشاءاللہ آپ کی قلمی کاوشیں تحقیق کے بلند معیار کی حامل ہوتی ہیں، آپ نے جامعہ کے دارالافتاء کی ذمہ داری شروع سے ہی سنبھالی اور اس کا حق ادا کردیا، ''مسائل مہمہ'' نے علمی حلقے میں خاص طور پر افتاء اور فقہ کے شائقین کے لیے گویا عمدہ مواد فراہم کردیا، اور قلیل مدت میں اس کے متعدد ایڈیشن

طبع ہو چکے ہیں، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، ایک صاحب فارسی میں ترجمہ کر رہے ہیں، جامعہ کے ایک آسامی طالبِ علم نے فون پر اطلاع دی کہ میں نے اس کا آسامی زبان میں ترجمہ کرلیا ہے، اسی طرح ''محقق و مدلل جدید مسائل'' کی دو جلدیں اور ''کرسی پر نماز'' کا مسئلہ، ''ٹوکن دے کر زمین کی خرید و فروخت'' کا مسئلہ ''قربانی کے مسائل''، غرضیکہ مذکورہ تمام کتابیں دلائل سے آراستہ و پیراستہ ہیں، اور علما و طلبہ میں بڑی مقبول ہیں، آپ کی لکھی گئی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ مسائلِ فقہیہ پر حتی المقدور قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ اور پھر تائید کے لیے فقہاء کی عبارتوں سے استدلال کی کوشش کی جاتی ہے۔

مفتی صاحب ہر سال ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کے فقہی سمیناروں کے لیے پورے اہتمام کے ساتھ مقالات تیار کرتے ہیں، اور گاہے بہ گاہے امت کو درپیش مسائل پر مضامین اور مقالات بھی قلم بند فرماتے رہتے ہیں، جو اپنے اندر ادب کی چاشنی اور مسائل کا اِدراک اور اس کا حل پیش کرتے ہیں، الغرض! آپ کی محنتوں کا عظیم ثمرہ علم دوستوں، طلبہ، علما، مفتیانِ کرام اور عوام الناس سب ہی کے لیے ایک تحفۂ گراں مایہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے، امت کو آپ کے علم سے خوب نفع پہنچائے، آپ کو مزید زورِ قلم عطا فرمائے، آخرت کے لیے ذخیرہ بنائے، اور امت کو اس کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

حذیفہ وستانوی

۷؍ربیع الاول، ۱۴۳۸ھ

مقالہ

(پانچواں فقہی سمینار [اعظم گڑھ] بتاریخ: ۳-۶ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، مطابق: ۳۰ر اکتوبر-۲ر نومبر ۱۹۹۲ء)

موجودہ حالات میں ''انشورنس'' کا حکم

سوال: اِدھر خصوصیت کے ساتھ جو صورتِ حال پورے ملک میں پیدا ہو رہی ہے، اور فرقہ پرست قوتوں نے جس طرح پورے ملک میں نفرت کا زہر پھیلا دیا ہے، اس صورتِ حال میں جس طرح مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے، اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو ہر وقت خطرہ میں ہے، خاص کر ان کی صنعت و تجارت کو تباہ کر کے معاشی طور پر ان کی کمر توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کے پیشِ نظر کیا مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ جان و مال کا انشورنس کرا سکیں۔

۱- کیا آپ کے نزدیک فقہی نقطۂ نظر سے جان و مال کے عمومی خطرہ کو دیکھتے ہوئے اسے ضرورتِ شدیدہ، یا اس حاجت کا درجہ دیا جا سکتا ہے، جسے فقہا بہ درجہ ضرورت (**الحاجة تتنزل منزلة الضرورة**) کو تسلیم کرتے ہیں۔

۲- اور موجودہ حالات میں یہ دیکھتے ہوئے کہ کہاں، کب کیا ہو جائے گا، کہنا مشکل ہے، کیا اسے عمومی ملی ضرورت تسلیم کیا جا سکتا ہے، جس کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنی زندگی اور اپنی تجارت کے انشورنس کرانے کا مشورہ دیا جائے؟

۳- ہندوستان میں انشورنس کمپنیاں عام طور پر سرکاری ہوتی ہیں، کیا اس صورتِ حال سے حکمِ مسئلہ پر کچھ فرق پڑے گا؟

اس مسئلے میں مجلس تحقیقاتِ شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے اجتماع منعقدہ مؤرخہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۵ء میں مختلف علما کے جوابات پر غور کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے پر مولانا شاہ معین الدین صاحب مرحوم، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب؛ مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا سید فخر الحسن مرحوم؛ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد اُویس ندوی، مولانا شاہ عون احمد قادری؛ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا ابواللیث ندوی اور مولانا اسحاق سندیلوی نے دستخط کیے تھے۔ اس تجویز کی نقل منسلک کی جارہی ہے۔

واضح رہے کہ زیر بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انشورنس کرانا جائز ہے یا ناجائز، اس وقت قابلِ توجہ بات صرف یہ ہے کہ اسے ناجائز تصور کرتے ہوئے فقہی ضرورت یا حاجتِ شدیدہ کی بنیاد پر اس عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ موجودہ حالات میں جان و مال کا جو خطرہ مسلمانوں کو درپیش ہے، وہ آپ کے نزدیک اس فقہی ضرورت یا حاجت بہ منزلہ ضرورت کے ضمن میں داخل ہے یا نہیں؟؟

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ''انشورنس'' ربوا، قمار، مخاطرہ جیسے معاصی وگناہوں پر مشتمل ہے، اور یہ وہ محرمات ہیں جن کی حرمت بہ نصِ کتاب وسنت ثابت ہے، اس لیے فی نفسہٖ انشورنس کرانا، ناجائز وحرام ہے۔ لیکن چوں کہ:

۱- آج کل ہندوستانی مسلمانوں کو جو حالات وحوادثات درپیش ہیں کہ ان کی جان ومال، اَملاک وجائداد غیر محفوظ ہیں، اور ہر وقت اس بات کا خطرہ لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں دشمن ہمارے جان ومال کو کس وقت تباہ وبرباد کردے گا، اس لیے محض بغرضِ

حفاظت ودفعِ مضرت، مسلمانوں کو جب اپنی جان ومال کے ضائع وبرباد ہونے کا قوی اندیشہ ہو، تو بیمہ کرالینا درست ہے، اس لیے کہ فقہ کے قواعد پر نظر کرنے سے ہمیں اس قسم کی روشنی ملتی ہے کہ بوقتِ ضرورت محظورات میں اِباحت اور جواز کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔ " الضرورات تبیح المحظورات ". " الضرر یزال " . " المشقة تجلب التیسیر ". (الأشباه والنظائر)

۲- پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے قبل ہی انتقال کر جائے، یا اپنی مدت پوری کرلے، ان دونوں صورتوں میں جمع کردہ رقم سے زائد رقم کا استعمال نہ وارثین کے لیے درست ہوگا، اور نہ ہی بیمہ کنندہ کو، اس لیے کہ انشورنس کی اجازت ہم نے بہ ضرورتِ شدیدہ دی ہے، اور نقصان کی بقدر معاوضہ لینے سے ضرورت پوری ہوجاتی ہے، زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ " الضرورة یتقدر بقدرها " . (السیر الکبیر)

۳- سرکاری ملازمین کو جبری بیمہ زندگی کی صورت میں حکومت کی طرف سے جو رقم زائد ملتی ہے، اسے پراویڈنٹ فنڈ پر قیاس کر کے ملازمین یا ان کے ورثا کا اسے لینا، اور اپنے استعمال میں لانا درست وجائز ہے۔

۴- انشورنس کمپنی جمع کردہ رقم پر جو سود دیتی ہے، خواہ اس سے نقصان کی تلافی ہو یا نہ ہو، اس زائد رقم کو جان ومال کی تلافی قرار دینا درست نہیں ہے، رہ گئی یہ بات کہ اس کا لینا اور تصرف میں لانا کیا حکم رکھتا ہے؟......اس کا جواب یہ ہے کہ اسے لے لیا جائے، اور بلانیتِ ثواب صدقہ کردیا جائے، اس لیے کہ اصولِ فقہ کا یہ قاعدہ ہے:" ما حصل بسبب خبیث فالسبیل رده " . جو چیز بذریعہ خبیث حاصل ہوا سے لوٹا دینا واجب ہے۔لیکن زائد رقم بیمہ کمپنی کو لوٹا دینے میں ہمارا ہی نقصان ہے کہ وہ

اس رقم کو ہمارے خلاف استعمال کرے گی، اس لیے اسے صدقہ کردیا جائے۔

۵- ایسی صورت میں چوں کہ کمپنیاں خود انشورنس کرتی ہیں، اور حمل ونقل کی متعارف اُجرت سے زیادہ رقم اس معاہدہ کے ساتھ صاحبِ مال سے وصول کرتی ہے کہ مال کے ضیاع ونقصان کی صورت میں ہم ضمان ادا کریں گے، تو کمپنیوں سے مال کے ضیاع یا نقصان کی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے، چاہے یہ کمپنیاں مسلمانوں کی ہوں، یا غیر مسلموں کی، دونوں کا ایک ہی حکم ہے، اس لیے کہ ''ردالمحتار'' کی عبارت ہے:'' إن المودع إذا أخذ أجرة على الوديعة يضمنها إذا هلكت '' . (۲۷۳/۳)

جب مودع ودیعت کے رکھنے پر اُجرت وصول کرے، تو اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا۔ هذا ما عندي .

والله الموفق للصواب !

(جدید فقہی مباحث: ۴/ ۲۸۵، ۲۸۶، موجودہ حالات میں انشورنس کا حکم، ادارۃ القرآن کراچی)

❁......❁......❁

مقالہ

(آٹھواں فقہی سمینار [علی گڑھ]، بتاریخ: ۲۷-۲۹ر جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ/ مطابق: ۲۲-۲۴ر اکتوبر، ۱۹۹۵ء)

طبی اخلاقیات سے متعلق جدید مسائل

امراض اور حوادث کی کثرت کی وجہ سے دن بدن ڈاکٹرز کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے، ہر گھر بلکہ ہر فرد کو ڈاکٹرز یا طبی اداروں سے علاج و معالجہ کی غرض سے رابطہ رکھنا پڑتا ہے، حکومتیں بھی اداروں کو ترقی دینے، ان میں جدید ترین آلات و مشینیں مہیا کرنے، مختلف امراض کے ماہر ترین ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، علاج و معالجہ کی روز افزوں ضرورت کی وجہ سے طب اور میڈیکل سائنس سے بے بہرہ لوگ بھی کسبِ زر کے لیے اس میدان میں داخل ہوگئے ہیں، اور ایسے افراد کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے، ایسے جاہل اور نیم طبیب قسم کے لوگوں کو علاج و معالجہ سے روکنے کے لیے حکومت نے بہت سے قوانین وضع کیے ہیں، اور مختلف امراض کے علاج کے لیے مخصوص طبی تعلیم اور تجربہ کی شرط لگادی گئی ہے، مستند میڈیکل اداروں میں تعلیم حاصل کر کے سند حاصل کرنے والے افراد ہی علاج و معالجہ کے مجاز ہوتے ہیں۔

مختلف امراض کے علاج میں سرجری آپریشن کا عمل بھی کثرت سے ہونے لگا ہے، آپریشن کے مرحلے میں ڈاکٹر کے آپریشن کا قانوناً مجاز ہونے اور مریض یا اس کے اولیاء کی طرف سے آپریشن کی اجازت حاصل ہونے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے، اگر غلط علاج کرنے یا آپریشن کی وجہ سے مریض کا انتقال ہوگیا، یا اسے سخت ضرر لاحق

ہوگیا، تو ڈاکٹر یا طبیب کو ضامن قرار دینے یا نہ دینے کا سوال بھی کھڑا ہوتا ہے، اس طرح کے مختلف مسائل میں اسلامی شریعت کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے درج ذیل سوالات قائم کیے جارہے ہیں، امید ہے کہ کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات تحریر کیے جائیں گے:

محورِ اول

سوال: ۱- ایسا کوئی شخص جو قانوناً کسی مرض کا علاج کرنے کا مجاز نہیں ہے، لیکن اپنے ذاتی مطالعہ اور تجربہ کی بنا پر دواؤں اور امراض کے بارے میں واقفیت رکھتا ہے، اگر اس شخص نے کسی مریض کے کہنے پر اس کا علاج کیا، تو شرعاً اس کا یہ علاج کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر اس کے علاج سے مریض کو غیر معمولی ضرر پہنچا، یا اس کا انتقال ہوگیا، تو اس پر کوئی ضمان یا تاوان لازم ہوگا یا نہیں؟ کیا اس کا عمل شرعاً قابلِ تعزیر جرم شمار ہوگا؟

جواب: ۱- امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلق کے بارے میں، شریعت کے مقاصد پانچ ہیں، اور وہ یہ ہیں، کہ اس کے دین، اس کی جان، اس کی عقل، اس کی نسل اور اس کے مال کی حفاظت کی جائے، بس ہر وہ بات، جو ان اصولِ خمسہ کی ضامن ہو، وہ مصلحت قرار پائے گی، اور ہر وہ چیز جو ان پانچوں امور کی حفاظت میں مخل ہو، وہ مفسدہ قرار پائے گی، اور اس کا اِزالہ مصلحت ہوگا۔

حضرت علامہ کی اس عبارت سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ایسے آدمی کو علاج کی اجازت دینا، جو محض ذاتی مطالعہ وتجربہ کی بنا پر دوا، اور امراض کے بارے میں واقفیت رکھتا ہے، جائز نہیں، ورنہ انسانی نفوس کی سالمیت وحفاظت کو ایک زبردست خطرے کا سامنا ہوگا، جو شریعت کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد ہے۔ نیز ہر کس وناکس کو

اپنے ذاتی مطالعہ وتجربہ کی بنا پر علاج کی اجازت سے، مصلحتِ عامہ یا نظامِ عام کو ضرر پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے، جس کا دفع کرنا مصلحت ہے، فقہائے کرام نے بھی سدِ ذرائع کی بحث میں اس کی صراحت کی ہے، کہ جو اسباب وطریقے عمومی حالت میں فساد و ضرر کا ذریعہ بنتے ہیں، ان پر بندش لگانا، اور پوری قوت کے ساتھ ان سے دور رہنا، اسلامی تعلیمات کا اہم ترین جز ہے، جو آیتِ قرآنی ﴿**لا تسبوا الذین یدعون من دون اللّٰہ فیسبوا اللّٰہ عدوًا بغیر علم**﴾ سے مفہوم ہوتا ہے۔

لہٰذا کسی شخص کو محض اپنے ذاتی مطالعہ وتجربہ کی بنا پر علاج کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور اگر اس نے عدم جواز کے بعد بھی علاج کیا، اور اس کے علاج سے مریض کو غیر معمولی ضرر پہنچا، یا ہلاک ہوا، تو اس پر تاوان لازم ہوگا۔ **کما قال رسول اللّٰہ** ﷺ : ’’ **من تطبب ولم یعلم منه طب فهو ضامن** ‘‘ . (ابوداؤد شریف: ص/ ۱۰۸)

ایسا شخص قابلِ تعزیر بھی ہوگا، کیوں کہ ہر ایسے فعل کا ارتکاب جس سے مصلحتِ عامہ، یا نظامِ عام کو ضرر لاحق ہو، باعثِ تعزیر ہے۔ (اسلامی قوانین: ص/ ۳۹۸)

سوال: ۲- جس ڈاکٹر کو قانوناً علاج ومعالجہ کی اجازت ہے، اس نے اگر کسی مریض کا علاج کیا، لیکن اس نے طبی احتیاط میں ملحوظ نہیں رکھیں، مثلاً بعض ضروری جانچیں نہیں کروائیں، یا مریض کی پورے طور پر دیکھ ریکھ نہیں کی، اگر اس کے علاج کے باوجود مریض فوت ہوگیا، یا اس کا کوئی عضو (مثلاً آنکھ) ضائع ہوگیا، تو کیا یہ ڈاکٹر مریض کے پہنچنے والے نقصان کا یا اس کی جان کے تاوان کا ضامن ہوگا؟

جواب: ۲- جس ڈاکٹر کو قانوناً علاج ومعالجہ کی اجازت ہے، اس نے اگر کسی مریض کا علاج کیا، لیکن اس نے طبی احتیاطیں ملحوظ نہ رکھیں، مثلاً بعض ضروری

جانچیں نہیں کروائیں، یا مریض کی پوری دیکھ ریکھ نہیں کی، اور اس علاج کے باوجود مریض فوت ہوگیا یا اس کا کوئی عضو ضائع ہوگیا، تو ڈاکٹر مریض کو پہنچنے والے نقصان، یا اس کی جان کے تاوان کا ضامن ہوگا، اس لئے اگر ہم ڈاکٹروں کی بداحتیاطی، غفلت و کوتاہی پر تاوان واجب نہیں کریں گے، تو ضررِ خاص کی خاطر ضررِ عام کو نظرانداز کرنا لازم آئے گا، جب کہ قاعدہ فقہیہ یہ ہے کہ: ''ضررِ عام کو دفع کرنے کے لیے ضررِ خاص کو برداشت کیا جائے گا۔''۔'' **يُتَحَمَّلُ الضرر الخاص لدفع ضرر عام**''.

(الأشباه والنظائر: ص/ ۱۴۱)

سوال: ۳- اگر ڈاکٹر کی رائے میں زیرِ علاج مریض کا آپریشن ضروری ہے، اور ڈاکٹر نے مریض یا اس کے قریبی اعزہ سے اجازت لیے بغیر آپریشن کرڈالا، آپریشن کامیاب ہونے کے بجائے مہلک ثابت ہوا، مریض فوت ہوگیا، یا اس کا آپریشن شدہ عضو بے کار ہوگیا، تو ایسی صورت میں کیا ڈاکٹر اس مریض کو پہنچنے والے نقصان کا ضامن ہوگا؟ جب کہ وہ ڈاکٹر اس آپریشن کا مجاز ہے اور تجربہ رکھتا ہے۔؟

جواب: ۳-اگر ڈاکٹر کی رائے میں زیرِ علاج مریض کا آپریشن ضروری ہے، اور ڈاکٹر نے مریض یا اس کے قریبی اعزہ سے اجازت لیے بغیر آپریشن کرڈالا، اور آپریشن کامیاب ہونے کے بجائے مہلک ثابت ہوا، اور مریض فوت ہوگیا، یا اس کا آپریشن شدہ عضو بے کار ہوگیا، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر مریض کو پہنچے والے نقصان کا ضامن ہوگا، اگرچہ وہ اس آپریشن کا مجاز ہو، اور تجربہ رکھتا ہو، اس لیے کہ مریض کے مرض کے علاج ومعالجہ کا اختیار خود اسے یا اس کے اعزہ کو حاصل ہے۔ جب ڈاکٹر نے خود مریض یا اس کے اولیاء کی اجازت کے بغیر آپریشن کیا تو وہ ضامن ہوگا، اس کی نظیر ''فتاویٰ ہندیہ'' کی یہ عبارت ہوسکتی ہے: '' **رجل أو امرأة قطع الأصبع**

الزائدة من ولده قال بعضهم : لا يضمن ، ولهما ولاية المعالجة ، وهو المختار ، ولو فعل ذلك غير الأب والأم فهلك كان ضامنًا ''. (۳۶۰/۵)

سوال: ۴- بعض اوقات مریض پر بے ہوشی طاری ہوتی ہے، وہ اجازت دینے کے لائق نہیں ہوتا ہے، اوراس کے اعزہ زیرعلاج مقام سے بہت دور ہوتے ہیں، ان سے فی الفور رابطہ قائم نہیں کیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں اگر ڈاکٹر کی رائے میں آپریشن فوری طور پر ضروری ہے، اور تاخیر ہونے میں اس کے نزدیک مریض کی جان یا عضو کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، اس لیے اس نے مریض اوراس کے قریبی اعزہ سے اجازت حاصل کیے بغیر مریض کا آپریشن کردیا، اور یہ آپریشن ناکام رہا، مریض کی جان چلی گئی، یا اس کا کوئی عضو ضائع ہوگیا، تو کیا اس صورت میں ڈاکٹر کو ضامن قرار دیا جائے گا؟ اور مریض کو پہنچنے والے نقصان کا تاوان اس پر شرعاً لازم ہوگا؟

جواب: ۴- بعض اوقات مریض پر بے ہوشی طاری ہوتی ہے، وہ اجازت دینے کے لائق نہیں ہوتا ہے، اوراس کے اعزہ زیرعلاج مقام سے بہت دور ہوتے ہیں، ان سے فی الفور رابطہ قائم نہیں کیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں اگر ڈاکٹر کی رائے میں آپریشن ضروری ہے، اور تاخیر ہونے میں اس کے نزدیک مریض کی جان یا عضو کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، نیز غالب گمان یہ ہے کہ اگر آپریشن کردیا جائے تو جان بچ سکتی ہے، یا ضائع ہونے والے عضو کی حفاظت ہوسکتی ہے، تو ڈاکٹر کو مریض یا اس کے اعزہ کی اجازت کے بغیر آپریشن کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ آپریشن ناکام ہونے کی صورت میں، ڈاکٹر پر کسی قسم کا تاوان لازم نہیں ہوگا، اس لیے کہ ڈاکٹر کا یہ عمل انسان کی جان، یا اس کے عضو کے تحفظ کی خاطر وجود میں آیا، جو مصلحتِ شرعیہ ہے، اس پر ضمان کا واجب کرنا اصولِ شرع کے خلاف ہے۔

محورِ دوم

ایڈز کا خوف پوری دنیا پر مسلط ہے، یہ مرض جسم انسانی کے دفاعی نظام کو تباہ کر دیتا ہے، اس کے بعد انسان بڑی تیزی کے ساتھ مختلف موذِی اور مہلِک امراض میں گرفتار ہو کر دَم توڑ دیتا ہے، اس مرض کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ مرض بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا ہے، اگر کسی جگہ ایڈز کا مرض کسی شخص کو لاحق ہو گیا، تو ضروری احتیاطیں ملحوظ نہ رکھنے پر بہت تھوڑے وقت میں بے شمار افراد کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے، یہ مرض خاص طور سے جنسی عمل اور ایڈز کے مریض کا خون چھونے سے منتقل ہوتا ہے، یا ماں سے اس کے بچے کی طرف دورانِ حمل یا شیر خوارگی سے منتقل ہوتا ہے، یوں عام اختلاط سے منتقل نہیں ہوتا۔

ایڈز کے اس مہلک مرض نے مریض، مریض کے متعلقین اور سماج کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان کے بارے میں شریعت کی رہنمائی درکار ہے:

سوال: ۱- جس مریض میں ایڈز کے جراثیم پائے گئے ہیں، کیا اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے گھر والوں یا متعلقین سے اس خوف سے اس مرض کو چھپائے، کہ اس مرض کا اظہار ہونے کے بعد وہ اپنے گھر اور سماج میں اَچھوت بن کر رہ جائے گا، یا اس کے لیے اپنے اہلِ خانہ اور متعلقین کو اس مرض سے مطلع کر دینا ضروری ہے؟

جواب: ۱- ایڈز ایک مہلک بیماری ہے، جس سے جسمِ انسانی کا دفاعی نظام تباہ ہو کر رہ جاتا ہے، اور اس کے بعد انسان بہت جلد مختلف موذِی وخطرناک بیماریوں کا شکار ہو کر دم توڑ دیتا ہے، یہ مرض متعدی بھی ہے، اگر ضروری احتیاطیں ملحوظ نہ رکھی گئیں، اور گھر والوں یا متعلقین سے اس مرض کو پوشیدہ رکھا گیا، تو پورے خاندان کے

اس قاتل مرض سے متاثر ہونے کا امکان ہے، جو ضررِ عام ہے، اور اِفشاء کی صورت میں مریض کے اَچھوت بن کر رہ جانے کا ضرر، ضررِ خاص ہے۔ جب کہ قاعدۂ فقہیہ یہ ہے کہ: ''ضررِ عام کو رفع کرنے کے لیے ضررِ خاص کو برداشت کیا جائے گا۔'' (الأشباہ والنظائر: ص/۱۴۱) اس لیے ایڈز کے مریض پر لازم ہے کہ اپنے گھر والوں یا متعلقین کو اِس مرض سے مطلع کرے۔

سوال: ۲- اگر ایڈز کا مریض اپنے اہلِ خانہ اور متعلقین سے اپنے مرض کو چھپا رہا ہے، اور ڈاکٹر سے بھی اِصرار کر رہا ہے کہ وہ اس کے مرض کو کسی پر ظاہر نہ کرے، تو ایسی صورت میں شرعاً ڈاکٹر کی کیا ذمہ داری ہے؟ وہ اس مرض کو راز میں رکھے یا اِفشاء کرے؟

جواب: ۲- اگر ایڈز کا مریض اپنے اہلِ خانہ یا متعلقین سے، اپنے اِس مرض کو چھپا رہا ہے، اور ڈاکٹر سے بھی اِصرار کر رہا ہے، کہ اس مرض کو کسی پر ظاہر نہ کرے، تو ایسی صورت میں بھی شرعاً ڈاکٹر کی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اس مرض کا افشاء کرے، تاکہ دوسرے لوگ اس متعدی مرض سے بچنے کی احتیاطی تدابیر ملحوظ رکھیں۔ ''**يتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام**'' .

سوال: ۳- ایڈز اور دوسرے خطرناک متعدی امراض، مثلاً طاعون وغیرہ کے مریض کے بارے میں اس کے اہلِ خانہ، متعلقین اور سماج کی شرعاً کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: ۳- ایڈز اور دوسرے خطرناک متعدی امراض، مثلاً طاعون وغیرہ کے مریض کے بارے میں، اُس کے اہلِ خانہ متعلقین اور سماج پر، شرعاً وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، جن سے دوسروں کو اس کے ضرر سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ ''**الضرر يزال**'' . (الأشباه والنظائر: ص/۱۳۹)

سوال: ۴- ایڈز کا ایسا مریض جو کہ اپنے مرض اور اس کی نوعیت سے بخوبی واقف ہے، اگر وہ کسی دوسرے تک اپنے مرض کو منتقل کرنے کی غرض سے کوئی ایسا کام کرے، مثلاً: [الف] اس نے بیوی سے مجامعت کی، جس کی وجہ سے ایڈز کے وائرس (جراثیم) بیوی میں منتقل ہوگئے۔ [ب] یا کسی مریض کو خون کی ضرورت ہے، ایڈز کے اس مریض نے اپنا خون اس کے لیے پیش کیا، اور مریض کو وہ خون چڑھ گیا، جس کے نتیجے میں اس مریض کو بھی ایڈز کا مرض لاحق ہوگیا، تو کیا ایڈز کا یہ مریض جو دانستہ دوسرے شخص تک اس قاتل مرض کی منتقلی کا سبب بنا ہے، قابلِ سزا قرار پائے گا؟ اور اسے سزا دی جائے گی؟

جواب: ۴-(الف): نکاح کے نتیجے میں شوہر کو ملکِ بضع حاصل ہوتی ہے، اور وہ اپنے اس ملک میں تصرف کا مجاز ہے، لیکن اگر وہ ایڈز کا مریض ہے، اور اس بات کا قوی اِمکان ہے کہ مجامعت کی صورت میں ایڈز کے وائرس بیوی کے جسم میں منتقل ہوکر، اُس کو اِس مہلک وقاتل مرض میں مبتلا کردیں گے، تو ایسی صورت میں اُسے جماع کی اجازت نہیں ہوگی۔ "**الأشباہ والنظائر**" کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ: اگر اپنی ملک میں تصرف کرنے سے دوسرے کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے، تو ایسی صورت میں صاحبِ تصرف کو، تصرف کی اجازت نہیں ہوگی۔

چنانچہ اگر شوہر محض اپنے اِس خطرناک مرض کو منتقل کرنے کی غرض سے مجامعت کرتا ہے، تو وہ شرعاً مجرم وگناہ گار ہوگا، نیز اسے سزا بھی دی جاسکتی ہے، اس لیے کہ شریعتِ اسلامیہ کا عام اُصول ہے کہ: ہر وہ کام باعثِ تعزیر ہے جو شریعت کی نظر میں معصیت ہے، اور شوہر کا محض اسی ارادے سے مجامعت کرنا کہ ایڈز کے وائرس بیوی کے جسم میں

منتقل ہوکر، اُسے مہلک بیماری میں مبتلا کریں، عملِ معصیت ہے۔

(ب): ایڈز کا مریض جو اس کی نوعیت سے بخوبی واقف ہے، اگر وہ کسی دوسرے تک اپنے مرض کو منتقل کرنے کی غرض سے، خون کے ضرورت مند مریض کو اپنا خون پیش کرتا ہے، تو اس کی چند صورتیں ہوں گی:

(۱) مریضِ ایڈز نے اپنا مہلک خون ازخود بلاطلب پیش کیا، تو یہ صورت قابلِ سزا ہے۔(۲) مریضِ ایڈز نے اپنا مہلک خون طلب پر، یہ بتلائے بغیر، کہ مجھے ایڈز کی بیماری ہے پیش کیا، یہ صورت بھی قابلِ سزا ہے۔(۳) مریضِ ایڈز نے اپنا مہلک خون طلب پر، اپنی بیماری بتلا کردیا، لیکن اس کو اس کے لیے اس قدر مجبور نہیں کیا گیا، کہ اس پر مُکرَہِ شرعی کا اِطلاق ہو، بظاہر یہ صورت بھی قابلِ سزا ہے۔البتہ اگر اسے اس قدر مجبور کیا گیا کہ وہ مُکرَہِ شرعی کی فہرست میں شمار ہو، تو یہ صورت قابلِ سزا نہیں ہوگی۔

سوال: ۵- اگر کسی مسلمان خاتون کا شوہر ایڈز کے مرض میں گرفتار ہوگیا، تو اس عورت کو شوہر کے اس مرض کی بنا پر فسخِ نکاح کا مطالبہ کرنے کا اختیار ہے؟ اسی طرح اگر ایڈز کے کسی مریض نے اپنا مرض چھپا کر کسی عورت سے نکاح کرلیا، تو کیا عورت فسخِ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے؟

جواب: ۵- اگر کسی مسلمان خاتون کا شوہر ایڈز کے مرض میں گرفتار ہوگیا، اور دونوں عمر میں کے اِس مرحلے میں ہوں، جس میں جنسی عمل کا وقوع ہوسکتا ہے، تو بیوی کو فسخِ نکاح کے مطالبہ کی اجازت ہوگی۔ علامہ طحاوی رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں:

”وألحق بها القهستاني كل عيب لا يمكن المقام معه إلا بضرر“ .

(طحاوي : ۱/۱۱۳)

شوہر میں ہر ایسے عیب کا پایا جانا، جس کی وجہ سے بیوی بغیر ضرر مرد کے ساتھ نہیں رہ

سکتی ہے، باعثِ فسخِ نکاح ہے۔ اور اگر میاں بیوی اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں، جس میں جنسی عمل کا وقوع نہیں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں بیوی کو فسخِ نکاح کے مطالبہ کی اجازت نہیں ہوگی، علتِ انتقالِ مرض معدوم ہونے کی بنا پر۔ اگر ایڈز کے مریض نے اپنا مرض چھپا کر کسی خاتون سے نکاح کیا، اور وہ دونوں عمر کے اس مرحلے میں ہیں جس میں جنسی عمل کا وقوع ہوسکتا ہے، تو بیوی کو فسخِ نکاح کے مطالبہ کی اجازت ہوگی، علتِ انتقالِ مرض پائی جانے کی وجہ سے۔

سوال: ۶- جو خاتون ایڈز کے مرض میں گرفتار ہو، اگر اسے حمل قرار پا گیا، تو اس کا مرض دورانِ حمل، یا دورانِ ولادت، یا دورانِ رضاعت بچے کی طرف منتقل ہونے کا طبی لحاظ سے پورا اندیشہ ہے، ایسی عورت کیا بچہ تک اس مرض کی منتقلی کے خوف سے اِسقاطِ حمل کرا سکتی ہے؟ اور اگر عورت اس کے لیے تیار نہ ہو، تو کیا اس کا شوہر، یا حکومت کا محکمۂ صحت اُسے اِسقاطِ حمل پر مجبور کرسکتا ہے؟ کیوں کہ ایڈز کا مریض بچہ سماج کے لیے خطرہ ہوگا، اور حکومت کے لیے بڑا بار ہوگا؟

جواب: ۶- جو خاتون ایڈز کے مرض میں گرفتار ہو، اگر اسے حمل قرار پا گیا، اور طبی لحاظ سے ظنِ غالب کے درجہ میں یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کا مرض دورانِ حمل، یا دورانِ ولادت، یا دورانِ رضاعت اس بچے کی طرف منتقل ہوگا، تو ایسی صورت میں اس خاتون کو نفخِ روح؛ یعنی استقرارِ حمل کے ایک سو بیس (۱۲۰) دن کے اندر اِسقاطِ حمل کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر عورت اس کے لیے تیار نہ ہو، تو شوہر یا حکومت کا محکمۂ صحت اُسے اِسقاطِ حمل پر مجبور نہیں کرسکتا۔ "العلاج لإسقاط الولد إذا ستبان خلقه كشعر و ظفر ونحوهما لا يجوز ، وإن

کان غیر مستبین الخلق یجوز لما في زماننا یجوز علی کل حال ، وعلیه الفتوی . کذا في جواهر الأخلاطي" . (الفتاوی الهندیة : ۳۵۶/۵)

سوال: ۷- جو بچے یا بچیاں ایڈز کے مرض میں مبتلا ہیں، کیا نہیں مدارس اور اسکولوں میں داخلے سے محروم کرنا درست ہوگا؟ جب کہ مرض مریض کو چھونے، یا اس کے ساتھ اُٹھنے یا بیٹھنے سے منتقل نہیں ہوتا، بلکہ مریض سے جنسی تعلق پیدا کرنے، یا اس کا خون چھونے سے منتقل ہوتا ہے، اگر ایڈز کا مریض بچہ کسی اسکول میں داخل ہے، تو عام حالات میں اس سے دوسرے بچوں میں مرض منتقل ہونے کا خطرہ نہیں ہے، لیکن اس بات کا اندیشہ ضرور ہے کہ مریض بچہ کو چوٹ لگ جائے، بچوں کی آپس میں لڑائی میں اس کے جسم سے خون نکل جائے، اور وہ خون دوسرے بچوں کو لگ جائے، یا دوسرے بچے اس کا خون چھو لیں، یا جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو کر یہ مرض دوسروں تک پہنچ جائے۔

جواب: ۷- جو بچے یا بچیاں ایڈز کے مرض میں مبتلا ہیں، انہیں مدارس اور اسکولوں میں داخلہ نہ دینا ہی بہتر ہے، گرچہ یہ مرض مریض کو چھونے یا اس کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے منتقل نہیں ہوتا، لیکن جنسی بے راہ روی وغیرہ کی جو لہر پوری دنیا میں چل رہی ہے، اس سے اسکول اور کالج بھی محفوظ نہیں ہیں، گویا انتقالِ مرض کی علت موجود ہے، اس لیے اس مرض کے شکار بچے اور بچیوں کے لیے الگ سے تعلیم وتربیت کا نظم کیا جائے۔

سوال: ۸- اگر کوئی بچہ یا بچی ایڈز کے مرض میں گرفتار ہے، تو اسلامی تعلیمات کی رُو سے اس بچے یا بچی کے بارے میں اس کے والدین، اہلِ خانہ اور سماج کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟

جواب: ۸- اگر کوئی بچہ یا بچی ایڈز کے مرض میں مبتلا ہو، تو اس کے بارے میں

اس کے والدین، اہلِ خانہ اور سماج پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، جن سے ان کے حقوق کا بطلان لازم نہ آئے، اور اہلِ خانہ اور سماج کے دوسرے لوگ اس کے ضرر سے محفوظ رہ سکیں۔

سوال: ۹- ایڈز، نیز طاعون وکینسر جیسے امراض جب طبی لحاظ سے نا قابلِ علاج مرحلہ میں پہنچ جائیں، تو کیا ان کے لیے مرض الموت کا حکم ہوگا؟ اور ایسے مریض کے لیے مرضِ موت ووفات کے احکام جاری ہوں گے؟

جواب: ۹- اگر ایڈز، طاعون وکینسر وغیرہ کا مرض اس حد تک پہنچ گیا کہ مریض اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل پر قادر نہیں رہا، اور اُس کے اِس مرض کی کیفیت مرض الموت کی بن گئی، تو اس پر مرض الموت کے احکام جاری کرنے کے سلسلے میں حسبِ ذیل تفصیل ہے:

(الف): اگر اس مرض میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا ہے، تو اول روز سے ہی یہ مرض، مرض الموت تصور کیا جائے گا۔

(ب): اگر اس میں افاقہ واضافہ کی دونوں صورتیں پیدا ہوئیں، تو آخری اضافہ کی ابتدا سے مرض الموت کی ابتدا ہوگی۔

(ج): اگر یہ مرض دائمی رہا، مگر اس میں اضافہ کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی، تو یہ مرض، مرض الموت نہیں ہے، خواہ کتنا ہی طویل ہوجائے۔ (الفتاوی الهندیة : ۱/۴۶۳ ، وکذا علی هامش الهدایة ، في باب طلاق المریض " . (ص/۳۹۲)

سوال: ۱۰- طاعون یا اس جیسے مہلک مرض کے پھیلنے کی صورت میں اگر کسی علاقہ کے اندر حکومت کی طرف سے آمد ورفت کی پابندی لگتی ہے، تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: ۱۰- طاعون یا اس جیسے مہلک مرض کے پھیلنے کی صورت میں، کسی علاقہ

کے اندر حکومت کی طرف سے آمد ورفت پر پابندی لگانا، شرعاً جائز ودرست ہے۔ اس لیے کہ ہمارے آقا سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طاعون زدہ علاقہ میں جانے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث: " **إذا سمعتم بالطاعون بأرض فلا تدخلوها ، وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا عنها** ". (بخاری) سے معلوم ہو رہا ہے۔

سوال: ۱۱- (الف): اگر ایسی جگہ سے کچھ لوگ اپنی ضروریات سے باہر گئے ہوئے ہیں، اور پھر یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی، اور ان کے قیام کی نہ اب ضرورت ہے، نہ ممکن ہے، پھر اُن کا گھر، اہل وعیال سب اس طاعون زدہ علاقہ میں ہیں، اہل وعیال کو ان کی ضرورت ہے، نیز گھر وکاروبار کو بھی ان کی نگہداشت کی ضرورت ہے؟ تو ایسے لوگ کیا کریں؟

(ب): اس کے برعکس باہر سے کسی ضرورت سے آئے ہوئے لوگ، جن کا کام ختم ہو چکا ہے، یا اب نہیں ہو رہا ہے، وہ کیا کریں؟

(ج): اسی طرح وہ شخص جس کی مناسب نگہداشت اور علاج وتیمارداری کا یہاں انتظام نہیں ہو رہا ہے، یا کسی وجہ سے اس کی دوسری جگہ ضرورت ہے، ان کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب: ۱۱- (الف): اگر کچھ لوگ اپنی ضروریات سے باہر گئے ہوئے ہیں، اور پھر طاعون کی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، اور ان کے قیام کی نہ ضرروت ہے، نہ ممکن ہے، پھران کے گھر اہل وعیال، سب اس طاعون زدہ علاقہ میں ہیں، اہل وعیال کو ان کی ضرورت ہے، نیز گھر، کاروبار کو بھی ان کی نگہداشت کی ضرورت ہے، تو ایسے لوگ طاعون زدہ علاقہ میں داخل ہو سکتے ہیں، نیز ضررِ یقینی کے رفع کے واسطے ضررِ

مشکوک پر نظر نہیں کی جائے گی۔ (امداد الفتاویٰ:۴/۲۸۴)

(ب): باہر سے کسی ضرورت سے آئے ہوئے لوگ، جن کا کام ختم ہو چکا ہے، یا اب ختم ہو رہا ہے، اگر ان لوگوں نے اس طاعون زدہ مقام کو اپنا وطنِ اقامت نہیں بنایا تھا، تو انہیں خروج کی اجازت ہوگی، اس لیے کہ " نهي عن الخروج "کا تعلق مقیمین سے ہے، نہ کہ مسافروں سے۔ (امداد الفتاویٰ:۴/۲۸۲)

(ج): اسی طرح وہ شخص جس کی نگہداشت یا تیمارداری کا انتظام نہیں ہو رہا ہے، یا کسی وجہ سے دوسری جگہ اس کی ضرورت ہے، تو چوں کہ اس صورت میں، علت ذہابِ طاعون نہیں ہے، اس لیے خروج جائز ہوگا۔

محورِ سوم

اسلام نے امانت پر بہت زیادہ زور دیا ہے، اور امانت کے بارے میں اسلام کا تصور بہت وسیع ہے، کہ اگر کسی مجلس میں چند لوگ باہم بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں، ان باتوں کو امانت قرار دیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "المجالس بالأمانة"۔ ڈاکٹر اپنے مریضوں کا راز دار ہوتا ہے، اس کی شرعی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے کہ اپنے زیرِ علاج یا زیرِ تجربہ مریضوں کا راز اِفشا نہ کرے، جس سے ان مریضوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یا سماج میں ان کی بدنامی یا سبکی ہو، لیکن بعض حالات میں مریض کا راز ظاہر نہ کرنے سے اس سے متعلق دوسرے شخص یا اشخاص کے شدید نقصان کا خطرہ ہوتا ہے، اور بعض دفعہ مریض کی پردہ داری بے شمار لوگوں کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، ایسی حالت میں ایک مسلمان ڈاکٹر بڑی کشمکش میں گرفتار ہوتا ہے، اگر افشائے راز نہیں کرتا ہے، تو مریض کے علاوہ دوسرے اشخاص کا نقصان

ہوتا ہے، اور اگر افشائے راز کرتا ہے، تو اسے مریض کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے، جس نے اسے ڈاکٹر سمجھ کر اپنا رازدار بنایا تھا، اس طرح کی چند صورتیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں، ان مسائل کے بارے میں حکمِ شرع کی وضاحت مطلوب ہے، تاکہ جو مسلمان ڈاکٹرس اور اطباء اس طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں، وہ شریعت کی رہنمائی میں اپنا طریقۂ کار طے کریں:

سوال: ۱- (الف): ایک ماہر امراضِ چشم () مسلمان ڈاکٹر نے ایک نوجوان کی آنکھ کا علاج کیا، اس نوجوان کی ایک آنکھ کی بصارت ختم ہوچکی ہے، لیکن ڈاکٹر کی کوششوں سے اس مریض کی وہ آنکھ دیکھنے میں بالکل صحیح وسالم معلوم ہوتی ہے، اس نوجوان کا رشتہ کسی خاتون سے طے پا رہا ہے، ڈاکٹر کو یقین ہے کہ اگر خاتون کو نوجوان کے اس عیب کا علم ہوجائے، تو ہرگز یہ رشتہ کرنے کو راضی نہیں ہوگی، نوجوان یہ عیب چھپا کر اس خاتون سے رشتۂ نکاح کر رہا ہے، ایسی صورت میں کیا اس مسلمان ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس خاتون یا اس کے گھر والوں کو نوجوان کے اس عیب کی اطلاع کردے، یا اس کے لیے نوجوان کے اس عیب کو راز میں رکھنا ضروری ہوگا؟

(ب): اگر لڑکی کے گھر والوں کو یہ بھنک لگ گئی ہے کہ وہ نوجوان فلاں ڈاکٹر سے آنکھ کا علاج کروا رہا ہے، اور لڑکی یا اس کے گھر والے معلومات کرنے کے لیے اس ڈاکٹر کے پاس آئیں، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ وہ لڑکی اور اس کے گھر والوں کو نوجوان کے اس عیب سے باخبر کردے، یا نوجوان کا راز افشا نہ کرے؟

جواب: ۱- (الف): اگر نوجوان اپنا یہ عیب چھپا کر، اُس خاتون سے نکاح کر رہا ہے، اور ڈاکٹر کو یقین ہے کہ اگر اس خاتون کو نوجوان کے اِس عیب کا علم

ہوجائے، تو ہرگز یہ رشتہ کرنے کو راضی نہیں ہوگی، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر کے لیے واجب نہیں، مگر بہتر ضرور ہے کہ وہ اس خاتون یا اس کے گھر والوں کو نوجوان کے اس عیب کی اطلاع کردے۔

(ب): لڑکی یا اس کے گھر والوں کو کسی بھی طرح یہ پتہ چلا کہ نوجوان فلاں ڈاکٹر سے اپنی آنکھ کا علاج کروارہا ہے، اور لڑکی یا اس کے گھر والے ڈاکٹر سے معلومات کرنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس آئیں، تو ڈاکٹر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں اس عیب سے باخبر کرے۔'' **فقال : أما أبو الجهم فلا يضع عصاه عن عاتقه ، وأما معاوية فصعلوك لا مال له ، انكحي أسامة ''**. (صحيح بخاري)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ: اگر نکاح کے بارے میں کوئی تم سے مشورہ لے، تو خیر خواہی کی بات یہ ہے کہ اگر اس موقع کی کوئی خراب تم کو معلوم ہو، تو ظاہر کردو، یہ غیبت حرام نہیں ہے۔ (تعلیم الدین: ص/۷۶)

سوال: ۲- ایک مرد اور ایک عورت جن کے درمیان رشتۂ نکاح کی بات چل رہی ہے، کسی ڈاکٹر کے پاس طبی جانچ کے لیے آتے ہیں، طبی جانچ کے نتیجے میں ڈاکٹر کو کسی ایک کا کوئی ایسا مرض معلوم ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس بات کا پورا اندیشہ ہے کہ ناقص الاعضاء بچے پیدا ہوں گے، یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد یا عورت کے مادۂ منویہ میں جراثیمِ تولید نہیں ہیں، ایسی صورت میں کیا ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے فریق کو پہلے فریق کے عیب یا مرض سے باخبر کرے، یا اس طبی جانچ کو راز سمجھ کر دوسرے فریق کو اس سے باخبر نہ کرے؟

جواب: ۲- سوال سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا طبی جانچ کے لیے ڈاکٹر

کے پاس آنا، رشتہ کے متعلق مشورہ طلب کرنے کی غرض سے ہے، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ فریقین میں سے ہر ایک پر ایک دوسرے کی حقیقت واضح کردے۔ " وكذلك المستشار في التزويج وإيداع الأمانة له أن يذكرها يعرفه على قصد النصح للمستشير لا على قصد الواقعية " . (احياء العلوم الدين :۳/۱۵۲)

سوال: ۳- (الف): ایک شخص کسی ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے، ڈاکٹر کو طبی جانچ کے نتیجے میں یہ بات معلوم ہے کہ یہ شخص نامرد ہے، یا اس میں کوئی ایسا عیب پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کا نکاح بارآور نہیں ہوسکتا، ڈاکٹر کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص کسی عورت سے نکاح کی بات چیت کررہا ہے، اور اپنے اس عیب کو چھپا کر اس عورت سے نکاح کرلینا چاہتا ہے۔

(ب): یا کوئی خاتون کسی ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے، وہ کسی ایسے اندرونی مرض یا عیب میں مبتلا ہے، جس پر مطلع ہونے کے بعد اس کا رشتۂ نکاح کہیں ہونا بہت مشکل ہے، اور وہ خاتون اپنے اس اندرونی مرض یا عیب کو چھپا کر کسی مرد سے نکاح کی بات چیت کررہی ہے، رشتۂ نکاح کی بات ڈاکٹر کے علم میں آچکی ہے۔ اِن دو صورتوں میں کیا ڈاکٹر کے لیے جائز یا واجب ہے کہ وہ دوسرے فریق کو اپنے مریض کے مرض یا عیب سے مطلع کردے؟ اور اگر وہ دوسرا فریق اس مریض، یا مریضہ کے بارے میں معلومات کرنے کے لیے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرتا ہے، تو ڈاکٹر کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

جواب: ۳- (الف): ایک شخص کسی ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے، ڈاکٹر کو طبی جانچ کے نتیجہ میں یہ بات معلوم ہے کہ یہ شخص نامرد ہے، یا اس میں کوئی ایسا عیب پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کا نکاح بارآور نہیں ہوسکتا ہے، اور ڈاکٹر کو یہ معلوم ہے کہ یہ

شخص کسی عورت سے نکاح کی بات چیت کر رہا ہے، اور اپنے اس عیب کو چھپا کر اس عورت سے نکاح کر لینا چاہتا ہے، اس صورت میں ڈاکٹر کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ دوسرے فریق کو اپنے مریض کے اس مرض یا عیب سے مطلع کر دے۔ "**فإن المصالح الشرعية بالنكاح لا تتأتى إلا بذلک**".

(ب): کوئی خاتون کسی ڈاکٹر کے زیر علاج ہے، وہ کسی اندرونی مرض یا عیب کو چھپا کر کسی مرد سے نکاح کی بات چیت کر رہی ہے، رشتۂ نکاح کی بات چیت ڈاکٹر کے علم میں آچکی ہے، تو اس صورت میں بھی ڈاکٹر کے لیے یہی اَولیٰ ہے کہ وہ اپنے مریض کے مرض یا عیب سے دوسرے فریق کو باخبر کر دے، کیوں کہ عدمِ اِطلاع کی صورت میں مصالحِ نکاح حاصل نہیں ہو سکتے۔

سوال: ۴- ایک شخص کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے، اس کی بینائی بری طرح متأثر ہو چکی ہے، ڈاکٹر کی رائے میں اس کا گاڑی چلانا اس کے، اور دوسروں کے لیے مہلک ہو سکتا ہے، ایسا شخص اگر ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود گاڑی چلاتا ہے، تو کیا ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ متعلقہ محکمے کو اس کی بینائی کے بارے میں اطلاع کرے، اور ڈرائیونگ لائسنس منسوخ کرنے کی سفارش کرے؟ یا وہ راز داری برت کر خاموشی اختیار کر سکتا ہے؟ یہ سوال اس وقت اور اہمیت حاصل کر لیتا ہے، جب کہ یہ شخص گاڑی چلانے کی ملازمت کرتا ہو، بس وغیرہ چلاتا ہے، اس میں اگر ڈاکٹر متعلقہ محکمے کو اطلاع نہیں کرتا ہے، تو بہت سے لوگوں کی جان ضائع ہونے کا پورا خطرہ ہوتا ہے، اور اگر اطلاع کر دیتا ہے، تو اس ڈرائیور کی ملازمت خطرے میں پڑ جاتی ہے، وہ اور اس کے گھر والے بے پناہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

جــواب: ۴- ایک شخص کے پاس ڈرائیورنگ لائسنس ہے، اس کی بینائی بری طرح متأثر ہو چکی ہے، اور ڈاکٹر کی رائے میں اس کا گاڑی چلانا خود اس کے اور دوسروں کے لیے مہلک ہوسکتا ہے، ایسا شخص اگر ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود گاڑی چلاتا ہے، تو ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ متعلقہ محکمے کو اس کی بینائی کے بارے میں اطلاع کرے، اور ڈرائیونگ لائسنس منسوخ کرنے کی سفارش کرے، اس لیے کہ اطلاع کی صورت میں ضررِ خاص کو خطرہ ہے، اور عدمِ اطلاع کی صورت میں ضررِ عام کا۔اور فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ: ''**یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام**'' نیز ''**تحذیر المسلم من الشر**'' ایسا عذر ہے، جس سے غیبت کی رخصت ہے۔

(احیاء علوم الدین: ۱۵۲/۳)

ســـــوال: ۵- اگر کوئی شخص ایسی ملازمت پر ہے، جس سے بہت سے لوگوں کی زندگیوں کا تحفظ وابستہ ہے، مثلاً ہوائی جہاز کا پائلٹ یا ٹرین یا بس وغیرہ کا ڈرائیور، یہ شخص شراب یا دوسری نشہ آور چیزوں کا بری طرح عادی ہے، اور کسی ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے، نشہ کو ترک نہیں کرتا، اور اسی حال میں ملازمت کے فرائض انجام دیتا ہے، تو کیا ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ متعلقہ محکمے کو اس مریض کے بارے میں خبر کرے کہ یہ شخص کثرت سے شراب یا نشہ آور چیزوں کا استعمال کرتا ہے، یا مریض کی رازداری کرے؟

جــواب: ۵- اگر کوئی شخص ایسی ملازمت پر ہے، جس سے بہت سے لوگوں کی زندگیوں کا تحفظ وابستہ ہے، مثلاً ہوائی جہاز کا پائلٹ، یا ٹرین یا بس کا ڈرئیور وغیرہ، اور یہ شخص شراب یا دوسری نشہ آور چیزوں کا بری طرح عادی ہے، اور کسی ڈاکٹر کے زیر علاج ہے، نشہ ترک نہیں کرتا، اور اسی حال میں ملازمت کے فرائض انجام دیتا ہے، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ متعلقہ محکمے کو اس مریض کے بارے میں

خبر کردے، کیوں کہ عدمِ اطلاع کی صورت میں ضررِ عام کا اندیشہ ہے۔

”یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام“ .

سوال: ۶- اگر کسی عورت کو ناجائز حمل تھا، اس عورت سے بچہ پیدا ہوا، اور وہ اس نومولود کو کسی شاہراہ، یا پارک، یا کسی اور مقام پر زندہ حالت میں چھوڑ کر چلی آئی، تا کہ سماج میں بدنامی سے بچ جائے، اس نے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا، اور ڈاکٹروں کو اس صورتِ حال کی خبر دی، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا وہ اس عورت کی راز داری کرے، اور اس کے غلط اِقدام کے بارے میں کسی کو خبر نہ دے؟ یا اس کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ اس معصوم زندہ بچے کے بارے میں حکومت کے متعلقہ محکمے کو باخبر کردے؟

جواب: ۶- اگر کسی عورت کو ناجائز حمل تھا، اس عورت سے بچہ پیدا ہوا، اور وہ اس نومولود کو کسی شاہراہ، پارک یا کسی اور مقام پر زندہ حالت میں چھوڑ کر چلی آئی، تا کہ سماج میں بدنامی سے بچ جائے، اس نے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا، اور ڈاکٹر کو اس صورتِ حال سے باخبر کیا، تو ایسی صورت میں ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ معصوم بچے کی حفاظت کے پیشِ نظر، حکومت کے متعلقہ محکمے کو، یا کسی بھی حفاظتی تنظیم کو خبر کردے، اس میں مقصود عورت کی پردہ داری ہے، اور اس کے جرم کا اِفشا نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: ۷- ایک شخص شراب کا، یا کسی اور نشہ آور چیز کا بہت بری طرح عادی ہے، اور اپنی اس بری عادت کو خواہش کے باوجود نہیں چھوڑ رپا رہا ہے، اس شخص نے یا اس کے گھر والوں نے ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر سے اس مریض کا علاج کرانے کے لیے رابطہ قائم کیا، ڈاکٹر نفسیاتی علاج کے مختلف طریقے مریض پر آزما چکا، لیکن اسے کامیابی نہیں مل سکی، اور یہ شخص برابر شراب یا منشیات کا رسیا رہا، اس ماہر نفسیات ڈاکٹر

کے پاس ایک ہی طریقۂ علاج باقی بچا ہے، وہ یہ کہ مریض کو وقفہ وقفہ سے وہی شراب یا نشہ آور چیز استعمال کرنے کی تجویز کرے، جس کا وہ عادی ہے، لیکن مریض کے علم میں لائے بغیر اس میں کوئی ایسی دوا شامل کرادے، جو شراب یا نشہ آور چیز کے استعمال کے بعد وہ مریض کافی دیر تک متلی یا قے وغیرہ کی شکایت میں گرفتار رہے، اس طرح مریض کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ میں شراب یا نشہ آور چیز کا استعمال کروں گا، تو متلی اور قے میں گرفتار ہو جاؤں گا، یہ طریقۂ علاج بہت سے مریضوں پر کارآمد ثابت ہوتا ہے، کیا مختلف نفسیاتی طریقۂ علاج کے ناکام ہونے کے بعد ایک مسلمان ڈاکٹر اپنے مریض پر یہ طریقۂ علاج استعمال کرسکتا ہے؟ حالانکہ اس میں مریض کو ایک ناجائز اور حرام چیز کے استعمال کا مشورہ دیا جارہا ہے۔

جـــواب : ۷- اس صورت کا تعلق اِصلاح سے ہے، اور کوئی بھی آدمی کسی کی اصلاح کا اس قدر مکلّف نہیں ہے، کہ اسے حرام چیز کے استعمال کا مشورہ دے۔

”**درء المفاسد أولی من جلب المصالح**“ . (الأشباہ والنظائر)

ســـوال: ۸- بہت سے جرائم پیشہ افراد ماہر نفسیات ڈاکٹر کے زیر علاج ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنے جرائم پیشہ ہونے کا حد درجہ اِخفا کرتے ہیں، کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہوسکے، مثلاً ایک شخص جاسوسی کرتا ہے، اور لوگوں کے راز مختلف ذرائع سے حاصل کرکے دوسرے افراد، یا پارٹیوں تک پہنچاتا ہے، اس کی جاسوسی سے بہت سے لوگوں کا غیر معمولی نقصان ہوتا ہے، ایسا جاسوس بسا اوقات نفسیاتی اُلجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے، نفسیاتی اُلجھن کی وجہ سے بسا اوقات اسے بے خوابی اور دوسری شکایتیں پیدا ہوجاتی ہیں، اور وہ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرتا ہے، اسے

اپنے پیشہ اور جرائم کی خبر دیتا ہے، ایسے بعض لوگ اپنے پیشوں اور جرائم کو انتہائی غلط سمجھتے ہیں، لیکن چوں کہ ان کے معاشی مفادات اس پیشہ یا جرم سے وابستہ ہو گئے ہیں، اس لیے اسے ترک کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں، ڈاکٹر کو اس مریض کے بتانے سے اس کے ناجائز پیشہ اور جرم کی خبر ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں اس مریض کے بارے میں ڈاکٹر کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا وہ راز داری سے کام لے، اور کسی کو اس کے بارے میں باخبر نہ کرے؟ یا اس کے بارے میں لوگوں کو اور حکومت کے متعلقہ محکمے کو باخبر کر دے، تا کہ اس کے ضرر سے لوگ محفوظ رہیں؟

جــــواب: ۸- اس صورت میں ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کو، اور حکومت کے متعلقہ محکمے کو خبر کر دے، تا کہ متعلقہ افراد اور حکومت اس کے شر سے محفوظ رہے۔ (فتاوی هندیه: ۵/۳۶۳)

ســوال: ۹- کسی مریض (مثلاً نفسیاتی مریض) نے کسی جرم کا ارتکاب کیا، مثلاً کسی کو قتل کیا، یا اس طرح کی کوئی اور سنگین وارِدات کی ہے، اور ڈاکٹر کے پاس اس جرم کا اقرار کیا ہے، اسی جرم پر شبہ کی بنیاد پر دوسرا شخص ماخوذ ہو گیا ہے، اس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے، اس بات کا پورا اندیشہ ہے کہ وہ دوسرا شخص جو دار اصل جرم سے بری ہے عدالت میں مجرم قرار دے دیا جائے، اور سزا یاب ہو جائے، ایسی صورت میں کیا ڈاکٹر اس مجرم مریض کے بارے میں راز داری سے کام لے؟ یا اس کا راز افشا کرتے ہوئے عدالت میں جا کر بیان دے، تا کہ بے گناہ شخص کی رہائی ہو سکے؟

جــواب: ۹- کسی مریض (مثلاً نفسیاتی مریض) نے کسی جرم کا ارتکاب کیا، مثلاً کسی کا قتل کیا، یا اس طرح کی اور کوئی سنگین واردات کی ہے، اور ڈاکٹر کے پاس اپنے

جرم کا اقرار کیا ہے، اسی جرم کی شبہ کی بنا پر دوسرا شخص ماخوذ ہوگیا ہے، اس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے، اس بات کا پورا اندیشہ ہے کہ وہ دوسرا شخص جو دراصل مجرم نہیں ہے، عدالت میں مجرم قرار دے دیا جائے، اور سزایاب ہوجائے، ایسی صورت میں ڈاکٹر پر واجب ہے کہ عدالت میں جاکر مقدمہ میں گرفتار شخص کی برأت، اور اپنے زیر علاج مجرم مریض کے جرم میں ملوث ہونے کی شہادت دے۔

سوال: ۱۰- اگر کوئی شخص کسی متعدی مرض (مثلاً ایڈز، طاعون وغیرہ) میں مبتلا ہے، اور کسی ڈاکٹر کے زیر علاج ہے، مریض کا اِصرار ہے کہ ڈاکٹر اس کے اس مرض کی اطلاع کسی سے، حتی کہ اس کے گھر والوں سے بھی نہ کرے، ورنہ وہ گھر اور سماج میں اَچھوت بن کر رہ جائے گا، کوئی بھی اس سے ملنا جلنا، اس کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا گوارا نہیں کرے گا، ایسی صورت میں اس مریض کے تئیں ڈاکٹر کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا وہ اس کے مرض کو راز میں رکھے، تاکہ مریض کو ضرر سے بچا سکے، یا اس کے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو اس کے مرض کی خبر کردے، تاکہ یہ مرض دوسروں کو لاحق نہ ہوجائے؟

جواب: ۱۰- اگر کوئی شخص کسی متعدی مرض میں مبتلا ہے، اور کسی ڈاکٹر کے زیر علاج ہے، اور مریض کا اِصرار ہے کہ ڈاکٹر اس کے اس مرض کی اطلاع کسی کو نہ دے، حتی کہ اس کے گھر والوں کو بھی نہ کرے، ورنہ وہ اَچھوت بن کر رہ جائے گا، اور ڈاکٹر کو ظن غالب ہے کہ عدم اطلاع کی صورت میں دیگر افراد کو ضرر پہنچے گا، تو ڈاکٹر اس کے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو اس کے اس مرض سے خبر کردے۔

(منقول از: جدید فقہی مباحث: ۱۰/۱۵۶-۱۶۱، ترتیب: قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب رحمہ اللہ، ط: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی، طبی اخلاقیات؛ دائرے ضابطے فقہ اسلامی کی روشنی میں: ص/۲۶۱-۲۷۱، ط: ایفا پبلی کیشنز دہلی)

مقالہ

(۱۷رواں فقہی سمینار[برہان پور]، بتاریخ: ۲۸-۳۰/ربیع الاول ۱۴۲۹ھ/ مطابق: ۵-۷/اپریل ۲۰۰۸ء)

بعض جدید وسائل کے روزہ پر اثرات

تمہید: اسلام؛ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا ایسا دین ہے، جو پورے عالمِ انسانی کی دنیوی کامیابی اور اخروی نجات کا ضامن ہے، اور فقہ اسلامی ایسا قانون ہے، جو پیغامِ نبوت سے مستنبط وماخوذ ہے، اس میں ہر عہد و زمانہ کے معاشی، معاشرتی، سیاسی، صنعتی تبدیلیوں اور جدید ترقیات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دشواریوں و پریشانیوں کا حل موجود ہے۔ اگر ہمارے سامنے قرآن وسنت، آثارِ صحابہ اور سلفِ صالحین کی تشریحات موجود ہوں، اور جدید مسائل کی صحیح خد وخال سے ہم واقف ہوں، تو نئے مسائل پر حکمِ شرعی کا انطباق کر کے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ:

''اسلام میں قیامت تک تمام پیش آمدہ مسائل کا حل موجود ہے!''

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے، یہ بات فخر سے بڑھ کر باعث شکر ہے کہ **''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند''** ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائلِ جدیدہ کے حل کے لیے، ہندوستان بھر کے علماء، شیوخ اور اربابِ افتاء کی توجہ مبذول کرا کر، کسی بھی جدید مسئلے کے جواز یا عدمِ جواز پر متفقہ فیصلے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ بانیٔ اکیڈمی، استاذِ محترم ''حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی رحمہ اللہ'' کی

کروٹ کروٹ مغفرت فرما کر، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، اور یہ ادارہ تا قیامت یوں ہی پھلتا پھولتا اور ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کرتا باقی رہے۔ آمین!

اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک اہم رکن روزہ ہے، روزہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک اکل وشرب اور جماع سے رُکے رہنے کا نام ہے، اکل وشرب کا لفظ معروف ہے، اور عام آدمی بھی اس کے متبادر مفہوم سے واقف ہے، کھانے اور پینے میں بنیادی طور پر حلق کے راستے سے قابلِ خورد ونوش اشیاء انسان کے معدے تک پہنچتی ہیں، فقہاء نے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد سے کام لے کر اکل وشرب کے دائرے کو وسیع فرمایا ہے، اور کسی بھی چیز کے فطری منافذ کے ذریعے جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ تک پہنچنے کو ناقضِ صوم قرار دیا ہے۔

اس پس منظر میں قدیم فقہاء نے ناک، کان، آنکھ اور آگے اور پیچھے کے راستے سے جسم میں داخل ہونے والی اشیاء سے روزہ ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کا ذکر کیا ہے، نیز ان میں سے بعض صورتوں میں فقہاء کے درمیان اختلافِ رائے بھی پایا جاتا ہے، فقہاء نے عام طور پر فطری منفذ اور غیر فطری منفذ کے درمیان فرق کیا ہے، اس بات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ داخل ہونے والی شئے کسی جوف میں جا کر قرار پذیر ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ نیز اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ مجوف اعضاء سے کون سے اعضاء مراد ہیں؟ اس موضوع کا تعلق ایک حد تک طب اور علم التشریح سے بھی ہے، مثلاً: دماغ کو قدیم اطباء جوف مانتے تھے، غالباً اسی پس منظر میں فقہاء نے جوفِ دماغ اور جوفِ بطن کا ذکر کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں سائنس داں جوفِ دماغ کے قائل نہیں ہیں، یعنی وہ دماغ کے اندر کوئی ایسا مجوف حصہ نہیں مانتے، جس میں داخل ہو کر کوئی شئے ٹھہر جائے اور قرار پذیر ہو۔

میڈیکل سائنس کی ترقی اور طریقۂ علاج میں بعض اختراعات نے کچھ نئے مسائل پیدا کردیئے ہیں، جن پر قرآن وحدیث کے ارشادات اور سلفِ صالحین کے مقرر کیے ہوئے اصول واجتہادات کی روشنی میں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، اسی طرح کے چند سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں:

سوال:۱- امراضِ قلب سے متعلق بعض دوائیں وہ ہیں جنہیں نگلا نہیں جاتا، بلکہ زبان کے نیچے دبا کر رکھا جاتا ہے، اگر روزہ کی حالت میں اس طریقہ پر مذکورہ دوا کا استعمال کیا جائے، اور اس دوا کو، یا لعاب میں مل جانے والے اس کے اجزا کو نگلنے سے بچا جائے، تو اس کا کیا حکم ہوگا، یہ مفسد صوم ہوگا یا نہیں؟

جواب:۱- اَمراضِ قلب سے متعلق وہ دوائیں (Tablets) جنہیں نگلا نہیں جاتا، بلکہ زبان کے نیچے دبا کر رکھا جاتا ہے، اگر روزہ کی حالت میں اس دوا کو اس طریقہ پر استعمال کیا جائے کہ دوا یا لعاب میں مل جانے والے اَجزا کو نگلنے سے بچا جائے، تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں دوا کی کوئی شئے پیٹ میں داخل نہیں ہوتی ہے، مریض کو جو افاقہ ملتا ہے وہ دوا کا اثر ہے، اور محض اثر مفسدِ صوم نہیں ہے۔ (موقع علماء الشريعه : مفطرات الصيام الصيام المعاصرة)

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوا کے مزے کا حلق میں پایا جانا مفسد صوم نہیں۔ ” (كطعم أدوية) أي لو دق دواء فوجد طعمه في حلقه . زيلعي وغيره . وفي القهستاني : طعم الأدوية وريح العطر إذا وجد في حلقه لم يفطر كما في المحيط “ . (رد المحتار : ۳/۳۶۷) اور طعمیت اثر کا ایک فرد ہے، کیوں کہ اثر میں تین چیزیں داخل ہیں: رنگ، بو اور مزہ۔

سوال: ۲- جن لوگوں کو تنفس کا مرض ہو، انہیں بعض اوقات انہیلر استعمال کرنا پڑتا ہے، انہیلر کے ذریعے ہوا، اور اس کے ساتھ دوا- جو غالباً سفوف کی شکل میں ہوتی ہے- کا نہایت مختصر جز پھیپھڑے تک پہنچایا جاتا ہے، گویا یہ جاتا تو حلق کے راستے ہی سے ہے، لیکن معدہ میں نہیں جاتا بلکہ پھیپھڑے میں جاتا ہے، کیا روزہ کی حالت میں اس کا استعمال درست ہوگا؟

جواب: ۲- جن لوگوں کو تنفس کا مرض ہوتا ہے ، انہیں بعض اوقات انہیلر یا (Spray Asthma) یا گیس پمپ استعمال کرنا پڑتا ہے (جس کے ذریعہ ہوا، اوراس ساتھ دوا جو غالباً سفوف کی شکل میں ہوتی ہے) کا نہایت مختصر جز پھیپھڑے تک پہنچ جاتا ہے، یہ حلق ہی کے راستے سے جاتا ہے، لیکن معدے میں نہیں جاتا، اگر چہ یہ بات جدید تحقیق سے یقینی طور پر ثابت ہے کہ سفوف کا یہ جز معدے تک نہیں پہنچتا، تب بھی روزہ فاسد ہوگا، کیوں کہ ہمارے نزدیک قصداً وارادۃً دھویں یا غبار کو حلق میں داخل کرنے سے بھی روزہ فاسد ہوتا ہے، جب کہ یہ دھواں بھی معدے تک نہیں پہنچتا۔

" تنویر الأبصار" کے متن: (أو دخل حلقه غبار أو ذباب أو دخان) کی تشریح میں، صاحبِ درمختار رقمطراز ہیں: " ومفاده أنه لو أدخل حلقه الدخان أفطر أي دخان كان . اهـ . " (رد المحتار :۳/۳۶۶)

فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمہ اللہ کا رجحان بھی کچھ اسی طرح معلوم ہوتا ہے، آپ اسی سلسلے کے ایک جواب میں لکھتے ہیں کہ:" ہوا منہ کے اندر جانے سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا، اگر چہ پمپ سے پہنچائی جائے، جب کہ اس میں کوئی اور چیز نہ ہو۔" مطلب یہ ہوا کہ پمپ کے اندر اگر دوا ہے، تو روزہ فاسد ہوگا۔

(فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۱۵۴، خیر الفتاویٰ: ۴/۹۸)

سوال: ۳- بعض دوائیں بھاپ کے ذریعے اندر لی جاتی ہیں، اس کا ایک سادہ طریقہ تو وہی ہے جو قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، کہ اُبلتے ہوئے گرم پانی میں دوا ڈال دی جاتی ہے، اور اس سے نکلنے والی بھاپ کو ناک اور منہ کے ذریعے کھینچا جاتا ہے، آج کل اس کے لیے بعض مشینی طریقے بھی ایجاد ہوئے ہیں، کیا اس طرح بھاپ کا لینا درست ہوگا؟

جواب: ۳- بعض دوائیں بھاپ کے ذریعے اندر لی جاتی ہیں، اس کا ایک سادہ طریقہ تو وہی ہے جو زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے، کہ اُبلتے ہوئے گرم پانی میں دوا ڈال دی جاتی ہے، اور اس سے نکلنے والی بھاپ کو ناک کے ذریعے کھینچا جاتا ہے، آج کل اس کے لیے مشینی طریقے ایجاد ہوئے ہیں، اس طرح بھاپ لینا روزہ کو فاسد کردے گا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ ''درمختار'' کی عبارت: (انه لو أدخل حلقه الدخان) کی شرح فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں: " (أي بأي صورة كان الإدخال حتى لو تبخر ببخور فآواه إلى نفسه واشتمه ذاكرًا لصومه أفطر لإمكان التحرز عنه ، وهذا مما يغفل عنه كثير من الناس) ولا يتوهم أنه كشم الورد ومائه والمسک لوضوح الفرق بين هواء تطيب بريح المسک وشبهه، وبين جوهر دخان وصل إلى جوفه بفعله . اهـ ." (رد المحتار: ۳/ ۳۶۶)

اسی طرح صاحب ''مراقی الفلاح'' فرماتے ہیں:" وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه من أدخل بصنعه دخانا حلقه بأي صورة كان الإدخال فسد صومه ، سواء كان دخان عنبر أو عود أو غيرهما ، حتى من تبخر ببخور فآواه إلى نفسه واشتم دخانا ذاكرا لصومه أفطر لإمكان التحرز عن إدخال المفطر جوفه ودماغه ، وهذا مما يغفل عنه كثير من الناس . فلينبه له . اهـ . "

(مراقي الفلاح مع الطحطاوي : ص/ ۳۶۱، ۳۶۲ ، الفقه الإسلامي وأدلته : ۲/۶۵۷)

سوال: ۴- موجودہ دور میں جسم کے اندر دواؤں کے پہنچانے کی ایک صورت انجکشن کی اختیار کی گئی ہے، جو جسم کے مختلف حصے میں لگائے جاسکتے ہیں، انجکشن کے ذریعے دوا کسی خاص حصہ میں بھی پہنچائی جاتی ہے، اور رگوں میں بھی پہنچائی جاتی ہے، تاکہ خون کے ساتھ پورے جسم میں اس کی رسائی ہوجائے، پھر بعض انجکشن محض دوا کی ضرورت پوری کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو جسم کی غذا کی ضرورت پوری کرتے ہیں، پس انجکشن کے ذریعے جسم کے اندر دوا پہنچانا، یا جسم کی غذائی ضرورت کو پوری کرنا مفسد صوم ہے یا نہیں؟ یا اس سلسلے میں کچھ تفصیل بھی ہے؟

جواب: ۴- موجودہ دور میں جسم کے اندر دوا پہنچانے کی ایک صورت انجکشن کی اختیار کی گئی ہے، جو جسم کے مختلف حصوں میں لگائے جاسکتے ہیں، انجکشن کے ذریعہ دوا کسی خاص حصہ میں بھی پہنچائی جاتی ہے، اور رگوں میں بھی پہنچائی جاتی ہے، تاکہ خون کے ساتھ پورے جسم میں اس کی رسائی ہوجائے۔ انجکشنوں کی دو قسمیں ہیں؛ بعض محض دوا کی ضرورت پوری کرتے ہیں، اور بعض جسم کی غذائی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ ہر دو قسم کے انجکشن مفسد صوم نہیں، کیوں کہ دوا ہو یا غذا ہر دو کا منافذِ اصلیہ سے پیٹ میں پہنچنا ضروری ہے، جب کہ انجکشنوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ ''النہر الفائق'' کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں: ''**والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ**''- کہ ''منافذ اصلیہ سے داخل ہونے والی شئ ہی روزہ کو توڑتی ہے۔'' (ردالمحتار: ۳/۳۶۷)

نیز صاحب ''بدائع الصنائع'' فرماتے ہیں: ''**وأما ما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ عن غير المخارق الأصلية بأن داوى الجائفة والآمة، فإن داواها**

بـدواء يابسٍ لا يفسد ؛ لأنه لم يصل إلى الجوف ولا إلى الدماغ ، ولو علم أنه وصل يفسد في قول أبي حنيفة ، وإن داواها بدواء رطبٍ يفسد عند أبي حنيفة ، وعندهما لا يفسد ، هما اعتبر المخارق الأصلية؛ لأن الوصول إلى الجوف من المخارق الأصلية متيقن به ، ومن غيرها مشكوک فيه ، فلا نحكم بالفساد مع الشک . ولأبي حنيفة أن الدواء إذا كان رطبا فالظاهر هو الوصول لوجود المنفذ إلى الجوف ، فيبنى الحكم على الظاهر " . (۲/ ۲۴۳، ط : زكريا ديوبند)

فتاویٰ "ہندیہ" میں ہے: " وفي دواء الجائفة والآمة أكثر المشائخ على أن العبرة للوصول إلى الجوف والدماغ ، لا لكونه رطبا أو يابسا حتى إذا علم أن اليابس وصل يفسد صومه ، ولو علم أن الرطب لم يصل لم يفسد . هكذا في العناية " . (۱/۲۰۴)

علامہ شامی رحمہ اللہ اسی سلسلے کی بحث میں فرماتے ہیں: " فالمعتبر حقيقة الوصول حتى لو علم وصول اليابس أفسد أو عدم وصول الطري لم يفسد" . (رد المحتار: ۳/۳۷۶ ، خلاصة الفتاوى: ۱/ ۵۳ ، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح : ص/۳٦۸) (امداد الفتاویٰ: ۱/ ۱۴۷، احسن الفتاویٰ: ۴/۴۳۲، فتاویٰ حقانیہ: ۴/۱۶۲، فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۱۵۳، فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۲۵۷، فتاویٰ مفتی محمود: ۳/ ۴۸۹، فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ٦/ ۴۰۸، ۴۰۹)

سوال: ۵- جسم میں نمکیات کی کمی کو پورا کرنے اور غذا سے مطلوبہ قوت فراہم کرنے کے لیے "گلوکوز" چڑھایا جاتا ہے، یہ چوں کہ ایک حد تک غذا کا متبادل ہے، اس لیے اس سے بھوک کا احساس کم ہو جاتا ہے، اور بھوک کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوری سے بھی آدمی محفوظ رہتا ہے، روزہ کی حالت میں کیا اس طرح گلوکوز کا

استعمال درست ہوگا؟ جب کہ یہ فطری منفذ سے داخل نہیں کیا جاتا، لیکن اس کی وجہ سے ترکِ اکل وشرب سے پیدا ہونے والی کیفیت بھی انسان کے اندر متحقق نہیں ہوتی۔

جواب: ۵- جسم میں نمکیات کی کمی پورا کرنے اور غذا سے مطلوبہ قوت فراہم کرنے کے لیے جو ''گلوکوز'' چڑھایا جاتا ہے، یہ چوں کہ ایک حد تک غذا کا متبادل ہے، اس لیے اس سے بھوک کا احساس کم ہو جاتا ہے، اور بھوک کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوری سے بھی آدمی محفوظ رہتا ہے، روزہ کی حالت میں اس طرح ''گلوکوز'' کو چڑھانے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، کیوں کہ فسادِ صوم کے لیے کسی بھی شئ کا انسانی پیٹ میں منافذِ اصلیہ سے پہنچنا ضروری ہے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت: ''**والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ**'' (مفطر صوم وہی چیز ہے، جو جوف میں منافذِ اصلیہ سے داخل ہو) سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ (رد المحتار: ۳/۳۶۶) اور گلوکوز چڑھانے میں یہ بات نہیں پائی جاتی، خواہ گلوکوز چڑھانے سے بھوک کا احساس کم ہو جاتا ہو، یا بھوک سے پیدا ہونے والی کمزوری دور ہو جاتی ہو، فسادِ صوم کا حکم نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ اکل وشرب اَمرِ بدیہی ہے، اور گلوکوز چڑھانے پر ''اکل'' کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/ ۱۴۸، منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/۱۳۳)

''شرح مہذب'' کی یہ عبارت ہے: ''**لو أوصل الدواء إلى داخل الساق أو غرز فيه سكينا أو غيرها فوصلت مخه لم يفطر بلا خلاف ؛ لأنه لا يعد عضوا مجوفا**''. (۵/۳۱۴)

......بھی اس پر شاہد ہے کہ جسم کے کسی بھی حصے میں دوا وغیرہ کا داخل کرنا مفطرِ صوم نہیں۔ بلکہ افطار کے لیے دو شرطیں ہیں: (۱) دخول، منافذِ اصلیہ سے ہو۔

(۲) داخل ہونے والی شئ جوف میں مستقر ہو، صاحبِ ''بدائع الصنائع'' فرماتے ہیں:'' وما وصل إلی الجوف أو إلی الدماغ من المخارق الأصلية كالأنف والأذن والدبر بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلی الجوف أو إلی الدماغ فسد صومه ''. '' وأما إذا وصل إلی الجوف فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة ، وكذا إذا وصل إلی الدماغ ؛ لأن له منفذًا إلی الجوف ، فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجو ف ''. (۲/۲۴۳، ط: زکریا) اس بحث کے آخر میں آپ فرماتے ہیں:'' هذا يدل علی أن استقرار الداخل في الجوف شرط فساد الصو م ''.

(بدائع الصنا ئع : ۲/۲۴۴ ، رد المحتا ر:۳/۳۶۹ ، البحر الرائق : ۲/۴۳۸)

سوال:۶- بعض سیال یا غیر سیال دوائیں پیچھے کے راستے سے اندر پہنچائی جاتی ہیں، اسی طرح بواسیر کے مرض میں اندرونی مسوں پر مرہم لگایا جاتا ہے، اورامراضِ معدہ کی تحقیق کے لیے بعض آلات بھی اندر داخل کیے جاتے ہیں، یہ صورتیں روزہ کے لیے مفسد ہوں گی یا نہیں؟

جواب:۶- (الف): بعض سیال یا غیر سیال دوائیں(Injection Of Liquid) اینما یا کسی اور طریقے سے اندر پہنچائی جاتی ہیں، یہ دوائیں جوف تک پہنچتی ہیں، اس لیے مفسد صوم ہیں، خواہ سیال ہوں یا غیر سیال، اس لیے کہ اعتبار سیال یا غیر سیال کا نہیں، بلکہ وصول الی الجوف کا ہے، جیسا کہ صاحب ''البحر الرائق''، ''کنز الدقائق'' کے متن:(وإن احتقن أو استعط أو أقطر في أذنه أو داویٰ جائفة أو آمة بدواء ، ووصل الدواء إلی جوفه أو دماغه أفطر) کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:'' أطلق الدواء ، فشمل الرطب واليابس ؛ لأن العبرة للوصول ،

لا لكونه رطبا أو يابسا ، وإنما شرطه القدوري ؛ لأن الرطب هو الذي يصل إلى الجوف عادة ، حتى لو علم أن الرطب لم يصل لم يفسد ، ولو علم أن اليابس وصل فسد صومه . كذا في العناية ".

(البحر الرائق : ۲/۴۳۸ ، الفتاوى الهندية : ۱/۲۰۴)

شیخ الاسلام، قاضی القضاۃ ابوالحسن علی ابن الحسین ابن محمد السغدی رحمہ اللہ "النتف فی الفتاویٰ" میں فرماتے ہیں:" وأما من الدبر فواحدة وهي الاحتقان فلا يفسد منه الصوم في قول أبي عبد الله ، ويفسد في قول أبي حنيفة وأصحابه ".

(حقنہ لگانے سے ابوعبداللہ کے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوتا، البتہ امام ابوحنیفہ اوران کے اصحاب کے نزدیک روزہ فاسد ہوجاتا ہے)۔ (ص/۱۰۳)

علامہ شامی رحمہ اللہ نے " باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد " میں "تنویر الابصار" کے متن: (أو احتقن أو استعط أو أقطر في أذنه دهنًا أو داوى جائفة أو آمة) کے ذیل میں بڑی اچھی بات ذکر فرمائی کہ:

اِحتقان (پیچھے کی راہ سے دوا کا اندر پہنچانا)، اِستعاط (ناک میں دوا چڑھانا) اِقطار (کان میں دوا ٹپکانا) کو فقہائے کرام نے "وصول" کی قید کے ساتھ اس لیے مقید نہیں فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ ان تینوں صورتوں میں وصول ہو ہی جاتا ہے، اس لیے روزہ فاسد ہوگا۔ " قلت : ولم يقيدوا الاحتقان والاستعاط والإقطار بالوصول إلى الجوف بظهوره فيها ، وإلا فلا بد منه ، حتى لو بقي السعوط في الأنف ولم يصل إلى الرأس لا يفطر ". (رد المحتار: ۳/۳۷۶) -- " وإذا احتقن يفسد صومه ".

(الفتاوى التاتارخانية : ۲/ ۳۶۵ ، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح : ص/ ۳٦٧ ، باب ما يفسد الصوم ويوجب القضاء من غير كفارة ، فتاوى قاضي خان على هامش الهندية : ۱/۲۱۰ ، الفصل السادس فيما يفسد الصوم)

خلاصۃ الفتاوی میں ہے:" وما وصل إلی جوف الرأس والبطن من الأذن والأنف والدبر فهو مفطر بالإجماع ، وفیه القضاء ، وهي مسائل الإفطار في الأذن والسعوط والوجور والحقنة ، وکذا من الجائفة والآمة عند أبي حنیفة " . (۱/۲۵۳)

(ب): بواسیر کے مرض میں ان مسوں پر مرہم لگانا جو باہر ہی رہتے ہیں، دوا لگانے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، ان مسوں کو ظاہرِ بدن کا حکم حاصل ہوگا، اور ظاہرِ بدن پر دوا لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اسی طرح وہ مسّے جو بوقتِ استنجا باہر نکل آتے ہیں، اور فراغت پر انہیں پانی سے تَر کر کے انگلی وغیرہ کی مدد سے اُوپر چڑھانا ہوتا ہے۔ پَر دوا لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیوں کہ یہ مسے موضعِ حقنہ سے بہت نیچے ہوتے ہیں، اور مقعد کی راہ سے داخل ہونے والی چیز اسی وقت مفسد صوم ہوتی ہے، جب موضعِ حقنہ تک پہنچے۔

(احسن الفتاویٰ:۴/۴۴۰، خیر الفتاویٰ:۴/۵۹)

علامہ شامی رحمہ اللہ "تنویر الابصار" کے متن:(أو أدخل اصبعه الیابسة فیه أي دبره أو فرجها ولو مبتلّة فسد " کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" قوله : ولو مبتلّة فسد لبقاء شيء من البلّة في الداخل ، وهذا لو أدخل الاصبع إلی موضع الحقنة " . (رد المحتار:۳/۳۶۹)

(ج): اَمراضِ معدہ کی تحقیق کے لیے بعض جدید آلات، معدے میں داخل کیے جاتے ہیں، اگر اس پر کوئی (Liquid) سیال مادہ وغیرہ نہ لگایا گیا ہو، تو محض اس آلے کو داخل کر کے نکالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ جیسا کہ "البحر الرائق" کی اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے۔

" ولو شد الطعام بخيط وأرسله في حلقه وطرف الخيط في يده لا يفسد الصوم". اگر کھانا دھاگے سے باندھے اور اس کو اپنے حلق میں چھوڑ دے، اور دھاگے کا ایک کنارہ اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ (۴۳۸/۲)

صاحبِ درمختار علامہ حصکفی رحمہ اللہ کی عبارت: (وكذا ابتلع خشبة أو خيطا ولو فيه لقمة مربوطة إلا أن ينفصل منها شيء ، ومفاده أن استقرار الداخل في الجوف شرط للفساد . بدائع .) کی شرح کرتے ہوئے علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" قوله : (مفاده) ما ذكر متنا وشرحا ، وهو ان في ما دخل في الجوف إن غاب فيه فسد ، وهو المراد بالاستقرار ، وإن لم يغب بل بقي طرف منه في الخارج أو كان متصلاً بشيء خارج لا يفسد لعدم استقراره". (ردالمحتار: ۳۶۹/۳)-- لیکن اگر اس داخل کیے جانے والے آلہ پر کسی قسم کا کوئی "Liquid" وغیرہ لگایا گیا ہو، جس سے اس آلہ کا داخل ہونا وغیرہ آسان ہو جاتا ہے، تو اس آلہ پر لگے "Liquid" کے معدہ میں داخل ہونے کی وجہ سے روزہ فاسد ہونا چاہئے، کیوں کہ اس پر تو" غيبوبت في الجوف" صادق آرہا ہے، جو فسادِ صوم کی شرط ہے، جیسا کہ شامی کی یہ عبارت اس پر شاہد ہے۔ " مفاد ما ذكر متنا وشرحا وهو ان ما دخل في الجوف إن غاب فيه فسد ، وهو المراد بالاستقرار " . (ردالمحتار: ۳۶۹/۳)

سوال: ۷- آگے کی راہ سے بھی بعض اشیاء اندر تک پہنچائی جاتی ہیں، جیسے مرد وعورت کے جسم میں مثانہ تک نلکی پہنچائی جاتی ہے، بعض امراض میں خواتین کی شرم گاہ میں سیال یا جامد دوا رکھی جاتی ہے، یا مرض کی تحقیق کے لیے بعض آلات رحم تک پہنچائے جاتے ہیں، یہ صورتیں ناقضِ صوم ہیں یا نہیں؟

جواب: ۷- جو چیزیں آگے کی راہ سے اندر تک پہنچائی جاتی ہیں، اس سلسلے میں قدرے تفصیل ہے:

(الف): اگر مرد یا عورت کے آگے کے راستے میں مثانہ تک صرف نلکی ڈالی جائے، اور اس پر کوئی ''Liquid'' وغیرہ نہ لگی ہو، تو دونوں کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ '' وكذا لو دخل اصبعه في استه أو أدخلت المرأة في فرجها هو المختار'' . (البحر الرائق: ۲/۴۳۸) '' أو أقطر في إحليله ماء أو دهنا وإن وصل إلى المثانة على المذهب '' . (در مختار) . (ردالمحتار: ۳/۳۷۲)

(ب): اگر مرد کے آگے کے راستے میں نلکی ڈالی جائے اور اس پر کوئی Liquid وغیرہ لگی ہو، تو طرفین کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیوں کہ مثانہ اور معدہ کے مابین کوئی منفذ نہیں، جس سے یہ Liquid یا دوا معدہ تک پہنچ کر مفسد صوم بن جائے، البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں روزہ فاسد ہوگا، کیوں کہ وہ فرماتے ہیں مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ ہے، جس سے یہ دوا یا Liquid معدہ تک پہنچ جائے گی۔

'' وإن أقطر في إحليله .... أي لا يفطر . أطلقه فشمل الماء والدهن ، وهذا عندهما خلافا لأبي يوسف رحمه اللّٰه '' . (البحر الرائق : ۲/۴۳۸)

(ج): اگر عورت کے آگے کے راستے میں نلکی ڈالی جائے اور اس پر Liquid یا کوئی دوا وغیرہ لگی ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ '' إلا إذا كانت الأصبع مبتلة بالماء أو الدهن ، فحينئذ يفسد لوصول الماء أو الدهن '' . (البحر الرائق: ۲/۴۳۸)

علامہ شامی رحمہ اللہ کی رائے اس سلسلے میں یہی ہے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:

'' أو أدخل اصبعه اليابسة فيه أي دبره أو فرجها ولو مبتلة فسد (در

مختار)..... وفي الشامية : قوله : لبقاء شيء من البلة في الداخل ".
(ردالمحتار:۳/۳۶۹)

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:" ولو أدخل اصبعه في استه أو المرأة في فرجها لا يفسد ، وهو المختار إلا إذا كانت مبتلة بالماء أو الدهن ، فحينئذ يفسد لوصول الماء أو الدهن . هكذا في الظهيرية ". (۱/۲۰۴)

" وأما في قبلها فمفسد إجماعا ؛ لأنه كالحقنة . (در مختار). وفي الشامية : قلت : الأقرب التخلص بأن الدبر والفرج الداخل من الجوف إذ لا حاجز بينهما وبينه فهما في حكم ". (ردالمحتار:۳/۳۷۲)

(د): اگر بحالت صوم عورت کی شرم گاہ میں سیال یا جامد دوا رکھی جائے، تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ " وتكلم المشائخ في الإقطار في إقبال النساء ، منهم من قال على الخلاف ، ومنهم من قال تفسد بلا خلاف ، وهو الصحيح ".
(خلاصة الفتاوی : ۱/۲۵۳)

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" الدبر والفرج الداخل من الجوف إذ لا حاجز بينهما وبينه فهما في حكم ". (ردالمحتار:۳/۳۷۲) (فتاویٰ حقانیہ:۴/۱۶۸)

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:" وفي الإقطار في إقبال النساء يفسد بلا خلاف ، وهو الصحيح . هكذا في الظهيرية ". (۱/۲۰۴ ، البحر الرائق : ۲/۴۳۸)

(ھ): بسا اوقات تحقیقِ مرض کے لیے بعض آلات عورت کے آگے کی راہ سے رحم تک پہنچائے جاتے ہیں، اگر ان آلات پر کوئی دوا وغیرہ نہ لگائی گئی ہو، تو روزہ فاسد نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' کی اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے:" ولو شدّ الطعام بخيط وأرسله في حلقه وطرف الخيط في يده لا يفسد الصوم "

.–اگر کھانا دھاگے سے باندھے اور اس کو اپنے حلق میں چھوڑ دے، اور دھاگے کا ایک کنارہ اس کے ہاتھ میں ہو، تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ (۴۳۸/۲ ، رد المحتار: ۳۶۹/۳)

اور اگر ان آلات پر کوئی دوا وغیرہ لگائی گئی ہو، تو دوا کا کچھ نہ کچھ جز اندر باقی رہے گا، اس لیے روزہ فاسد ہوگا، جیسا کہ ''البحر الرائق'' کی اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے: ''إلا إذا كانت الأصبع مبتلّة بالماء أو الدهن ، فحينئذ يفسد لوصول الماء أو الدهن '' . ''جب انگلی پانی یا تیل سے تر ہو، تو روزہ فاسد ہوگا پانی یا تیل کے پہنچنے کی وجہ سے۔'' (۴۳۸/۲)– '' لبقاء شيء من البلة في الداخل ''. ''اندر کچھ نہ کچھ تری کے باقی رہ جانے کی وجہ سے۔'' (رد المحتار: ۳۶۹/۳)

فقیہ عصر، شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کا بھی یہی خیال ہے، آپ فرماتے ہیں: '' إن المنظار لا يفطر إلا إذا وضع مع المنظار مادة دهنية مغذية تسهل دخول المنظار ، فهھنا يفطر الصائم بهذه المادة لا بدخول المنظار ؛ لأنه لا يفطر إلا المغذي '' . (موقع علماء الشريعة : مفطرات الصيام المعاصرة)

(نواقضِ صوم سے متعلق نئے مسائل: ص/۴۹۲–۵۰۰، ط: ایفا پبلی کیشنز دہلی)

❀……❀……❀

مکہ ومنیٰ میں قصر واِتمام

سوال: کیا قصر واتمام میں مکہ ومنی ایک ہی شہر شمار ہوگا؟

جواب: جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک، اوراس کے بعد کے اَدوار میں منیٰ کی آبادی مکہ مکرمہ کی آبادی سے بالکل الگ اور خاصے فاصلے پر تھی۔ مکہ معظّمہ اور منیٰ کو دوالگ الگ آبادیاں شمار کیا جاتا تھا، اس لیے اگر کوئی شخص مکہ اور منیٰ دونوں میں ملا کر پندرہ ایام کے قیام کی نیت کرتا تھا، تو بھی اس پر مسافر کے احکام جاری ہوتے تھے، اور وہ مقیم کی امامت میں نماز ادا نہ کرنے کی صورت میں قصر کرتا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بدل چکی، مکہ مکرمہ کی آبادی بڑھتے بڑھتے منیٰ تک ہی نہیں، بلکہ اس سے آگے پہنچ چکی، اور منیٰ سرکاری طور پر بھی بلدیہ مکہ مکرمہ کا حصہ بن چکا ہے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے ایک خط کے جواب میں، امام وخطیب مسجد حرام، شیخ محمد ابن عبداللہ السبیل فرماتے ہیں:

"إن منىٰ أصبحت اليوم جزءً من مدينة مكة بعد أن اكتنفها بنيان مكة وتجاوزها إلى حدود عرفة ، وبناء على هذا فإنها قد أصبحت اليوم من أحياء مدينة مكة ، فلا يعد الذاهب إليها من مكة مسافرًا ، وبناء عليه فإنه لا يجوز للحاج أن يقصر ولا أن يجمع بها على قول من يقول من العلماء ان العلة في القصر بمنى إنما هو من أجل السفر ؛ لأن الذاهب إلى منى لم يخرج عن حدود مكة – إن حكومة المملكة العربية السعودية تعد منى من مكة على اعتبار أنها من أحياء ها إلا أن الحكومة تمنع البناء فيها لمصلحة عامة" . "دورِ حاضر میں شہر منیٰ مکہ مکرمہ کا ایک حصہ بن چکا ہے، اور مکہ

مکرمہ کی آبادی نے نہ صرف اس کا احاطہ کیا، بلکہ وہ حدودِ عرفہ تک بڑھ چکی۔اسی بنا پر منیٰ مکہ مکرمہ کے محلوں میں داخل ہو چکا، اور منیٰ جانے والا شخص مسافر شمار نہیں ہوتا، اور نہ حاجی کے لیے قصر جائز ہے، اور نہ منیٰ میں جمع بین الصلوٰتین جائز ہے (ان علماء کے قول کے مطابق جو اس کے قائل ہیں)، کیوں کہ منیٰ میں قصر کی علت سفر ہے، اور منیٰ میں جانے والا شخص حدودِ مکہ سے نکلا ہی نہیں۔نیز سعودی حکومت منیٰ کو شہر معظم مکہ مکرمہ کا ایک محلّہ ہی گردانتی ہے، اور منیٰ میں تعمیرات سے روکنا مصلحتِ عامہ کی خاطر ہے۔"

شیخ کی اس تحریر سے معلوم ہو رہا ہے کہ مکہ مکرمہ اور منیٰ دونوں بلدِ واحد کے حکم میں ہیں، اس لیے حاجی ان دونوں مقاموں کے قیام میں پندرہ دنوں کی نیت کرے، تو قصر نہیں بلکہ اتمام کرے گا، جیسے کوئی شخص کسی بڑے شہر کے دو مقاموں میں پندرہ روز کے قیام کی نیت کرے، تو وہ مقیم کہلائے گا، اور نمازوں میں اِتمام کرے گا۔

فقہائے کرام نے اِتمام سے جو منع فرمایا تھا، اس کی وجہ اور علت ماضی بعید میں مکہ اور منیٰ دونوں کی آبادیوں کا الگ الگ ہونا تھا، جو اب ختم ہو چکی ہے، اور جب علتِ منع ختم ہو چکی، تو ممنوع بھی ختم ہوگا، قاعدۂ مسلمہ ہے: " **إذا زال المانع عاد الأصل** " "جب مانع ختم ہو، تو اصل لوٹ آئے گا۔" اور قیام کی حالت میں اصل اِتمام ہے۔

صاحبِ "البحر الرائق"، "کنز الدقائق" کے متن (**لا بمكة ومنى**) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " **قيد بالمصرين ؛ ومراده موضعان صالحان للإقامه ، لا فرق بين المصرين أو القريتين ، أو المصر والقرية للاحتراز عن نية الإقامة في موضعين من مصر واحد أو قرية واحدة ، فإنها صحيحة لأنهما متحدان حكمًا – ألا ترى أنه لو خرج إليه مسافرًا لم يقصر** ".

ماتنِ ''کنزالدقائق'' نے (لا بمكة ومنى) میں دوشہروں کی قید اس لیے لگائی کہ اگر دو ایسے مقام (جو اِقامت کی صلاحیت رکھتے ہوں) میں کوئی شخص پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کرے، تو وہ مقیم نہیں ہوگا۔ اس میں اس سے احتراز مقصود ہے کہ اگر ایک ہی شہر کے دو مقاموں، یا ایک ہی گاؤں کے دو مقاموں میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کرے، تو یہ نیتِ اقامت صحیح ہوگی، کیوں کہ ایک شہر کے دو مقام یا ایک گاؤں کے دو مقام حکماً ایک ہی ہیں۔ دورِ حاضر میں چوں کہ مکہ اور منیٰ ایک ہی شہر شمار ہو رہے ہیں، اس لیے اگر حاجی دونوں مقاموں کے قیام کو ملا کر پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کرتا ہے، تو وہ مقیم ہوگا، اور اپنی نمازیں پوری پڑھے گا، قصر نہیں کرے گا۔ (۲۳۳/۲، ط: بیروت)

❀......❀......❀

وطن اصلی سے تعلق باقی رکھتے ہوئے کسی اور مقام پر مستقل قیام کی صورت میں قصر واتمام کا حکم؟

سوال: وطن اصلی سے تعلق باقی رکھتے ہوئے کسی اور مقام پر مستقل قیام کی صورت میں قصر واتمام کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: کھانے پینے کی طرح رہائش انسان کی بنیادی ضرورت ہے، فرمانِ خداوندی ہے: ﴿والله جعلَ لكُم مِن بُيوْتِكُم سَكَنًا﴾ – ''اللہ نے تمہارے گھر تمہاری رہنے کی جگہ بنائی۔'' (سورہ النحل: ۸۰)

اسی لیے انسان اپنی اور اپنے اہل وعیال کی رہائش کے لیے، جس جگہ مکان بناتا ہے، اور اس میں رہائش اختیار کرتا ہے، اُس کو فقہائے کرام اُس کا وطنِ اصلی قرار دیتے

ہیں۔جس طرح وطنِ اصلی اور مستقل قیام گاہ انسان کی ضرورت ہے، اسی طرح سفر اور نقل وحرکت بھی اس کی ضروت ہے، اس لیے شریعت نے سفر وحضر کے احکام الگ الگ رکھے ہیں۔ فقہائے عظام نے قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ کو سامنے رکھتے ہوئے، وطن کی تین قسمیں بیان فرمائی ہے:

(۱)وطنِ اصلی۔ (۲)وطنِ اقامت۔ (۳)وطنِ سکنیٰ۔

وطنِ اصلی: وہ جگہ ہے، جہاں انسان کی پیدائش ہو، یا وہ شہر ہے جس میں اس نے شادی کی ہو۔

وطنِ اقامت: وہ جگہ ہے، جہاں مسافر نے پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کی ہو۔

وطنِ سکنیٰ: وہ جگہ ہے، جہاں مسافر نے پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت کی ہو۔ " اعلم أن الأوطان ثلاثه : وطن أصلي ؛ وهو مولود إنسان أو البلدة التي تأهل فيها . ووطن الإقامة ؛ وهو الموضع الذي ينوي المسافر أن يقيم فيه خمسة عشر يومًا فصاعدًا . ووطن السُّكنى ؛ وهو المكان الذي ينوي أن يقيم فيه أقل من خمسة عشر يومًا " .

(تبيين الحقائق : ۱/۵۱۷ ، الفتاوى الهندية : ۱/۱۴۲ ، بدائع الصنائع : ۱/۲۸۰)

اس دورِ عولمیت(Globalization)میں کسبِ معاش کے ذرائع کی وُسعت کی وجہ سے، قیام وسفر کی بعض نئی صورتوں نے جنم لیا ہے، جو نماز کے پورے پڑھنے، یا قصر کرنے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) بعض لوگ ملازمت وغیرہ کے لیے اپنے وطنِ اصلی سے تعلق رکھتے ہوئے کسی اور جگہ اِقامت اختیار کر لیتے ہیں، اور اُن کا سال کا زیادہ تر حصہ اسی جائے قیام پر

گزرتا ہے، عید، بقرعید، یا طویل تعطیلات میں ہی وہ اپنے وطنِ اصلی جاتے ہیں، اگر اس طرح کے لوگ جائے ملازمت میں اپنا ذاتی مکان بنالیں، اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ وہاں رہائش پذیر ہوں، اور اس جگہ مستقلاً رہنے کا عزمِ مصمم کرلیں، تو یہ جگہ ان کے لیے وطنِ اصلی ہے۔

" والوطن الأصلي : هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرىٰ اتخذها دارًا وتوطن بها مع أهله وولده ، وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها " . (البحر الرائق : ۲/۲۳۹ ، بدائع الصنائع : ۱/۲۸۰)

(۲) جن لوگوں نے جائے ملازمت میں ذاتی مکان نہ بنایا ہو، کرایہ کے مکان یا ادارہ وکمپنی کی طرف سے دیئے گئے مکان میں اہل عیال کے ساتھ رہتے ہوں، اور مستقلاً رہنے کا عزم بھی ہو، نیز ان کی حالت وپوزیشن (Possession) کچھ ایسی ہو کہ اس عزم وارادہ کے منافی ومخالف نہ ہو، تو یہ جگہ ان کے لیے وطنِ اصلی ہوگی، اور انہیں وہاں نمازیں پوری پڑھنی ہوگی۔ جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ ''درمختار'' کی وطنِ اصلی کی تعریف (الوطن الأصلي : هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قوله : (أو توطنه) أي عزم على القرار فيه ، وعدم الارتحال وإن لم يتأهل . (رد المحتار : ۲/۶۱۴)

اور " والحاصل أن شروط الإتمام ستة : النية ، والمدة ، واستقلال الرأي، وترك السير ، واتحادالموضع ، وصلاحيته . قهستاني . (در مختار) میں ''حلیہ'' کے حوالہ سے مزید ایک شرط کا اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قوله: (ستة) زاد في الحلية شرطًا آخر : وهو أن لا تكون حالته منافية لعزيمته .

قال : كما صرحوا به في مسائل : أي كمسئلة من دخل بلدةً لحاجة ، ومسئلة العسكر فافهم . (ردالمحتار: ۲/ ۶۰۹)

(۳) اگر کوئی آدمی جائے ملازمت میں تنہا رہ رہا ہو، بال بچے ساتھ نہ ہوں، اور مکان بھی ذاتی نہ ہو، اوراس جگہ مستقلاً رہنے کا عزمِ مصمم ہو، اوراس کی حالت اس عزم کے منافی ومخالف نہ ہو، تو یہ جگہ اس کے لیے وطنِ اصلی ہوگی، اور وہ وہاں نمازیں پوری پڑھے گا۔ جیسا کہ وطنِ اصلی کی اس تعریف سے مفہوم ہوتا ہے: **(هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه) . (در مختار) وفي الشامية: قوله : (أو توطنه) أي عزم على القرار فيه ، وعدم الارتحال وإن لم يتأهل " .** (رد المحتار: ۲/ ۶۱۴) (خیر الفتاویٰ: ۲/ ۶۷۵) - **قوله : (ستة) زاد في الحلية شرطًا آخر ، وهو أن لا تكون حالته منافية لعزيمته " .** (رد المحتار: ۲/ ۶۰۹) – لیکن اگر شخصِ مذکور اس جگہ مستقلاً رہنے کا عزم نہ رکھتا ہو، یا رکھتا ہو لیکن اس کی حالت اس عزم کے منافی و مخالف ہو، تو اس کے لیے یہ جگہ وطنِ اقامت ہوگی، اگر پندرہ دن یا اس سے زائد رہنے کی نیت ہو، تو نمازیں پوری پڑھے گا، ورنہ قصر کرے گا۔ **"ووطن إقامة وهو الموضع الذي ينوي المسافر أن يقيم فيه خمسة عشر يومًا فصاعدًا".** (تبيين الحقائق : ۱/ ۵۱۷) – **" أما وطن الإقامة فهو الوطن الذي يقصد المسافر الإقامة فيه وهو صالح لها نصف شهر " .** (البحر الرائق : ۲/ ۲۳۹) – **(ويبطل وطن الإقامة) يسمى أيضًا الوطن المستعار والحادث وهو ما خرج إليه بنية إقامة نصف شهر ، سواء كان بينه وبين الأصلي مسيرة السفر أو لا ".**

(رد المحتار: ۲/ ۶۱۴ ، بدائع الصنائع : ۱/ ۲۸۰)

وطنِ اصلی متعدد ہو سکتے ہیں!

سوال: کیا وطنِ اصلی متعدد ہو سکتے ہیں؟

جواب: کوئی بھی مقام انسان کا وطن اصلی دو چیزوں کی بنیاد پر ہوتا ہے: (۱) اہل وعیال۔ (۲) گھربار وجائداد ''Real Property''

اگر کسی انسان کے لیے یہ دونوں چیزیں ایک سے زائد مقام پر ہوں، تو وہ مقامات اس کے لیے وطنِ اصلی ہوں گے، اور اس طرح تعددِ وطنِ اصلی ممکن ہے، جیسا کہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وطنِ اصلی کا ایک یا اس سے زائد ہونا جائز ہے، بایں طور کہ کسی کے اہل وعیال اور گھربار دو، یا اس سے زائد شہروں میں ہوں، اور اس کے اہل وعیال کا وہاں سے نکلنے کا ارادہ نہ ہو، اور شخصِ مذکور سال بھر ادھر سے ادھر منتقل ہوتا رہتا ہو، اگر وہ بہ نیتِ سفر ایک شہر سے (جس میں اس کے اہل وعیال موجود ہیں) دوسرے شہر کی طرف (جہاں اس کے اہل وعیال موجود ہیں) نکلے، تو محض شہر میں داخل ہونے سے مقیم ہوگا بلانیتِ اقامت۔'' ثم الوطن الأصلي يجوز أن يكون واحدًا أو أكثر من ذلك بأن كان له أهل ودار في بلدتين أو أكثر ، ولم يكن من نية أهله الخروج منها ، وإن كان هو ينتقل من أهل إلى أهل في السنة حتى انه لو خرج مسافرًا من بلدة فيها أهله ، ودخل في أي بلدة من البلاد التي فيها أهله فيصير مقيمًا من غير نية الإقامة ''. (بدائع الصنائع : ۱/ ۲۸۰، البحر الرائق : ۲/ ۲۳۹، مجمع الأنهر: ۱/ ۱۶۴) (فتاویٰ حقانیہ: ۳/ ۳۵۰، ۳۵۱)

(أو تأهله) أي تزوجه . قال في شرح المنية : ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به ، فقيل لا يصير مقيمًا ، وقيل يصير مقيمًا وهو الأوجه ، ولو كان

له أهل ببلدتين فأيتهما دخلها صار مقيمًا ". (رد المحتار: ۲/۶۱۴)

" ولـو انتـقل بأهله ومتاعه إلى بلد وبقي له دور وعقار في الأول قيل بقي الأول وطنًا له ، وإليه أشار محمد رحمه اللّٰه تعالى . كذا في الزاهدي " .

(الفتاوى الهندية : ۱/۱۴۲)

شہری حدود سے خروج اور مسافرت کا آغاز

مسافتِ سفر کا شمار کہاں سے ہوگا؟

سوال: آبادی میں اضافہ اور دیہی آبادیوں کی شہر کی طرف منتقلی کی وجہ سے شہر پھیلتے جارہے ہیں، اور بعض شہر تو ایسے ہیں کہ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کا فاصلہ سو کلومیٹر سے بھی تجاوز کرگیا ہے، شریعت میں سفر کی بنیاد پر بعض سہولتیں دی گئی ہیں، ان میں سے بعض سہولتیں مطلق سفر سے متعلق ہیں، اور بعض کا تعلق ایک خاص مسافت کے سفر سے ہے، ان ہی سہولتوں میں نماز میں قصر اور روزہ نہ رکھنے کا حکم بھی شامل ہے، یہ مسافت علمائے ہند کے مشہور نقطۂ نظر کے مطابق ۴۸/میل کی ہے، اس بات پر بھی تقریباً اتفاق ہے کہ ان سہولتوں کا فائدہ عملاً شہر کی آبادی اور شہر کے متعلقات سے باہر نکلنے کے بعد ہی اُٹھایا جاسکتا ہے، اس پس منظر میں یہ بات اہمیت اختیار کرگئی ہے کہ: [**الف**]:- اگر ایک شخص اپنے گھر سے ۴۸/میل کا راستہ طے کرلے، لیکن ابھی وہ ہوشہر میں ہی، شہر کی حدود سے باہر نکلنے کی نوبت نہیں آئی ہو، اور اس سے آگے جانے کا ارادہ بھی نہ ہو، تو کیا اس پر مسافر کے احکام جاری ہوں گے اور وہ نماز میں قصر کرے گا؟ [**ب**]:- اگر وہ ایسے مقام کا سفر کررہا ہو، جو شہر کی انتہائی حدود سے تو ۴۸/میل کے فاصلے پر نہ ہو، لیکن اس کے گھر کے پاس ۴۸/میل یا اس سے زیادہ کا فاصلہ ہو، تو وہ قصر کرے گا یا اِتمام؟ یہ سوالات اس لیے خاص طور پر

اہمیت کے حامل ہیں کہ حنفیہ اور بعض اور فقہاء کے نزدیک مسافر کے لیے قصر کا حکم بطورِ عزیمت کے ہے نہ کہ بطورِ رخصت کے، اور قصر واجب ہے نہ کہ محض جائز۔

جواب: شریعتِ اسلامیہ میں سفر کی بنیاد پر اپنے ماننے والوں کے لیے بعض سہولتیں دی گئی ہیں، مثلاً نماز میں قصر کرنا، اِفطار کا مباح ہونا، مدتِ مسح علی الخفین کا تین دن تک دراز ہونا، جمعہ، عیدین اور قربانی کے وجوب کا ساقط ہونا، اور آزاد عورت کے لیے بلا محرم نکلنے کا حرام ہونا وغیرہ۔ (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ص/۲۲۸، الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۸، رد المحتار: ۲/۵۹۹)

مگر یہ سہولتیں علمائے کرام کے مشہور نقطۂ نظر کے مطابق اسی وقت حاصل ہونگی، جب کہ مسافتِ سفر ۴۸/ میل ہو۔ ''**ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح**''. (الهداية: ۱/۱۴۵، باب صلاة المسافر، الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۸، رد المحتار: ۲/۲۰۲)

نیز فقہائے کرام کی عبارتیں اس بات پر شاہد ہیں کہ مسافر ان سہولتوں سے اسی وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے، جب کہ عملاً شہر کی آبادی اور اس کے متعلقات سے باہر نکل جائے۔ ''من جاوز بيوت مصره مريدًا سيرًا وسطًا ثلاثة أيام''. (تبيين الحقائق: ۱/۵۰۶)

لیکن آج آبادی میں اضافہ اور دیہی آبادیوں کے شہر کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے شہر پھیلتے جارہے ہیں، اور بعض شہر تو اتنے پھیل چکے ہیں کہ مسافتِ سفر شہری حدود ہی میں پوری ہوجاتی ہے، تو اب فقہائے کرام کے سامنے یہ سوال آکھڑا ہوا کہ مسافتِ سفر-آیا مسافر کے گھر سے شمار ہوگی؟ یا شہری حدود کی انتہا سے؟ تو فقہائے کرام کی عبارتوں سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ جہاں حدودِ شہر ختم ہو، وہی سے مسافتِ سفر شمار ہو، کیوں کہ شہر کی آبادی خواہ کتنی ہی تجاوز کر جائے، وہ بلدِ واحد ہی کے حکم میں ہوگی۔ ''**قوله: (لا بمكة ومنى)** ..... **قيد بالمصرين ومراده موضعان صالحان للإقامة لا فرق بين المصرين أو**

القريتين أو المصر والقرية للاحتراز عن نية الإقامة في موضعين من مصر واحد أو قرية واحدة فإنها صحيحة لأنهمامتحدان حكمًا ألا ترى أنه لو خرج إليه مسافرًا لم يقصر". (البحر الرائق: ٢/٢٣٣، ط: بيروت)

صاحب "البحر الرائق" کی اس عبارت کا آخری جز: "ألا ترى أنه لو خرج إليه مسافرًا لم يقصر" صاف طور پر یہ بتلا رہا ہے، کہ ایسا شہر جو مسافتِ سفر کی بقدر آبادی پر مشتمل ہو، اور کوئی شخص اس شہر کی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف بہ قصدِ سفر نکلے، تو وہ مسافر نہیں ہوگا، اور اسے قصر کی رخصت نہیں دی جائے گی۔......یہی رجحان فقیہ الامت، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن رحمہ اللہ کا معلوم ہوتا ہے، آپ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: "وطن کے آخری مکان سے مسافتِ سفر شروع ہوگی، اور جس بستی میں جانا ہے اس کی ابتدائی سرحد تک مجموعی مسافت کو دیکھا جائیگا۔" (فتاویٰ محمودیہ: ٧/٤٧٦)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا رجحان یہ ہے کہ شہروں کے درمیان مسافتوں کا تعیُّن سرکاری کاغذات میں جس بنیاد پر ہوتا ہے، اسی کو سفرِ شرعی کے تعیُّن کی بنیاد قرار دینے میں سہولت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے:

(١) اگر کوئی شخص ٤٨ میل کا راستہ طے کر لے، لیکن ابھی وہ شہر ہی میں ہو، شہر کی حدود سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آئی ہو، اور اس سے آگے جانے کا ارادہ بھی نہ ہو، تو اس پر مسافر کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

(٢) اگر وہ ایسے مقام کا سفر کر رہا ہو، جو شہر کی انتہائی حدود سے تو ٤٨ میل کے فاصلے پر نہ ہو، لیکن اس کے گھر کے پاس سے ٤٨ میل یا اس سے زیادہ کے فاصلے پر ہو، تو بھی وہ مسافر نہیں ہوگا۔ (مسافتِ سفر کا آغاز ایک اہم شرعی مسئلہ: ص/ ٢٧٧-٢٧٩)

مقالہ

(۱۸رواں فقہی سمینار[مدورائی،چنئی]، بتاریخ:۲-۴ر ربیع الاول ۱۴۳۰ھ/ مطابق:۲۸رفروری-۲ر مارچ ۲۰۰۹ء)

تعلیمی قرضے،صورتیں اوراحکام

تمہید: اسلام ایک مکمل دین اور کامل قانون ہے، اسلام کی قانونی مندرجات اورتفصیلات کا بنظرِ انصاف مطالعہ کرنے سے آدمی اس نتیجے پر پہنچتا ہے، کہ اس کے قوانین، فطرتِ انسانی اور جذباتِ بشری کے عین مطابق ہیں۔

قرآن وحدیث میں ایسی کلیات اور اصول موجود ہیں کہ ان میں غور فکر کر کے، قیامت تک تمام پیدا ہونے والے حوادث، واقعات اورنوازل کے احکامِ شرعیہ مستنبط کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم تاریخِ اسلام پرنظر ڈالتے ہیں،تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد، اللہ رب العزت نے اس امت میں ایسے افراد واشخاص پیدا فرمائے ،جنہوں نے نصوصِ قرآن وحدیث کو سامنے رکھ کر، وہ اصول وقواعد مقرر ومرتب کیے،جنہیں بنیاد بنا کر ان تمام مسائل کا شرعی حل نکالنا آسان ہے،جن کا ذکر نصاً وصراحۃً قرآنِ کریم اورحدیثِ نبوی میں موجودنہیں ہے۔

اسی پر بس نہیں، بلکہ فقہائے مجتہدین نے جب اصول وقواعد کو بنیاد بنا کر، مسائل کا استنباط واستخراج فرمایا، اور فروعات وجزئیاتِ مستنبطہ ومخرجہ میں ان کے ما بین

اختلاف پیدا ہوا، تو ان اقوال ومسائلِ مختلف فیہا میں تصحیح وترجیح کے لیے، اللہ رب العزت نے اصحابِ تصحیح وترجیح کو بھی پیدا فرمایا، جنہوں نے قولِ صحیح وقولِ راجح کی نشان دہی فرما کر، نہ صرف امتِ مسلمہ پر احسان کیا، بلکہ اسلامی قوانین کو ایسے صاف ستھرے، روشن اور تابناک شکل وصورت میں پیش فرمایا، کہ وہ دیگر قوانینِ عالم میں ممتاز اور نمایا نظر آتے ہیں، اور ایک منصف طبیعت، صحیح الفطرت انسان بول اٹھتا ہے: سچ فرمایا ارض وسماء، جن وانس کے خالق ومالک نے: ﴿اَلْیومَ اَکملْتُ لَکُم دِینَکُم وَأَتْمَمْتُ عَلیکُم نِعمَتِيْ وَرضِیتُ لکمُ الاسْلامَ دِیْنًا﴾ . ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی، اور تمہارے لیے اسلام کو بہ طورِ دین کے پسند کرلیا۔'' (سورۂ مائدہ:٣)

یہ بات ایک حقیت ہے کہ جب تک تصحیح وترجیح کا کام مکمل نہ ہوا، اللہ رب العزت اہلِ تصحیح وترجیح کو پیدا فرماتے رہے۔ جیسا کہ محقق علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کے تلمیذِ رشید، محقق علامہ شیخ قاسم ابن قطلو بغا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' إن المجتهدین لم یفقدوا حتی نظروا في المختلف ورجّحوا وصحّحوا '' . (عقود رسم المفتي: ص/١٢٦)

آج عالم گیریت (Globlization) نے بہت سے، نت نئے مسائل لا کھڑے کر دیئے، جن کا شرعی حل اُمت کے سامنے پیش کرنا اُمت کے علماء ومفتیانِ کرام کی ذمہ داری ہے، اور جب یہ ان کی ذمہ داری ہے، تو ضرور اللہ رب العزت ان میں ایسی اہلیتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں گے، جو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے درکار ہیں، کیوں کہ خدائی قانون ﴿لا یکلّفُ اللّٰهُ نفسًا إلا وُسْعَهَا﴾ اس پر شاہد ہے۔

معلوم ہوا کہ تخریج واستنباط کا کام تا قیامت جاری وساری رہے گا، اور ہر زمانے میں

’’مجتہدین فی المذہب‘‘ پیدا ہوتے رہیں گے، جو اپنے مذہب کے اُصول وقواعد کی بنیاد پر تخریج واستنباط کا فرض انجام دیتے رہیں گے۔

دورِ حاضر میں جن مسائل کی تحقیق، تخریج اور تطبیق کی ضرورت ہے، ان ہی میں سے بعض مسائل وہ ہیں، جو سوال نامہ کی شکل میں ’’اکیڈمی‘‘ کی طرف سے تمام مندوبین کو روانہ کیے گئے، ہم ان مسائل سے متعلق بالترتیب اپنی آراء کو تحریر کرتے ہیں۔

اللہ ہم سب کو اصابتِ رائے کی دولت سے مالا مال فرمائے۔آمین!

تعلیمی قرضے، اُن کی صورتیں اور احکام

سوال:١- جدید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں شریعت کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور اس سلسلے میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟

جواب:١- کسی بھی قوم کی بقاءِ زندگی اور عزت کے لیے تعلیم اس کی بنیادی ضرورت ہے، یہ ضرورت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی، اس سے کسی کو انکار نہیں، اور تعلیم سے مراد ’’دینی تعلیم‘‘ ہے، اس پر بھی جمہور کا اتفاق ہے [١]، کیوں کہ اسی میں دنیوی واُخروی فلاح وکامیابی مضمر و پوشیدہ ہے، اور یہی ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے، اسی لیے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر رب العالم نے سب سے پہلی جو آیت نازل فرمائی، اُس کا تعلق تعلیم ہی سے ہے، ارشادِ ربانی ہے:﴿اقرأ باسم ربک الذي خلق﴾. ’’پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔‘‘ (سورۃ العلق:١)

مگر اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری فنون کی تحصیل کی بھی شریعت نے نہ صرف

حمایت کی، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے، جیسا کہ احادیثِ نبویہ اس پر شاہد ہیں (۲)، تاکہ انسان ان فنون کے ذریعے دیگر انسانوں کی خدمت کرسکے، انہیں اپنے لیے حلال آمدنی کا ذریعہ بناسکے، اوران فنون میں وہ دیگراقوام کا دستِ نگر نہ رہے۔

رہی دینی تعلیم تو وہ آج بھی مفت دی جارہی ہے، البتہ عصری فنون کی تعلیم بڑی مہنگی ہوچکی، کیوں کہ لوگوں نے اسے ایک نفع بخش تجارت بنالیا، اوران کی تحصیل کواس قدر گراں کردیا کہ متوسط المعاش لوگوں کے لیے ان تک رسائی انتہائی دشوارگزارامر بن چکا۔حکومتِ ہند نے ایسے ہی لوگوں کی سہولت کے لیے کم شرح سود پرتعلیمی قرضوں کا نظم کیاہے، اوراس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ:

''ان قرضوں سے سود حاصل کرنا ہمارا مقصد نہیں بلکہ تعلیم میں تعاون مقصود ہے''

سوال: ۲- سرکاری بینک عام معمول کے برخلاف تعلیمی قرضوں میں کم شرح سود لیتے ہیں، اور یہ قرض زیادہ مدت کے لیے دیا جاتا ہے، نیز حکومت کا ادّعا ہے کہ اس قرض کا مقصد نفع کمانا نہیں، تو کیا اس کم شرح سود کو سروس چارج (اُجرتِ خدمت) پرمحمول کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ۲- جواباً عرض ہے کہ سودی قرض صرف بوقتِ ضرورت اوروہ بھی بقدرِ ضرورت ہی لیا جاسکتا ہے (۳)، اورضرورت وہی ہے جسے فقہائے کرام نے ضرورت قراردیا ہے (۴)۔ اوراعلیٰ تعلیم ایسی ضرورت نہیں ہے، جس کے لیے سودی قرض لینا جائزہو، خواہ وہ کم شرح سود والا قرض ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ حرام قلیل ہو یا کثیر، حرام ہوتاہے، اوراس سے بچنا فرض ہے۔ (۵)

نیز شریعتِ اسلامیہ میں سود کا لینا دینا بالکلیہ حرام ہے، اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس کی شناعت اور قباحت کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، کہ اللہ رب العزت نے بڑے سے بڑے گناہ پر اعلانِ جنگ نہیں فرمایا، سوائے دو گناہ کے: سود کا لین دین[۶]، خدا کے ولی سے عداوت۔[۷]

جدید اعلیٰ تعلیم ایسی ضرورت نہیں ہے، جس کے لیے سودی قرض لینے کی اجازت دی جائے، اور نہ ہی اس کم شرحِ سود کو سروس چارج (Service Charge) پر محمول کیا جائے گا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کل قرض جرَّ منفعة فهو ربوًا''.– ''ہر وہ قرض جو منفعت کو کھینچ لائے وہ سود ہے۔''[۸]، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرحِ سود کم ہو یا زیادہ بہر صورت حرام ہے، نیز کم شرحِ سود والے قرض کو جائز قرار دینا سود کے دروازے کو کھولنے کے مترادف ہے، وہ اس طرح کہ اگر اعلیٰ تعلیم کے لیے اس طرح کے قرض کو لینا جائز قرار دیا جاتا ہے، تو لوگ دیگر مواقع میں بھی بلا جھجک و بلا روک ٹوک زیادہ شرح سود والے قرض کو بھی لیں گے، اور یہی کہیں گے کہ ''**یہ شرحِ سود کم ہی ہے، کیوں کہ پہلے شرحِ سود اتنی تھی اور اب اتنی**''، جیسا کہ آج کل گھروں کے لیے قرض (Housing loan) کی شرحِ سود کم کی گئی، جب کہ فقہ کا مسلم قاعدہ ہے کہ: ''ذریعۂ حرام بھی حرام ہے۔''[۹]

سوال: ۳- اگر ایک شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبے میں داخلے کا اہل ہے، یا وہ بیرونِ ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کو برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہیں، تو کیا اس کے لیے اس قرض اسکیم سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے؟

جواب: ۳- اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبے میں داخلہ کا اہل ہو، اور وہ بیرونِ ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کے معاشی حالات اس کے لیے ساز گار نہیں ہیں، اور وہ کم شرح سود والے قرض سے فائدہ اٹھانا چاہے، تو اسے بھی اس کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کہ جدید تعلیم کی تحصیل فرضِ کفائی ہے (۱۰)، اور سود کے لین دین سے بچنا فرضِ عین ہے۔ اور فرضِ عین کو چھوڑ کر فرضِ کفائی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ شریعتِ اسلامیہ نے مامورات سے زیادہ منہیات کی جانب اعتنا کیا ہے (۱۱)، وہ اس طرح کہ امر بالشئ میں، امر حسبِ استطاعت بجالانے کا حکم ہے، اور نہی میں بچنا ہی بچنا ہے۔ (۱۲)

سوال: ۴- اگر خود طالبِ علم کی معاشی حالت اس کی متحمل نہیں ہے، لیکن اس کے والد اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو کیا والد کے صاحبِ استطاعت ہونے کی وجہ سے اسے صاحبِ استطاعت سمجھا جائے گا؟ یا قرض کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا تعلق طالبِ علم کے اپنے حالات سے ہوگا؟

جواب: ۴- اگر خود طالبِ علم کی معاشی حالت اعلیٰ تعلیم کی متحمل نہیں، لیکن اس کے والد کی معاشی حالت اس کی متحمل ہے، تو والد اپنے ولد کے لیے اعلیٰ تعلیم کا نظم کرے، یہ والد کی طرف سے ولد کے لیے بہترین تحفہ، اور اسلام اور مسلمانوں کی عمدہ خدمت ہوگی، والد کے صاحبِ استطاعت ہونے اور نہ ہونے سے سودی قرض لینے کے عدمِ جواز کے حکم پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، کیوں کہ ولد کے عدمِ استطاعت اور والد کے صاحبِ استطاعت ہونے کی صورت میں، نہ والد پر اپنے ولد کو یہ اعلیٰ تعلیم دینا

فرضِ عین ہے، اور نہ ولد پر اس کی تحصیل فرض اور امرِ مستحسن ہے، کیوں کہ دستورِ خداوندی ہے:﴿**لا يكلف الله نفسًا إلا وسعها**﴾. -''اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اس کی بساط کے مطابق۔'' (سورۂ آل عمران :۲۸۶)

اس کی تفسیر میں صاحبِ ''روح المعانی'' علامہ ابوالفضل شہاب الدین رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں: '' **أي سنته تعالى لا يكلف نفسًا من النفوس إلا ما تطيق** '' -یعنی یہ سنتِ خداوندی ہے کہ وہ انسانوں میں سے کسی صاحبِ نفس کو اس کی بساط کے مطابق ہی ذمہ داری سونپتا ہے۔ (۱۱۲/۳)

سوال: ۵- اگر طالبِ علم یا والد صاحب استطاعت ہوں، اس کے باوجود وہ فی الحال تعلیم میں اپنا پیسہ نہ لگانا چاہیں، تو کیا ان کے لیے اس قرض اسکیم سے فائدہ اُٹھانا جائز ہوگا؟

جواب: ۵- ہرگز جائز نہیں۔ (بحوالہ سابق)

(تعلیم کے لیے قرض کا حصول اسلامی نقطۂ نظر: ص/ ۱۶۹-۱۷۳، ط: ایفا)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في القرآن الكريم : ﴿وقل رَّبِّ زدني علمًا﴾ . (سورة طٰه: ۱۱۴)

ما في '' فتح الباري لإبن حجر العسقلاني '' : والمراد بالعلم العلم الشرعي الذي يفيد معرفة ما يجب على المكلف من أمر دينه في عباداته ومعاملاته ، والعلم بالله وصفاته ، وما يجب له من القيام بأمره . (۱/۱۸۷، باب فضل العلم)

(۲) ما في '' جامع الترمذي '' : عن زيد بن ثابت قال : أمرني رسول الله ﷺ أن أتعلّم له كلمات من يهود ، قال : '' إني والله ما آمن يهود على كتابي'' . قال : فما مرّ بي نصف شهر حتى تعلّمته له ، قال : فلما تعلّمته كان إذا كتب إلى يهود كتبت إليهم وإذا كتبوا إليه قرأت له كتابهم . قال أبو عيسى: هذا حديث حسن صحيح . وفي رواية : قال : أمرني رسول الله ﷺ أن أتعلّم السريانية.=

....

....

....

....

....

....

....

....

= أخرجه البخاري في الأحكام تعليقًا ، وأبو داود في العلم ٣٦٤١٦ . (٣/٤٩٥، ٤٩٦)

ما في " سنن أبي داود " : عن جابر : " أن النبي ﷺ كوى سعد بن معاذ من رميته " . (ص/٥٤٠)

(٣) ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح .

(١/٣٢٧ ، القواعد الكلية والضوابط الفقهية: ص/٢٣٢)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها . (١/٣٠٨)

(٤) ما في " الموافقات للشاطبي " : فأما الضرورة فمعناها لا بد منها في قيام المصالح الدين والدنيا ، بحيث إذا فقدت لم تجر مصالح الدنيا على استقامته بل على فساد وتهارج وفوت حياة ، وفي الآخرة فوت النجاة والنعيم والرجوع بالخسران المبين . ''ضرورت یہ ہے کہ دینی اور دنیوی مصلحت کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، بایں طور کہ اگر وہ نہ ہو تو دنیوی مصلحت ٹھیک طرح سے انجام پذیر نہ ہو، بلکہ اس میں اضطراب اور بگاڑ پیدا ہو جائے، وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور آخرت میں نجات، آرام وآسائش میسر نہ ہو، اور وہ بالکل گھاٹے میں پڑ جائے۔'' (۲/۴،۵)

(٥) ما في " السنن الكبرى للنسائي " : عن عمرو بن شعيب ، عن أبيه ، عن جده ، عن النبي ﷺ قال : " ما أسكر كثيره فقليله حرام " . (٤/١٨٦ ، رقم : ٦٨٢٠)

(٦) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يا أيها الذين امنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوآ إن كنتم مؤمنين ، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله﴾ . – ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو۔ لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے۔'' (سورة البقرة :٢٧٨–٢٧٩)=

....

....

....

....

....

=ما في " صحيح مسلم " : " لعن الله آكل الربا وموكله وشاهديه وكاتبه ، وقال : هم سواء" . – "اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، گواہوں پر، لکھنے والے پر، اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔" (۲/۲۷، التفسير المنير : ۲/۹۲)

(۷) ما في " صحيح البخاري " : اللہ رب العزت فرماتے ہیں: " من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب " ."جس نے میرے قریبی بندے سے عداوت کی میں اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔"

(أخرجه البخاري في الرقاق في باب التواضع ، برقم : ۶۵۰۲)

(۸) (السنن الكبرى للبيهقي :۵/۳۵۰ ، كنز العمال : رقم :۱۵۵۱۶)

(۹) ما في " الجمهرة القواعد الفقهية وموسوعة القواعد الفقهية " : " ما كان سببًا لحرام حرام " .

(جمهرة: ۲/۹۱۴ ، قاعدة :۲۱۰۶ ، موسوعة القواعد : ۹/۴۲)

(۱۰) ما في " رد المحتار " : (وفرض كفاية ، وهو ما زاد عليه لنفع غيره) . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (وفرض كفاية الخ) عرفه في شرح التحرير بالمتحتم المقصود حصوله من غير نظر بالذات إلى فاعله . قال: فيتناول ما هو ديني كصلاة الجنازة ، ودنيوي كالصنائع المحتاج إليها ..... قال في تبيين المحارم : وأما فرض الكفاية من العلم ، فهو كل علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب ..... والعلم بأعمارهم وأصول الصناعات والفلاحة كالحياكة والسياسة والحجامة . اهـ . قوله : (وهو ما زاد عليه) أي على قدر يحتاجه لدينه في الحال .

(۱/۱۲۶ ، مطلب في فرض الكفاية وفرض العين)

(۱۱) ما في " سنن ابن ماجة " : " فإذا أمرتكم بشيء فخذوا منه ما استطعتم ، وإذا نهيتكم عن شيء فانتهوا " .– "جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم کروں، تو جہاں تک ہو سکے تم اس کو بجالاؤ، اور جب میں تمہیں کسی چیز سے روکوں تو باز آجاؤ۔" (ص/۲ ، صحيح البخاري : ۲/۱۰۸۲)

(۱۲) ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : " اعتناء الشرع با لمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات " . (ص/۷۸)

خواتین کی ملازمت، صورتیں اور احکام

سوال: ۱-شریعتِ اسلامی خواتین کے لیے کسبِ معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

جواب: ۱- اللہ رب العزت نے مرد وعورت دونوں کو ایک ہی جنس سے پیدا کیا، لیکن دونوں کی تخلیق کی اغراض ومقاصد، حقوق، واجبات وذمہ داریاں الگ الگ بیان فرمائی ہے۔[۱]

کسبِ معاش کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے مرد کے سر رکھی ہے، اور عورت کو کسبِ معاش کی ذمہ داری سے ہر حال میں بری رکھا، اگر وہ کسی کی لڑکی ہے، تو اس کا نفقہ جب تک کہ شادی نہیں ہوتی اس کے والد پر واجب ہے۔[۲]

اگر وہ کسی کی بیوی ہے، تو اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے۔[۳]......اگر وہ کسی کی ماں ہے، اور شوہر نفقہ سے عاجز ہو، تو اس کا نفقہ اس کے ولد پر لازم ہے۔[۴]...... اگر وہ کسی کی بہن ہے، اور اس کا شوہر نہیں ہے، اور نہ والد، تو اس کا نفقہ اس کے بھائی پر واجب ہے۔[۵]

معلوم ہوا کہ عورت پر کسی بھی حال میں نفقہ واجب نہیں ہے، کیوں کہ اس کا کسبِ معاش میں مشغول ہونا بہت سے مفاسد کا سبب ہوسکتا ہے، اسی لیے شریعت عورت کے کسبِ معاش میں مشغول ہونے کو عام حالات میں ناجائز قرار دیتی ہے۔

سوال: ۲- کیا شریعت نے خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے؟ (خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا)۔

جواب: ۲- شریعت نے عام حالات میں خواتین پر نہ ان کے اپنے نفقہ کی ذمہ داری رکھی، اور نہ ہی ان کے بچوں کے نفقہ کی، نفقہ کا ذمہ دار صرف اور صرف مرد ہی کو قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ کوئی بھی خاتون یا تو کسی کی بیوی ہوگی، یا لڑکی ہوگی، یا ماں ہوگی، یا بہن ہوگی وغیرہ، اوران تمام صورتوں میں شریعت نے اُس کا نفقہ شوہر، باپ، بیٹے، بھائی وغیرہ پر لازم کیا ہے۔(۶)

سوال: ۳- محض معیارِ زندگی کو بلند کرنے، یا وقت گزاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لیے معاشی جدوجہد اختیار کرنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ جس میں تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے اور چلتا ہے۔

جواب: ۳- محض معیارِ زندگی بلند کرنے، یا وقت گزاری اوراثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے، عورتوں کے لیے معاشی جدوجہد اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ اس سے اوامرِ شرعیہ کی مخالفت اور نواہی کا ارتکاب لازم آتا ہے، مثلاً:

(۱) اگر عورت معاشی جدوجہد اختیار کرتی ہے، تو اسے اپنے گھر کی چہار دیواری چھوڑنی ہوگی، جب کہ اسے حکم یہ ہے کہ وہ گھر میں قرار کے ساتھ رہے، تبرُّج اور زینت اختیار نہ کرے۔(۷)

(۲) خانگی اُمور کی اصلاح اوراپنی اولاد کی تربیت عورت کے ذمہ ضروری ہے، جو در حقیقت پوری قوم اور معاشرے کی بنیاد ہے، اور معاشی جدوجہد اختیار کرنے سے اس کی یہ ذمہ داری متاثر ہوگی، اور یہ بھی مخالفتِ امرِ شرع ہے۔(۸)

(۳) بے پردگی ہوگی، غیر محرم مردوں سے اختلاط ہوگا، اور بعض موقعوں پر ان سے

خلوت اور تنہائی کا موقعہ بھی آ سکتا ہے، بعض مرتبہ ان کے ساتھ بے تکلُّفانہ بات چیت اور آمد ورفت وغیرہ بھی ہوگی، یہ سب نواہیٔ شرع کا ارتکاب ہے۔[۹]

سوال: ۴- خواتین کے لیے کسبِ معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے میں کیا اس وقت بھی، جب کہ وہ اندرونِ خانہ ہی اپنی معاشرتی سرگرمیوں کو محدود رکھیں، اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا؟

جواب: ۴- اگر عورت اندرونِ خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھے، تو اس صورت میں بھی اسے اپنے ولی یا شوہر کی اجازت درکار ہوگی، اور ولی اور شوہر کو چاہیے کہ وہ اسے معاشی سرگرمیوں کی اجازت دے، جن سے کوئی دینی ضرر یا اپنے حق میں کوئی نقصان لازم نہ آتا ہو[۱۰]، خصوصاً جب کہ مرد گھر پر نہ ہو، کیوں کہ بے کاری، وساوسِ نفس وشیطان کی طرف مؤدّی ہے، اور اَجانب وجیران کے ساتھ لایعنی کاموں میں اشتِغال کا باعث ہے۔[۱۱]

سوال: ۵- اگر عورت کو کسبِ معاش کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑے، تو کیا اس کے لیے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی؟ گھر سے نکلنا مسافتِ سفر یا اس سے زیادہ کے لیے ہو، یا اس سے کم کے لیے، دن کے وقت ہو، یا رات کے وقت، ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، ان صورتوں میں حکمِ شرعی کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

جواب: ۵- اگر عورت واقعۃً ایسے حالات سے دوچار ہو، جن میں کسبِ معاش کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے، تو اس صورت میں اس کے لیے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی۔[۱۲]

اگر خروج مسافتِ سفر، یا اس سے زیادہ کے لیے ہے، تو محض ولی یا شوہر کی اجازت کافی نہیں ہوگی، بلکہ کسی محرم کا ساتھ میں ہونا ضروری ہے، اور اگر مسافتِ سفر سے کم کے لیے ہے، تو محض اجازت کافی ہوگی۔ (۱۳)-اور مجبوری کی اس صورت میں (جس میں کسبِ معاش کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے) صرف دن میں خروج کی اجازت ہوگی، رات میں نہیں (۱۴)، کیوں کہ اس سے بہت سارے فتنے جنم لے سکتے ہیں۔

سوال:۶- خواتین کے لیے ملازمت کے سلسلے میں شرعی حدود کیا ہیں؟

جواب:۶- عام حالات میں عورت کے لیے کسبِ معاش کے لیے نکلنا جائز ہے ہی نہیں، لیکن اگر وہ مجبور ہو، تو اس پر لازم ہے کہ: بھرپور لباس اور پردے کے ساتھ نکلے۔ (۱۵)-نگاہیں نیچی رکھیں۔ (۱۶)-تنہائی اور اختلاطِ رجال سے گریز کریں۔ (۱۷)

اگر کام کے دوران مردوں سے گفتگو اور تبادلۂ خیال کی ضرورت پڑے، تو گفتگو میں سختی وتلخی برقرار رکھے، نرم گفتاری سے پرہیز کرے۔-ایسی ملازمت اختیار نہ کرے جس میں کسی کے ساتھ تنہائی حاصل ہوتی ہو۔ (۱۸)

سوال:۷- ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے)، جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں، اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں، تو اس صورت میں پردہ کے کیا احکام ہوں گے؟

جواب: ۷- اگر عورت کسی ایسے ادارے میں ملازمت کرتی ہو، جہاں خواتین ہی اپنی خدمات انجام دیتی ہیں، اور کام کی جگہوں میں مرد نہیں ہوتے ہیں، ایسے ادارے میں

عورت پر پردہ ضروری نہیں ہے، کیوں کہ اللہ رب العزت نے عورت کو چند لوگوں سے پردہ نہ کرنے کی رخصت دی ہے، ان میں سے عورتیں بھی ہیں[۱۹] مگر احتیاط یہی ہے کہ خواتین کے درمیان بھی بالکل بے پردہ نہ ہو جائے، خصوصاً جب کہ غیر مسلم خواتین بھی ہوں، کیوں کہ بعض مفسرین نے (أو نسآئهن) سے مسلم عورتوں کو مراد لیا ہے۔[۲۰]

شریعتِ اسلامیہ نے عورت کو اجنبی مرد سے پردہ کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے ادارے کے ذمہ دار مردوں سے بہر حال پردہ کرنا ضروری ہے[۲۱]، البتہ بقدرِ ضرورت ان سے گفتگو کر سکتی ہے، بایں شرط کہ آواز میں سختی برقرار رکھے، تا کہ مخاطب کے دل میں کسی قسم کا کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو[۲۲]، اسی طرح تنہائی میں ملاقات کرنے سے کلی اجتناب کریں۔[۲۳]

سوال: ۸- اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں، تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لیے پردہ کی کیا حدود ہوں گی؟ اس سلسلے میں کیا سن رسیدہ خواتین اور جوان عورتوں کے درمیان فرق ہوگا؟

جواب: ۸- اگر عورت ایسی جگہ کام کرے، جہاں مرد بھی کارکن ہوں، تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لیے پردے کی حدود یہ ہیں: لباس بھرپور ہو، چہرہ دکھائی نہ دے، دونوں ہاتھ نظر نہ آئے، نگاہیں نیچی رکھی جائیں[۲۴]، تنہائی و اختلاط سے گریز کریں[۲۵]، محبت آمیز انداز میں گفتگو نہ کریں[۲۶]، کام کی نوعیت، تعاوُن، تبادلۂ خیالات یا دیگر مصلحتیں مرد کے پاس آمد و رفت کی متقاضی ہوں، تو ضرورتِ شدیدہ کی

موجودگی میں بقدرِ ضرورت اس کی گنجائش ہوگی۔ (۲۷)

مذکورہ بالا پردے کی حدود جوان عورتوں کے لیے ہیں، اگر کوئی خاتون سن رسیدہ ہو، جوان عورتوں کی طرح فیشن نہ کرتی ہو، کوئی مرد اس کی طرف رغبت نہ کرتا ہو، اور نہ اسے مرد کی رغبت ہو، تو اس کے لیے پردے میں تھوڑی سی رخصت ہے، اور وہ یہ کہ جو کپڑے اُوپر سے رکھے جاتے ہیں، مثلاً: نقاب وغیرہ، اگر وہ نہ رکھنا چاہے، تو اسے اس کی اجازت ہے، جب کہ اس کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ جوان عورتوں کی طرح مکمل پردہ کرلے۔ (۲۸)

سوال: ۹- کیا اس کا بھی فرق ہوسکتا ہے کہ ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ، اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہوسکتا ہے، مثلاً: دوکان میں سیلز مین اور آفس میں یک سوئی سے بیٹھ کر کام کرنے میں فرق ہوسکتا ہے؟

جواب: ۹- عورت کے لیے ملازمت کی اجازت بحالتِ مجبوری دی جائے گی، اس لیے وہ اپنے لیے ایسی ملازمت اختیار کرے، جس میں کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے کم ہو، ایسی ملازمت اختیار نہ کرے، جس میں کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ (۲۹)

سوال: ۱۰- ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور (خواہ اندرونِ ملک ہو یا بیرونِ ملک) مستقل قیام کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۱۰- اگر عورت کو کسبِ معاش کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے، اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو، تو اس کے لیے خروج کی اجازت محض اتنی مسافت تک کے لیے ہی

ہوگی،جس سے اس کی ضرورت پوری ہو (۳۰)،اورضرورت شہر میں ہلکا پھلکا کام کرکے پوری ہوسکتی ہے،محض ملازمت کی غرض سے اپنے گھراوراپنوں سے دوری پر بلامحرم مستقل قیام کرنا،جومسافتِ شرعی کے برابریااس سے زیادہ ہو،شرعاً جائزنہیں ہوگا۔(۳۱)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " كشف الأسرار شرح المصنف على المنار " : والغرض منه خلقة الرجل : هو كونه نبيا وإماما وشاهدا في الحدود والقصاص ، ومقيما للجمعة والأعياد ونحوه ، والغرض من المرأة كونها مستفرشة آتية بالولد مدبرة لحوائج البيت وغير ذلک .

(۱/۲۸ ، مبحث الخاص ، نور الأنوار :ص/۱۸)

(۲) ما في " الفتاوى الهندية " : ونفقة الإناث واجبة مطلقا على الآباء ما لم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال . الذكور من الأولاد إذا بلغوا حدّ الكسب ، ولم يبلغوا في أنفسهم يدفعهم الأب إلى عمل ليكسبوا ، أو يؤاجرهم وينفق عليهم من أجرتهم وكسبهم ، وأما الإناث فليس للأب أن يؤاجرهن في عمل أو خدمة . (۱/۵۶۲، ۵۶۳ ، الباب السابع عشر في النفقات ، الفصل الرابع في نفقة الأولاد)

(۳) ما في " القرآن الكريم " : ﴿الرجال قوامون على النسآء بما فضّل الله بعضهم على بعض وبمآ أنفقوا من أموالهم﴾ . (سورة النساء :۳۴)

ما في " التفسير المنير " : الرجل قيم على المرأة أي هو رئيسها وكبيرها ، والحاكم عليها ومؤدبها إذا اعوجت ، وهو القائم عليها بالحماية والرعاية ، فعليه الجهاد دونها ، وله من الميراث ضعف نصيبها ، هو المكلف بالنفقة عليها . (۳/۵۷)

وما في " القرآن الكريم " : ﴿فقلنا يآ ادم إن هذا عدوٌّ لک ولزوجک فلا يخرجنكما من الجنة فتشقى﴾ . (سورة طٰه :۱۱۷)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : إنما خصه بذكر الشقاء ولم يقل فتشقيا يعلمنا أن نفقة الزوجة على الزوج ، فمن يومئذ جرت نفقة النساء على الأزواج ، فما كانت نفقة حواء على آدم كذلک نفقة بناتها على بني آدم بحق الزوجية . (۱۱/۲۵۳)

ما في " سنن أبي داود " : قال رسول الله ﷺ : ﴿ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف﴾ .

(ص/۲۶۳ ، كتاب المناسک ، رقم :۱۹۰۵)

(۴) ما في " الفتاوى الهندية " : ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين وإن كان معسرًا ، أو هي=

=غير زمنة ، وإذا كان الإبن يقدر على نفقة أحد أبويه ، ولا يقدر عليهما جميعًا فالأم أحق .
(۵٦۴/۱ ، ۵٦۵ ، الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام)

ما في " الاختيار لتعليل المختار " : ونفقة الآباء والأجداد إذا كانوا فقراء على الأولاد الذكور والإناث . (۲۳۱/۳ ، باب في النفقة)

(۵) ما في " الفتاوى الهندية " : ولو كانت له ثلاثة إخوة متفرقين فالنفقة على الأخ لأب وأم ، وعلى الأخ لأم على قدر الميراث أسداسًا . (۵٦٦/۱ ، الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام)

ما في " الاختيار لتعليل المختار " : وقال أبو يوسف : وكذلک المرأة المعسرة إذا كان زوجها معسرًا ، ولها ابن من غيره موسر ، أو أخ موسر ، فنفقتها على زوجها ، ويؤمر الإبن أو الأخ بالإنفاق عليها ، وترجع على زوجها إذا أيسر ، ويحبس الإبن أو الأخ إذا امتنع ؛ لأن هذا من المعروف .
(۲۳۳/۳ ، فصل في نفقة الأولاد)

(٦) ما في " القرآن الكريم " : ﴿الرجال قوّامون على النسآء بما فضّل اللّٰه بعضهم على بعض وبمآ أنفقوا من أموالهم﴾ . – ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر، اور اس واسطے کہ خرچ کیے انہوں نے اپنے مال۔'' (سورة النساء : ۳۴)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : أي يقومون بالنفقة عليهن والذب عليهن . – ''یعنی مرد عورتوں کو نفقہ دیتے ہیں اور ان کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔'' (۱٦۸/۵)

ما في " التفسير المنير " : الرجل قيم على المرأة ، أي هو رئيسها وكبيرها ، والحاكم عليها ومؤدبها إذا اعوجت ، وهو القائم عليها بالحماية والرعاية ، فعليه الجهاد دونها ، وله من الميراث ضعف نصيبها هو المكلف بالنفقة عليها . – ''مرد کے عورت پر قیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت کا رئیس کبیر اور مؤدب ہے اس کی حمایت ورعایت کا ذمہ دار ہے مرد پر جہاد لازم ہے عورت پر نہیں، اور مرد کو عورت کی بنسبت میراث میں دوگنا حصہ ملتا ہے، کیوں کہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری اسی پر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں پر مردوں کی قوامیت وحاکمیت کی علت ہی یہ ہے کہ وہ عورتوں کے مہر ونفقہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔'' (۵۷/۳)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿فقلنا يآ ادم إنّ هذا عدوّ لک ولزوجک فلا يخرجنكما من الجنة فتشقى﴾ . (سورة طٰه :۱۱۷)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : إنما خصه بذكر الشقاء ولم يقل فتشقيا يعلمنا أن نفقة الزوجة على الزوج ، فمن يومئذ جرت نفقة النساء على الأزواج ، فما كانت نفقة حواء على آدم كذلک نفقة بناتها على بني آدم بحق الزوجية . (۲۵۳/۱۱) –''اللہ رب العزت نے ذکرِ مشقت کے=

....

= ساتھ حضرت آدم کوخاص فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ تم دونوں مشقت میں پڑ جائیں گے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم ہے،اسی دن سے عورتوں کا نفقہ شوہر پر جاری ہوا، چنانچہ جب حضرت حواء کا نفقہ حضرت آدم پر لازم تھا تو تمام بناتِ آدم کا نفقہ بحقِ زوجیت بنی آدم پر لازم ہوگا۔'' (تفسیر قرطبی: سورۃ طٰہٰ:۱۱۷)

ما في '' سنن أبي داود '' : قال رسول الله ﷺ : '' ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف '' . (ص/۲۶۳ ، كتاب المناسك ، رقم : ۱۹۰۵)

ما في '' المبسوط للسرخسي '' : ونفقة المرأة واجبة على الزوج وإن مرضت ، وهذا استحسان ؛ لأن النكاح يعقد للصحبة والألفة . -''بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے اگر چہ وہ بیمار ہی ہو اور یہ استحسان ہے کیونکہ عقدِ نکاح صحبت اور الفت کے لیے ہوتا ہے۔'' (۱۷۹/۵ ، باب النفقة)

ما في '' البحر الرائق '' : تجب النفقة للزوجة على زوجها ، والكسوة بقدر حالهما ، أي الطعام والشراب بقرينة عطف على الكسوة والسكنى عليها . – ''بیوی کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے اور کسوہ ،دونوں کی حالت کا اعتبار کرتے ہوئے۔'' (۲۹۳/۴ ، باب النفقة)

ما في '' جامع الترمذي '' : إن رسول الله ﷺ قال : '' لا يكون لأحدكم ثلاث بنات ، أو ثلاث أخوات ، فيحسن إليهن إلا دخل الجنة '' . (۲۹/۳، رقم :۱۹۱۲ ، ط : بيروت)

(۷) ما في '' القرآن الكريم '' : ﴿وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى ﴾ . (سورة الأحزاب :۳۳) . وقوله تعالى : ﴿ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها﴾ . (سورة النور: ۳۱)

ما في '' أحكام القرآن للجصاص '' : (وقرن في بيوتكن) كن أهل وقار وهدوء وسكينة ، وفيه الدلالة على أن النساء مامورات بلزوم البيوت منهيات عن الخروج . (ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى) يعني إذا خرجن من بيوتكن ، قال : كانت لهن مشية وتكسر وتغنج فنهاهن الله عن ذلك ، وقيل : هو إظهار المحاسن للرجال ، فهذه الأمور كلها مما أدب الله تعالى به نساء النبي ﷺ صيانة لهن وسائر نساء المؤمنين مرادات بها . (۴۷۱/۳)

(۸) ما في '' صحيح البخاري '' : وقال عليه الصلاة والسلام : '' كلكم راع وكلكم مسؤولون عن رعيته ، والأمير راع ، والرجل راع على أهل بيته ، والمرأة راعية على بيت زوجها وولده ، فكلكم راع ، وكلكم مسئولون عن رعيته . (۷۸۳/۲ ، رقم :۵۲۰۰)

(۹) ما في '' جامع الترمذي '' : وقال عليه الصلاة والسلام : '' المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان '' . (۲۳۰/۲ ، رقم :۱۱۷۳)

ما في '' مرقاة المفاتيح '' : (استشر فها الشيطن) أي زينها في نظر الرجال ، وقيل : أي نظر إليها=

....

=ليغويها ويغوي بها ، والأصل في الاستشراف رفع البصر للنظر إلى شيء ، وبسط الكف فوق الحاجب ، والعورة السوأة ، وكل ما يستحق منه إذا ظهر ، وقيل : إنها ذات عورة والمعنى أن المرأة يستقبح بروزها وظهورها ، فإذا خرجت أمعن النظر إليها ليغويها ويغوي غيرها فيوقعها أو أحدهما في الفتنة ، أو يريد بالشيطان شيطان الإنس من أهل الفسق ، أي إذا رأوها بارزة استشرفوها بمثابة الشيطان في نفوسهم من الشر ، ويحتمل أنه رآها الشيطان فصارت من الخبيثات بعد أن كانت من الطيبات . (٦/٢٥٧)

ما في " مشكوة المصابيح " : وقال عليه الصلاة والسلام : " إن المرأة تقبل في صورة شيطان ، وتدبر في صورة شيطان ، إذا أحدكم أعجبته المرأة فوقعت في قلبه فليعمد إلى امرأته فليواقعها ، فإن ذلک يرد ما في نفسه " . (٢٦٨ ، رقم :٣١٠٥)

ما في " مرقاة المفاتيح " : (في صورة شيطان) شبهها بالشيطان في صفة الوسوسة والإضلال ، فإن رؤيتها من جميع الجهات داعية للفساد ، (إذا أحدكم أعجبته المرأة) قال النووي رحمه الله : قال العلماء : معناه الإشارة إلى الهوى ، والدعاء إلى الفتنة بما جعل الله تعالى في نفوس الرجال من الميل إلى النساء ، والتلذذ بالنظر إليهن ، وما يتعلق بهن فهي شبيهة بالشيطان في دعائه إلى الشر بوسوة وتزيينه له ، ويستنبط من هذا أنه ينبغي لها أن لا تخرج إلا بضرورة ، ولا تلبس ثياباً فاخرة ينبغي للرجال أن لا نظر إليها ولا إلى ثيابها . (٦/٢٥٥)

ما في " جامع الترمذي " : وقال عليه الصلاة والسلام : " لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان " . (٢٢١ ، رقم : ١١٧١)

ما في " مرقاة المفاتيح " : وقال عليه الصلاة و السلام : " لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثها كل منهما حتى يلقيهما في الزنا " . (٦/٢٦١)

(١٠) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يا أيها الذين اٰمنوٓا اطيعوا الله واطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم﴾ . (سورة النساء : ٥٩)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : (أولي الأمر) يشتمل الأمراء والقضاة والزوج وغيرهم ، ويشتمل هذه الآية أيضا الزوج يأمر امرأته ، والوالد يأمر ولده ، يدل عليه سياق الآية ، فإن الله تعالى أمر الناس بطاعة أولي الأمر بعد ما أمرهم بالعدل في الحكم تنبيهًا على أن طاعتهم واجبة ما داموا على العدل . (٢/٢٩٢)

ما في " البحر المحيط " : (أولي الأمر) والظاهر أنه كل من ولي أمر شيء ولاية صحيحة قالوا:=

= حتی المرأة یجب علیها طاعة زوجها ، والولد مع والدیه . (۳/۳۹۶)

ما في " رد المحتار " : وحقه علیها أن تطیعه في كل مباح یأمرها به . (۹/۲۹)

(۱۱) ما في " رد المحتار " : والذي ینبغي تحریره أن یكون له منعها عن كل عمل یؤدي إلى تنقیص حقه أو ضرره أو إلى خروجها من بیتها ، أما العمل الذي لا ضرر له فیه فلا وجه لمنعها عنه خصوصًا في حال غیبته من بیته ، فإن ترك المرأة بلا عمل في بیتها یؤدي إلى وساوس النفس والشیطان أو الاشتغال بما لا یعني مع الأجانب والجیران . (۵/۱۰۷۵، باب النفقة)

(۱۲) ما في " القرآن الكریم " : ﴿یا أیها الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰه واطیعوا الرسول وأولي الأمر منكم﴾ . (سورة النساء : ۵۹)

ما في " تفسیر المظهري " : ویشتمل هذه الآیة أیضا الزوج یأمر امرأته ، والسید یأمر عبده ، والوالد یأمر ولده . (۲/۳٦٦)

ما في " صحیح البخاري " : قوله علیه السلام : " ألا كلكم راع ، وكلكم مسؤول عن رعیته ، فالإمام على الناس راع ، وهو مسؤول عن رعیته ، والرجل راع عن أهل بیته ، وهو مسؤول عن رعیته ، والمرأة راعیة على بیت زوجها وولده ، وهي مسؤولة عن رعیتها ، وعبد الرجل راع في مال سیده ، وهو مسؤول عنه ، فكلكم راعٍ ، وكلكم مسؤول عن رعیته " .

(۱/۱۲۲، رقم : ۵۲۰۰ ، صحیح مسلم : ۲/۱۳۲، سنن أبي داود: ص/۴۰٦)

(۱۳) ما في " سنن أبي داود " : " لا یحل لامرأة تؤمن باللّٰه والیوم الآخر أن تسافر سفرًا فوق ثلاثة أیام فصاعدا ، إلا ومعها أبوها أو أخوها أو زوجها أو إبنها أو ذو محرم منها " .

(ص/۲۴۲ ، رقم :۱۷۲٦، صحیح مسلم : ۱/۴۳۴)

وقوله علیه السلام : " لا تسافر المرأة ثلاثا إلا ومعها ذو محرم " . (سنن أبي داود: ص/ ۲۴۲ ، رقم : ۱۷۲۸، صحیح البخاري : ۱/۱۴۷، صحیح مسلم : ۱/۴۳۳)

ما في " رد المحتار " : وجاز سفر الأمة وأم الولد بلا محرم ، هذا في زمانهم ، أما في زماننا فلا ؛ لغلبة الفساد ، وفیه إشارة إلى أن الحرة لا تسافر ثلاثة أیام بلا محرم . (۹/۴۷۵ ، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في البیع ، النتف في الفتاوى : ۴۹۸ ، باب الكراهیة)

(۱۴) ما في " القرآن الكریم " : ﴿فمن اضطرّ في مخمصة غیر متجانف لإثم﴾ . (سورة المائدة :۳)

ما في " ترتیب اللآلي في سلك الأمالي " : " الضرورات تبیح المحظورات " – " ما أبیح للضرورة یتقدر بقدرها " . (ص/۱۰۲۸، الأشباه والنظائر: ۱/۳۰۷ ، ۳۰۸)=

....

=ما في " المقاصد الشرعية " : " إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرمًا ، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجبًا " . (ص/۴۶)

(۱۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يا أيها النبي قل لازوٰجک وبنٰتک ونسآء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن﴾ . (سورة الأحزاب : ۵۹)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : في هذه الآية دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبيين ، وإظهار الستر والعفاف عند الخروج ؛ لئلا يطمع أهل الريب فيهن . (۳/۴۸۶)

(۱۶) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وقل للمؤمنٰت يغضُضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها﴾ . (سورة النور : ۳۱)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : أمر اللّٰه سبحانه وتعالى المؤمنين والمؤمنات بغض الأبصار عما لا يحل ، فلا يحل للرجل أن ينظر إلى المرأة ، ولا المرأة إلى الرجل ، فإن علاقتها به كعلاقته بها ، وقصدها منه كقصده منها . وقال : يظهر لي بحكم ألفاظ الآية أن المرأة مأمورة بأن لا تبدي ، وأن تجتهد في الإخفاء لكل ما هو زينة ، ووقع الاستثناء فيما يظهر بحكم ضرورة حركة فيما لا بد منه ، أو إصلاح شأن ونحو ذلک . (ما ظهر) على هذا الوجه مما يؤدي إليه الضرورة في النساء فهو المعفو عنه . (۱۲/ ۲۲۷ - ۲۲۹)

(۱۷) ما في " جامع الترمذي " : إن النبي ﷺ قال : " لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان " . وقوله عليه السلام : " المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان " .

(۱/۲۲۱، ۲۲۲ ، رقم : ۱۱۷۱ - ۱۱۷۳)

(۱۸) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يٰنسآء النبي لستن كأحد من النسآء إن اتقيتن فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولا معروفًا﴾ . (سورة الأحزاب : ۳۲)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قيل : فيه أن لا تلين القول للرجال على وجه يوجب الطمع فيهن من أهل الريبة ، وفيه الدلالة على أن ذلک حكم سائر النساء في نهيهن عن إلانة القول للرجال على وجه يوجب الطمع فيهن ، ويستدل به على رغبتهن فيهم . (۳/۴۷۰)

ما في " المقاصد الشرعية " : إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرمًا، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجبًا . (ص/۴۶)

(۱۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وقل للمؤمنٰت يغضُضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها وليضربن بخمرهن على جيوبهن ولا يبدين زينتهن إلا لبعولتهن =

....

=أو اٰبآئهن أو اٰبآء بعولتهن أو ابنآئهن أو ابنآء بعولتهن أو إخوانهن أو بني إخوانهن أو بني أخوٰتهن أو نسآئهن أو ما ملكت أيمانهن﴾ . (سورة النور :٣١)

ما في " تفسير المظهري " : (أو نسائهن) يعني جاز للمرأة أن تنكشف للمرأة مؤمنة كانت أو كافرة حرة كانت أو أمة إلا ما بين سرتها وركبتها ، وجاز لها النظر إليها بوجود المجانسة وانعدام الشهوة غالبًا ، وعن أبي حنيفة أن نظر المرأة إلى المرأة كنظر الرجل إلى محارمه . (٣٨/٦)

(٢٠) ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : (أو نسائهن) يعني المسلمات ، وتدخل في هذا الاماء المؤمنات ، ويخرج منه نساء المشركين من أهل الذمة وغيرهم ، فلا يحل لإمرأة مؤمنة أن تكشف شيئًا من بدنها بين يدي امرأة مشركة إلا أن تكون أمة لها . (٢٣٣/١٢)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : ولا ينبغي للمرأة الصالحة أن تنظر إليها المرأة الفاجرة ؛ لأنه تصفها عند الرجال فلا تضع جلبابها ولا خمارها في السراج . (در مختار) .

(٥٣/٩ ، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في النظر والمس ، ط : ديوبند)

(٢١) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وإذا سألتموهن متاعًا فسئلوهن من ورآء حجاب﴾ .

(سورة الأحزاب :٥٣)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قد تضمن حظر روية أزواج النبي ﷺ وبين به أن ذلك لطهر قلوبهم وقلوبهن ؛ لأن نظر بعضهم إلى بعض ربما حدث عنه الميل والشهوة ، فقطع اللّٰه بالحجاب الذي أوجبه هذا السبب . (٤٨٣/٣)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : في هذه الآية تدل على أن اللّٰه تعالى أذن في مسألتهن من وراء حجاب في حاجة تعرض أو مسألة يستفتين فيها ، ويدخل في ذلك جميع النساء بالمعنى وبما تضمنته أصول الشريعة من أن المرأة كلها عورة ، بدنها وصوتها ، فلا يجوز كشف ذلك إلا لحاجة كالشهادة عليها ، أو داء يكون ببدنها ، أو سؤالها يعرض وتعين عندها . (٢٢٧/١٤)

ما في " صحيح البخاري " : عن عبد اللّٰه بن عباس أنه قال : " كان الفضل بن عباس رديف رسول اللّٰه ﷺ فجاء ته امرأة من خثعم فجعل ينظر إليه ، فجعل رسول اللّٰه ﷺ يصرف وجه الفضل إلى شق الآخر " . (٢٥٠/١ ، صحيح مسلم : ٤٣١/١)

ما في " تفسير المظهري " : هذا الحديث صريح في المنع عن النظر إلى وجه المرأة الأجنبية لعدم الأمن عليها من الشيطان . (٣٧٨/٦)

ما في " نصب الراية للزيلعي " : " من نظر إلى محاسن امرأة أجنبية عن شهوة صب في عينيه=

....

= الآنک یوم القیامة ‘‘ . (۵۴۰/۴)

ما في ’’ بدائع الصنائع ‘‘ : الأجنبيات الحرائر ، فلا يحل النظر للأجنبي من الأجنبية الحرة إلى سائر بدنها إلا الوجه والكفين ، لقوله تعالى : ﴿قل للمؤمنين يغضّوا من أبصارهم﴾ . [النور:۳۰] إلا أن النظر إلى مواضع الزينة ، وهي الوجه والكفان رخص بقوله تعالى : ﴿ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها﴾ . [النور:۳۰] .... ولأنها تحتاج إلى البيع والشراء والأخذ والعطاء ، ولا يمكنها ذلک عادة إلا بكشف الوجه والكفين ، فيحل لها الكشف ، وهذا قول أبي حنيفة (رضي اللّٰه عنه) .... ثم إنما يحل النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منها من غير شهوة ، فأما عن شهوة فلا يحل لقوله عليه السلام : ’’تزنيان وليس زنا العينين إلا النظر عن شهوة ‘‘ ، ولأن النظر عن شهوة سبب الوقوع في الحرام ، فيكون حرامًا إلا في حالة الضرورة بأن دعى إلى شهادة أو كان حاكمًا ، فأراد أن ينظر إليها ليجيز إقرارها عليها ، فلا بأس أن ينظر إلى وجهها ، وإن كان لو نظر إليها لا تشتهي أو كان أكبر رأيه ذلک ، لأن الحرمات قد يسقط اعتبارها لمكان الضرورة . (۴۹۲/۶)

(۲۲) ما في ’’ أحكام القرآن للجصاص ‘‘ : ﴿فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض﴾ قيل : فيه أن لا تلين القول للرجال على وجه يوجب من أهل الريبة ، وفيه الدلالة على أن ذلک حكم سائر النساء في نهيهن عن إلانة القول للرجال على وجه يوجب الطمع فيهن ، ويستدل به على رغبتهن فيهم . (۴۷۰/۳)

ما في ’’ التفسير المنير ‘‘ : ﴿إن اتقيتن فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولا معروفا﴾ أي أن التقوى أو كنتن متقيان مخالفة حكم اللّٰه تعالى ورضا رسوله ﷺ فلا تلن الكلام ولا ترفقنه عند محادثة الرجال ، وليكن كلامكن بجد وجزم وقوة ، حتى لا تطمع في الخيانة من في قلبه ميل إلى الريبة والفسق والفجور ، وقلن القول المعروف المعتاد الذي فيه ترخيم الصوت ، البعيد عن الريبة الذي يختلف عن مخالفة الأزواج .... ونساء الأمة تبع نساء النبي ﷺ في هذه الآداب التي أمر اللّٰه تعالى .... والخلاصة : لا تخاطب المرأة الأجانب كما تخاطب زوجها .

(۳۳۰/۱۱)

(۲۳) ما في ’’ صحيح البخاري ‘‘ : عن عقبة بن عامر أن رسول اللّٰه ﷺ قال : ’’ إياكم والدخول على النساء ‘‘ ، فقال رجل من الأنصار : يا رسول اللّٰه ! أفرأيت الحمو ؟ قال : ’’ الحمو الموت ‘‘ .

(۷۸۷/۲ ، رقم : ۵۲۳۲ ، صحيح مسلم : ۲۱۶/۲)

ما في ’’ صحيح البخاري ‘‘ : عن ابن عباس عن النبي ﷺ قال : ’’ لا يخلون رجل بامرأة إلا مع=

....

= ذي محرم "، فقام رجل فقال : يا رسول الله ! امرأتي حاجة واكتتبت في غزوة كذا وكذا قال : " ارجع فحج امرأتک ". (۲/۷۸۷ ، رقم :۵۲۳۳)

ما في " نصب الراية للزيلعي " : وقال عليه الصلاة والسلام : " ألا لا يخلون رجل بامرأة ليس منها بسبيل فإن ثالثهما الشيطان ". (۵۵۲/۴)

ما في " بدائع الصنائع " : فإن كان في البيت امرأة أجنبية أو ذات رحمٍ محرم ، لا يحل للرجل أن يخلوها ، لأن فيه خوف الفتنة والوقوع في الحرام . (۵۰۲/۶ ، كتاب الاستحسان)

(۲۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وقل للمؤمنٰت يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها وليضربن بخمرهن على جيوبهن ولا يبدين زينتهن إلا لبعولتهن أو اٰبآئهن أو اٰبآء بعولتهن أو أبنآئهن أو أبنآء بعولتهن أو إخوانهن أو بنيّ إخوانهن أو بنيّ أخواتهن أو ما ملكت أيمانهن﴾ . (سورة النور : ۳۱)

ما في " تفسير المظهري " : (ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها) لأن في إبداء الكف والوجه ضرورة لحاجتها إلى المعاملة مع الرجال أخذا أو إعطاء وغير ذلک ، فإن كان الرجل لا يأمن من الشهوة لا ينظر إلى وجهها إلا لحاجة كتحمل الشهادة وأدائها والقضاء .... لا يجوز للمرأة إبداء وجهها لرجل ذي إربة غير الزوج والمحرم ، فإن عامة محاسنها في وجهها ، فخوف الفتنة في النظر إلى وجهها أكثر منه في النظر إلى سائر أعضائها وإن كان المراد بها مواضع الزينة فمعنى الاستثناء إلا ما ظهر منها عند الضرورات ، ضرورة الخروج لقضاء الحوائج أو ضرورة الاستشهاد ونحو ذلک يدل على عدم جواز بدء المرأة وجهها . (۶/۳۷۷ ، ۳۷۸)

(۲۵) ما في " جامع الترمذي " : وقال النبي ﷺ : " لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان ". (۲۲۱ ، رقم : ۱۱۷۱)

ما في " مرقاة المفاتيح " : والمعنى يكون الشيطان معهما يهيج شهوة كل منهما حتى يلقيها الزنا . (۲۶۱/۶)

(۲۶) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ينٰسآء النبي لستن كأحد من النسآء ان اتقيتن فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولا معروفا﴾ . (سورة الأحزاب : ۳۲)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : فدل الآية على أنه لا يجوز للنساء إذا كلمن أجنبيا الإلانة في القول والخثونة والتمريض فيه ، وإن لم يكن ذلک على قصد الريبة فإنک تعلم أن أمهات المؤمنين مع بعد ساحتهن عن وهم الريبة نهين عن خضوع القول ؛ لأنه ربما يفضي لطمع المخاطب فيبتلى=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

= بمعصية وإن كان كلامها خاليا عن الريبة والمعصية . (۳۱۶/۳)

(۲۷) ما في " الأشباه والنظائر " : " الضرورات تبيح المحظورات " . " ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها " . (۳۰۷/۱ ، ۳۰۸)

(۲۸) ما في " القرآن الكريم " : ﴿والقواعد من النسآء اللاتي لا يرجون نكاحًا فليس عليهن جناح أن يضعن ثيابهن غير متبرجٰتٍ بزينة وأن يستعففن خير لهن والله سميع عليم﴾. (سورة النور: ۲۰)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : فاستثنى فيه من النساء المأمورات بالحجاب العجائز اللاتي قد أيسن ، ولم يبق لهن مطمع في الأزواج أن يضعن ثيابهن الظاهرة التي لا يفضي وضعها لكشف العورة كالجلباب والرداء والقناع الذي فوق الخمار . (۴۷۸/۳)

(۲۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿فمن اضطر في مخمصة غير متجانف لإثم﴾ . (سورة المائدة :۳)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : فإن الاضطرار هو الضر الذي يصيب الإنسان من جوع أو غيره ولا يمكه الامتناع منه . (۳۹۲/۲)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : ولا سيما الفقيرات اللاتي ليس لهن خادم ولا من يكفل لرزقهن ونفقتهن فيضطرن إلى الخروج ، وكذلک قد تضطر النساء إلى الخروج للسفر وأمثاله ، فأباحت الشريعة السمحة البيضاء الدرجة الثانية أيضًا عند الضرورة ، فيكون ذلک مقدرًا بقدر الضرورة . (۴۷۳/۳)

ما في " الأشباه والنظائر " : " الضرورات تبيح المحظورات " . ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها . (۳۰۷/۱ ، ۳۰۸)

ما في " درر الحكام " : " إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفّهما " .=

....

....

....

....

....

....

....

....

= لأن الضرورات تبيح المحظورات ، فإذا وجدت محظورات وكان من الواجب أو من الضروري ارتكاب أحد الضررين فيلزم ارتكاب أخفهما وأهونهما . (۱/ ۴۱ ، المادة :۲۸)

(۳۰) ما في " القرآن الكريم " : ﴿فمن اضطر في مخمصة غير متجانف لإثم﴾ . (سورة المائدة : ۳)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : فإن الاضطرار هو الضر الذي يصيب الإنسان من جوع أو غيره ولا يمكنه الامتناع منه . (۲/ ۳۹۲)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : ولا سيما الفقيرات اللاتي ليس لهن خادم ولا من يكفل لرزقهن ونفقتهن فيضطرن إلى الخروج ، وكذلک قد تضطر النساء إلى الخروج للسفر وأمثاله ، فأباحت الشريعة السمحة البيضاء الدرجة الثانية أيضًا عند الضرورة ، فيكون ذلک مقدرًا بقدر الضرورة . (۳/ ۴۷۳)

ما في " كنز العمال " : وقال عليه الصلاة والسلام : " ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة". (۱۶/ ۱۶۳ ، رقم : ۴۵۰۴۵)

ما في " تفسير ابن كثير " : (وقرن في بيوتكن) أي ألزمن بيوتكن فلا تخرجن لغير الحاجة. (۳/ ۳۳)

ما في " الأشباه والنظائر " : الضرورات تبيح المحظورات . ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها . (۱/ ۳۰۷ ، ۳۰۸)

(۳۱) ما في " النتف في الفتاوى " : ويكره للمرأة التي الحرة أن تسافر سفرًا يكون ثلاثة أيام فصاعدًا إلا مع زوج أو مع ذي رحم . (ص/ ۴۹۸ ، باب الكراهية ، رد المحتار : ۹/ ۴۷۵)

(خواتین کی ملازمت اوراسلامی تعلیمات:ص/ ۵۰۷-۵۱۰،ط:ایفا)

مشروعیتِ حبس

معاشرے میں بعض لوگ اپنے جرائم وبدکاری کی پاداش میں عقوبت کے مستحق ہوتے ہیں، اور قید کرنا عقوبت کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لیے جرائم پیشہ افراد کو قید کرنے کی مشروعیت کتاب اللہ(۱)، سنتِ رسول اللہ(۲) اور اجماع سے ثابت ہے(۳)، اور عقل بھی اس کی متقاضی ہے۔(۴)

قیدیوں کے حقوق کی بابت رہنما اصول

قرآنِ کریم اوراحادیث نے قیدیوں کے حقوق سے متعلق، تمام جزئیات کو تفصیل کے ساتھ بیان تو نہیں کیا، مگر ایسی کلیات اور ضوابط کی وضاحت فرمادی، جن کی روشنی میں فقہا وعلمائے امت ان کے حقوق کی تعیین کر سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- قیدیوں کے ساتھ حسنِ معاملہ۔(۵)

۲- قیدیوں کو کھانا کھلانا، انہیں بھوکا نہ رکھنا، قیدیوں کا کھانا عام لوگوں کے کھانے سے جودت (QUALITY) اور کمیت (COUNTITY) میں کم نہ ہو، بلکہ اس سے افضل ہو۔(۶)

۳- قیدیوں کے ساتھ اہانت واذلال کا معاملہ نہ ہو۔(۷)

۴- قیدیوں کو ایسے کپڑے مہیا کرنا جو موسم کے مناسب ہو۔(۸)

۵- قیدیوں کو زمانِ قید میں اپنے دین ومذہب کے شعائر پر عمل پیرا ہونے کی اجازت ہو۔

قیدیوں کے حقوق

۱- جس شخص کو ثبوتِ جرم کے فراہم ہوئے بغیر قید کیا جائے، تو اسے متہم کہتے ہیں، اور متہم دو حال سے خالی نہیں ہوتا: یا تو وہ معروف الحال ہوگا، یا مجہول الحال۔ پھر معروف الحال دو حال سے خالی نہیں، یا تو معروف بالبر والصلاح والتقویٰ ہوگا (جس کا صلاح وتقوی اور نیکی معلوم ہو)، یا معروف بالفسق والفجور ہوگا (جس کا فسق وفجور معلوم ہو)۔

صورتِ اولیٰ کا حکم: جس شخص کا صلاح وتقویٰ معلوم ہو، ایسے شخص کو محض تہمت کی بنا پر گرفتار کرنا جائز نہیں (۹)، اور جس شخص کا فسق وفجور معلوم ہو، اسے گرفتار کرنا جائز ہی نہیں، بلکہ اولیٰ ہے۔ (۱۰)

صورتِ ثانیہ کا حکم: جس شخص کا صلاح وتقویٰ اور فسق وفجور معلوم ومشہور نہ ہو، اسے انکشافِ حال تک قید میں رکھنا درست ہے۔ (۱۱)- البتہ متہم شخص کو کتنی مدت قید میں رکھا جاسکتا ہے، تو اس سلسلے میں اقلِ مدت کی تو کوئی حد نہیں، مگر اکثرِ مدت کے بارے میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں، علامہ ابن تیمیہؒ امام مالک، امام احمد رحمہم اللہ اور ان کے اصحاب، اور احناف کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ متہم مجہول الحال کی اکثرِ مدتِ حبس حاکم کے اجتہاد پر مبنی ہے، یعنی متہم شخص کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا، جب تک کہ اس کے حالات ظاہر نہ ہوجائیں۔ (۱۲)- اور بعض فقہائے کرام کے نزدیک اکثرِ مدتِ حبس ایک دن، بعض کے نزدیک دو یا تین دن ہیں، اور بعض حضرات نے ایک مہینے کی بھی اجازت دی

ہے۔[۱۳] ......رہا متہم معروف بالفجور والفساد، تو اس کو اتنی مدت تک قید میں رکھا جاسکتا ہے کہ اس کی حالت ظاہر ہوجائے، اور تحقیق طلب اُمور مکمل ہوجائیں، خواہ قید کی حالت ہی میں اس کی موت واقع ہو، یہی مذہب، فقہائے احناف، مالکیہ ،شوافع اور حنابلہ کا بھی ہے۔[۱۴]

۲- (الف): مذہبی امور، مثلاً عبادت کرنا[۱۵]، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، قیدیوں کے درمیان دعوتِ دین[۱۶]، اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لیے غذا فراہم کرنا[۱۷]، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کی بے حرمتی سے گریز کرنا[۱۸]، یہ تمام امور قیدیوں کے حقوق میں داخل ہیں۔

جسمانی ضروریات

(ب): قیدی کے لیے مناسب غذا، صاف پانی، موسم کے مناسب کپڑے[۱۹]، علاج معالجہ[۲۰]، بیوی سے ازدواجی تعلق، جب کہ اسے اس کی حاجت ہو، اور قیدخانہ میں اس کے لیے مناسب جگہ کا انتظام ہو[۲۱]، اسی طرح حفظانِ صحت کے لیے ورزش وتفریح قیدی کے بنیادی حقوق میں داخل ہیں۔[۲۲]

عام سماجی حقوق

(ج): اخبارات پڑھنا، ریڈیو سننا، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنا، دوسرے قیدیوں سے ملاقات کرنا، تعلیم وہنر سیکھنے اور ان جیسے دیگر اُمور، قیدیوں کی

اصلاح وفلاح، اور معاشرہ میں شریفانہ زندگی گذارنے کا اہل بنانے کے وسیع مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے، عالمی معیار نے یہ طے کردیا ہے کہ پوری دنیا سے ان کے ربط کو ختم نہیں کرنا چاہیے، اس لیے قیدیوں کو یہ عام سماجی حقوق حاصل ہوں گے، اور انہیں ان حقوق کا حاصل ہونا، قیدیوں کے سلسلے میں نظریۂ شرعِ اسلامی کے خلاف بھی نہیں ہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''**استوصوا بهم خيرًا**''، جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ قیدی ہر طرح کے خیر کے مستحق ہیں۔ (۲۳)

اخلاقی امور

(د): مردوں اور عورتوں کے لیے، اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کے لیے الگ الگ قید خانے ہونا، نہ صرف قیدیوں کے حقوق میں داخل ہیں، بلکہ ریاست پر اس کا انتظام لازم وضروری ہے (۲۴)، کیوں کہ ان سب کو ایک جگہ رکھنا مفاسد اور خرابیوں کا سبب ہے۔ (۲۵)

۳- (الف/ب/ج/د/ھ/و) قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لیے سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا، ان کو بے لباس کردینا، انہیں مسلسل جگہ رہنے پر مجبور کرنا، مار پیٹ کرنا، الکٹرک شاک لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، یہ سب افعال غیر انسانی، غیر اخلاقی اور ظلم وزیادتی پر مبنی ہونے کی وجہ سے غیر شرعی اور حرام ہیں (۲۶)، اگر قیدی اس طرح کی سزاؤں کے نتیجے میں اقبالِ جرم کریں، تو شرعاً وہ معتبر نہیں ہوگا، اور نہ اسے بنیاد بنا کر سزاؤں کا فیصلہ کرنا صحیح ہوگا۔ (۲۷)

۴- عام حالات میں قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا اور بیڑی ڈالنا

جائز نہیں ہوگا[۲۸]، لیکن جب اس کے فرار ہونے کا اندیشہ ہو، تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی۔[۲۹]

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں، اس طرح قید کرنا کہ پوری دنیا سے اس کے ربط وتعلق کے مواقع ختم ہوں، شرعاً جائز ہونا چاہیے۔[۳۰]

۶- جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لینا شرعاً جائز نہیں ہے[۳۱]، اور اگر لیا گیا تو وہ اس کام کی اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے، کیوں کہ اگر انہیں مستحقِ اجرت قرار دیا جائے، تو اس صورت میں جبراً عقدِ اجارہ کی صحت کا قائل ہونا لازم آتا ہے، جب کہ عقدِ اجارہ کی صحت کے لیے طرفین کی رضامندی شرط ہے، اور یہاں یہ شرط مفقود ہے[۳۲]، تو جو کام قیدیوں سے جبراً لیے گئے اسے استہلاکِ منافع کہا جائے گا، اور استہلاکِ منافع مضمون بالقیمت نہیں ہوتے[۳۳]، اس لیے اس صورت میں قیدی اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیرِ سماعت ہے، اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں باعتبارِ سلوک کے ان دونوں میں فرق کیا جانا جائز ہی نہیں، بلکہ لازم ہے، کیوں کہ ثبوتِ جرم کے فراہم ہوئے بغیر اس کے ساتھ وہ سلوک روا رکھنا، جو ان مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے، جن کی سزا کا حکم صادر ہو چکا، سراسر ظلم وزیادتی اور ناانصافی ہے، جو شرعاً ناجائز وحرام ہے۔[۳۴]

۸- جزء نمبر ایک میں ہم نے متہم کی جو تقسیم کی ہے، اس اعتبار سے صرف متہم معروف بالفسق والفجور، اور متہم مجہول الحال ہی کو ظہورِ حال اور تحقیق طلب اُمور کی

تکمیل تک قیدخانہ میں رکھ سکتے ہیں، خواہ یہ زمانۂ قید اس مدت سے زائد ہو، جو اس (قیدی) کے اوپر عائد فردِ جرم کی اصل سزا ہے۔ (۳۵)

۹- اولاً ملزم کی دو قسمیں ہیں: معروف الحال اور مجہول الحال، پھر معروف الحال کی دو قسمیں ہیں: معروف بالصلاح والتقوی اور معروف بالفسق والفجور۔

اگر قیدی معروف بالصلاح والتقوی ہے، تو اسے محض تہمت کی وجہ سے قیدخانہ میں رکھ کر ذہنی اذیت دینا یہ اعتدا اور ظلم ہے (۳۶)، اور ظلم وزیادتی کی صورت میں ہرجانہ طلب کرنا اس وقت درست ہوتا ہے، جب کہ اعتدا اور ظلم کا تعلق عین سے ہو، جب کہ ذہنی اذیت کا تعلق عین سے نہیں، اس لیے مالی ہرجانہ طلب کرنا صحیح نہیں ہونا چاہیے۔ (۳۷)

۱۰- زیرِ سماعت قیدیوں کو قانونی صلاح ومشورہ کا حق حاصل ہے، جو قیدی وکیلوں کے اخراجات برداشت کرسکتے ہیں، انہیں اپنے وکیلوں تک رسائی ملنی چاہیے، اور جو ایسا نہیں کرسکتے ان کے لیے قانونی نمائندگی کا بندوبست ریاست پر لازم ہونا چاہیے، کیوں کہ جو قیدی ثبوتِ جرم فراہم ہوئے بغیر قیدخانہ میں رکھے گئے ہیں، وہ مظلوم ہیں (۳۸)، اور دفعِ ظلم ہر ایک کا اپنا حق ہے (۳۹)، اگر وہ قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اپنے اس حق کو حاصل کرنا چاہیں، تو انہیں اس کا حق حاصل ہوگا، اور جو اس حق کو حاصل کرنے سے عاجز ہیں، انہیں ان کا حق دلانا ریاست کا فرض ہے۔ (۴۰)

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے شیرخوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے، کیوں کہ ماں اور ولد کو جدا کرنے سے ولد کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے (۴۱)، نیز شریعت نے ماں اور ولد کو جدا کرنے سے منع فرمایا ہے (۴۲)، لہٰذا حکومت کو زمانۂ حبس میں شیرخوار

بچے کو اپنی ماں سے جدا کرنے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ (۴۳)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿أو ينفوا من الأرض﴾ . (سورة المائدة :۳۳)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : وقال مالك أيضًا والكوفيون : نفيهم سجنهم فينفى من سعة الدنيا إلى ضيقها فصار كأنه إذا سجن فقد نفي من الأرض إلا من موضع استقرار . (۱۵۳/۶)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وقال الحنفية وجماعة من الشافعية والحنابلة وابن العربي من المالكية : إن المراد به الحبس ؛ لأن النفي من جميع الأرض محال ، وإلى بلد آخر فيه إيذاء ، وهو ليس نفيا من الأرض بل من بعضها والله تعالى يقول : (من الأرض) فلم يبق إلا الحبس ؛ لأن المحبوس في حقيقته بمنزلة المخرج من الدنيا . (۲۸۶/۱۶)

(۲) ما في " جامع الترمذي " : " ان النبي ﷺ حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه " . (ص/۲۶۱)

(۳) ما في " تبيين الحقائق " : أما الإجماع : فلأن الصحابة رضي الله عنهم ومن بعدهم أجمعوا عليه إلا أن في زمن النبي ﷺ وزمن أبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم لم يكن سجن ، وكان يحبس في المسجد والدهليز وبالربط ، ولما كان في زمن علي رضي الله عنه بنى السجن ، وكان هو أول من بناه في الإسلام ، وسمى السجن نافعًا ، ولم يكن حصينًا فانفلت الناس منه ، وبنى سجنًا آخر ، وسماه مخيسًا وقال فيه شعرًا : ؎

ألا تراني كيسًا مكيسا☆ بنيت بعد نافع مخيسًا

(۹۱،۹۰/۵، فتح القدير:۲۶۰/۷)

(۴) ما في " الموسوعة الفقهية " : وتدعو الحاجة عقلا إلى إقرار الحبس لكشف عن المتهم ، ولكف أهل الجرائم المنتهكين للمحارم الذين يسعون في الأرض فسادًا ويعتادون ذلک ، أو يعرف منهم ولم يرتكبوه ما يوجب الحد والقصاص . (۳۵۲/۱۶)

(۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يا أيها النبي قل لمن في أيديكم من الأسرىٰ إن يعلم الله في قلوبكم خيرًا يؤتكم خيرًا مما أخذ منكم ويغفر لكم والله غفور رحيم﴾ .- "اے نبی! ان قیدیوں سے کہہ دیجیے جو آپ کے ہاتھ میں ہیں کہ اگر اللہ کو تمہارے قلب میں نیکی کا علم ہوگا، تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے، اس سے بہتر تمہیں دے گا، اور تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے۔" (سورة الأنفال :۷۰)-(جب اللہ رب العزت ان قیدیوں سے عفو ومغفرت کا وعدہ فرما رہے ہیں، جن کے دلوں میں وہ کوئی بھی خیر جانے، تو انسانوں پر بھی لازم ہے کہ وہ قیدیوں کے ساتھ انتہائی درجہ کی رحمت وانسانیت کے ساتھ پیش آئیں۔)

(۶) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا﴾ .=

....

=-''اور کھانا کھلاتے رہتے ہیں مسکینوں اور یتیموں اور غریبوں کو اللہ کی محبت سے۔'' (سورة الإنسان:۸)
(بقولِ محققین یہ آیت مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کی تمام صورتوں کو شامل ہے، جس کی ایک اہم فرد کھانا کھلانا بھی ہے۔)

ما في '' التفسير الكبير للرازي '' : إطعام الطعام كناية عن الإحسان إلى المحتاجين والمواساة معهم بأي وجه كان ، وإن لم يكن ذلک بالطعام بعينه ، ووجه ذلک أن أشرف أنواع الإحسان هو الإحسان بالطعام ، وذلک لأن قوام الأبدان بالطعام ولا حياة إلا به . (۱۰/۷۴۷)

ما في '' روح المعاني '' : أقول : وهذا يدل على أن المراد من قوله :(إنما نطعمكم) ليس هو الإطعام فقط ، بل جميع أنواع المواساة من الطعام والكسوة (كبير) فكأنه ينفعونه بوجوه المنافع .

(روح المعاني . تفسيرماجدي)

ما في '' المعجم الكبير للطبراني '' : عن أبي عزيز بن عمير أخي مصعب بن عمير قال : كنت في الأسارى يوم بدر ، فقال رسول الله ﷺ : '' استوصوا بالأسارى خيرًا '' ، وكنت في نفر من الأنصار ، وكانوا إذا قدموا غدائهم وعشائهم أكلوا التمر وأطعموني الخير بوصية رسول الله ﷺ إياهم . — ''حضرت ابوعزیز سے مروی ہے فرماتے ہیں: کہ میں بدری قیدیوں میں شریک تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''قیدیوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو''اور میں انصار کی ایک جماعت میں تھا، جب وہ دوپہر اور شام میں کھانا کھاتے تو خود چھوہارے کھاتے اور مجھ کو روٹی کھلاتے ، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔'' (۲۲/۳۹۳ ، رقم :۹۷۷ ، ط : احياء التراث)

(۷) ما في '' القرآن الكريم '' : ﴿والذين يؤذون المؤمنين والمؤمنٰت بغير ما اكتسبوا﴾ .

(سورة الأحزاب :۵۸)

ما في ''تفسير القرطبي '' : أذية المؤمنين والمؤمنات هي أيضًا بالأفعال والأقوال القبيحة .

(۱۴/۲۴۰)

ما في '' جامع الترمذي '' : عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : '' المسلم أخو المسلم لا يخونه ولا يكذبه ولا يخذله ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ عرضه وماله ودمه ، التقوى ههنا ، بحسب امرئٍ من الشر أن يحقر أخاه المسلم '' . (۲/۱۴ ، أبواب البر والصلة)

ما في '' مشكوة المصابيح '' : عن ابن عمر قال : صعد رسول الله ﷺ المنبر ، فنادى بصوت رفيع فقال : '' يا معشر من أسلم بلسانه ولم يفض الإيمان إلى قلبه ، لا تؤذوا المسلمين ولا تعيروهم ولا تتبعوا عوراتهم ، فإنه من يتبع عورة أخيه المسلم يتبع الله عورته ، ومن يتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله '' . رواه الترمذي . (ص/۴۲۸ ، ۴۲۹ ، باب ما ينهى عنه من التهاجر)=

....

=(٨) ما في " صحيح البخاري " : عن جابر بن عبد اللّٰه قال : " لما كان يوم بدر أتي بأسارى وأتي بالعباس ، ولم يكن عليه ثوب ، فنظر النبي ﷺ له قميصًا فوجدوا قميص عبد اللّٰه بن أبي يقدر عليه ، فكساه النبي ﷺ إياه ، فلذلک نزع النبي ﷺ قميصه الذي ألبسه ، قال ابن عيينة : كانت له عند النبي ﷺ يد فأحب أن يكافئه " . (ص/٥٣٥ ، رقم :٣٠٠٨ ، تفسير المظهري :٢٥٤/٤)

(٩) ما في " كتاب الخراج لأبي يوسف " : روى أبو يوسف أن رسول اللّٰه ﷺ لا يأخذ الناس بالقرف (التهمة) . (ص/٣٤٤ ، التحذير من الأخذ بالتهمة ، الموسوعة الفقهية :٢٩٤/١٦)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وقد فصل القائلون بحبس التهمة ما يتعلق به من أحكام فذكروا : أنه تختلف أحكام حبس المتهم باختلاف حاله ، فإذا لم يكن من أهل تلک التهمة ولم تقم قرينة صالحة على اتهامه فلا يجوز حبسه ولا عقوبته اتفاقًا .

(١٠) وإن كان المتهم معروفًا بالفجور والسرقة والقتل ونحو ذلک جاز حبسه بل هو أولى ممن قبله .

(١١) وإن كان المتهم مجهول الحال لا يعرف ببر ولا فجور ، فهذا يحبس حتى ينكشف حاله عند جمهور الفقهاء . (٢٩٣/١٦)

(١٢) ما في " الموسوعة الفقهية " : لا حد لأقل مدة الحبس ، أما أكثره فيرجع إلى اجتهاد الحاكم حتى ينكشف حال المتهم ، وقد نسب ابن تيمية هذا القول إلى مالک وأصحابه وأحمد ومحققي أصحابه وأصحاب أبي حنيفة .

(١٣) وقال بعض الفقهاء : إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد ، وحددها قوم بيومين وثلاثة ، وأجاز آخرون بلوغها شهرًا .

(١٤) أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه بحسب ما يقتضيه ظهور حاله والكشف عنه ولو حبس حتى الموت ، وهذا هو الظاهر في مذاهب الفقهاء من الأمصار من الحنفية والمالكية والشافعية والحنابلة . (٢٩٤/١٦ ، ٢٩٥)

(١٥) ما في " القرآن الكريم " : ﴿واعبد ربک حتى يأتيک اليقين﴾ . (سورة الحجر: ٩٩) .
وقوله تعالى : ﴿أوصاني بالصلوة والزكوة ما دمت حيًّا﴾ . (سورة مريم: ٣١)

ما في " التفسير المنير " : المسلم مطالب على سبيل الفريضة بالعبادة التي هي الصلاة على الدوام حتى يأتيه الموت ما لم يغلب الغشيان ، أو فقد الذاكرة على عقله والإسلام سمح سهل فعليه أداء الصلاة بأي كيفية يستطيعها ، ولا تسقط عنه أصلا إلا في حال الغيبوبة ويحاسب على كل فريضة تركها أو أهملها عمدًا . (٣٨٦/٧)=

....

=(۱۶) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يا صاحبي السجن ء أرباب متفرق خير أم اللّٰه الواحد القهار﴾ . ﴿ما تعبدون من دونہٖ إلا أسمآء سمّيتموهآ أنتم واٰبآؤكم مآ أنزل اللّٰه بها من سلطٰن﴾ .

(سورة يوسف : ۳۹،۴۰)

ما في " التفسير المنير " : وبعد أن أبطل يوسف عليه السلام عبادة الشرك والمشركين ، وأثبت النبوة دعا إلى التوحيد الخالص القائم على الاعتراف بإله واحد ورب واحد لا بآلهة متعددة ، وهكذا مبدأ الأنبياء يهدمون عبادة الوثنية أولا ، ثم يقيمون الأدلة العقلية على وجود اللّٰه ووحدانيته فقال : (ء أرباب متفرقون) أي يا صاحبي في السجن هل تعدد الآلهة وتشتت الأرباب المتفرقين في الذوات والصفات التي تدعو إلى النزاع والتصادم وفساد الكون خير لكما ولغيركما في طلب النفع ودفع الضرر والإعانة في عالم الغيب ؟ أو اللّٰه الواحد الأحد الذي لا يحتاج لغيره ولا ينازع في تصرفه وتدبيره القهار بقدرته وإرادته الذي دل على كل شيء لجلاله وعظمته ؟ . (۹/۲۰۰)

(۱۷) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا﴾ .

(سورة الإنسان :۸)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قال قتادة : كان أسيرهم يومئذ المشرك فأخوك المسلم أحق أن تطعمه . (وأسيرًا) قال مجاهد : الأسير المسجون . قال الإمام أبو بكر الجصاص : الأظهر الأسير المشرك ، لأن المسلم المسجون لا يسمى أسيرًا على الإطلاق وهذه الآية تدل على أن في إطعام الأسير قربة . (۳/۶۳۳)

(۱۸) ما في " صحيح مسلم " : عن عائشة قالت : " أمرنا رسول اللّٰه ﷺ أن ننزل الناس منازلهم". (۱/۴)

ما في " الموسوعة الفقهية " : ينبغي تمكين المحبوس من الوضوء والصلاة ، ولا تجوز معاقبته بالمنع منها ، ونصوا على أنه لا يجوز منع المحبوس من قضاء حاجته . (۱۶/۳۲۸)

ما في " المقاصد الشرعية " : " إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما ، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجبا " . (ص/۴۶)

ما في " موسوعة القواعد الفقهية " : " ما أفضى إلى الحرام كان حراما " . (أي كل ما أوصل إلى الحرام كان حراما لأن للوسائل أحكام المقاصد) . (۹/۴۲)

(۱۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا﴾ .

(سورة الإنسان : ۸)=

....

=ما في " التفسير الكبير للرازي " : إطعام الطعام كناية عن الإحسان إلى المحتاجين والمواساة معهم بأي وجه كان ، وإن لم يكن ذلک بالطعام بعينه ، ووجه ذلک أن أشرف أنواع الإحسان هو الإحسان بالطعام ، وذلک لأن قوام الأبدان بالطعام ولا حياة إلا به . (۱۰/ ۷۴۷)

ما في " روح المعاني " : أقول : وهذا يدل على أن المراد من قوله : (إنما نطعمكم) ليس هو الإطعام فقط بل جميع أنواع المواساة من الطعام والكسوة (كبير) فكأنه ينفعونه بوجوه المنافع .

(روح المعاني ، تفسير ماجدي)

ما في " الموسوعة الفقهية " : لا يجوز الحبس في مكان يمنع فيه المحبوس الطعام والشراب ، أو في مكان حار أو تحت الشمس أو في مكان بارد ، أو في بيت تسد نوافذه وفيه دخان أو يمنع من الملابس في البرد ، فإن مات المحبوس فالدية على الحابس .

(۲۰) ما في " الموسوعة الفقهية " : إذا مرض المحبوس في سجنه وأمكن علاجه فيه فلا يخرج لحصول المقصود ولا يمنع الطبيب والخادم من الدخول عليه لمعالجته وخدمته ، لأن منعه مما تدعو الضرورة إليه يفضي إلى هلاكه ، وذلک غير جائز .... القول الثالث : يعالج في الحبس ولا يخرج ، والهلاک في الحبس وغيره سواء ، وهو المروي عن أبي يوسف رحمه الله ، وقد اهتم المسلمون منذ القديم برعاية المرضیٰ وفي السجون فكتب عمر بن عبد العزيز إلى عماله : انظروا من في السجون وتعهدوا المرضیٰ . وفي زمن الخليفة المقتدر خصص بعض الأطباء للدخول على المرضیٰ في السجون كل يوم وحمل الأدوية والأشربة لهم ورعايتهم وإزاحة عللهم .

(۱۶/ ۳۲۰ ، فتح القدير : ۷/ ۲۶۰ ، فصل في الحبس)

(۲۱) ما في " الموسوعة الفقهية " : لا يمنع المحبوس من وطئ زوجته في الحبس إذا كان فيه موضع لا يطلع عليه أحد وإلا منع ، وهذا مذهب الحنابلة ، واستظهره أكثر الحنفية ، وهو قول بعض الشافعية ، واستدلوا لذلک بأنه غير ممنوع من قضاء شهوة البطن ، فكذا شهوة الفرج . (۱۶/ ۳۲۳)

ما في " الفتاوى الهندية " : و لو احتاج إلى الجماع لا بأس بأن تدخل زوجته أو جاريته في السجن فيطؤها حيث لا يطلع عليه أحد . (۳/ ۳۱۸ ، الباب السادس والعشرون في الحبس والملازمة ، فتح القدير :۷/ ۲۶۱، فصل في الحبس)

(۲۲) ما في " السنن الكبرى للبيهقي " : قال رسول الله ﷺ : " وكل شيء يلهو به الرجل باطل إلا رمي الرجل بقوسه ، وتأديبه فرسه ، وملاعبته امرأته ، فإنهن من الحق ، ومن ترک الرمي بعد ما علمه فقد كفر الذي علمه " . =

....

=(۳۶۹/۱۰، رقم :۲۰۹۷۶ ، باب ما لا ینهی عنه من اللعب ، رد المحتار: ۵۰۲/۹)

ما في " صحیح مسلم " : عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : " المؤمن القوي خير وأحب إلى الله من المؤمن الضعيف ، وفي كل خير احرص على ما ينفعک واستعن بالله ، ولا تعجز ، وإن أصابک شيء فلا تقل لو أني فعلت كان كذا وكذا ، ولكن قل : قدر الله ، وما شاء فعل ، فإن لو تفتح عمل الشيطان . (۲۶۰/۸، باب : في الأمر بالقوة وترک العجز والاستعانة بالله وتفويض المقادير لله ، ط : دار احیاء التراث العربي ، السنن الكبرى للبيهقي : ۱۵۲/۱۰ ، باب فضل المؤمن القوي الذي يقوم بأمر الناس ويصبر على أذاهم)

ما في " رد المحتار " : قوله : فيباح في كل الملاعب ، أي التي تعلم الفروسية وتعين على الجهاد قد جاء الأثر في رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهي فإنه مكروه .

(۲۵۸/۵ ، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في البيع ، ط : مكتبه نعمانيه)

(۲۳) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا﴾ .

(سورة الإنسان :۸)

ما في " التفسير الكبير للرازي " : إطعام الطعام كناية عن الإحسان إلى المحتاجين والمواساة معهم بأي وجه كان ، وإن لم يكن ذلک بالطعام بعينه ، ووجه ذلک أن أشرف أنواع الإحسان هو الإحسان بالطعام ، وذلک لأن قوام الأبدان بالطعام ولا حياة إلا به . (۷۴۷/۱۰)

ما في " روح المعاني " : أقول : وهذا يدل على أن المراد من قوله : (إنما نطعمكم) ليس هو الإطعام فقط بل جميع أنواع المواساة من الطعام والكسوة (كبير) فكأنه ينفعونه بوجوه المنافع .

(روح المعاني ، تفسير ماجدي)

ما في " المعجم الكبير للطبراني " : عن أبي عزيز بن عمير أخي مصعب بن عمير قال : كنت في الأسارى يوم بدر ، فقال رسول الله ﷺ : " استوصوا بالأسارى خيرًا " ، وكنت في نفر من الأنصار وكانوا إذا قدموا غدائهم وعشائهم أكلوا التمر وأطعموني الخير بوصية رسول الله ﷺ إياهم .

(۳۹۳/۲۲ ، رقم : ۹۷۷ ، ط : احياء التراث العربي)

ما في " الفتاوى الهندية " : ولا يمنع المسجون من دخول أهله وجيرانه عليه .

(۴۱۸/۳ ، بدائع الصنائع : ۱۸۱/۶)

(۲۴) ما في " المقاصد الشرعية " : " إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجبا " . (ص/۴۶)=

....

=ما في " الموسوعة الفقهية " : " ما أفضى إلى الحرام كان حراما " . (۴۲/۹)

(۲۵) ما في " المحيط البرهاني " : وعن أبي حنيفة رضي الله عنه أن المرأة تحبس في مجلس النساء ، ولكن يحفظها الرجال ، لأن الرجال أقدر على الحفظ من النساء ، ولا تتحقق معنى الفتنة في الحفظ . (۹۴/۱۰، البحر الرائق : ۴۷۶/۶ ، فصل في الحبس)

ما في " الموسوعة الفقهية " : نص الفقهاء على أن يكون للنساء محبس علاحدة إجماعًا ولا يكون معهن رجل لوجوب سترهن وتحرزًا من الفتنة . والقول الآخر للحنفية : أن غير البالغ يحبس بالدين ونحوه تأديباً لا عقوبة ، تدل أكثر النصوص على أن يكون حبس الحدث في بيت أبيه أو وليه على أنه يجوز حبسه في السجن إلا إذا خشي عليه ما يفسده فيتوجب حبسه عند أبيه لا في السجن .

(۳۱۸/۱۶، ۳۱۹)

(۲۶) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إن الله يأمر بالعدل والإحسان وإيتآء ذي القربى وينهى عن الفحشآء والمنكر والبغي يعظكم لعلكم تذكرون﴾ . (سورة النحل : ۹۰)

ما في " التفسير المنير " : (بالعدل) فعل كل مفروض من عقائد وشرائع وسير مع الناس في أداء الأمانات وترک الظلم والإنصاف وإعطاء الحق (والمنكر) ما أنكره الشرع واستقبحه العقل السليم كالكفر والمعاصي من الضرب الشديد والقتل وغمط حقوق الناس ونحو ذلک .

(۵۳۱/۷ ، البحر المحيط : ۶۷۳/۵)

ما في " المعجم الكبير للطبراني " : عن أبي عزيز بن عمير أخي مصعب بن عمير قال : كنت في الأسارى يوم بدر ، فقال رسول الله ﷺ : " استوصوا بالأسارى خيرًا " ، وكنت في نفر من الأنصار وكانوا إذا قدموا غدائهم وعشائهم أكلوا التمر وأطعموني الخير بوصية رسول الله ﷺ إياهم .

(۳۹۳/۲۲ ، رقم : ۹۷۷ ، ط : احياء التراث العربي)

ما في " جامع الترمذي " : قال النبي ﷺ : " الظلم ظلمات يوم القيامة " .

(۲۳/۲ ، باب ما جاء في الظلم)

ما في " الموسوعة الفقهية " : لا تجوز المعاقبة بجذع أنف أو أذن أو اصطلام شفة وقطع أنامل وكسر عظم ولم يعهد شيء من ذلک عن أحد الصحابة ، ولأن الواجب التاديب وهو لا يكون بالإتلاف ..... يحرم التاديب بإحراق الجسم أو بعضه بقصد الإيلام والتوجيع إلا المماثلة في العقوبة .... لا يجوز الحبس في مكان يمنع فيه المحبوس الطعام والشراب أو في مكان حار أو تحت الشمس أو في مكان بارد أو في بيت تسد نوافذه وفيه دخان أو يمنع من الملابس في البرد ، تحرم=

....

=المعاقبة بالتجريد من الثياب لما في ذلك من كشف العورة . (۳۲۷/۱۶)

ما في " رد المحتار " : قوله : (ولا يجرد) أي من ثيابه في الحبس . (۵۴/۸)

ما في " البحر الرائق " : ولا يضرب المديون ولا يغل ولا يجرد ولا يؤاجر ولا يقام بين يدي صاحب الحق إهانة . (۴۷۶/۶ ، فصل في الحبس)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : (ولا يضرب) المحبوس إلا في ثلاث : إذا امتنع عن كفارة ظهار والإنفاق على قريبه والقسم بين نسائه بعد وعظه ، والضابط ما يفوت بالتأخير لا إلى خلف . أشباه . قلت : ويزاد ما في الوهبانية : وإن فر يضرب دون قيد تأدبا ☆ وتطيين باب الحبس في العنت يذكر . (در مختار)

وفي الشامية : قوله : (والضابط) أي لما يضرب فيه المحبوس فإنه بالامتناع عما ذكر يفوت الواجد لا إلى خلف . (رد المحتار :۵۴/۸)

(۲۷) ما في " كتاب الخراج لأبي يوسف " : ومن ظن به أو توهم عليه سرقة أو غير ذلک ، فلا ينبغي أن يعزر بالضرب والتوعد والتخويف ، فإن من أقر بسرقة أو بحد أو بقتل ، وقد فعل ذلک به ، فليس إقراره في ذلک بشيء ، ولا يحل قطعه ولا أخذه بما أقر به . قال : وحدثني محمد بن اسحاق ، عن الزهري قال : أتى طارق الشام برجل قد أخذه في سرقة فضربه فأقر ، فبعث به إلى عبد اللّٰه بن عمر يسأله عن ذلک ، فقال ابن عمر : لا نقطعه فإنه إنما أقر بعد ضربک إياه .

(ص/۳۴۳ ، لا يجوز ضرب المتهم)

ما في " شرح السير الكبير " : إقرار المكره باطل . (۲۳۱/۵ ، حسامي :ص/۱۷۱)

ما في " موسوعة القواعد الفقهية " : " إذا بطل الشيء بطل ما في ضمنه " . " إذا بطل المتضمِّن بطل المتضمَّن " . " المبني على الفاسد فاسد " . معنى هذه القاعدة ومدلولها ... الفاسد وما بني عليه ، ما بني على فاسد أو باطل فهو فاسد وباطل ، وذلک في التصرفات القولية والعقود . وما كان أساسه صحيحا كان صحيحا . لأنه لا يعقل أن ينشأ صحيح عن فاسد أو فاسد عن صحيح غالبا .

(۴۲۷/۱ – ۴۳۹/۹)

(۲۸) ما في " البحر الرائق " : ولا يضرب المديون ولا يقيد ولا يغل ولا يجرد ولا يؤاجر ولا يقام بين يدي صاحب الحق إهانة ، وفي المنتقى : إذا خاف فراره قيده . (۷۶/۶ ، فصل في الحبس)

ما في " المبسوط للسرخسي " : ولا يقيد ولا يقام ولا يؤاجر ، لأن هذه عقوبات زائدة ما ورد الشرع بها . (۹۸/۲۰ ، باب الحبس في الدين ، مجمع الأنهر:۲۲۴/۳ ، فصل في الحبس)=

....

=مـافي " التنوير مع الدر والرد " : (ولا يغل) إلا إذا خاف فراره فيقيد أو يحول لسجن اللصوص.

(در مختار) . (۵۴/۸ ، كتاب القضاء ، فصل في الحبس)

مـا فـي " الفتاوى الهندية " : ولا يقيد ولا يغل ولا يمد ولا يجرد ولا يقيمه في الشمس ، وإذا خاف القاضي على المحبوس في السجن أن يفر من حبسه حوله إلى حبس اللصوص .

(۴۱۴/۳ ، الباب السادس والعشرون في الحبس والملازمة)

(۲۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿فشدوا الوثاق﴾ . (سورة محمد:۴)

ما في " التفسيرات الأحمدية " : أي وثاق الأسارى وهو ما يوثق به حتى لا يتولوا منكم . (ص/۴۴۳)

ما في " المصنف لابن عبد الرزاق " : لـما أسر العباس في الأسارى يوم بدر سمع رسول الله ﷺ أنيـنـه وهـو في الوثاق ، جعل النبي ﷺ لا ينام تلك الليلة ولا يأخذه نوم ففطن له رجل من الأنصار ، فـقـال : يـا رسـول الله ! إنک لتؤرق منذ الليلة ؟ فقال : العباس أوجعه الوثاق ، فذلک أرقني ، قال : أفلا أذهب فأرخى عنه شيئًا ؟ قال : إن شئت فعلت ذلک من قبل نفسک ، فانطلق الأنصاري فأرخى عن وثاقه ، فسكن وهدأ ، فنام رسول الله ﷺ . (۳۵۳/۵ ، رقم : ۹۷۲۹ ، كتاب المغازي)

(۳۰) ما في " القرآن الكريم " : ﴿أو ينفوا من الأرض﴾ . (سورة المائدة :۳۳)

ما في " تفسير القرطبي " : وقال مالک أيضًا والكوفيون : نفيهم سجنهم فينبغي من سعة الدنيا إلى ضيقها فصار كأنه إذا سجن فقد نفى من الأرض إلا موضع استقرار . (۱۵۳/۶)

مـا فـي " الـبـحـر الـرائـق " : و إذا حبـس الـمـحبـوس في السجن متعنتًا لا يوفي المال ، قال الإمام الأرسـانيـدي : يـطيـن البـاب ويتـرک ثـقبة يـلـقـى منها الماء والخبز ، وقال القاضي : الرأي فيه إلى القاضي. (۴۷۶/۶ ، كتاب القضاء ، فصل في الحبس)

ما في " رد المحتار " : (في العنت يذكر) أي إذا كان متعنتًا لا يؤدى المال ، قيل : يطين عليه الباب ويترک له ثقبة يلقى له الخبز والماء ، وقيل : الرأي فيه للقاضي .

(۵۴/۸ ، كتاب القضاء ، فصل في الحبس)

ما في " الموسوعة الفقهية " : يجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردًا في غرفة يقفل عليه بابها إن كان في ذلک مصلحة . (۳۱۹/۱۶)

(۳۱) مـا فـي " الـمبسـوط للسرخسي " : ولا يقيد ولا يقام ولا يؤاجر ، لأن هذه عقوبات زائدة ما ورد الشـرع بهـا ، لا يقام يعني لا يؤمر بالقيام بين يدي صاحب المال إهانة له ، فإن ذلک مع عقوبة ، ولا يؤاجر من غير اختياره ، لأن ذلک نوع حجر عليه ، و لا يجوز ذلک في ماله ، فلأن لا يجوز=

....

=في نفسه بطريق الأولى . (۲۰/۹۸ ، باب الحبس)

ما في " التنوير مع الدر والرد " : (ولا يجرد ولا يؤاجر) وعن الثاني : يؤجره لقضاء دينه . (در مختار) . (۸/۵۴ ، النهر الفائق :۳/۲۱۲ ، كتاب القضاء)

(۳۲) ما في " الموسوعة الفقهية " : ويشترط في العاقدين للصحة أن يقع بينهما عن تراض ، فإذا وقع العقد مشوبًا بإكراه فإنه فاسد .... إذا اختل شرط من شروط الانعقاد بطلت الإجارة وإن وجدت صورتها ، لأن ما لا ينعقد فوجوده في حق الحكم وعدمه بمنزلة واحدة ، ولا يوجب فيه الحنفية الأجر المسمى ، ولا أجر المثل الذي يقضون به إذا ما اختل شرط من شروط الصحة التي لا ترجع إلى أصل العقد . (۱/ ۲۵۸ – ۲۶۴)

(۳۳) ما في " نور الأنوار " : المنافع لا تضمن بالإتلاف . (ص/۴۷ ، مبحث الأمر ، كشف الأسرار شرح المصنف على المنار : ۱/۸۶)

ما في " الموسوعة القواعد الفقهية " : ما ليس بمال لا يضمن بمال أصلاً . (۹/۲۷۱)

(۳۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تحسبنّ اللّٰه غافلاً عما يعمل الظلمون إنما يؤخرهم ليوم تشخص فيه الأبصار o مهطعين مقنعي رؤوسهم لا يرتد إليهم طرفهم وأفئدتهم هوآء﴾ . (سورة إبراهيم : ۴۲ ،۴۳) وقال تعالى : ﴿إعدلوا هو أقرب للتقوى﴾ . (سورة المائدة :۸)

ما في " صحيح البخاري " : عن عبد اللّٰه بن عمر رضي اللّٰه عنهما ، عن النبي ﷺ قال : " الظلم ظلمات يوم القيامة " . (ص/۳۳۰ ، رقم :۲۴۴۷ ، كتاب المظالم ، سنن الترمذي : ۲/۲۳)

ما في " صحيح مسلم " : عن عائشة رضي اللّٰه عنها قالت : " أمرنا رسول اللّٰه ﷺ أن ننزل الناس منازلهم " . (۱/۴)

ما في " كتاب الخراج لأبي يوسف " : ولا يقام عليه حد إلا ببينة عادلة أو بإقرار من غير تهدد من الوالي له أو وعيد . (ص/۳۴۴ ، التحذير من الأخذ بالتهمة)

(۳۵) ما في " الموسوعة الفقهية " : ذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية حبس التهمة واعتبره من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة أو ظهرت امارات الريبة على المتهم أو عرف على اتهامه فلا يجوز حبسه ولا عقوبته اتفاقا . وإن كان المتهم معروفا بالفجور والسرقة القتل ونحو ذالک جاز حبسه بل هو أولى ممن قبله ، وإن كان المتهم مجهول الحال لا يعرف بين ولا فجور ، فهذا يحبس حتى ينكشف حاله عند جمهور الفقهاء .... أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه بحسب ما يقتضيه ظهور حاله والكشف عنه ،=

....

= ولو حبس حتى الموت ، وهذا هو الظاهر في مذاهب فقهاء الأمصار من الحنفية والمالكية والشافعية والحنابلة . (۱٦/۲۹۲، ۲۹۳ – ۲۹۵)

ما في " جامع الترمذي " : " حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه " . (۱/۲٦۱)

(۳٦) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين﴾ . (سورة البقرة:۱۹۰)

ما في " التفسير المنير " : أي المتجاوزين ما حد لهم من الشرائع والأحكام ومحبة الله لعباده إرادة الخير والثواب لهم . (۱/۵۴۲)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية حبس التهمة ، واعتبروه من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة قوية ، أو ظهرت أمارات الريبة على المتهم أو عرف بالفجور ..... فإذا لم يكن من أهل تلك التهمة ولم تقم قرينة صالحة على اتهامه فلا يجوز حبسه ولا عقوبته اتفاقاً . (۱٦/۲۹۲، ۲۹۳)

(۳۷) ما في " التنوير مع الدر والرد " : بخلاف منافع الغصب استوفاها أو أعطاها . (تنوير) . فإنها لا تضمن عندنا . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (منافع الغصب) أي المغصوب . قوله : (استوفاها أو أعطاها) صورة الأول أن يستعمل العبد شهرا مثلا ثم يرده على سيده ، والثاني أن يمسكه ولا يستعمله ثم يرده كما في الدرر . (۹/۲۴۷)

ما في " درر الحكام شرح مجلة الأحكام " : منافع المغصوب ليست مضمونة ، ويثبت عدم لزوم ضمان المنافع بدليلين ، أولا : بما أن الضمان يلزم بسبب الغصب وحيث لا يجتمع الأجرة والضمان بمقتضى المادة (الأجرة والضمان لا يجتمعان) فلا تعطى الأجرة . ثانياً : ليس من مماثلة بين المنافع والمال أي النقود ، لأن المنافع لما كانت أعراضا ليس لها بقاء فليست متقومة لذاتها وإنما بضرورة ورود العقد فيشترط في ضمان العدوان المماثلة وقد وردت بالنص ، قال الله تعالى : ﴿فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم﴾ . [البقرة :۱۹۴] . وكذلك لم يجوز بالإجماع ضمان المنافع بالمنافع . (۱/۲۸٦)

ما في " كشف الأسرار " : المنافع لا تضمن بالإتلاف ...... فالمغصوب بنفسه يضمن بالهلاك والاستهلاك جميعًا ..... والمنافع لا تضمن بالاستهلاك والهلاك . (۱/۸٦ – ۸۸)

(۳۸) ما في " الموسوعة الفقهية " : وذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية حبس التهمة ، واعتبروه من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة قوية ..... فإذا لم يكن من أهل تلك التهمة ولم تقم قرينة صالحة على اتهامه فلا يجوز حبسه ولا عقوبته اتفاقاً . (۱٦/۲۹۲،۲۹۳)=

....

=(۳۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿لا يحب الله الجهر بالسوٓء من القول إلا من ظلم﴾ .

(سورة النساء :۱۴۸)

ما في " التفسير المنير " : ثم استثنى الله تعالى حالة يجوز فيها إعلان السوء من القول ، وهي حالة الشكوى من ظلم الظالم لحاكم أو قاض أو غيره ممن يرجى منه رفع ظلامته وإغاثته ومساعدة في إزالة الظلم ، والشكوى على الظالم أمر مطلوب شرعًا ، إذ لا يحب الله لعباده أن يسكتوا على الظلم، أو أن يخضعوا للضيم أو أن يقبلوا المهانة ويسكتوا على الذل روى الإمام أحمد " إن لصاحب الحق مقالا "، يباح للمظلوم اللجوء إلى القضاء والشكوى لرفع الظلم ووصف فعل الظالم ، كما أنه يجوز الدعاء على الظالم ودعوة المظلوم مستجابة قال عليه الصلوة والسلام : " اتق دعوة المظلوم فإنها ليس بينها وبين الله حجاب " . يقول الله : وعزتي وجلالي لأنصرنک ولو بعد حين .

(۳۵۲/۳، ۳۵۳)

(۴۰) ما في " صحيح البخاري " : التعاون في إزالة الظلم من أصول الإسلام ، قال عليه الصلوة والسلام :" انصر أخاک ظالما أو مظلوما " . فقال رجل : يا رسول الله ! أنصره إذا كان مظلومًا أفرأيت إذا كان ظالمًا كيف أنصره ؟ قال : " تحجزه أو تمنعه من الظلم فإن ذلک نصره " .

(۱۰۲۸/۲ ، كتاب الإكراه ، رقم :۶۹۵۲، صحيح مسلم : رقم :۲۵۸۴ ، سنن الترمذي : رقم : ۲۲۵۵)

ما في " التنوير مع الدر والرد " : ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس إلا أقاربه وجيرانه لاحتياجه للمشاورة . (۵۲/۸)

(۴۱) ما في " موسوعة القواعد الفقهية " : " ما أفضى إلى الحرام كان حرامًا " . (۴۲/۹)

(۴۲) ما في " جامع الترمذي " : قال عليه الصلاة والسلام : " من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيامة " .

(۲۴۱/۱ ، باب ما جاء في كراهية أن يفرق بين الأخوين أو بين الوالدة وولدها في البيع)

ما في " المستدرک للحاكم على الصحيحين " : نهى رسول الله ﷺ أن يفرق بين الأم وولدها فقيل : يا رسول الله ! إلى متى ؟ قال : " حتى يبلغ الغلام وتحيض الجارية " . (۵۵/۲ ، سنن الدار قطني : ۵۷/۳ ، كتاب البيوع ، نصب الراية للزيلعي :۵۴/۴ ، فصل فيما يكره)

(۴۳) ما في " درر الحكام " : التصرف على الرعية منوط بالمصلحة . (۵۷/۱)

ما في " النظريات الفقهية للزحيلي " : هذه القاعدة تحدد الغاية من تصرفات الحكام بأن تكون لمصلحة الرعية وإلا فهي باطلة . (ص/۲۳۸)

آپریشن (OPERATION)، اس کی صورتیں اور احکام

سوال: ۱- ایسا عیب جس سے انسان بدہیئت نظر آتا ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ عیب پیدائشی طور پر اس میں موجود ہو، لیکن یہ عام قانون فطرت کے خلاف ہو، جیسے ہونٹ کا کٹا ہوا ہونا، یا ناک کا ٹیڑھا ہونا، یا ہاتھ یا پاؤں میں پانچ کے بجائے چھ انگلیوں کا ہونا وغیرہ، کیا اس عیب کو دور کرنے کے لیے آپریشن کرانا درست ہوگا؟

جواب: ۱- ایسا عیب جس سے انسان بدہیئت نظر آتا ہے، جیسے پیدائشی طور پر ہونٹ کٹا ہوا ہونا، یا ناک کا ٹیڑھا ہونا، یا ہاتھ پاؤں میں پانچ کے بجائے چھ انگلیوں کا ہونا، اس طرح کے عیب کو دور کرنے کے لیے آپریشن کرانا درست نہیں ہونا چاہیے [۱]، کیوں کہ یہ تغییر فی خلق اللہ میں داخل ہے جو حرام ہے۔[۲]

سوال: ۲- بعض دفعہ پیدائشی طور پر تو کوئی عیب نہیں ہوتا، لیکن اس طرح کا عیب بعد میں کسی حادثہ کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس کے علاج کے لیے آپریشن کرانا درست ہوگا؟

جواب: ۲- بعض دفعہ پیدائشی طور پر کوئی عیب نہیں ہوتا، لیکن اس طرح کا عیب بعد میں کسی حادثہ کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے، اس کے علاج کے لیے آپریشن کرانا درست ہوگا، کیوں کہ یہ تغییر فی خلق اللہ نہیں، بلکہ حفظِ خلق اللہ ہے، جس کا بندہ مکلّف ہے۔[۳]

سوال: ۳- ایسا عیب جو فطری طور پر پیدا ہوتا ہے، جیسے عمر کے زیادہ ہونے کی

وجہ سے چہرہ پر جھریاں پیدا ہوجانا، یا کسی کی ناک کا پیدائشی طور پر زیادہ کھڑی نہ ہونا وغیرہ، اس نوعیت کے عیب کو دور کرنے کے لیے آپریشن کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ۳- ایسا عیب جو فطری طور پر پیدا ہوتا ہے، جیسے عمر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے چہرے پر جھریاں پیدا ہوجانا، یا کسی کی ناک کا پیدائشی طور پر کھڑا نہ ہونا، اس نوعیت کے عیب کو دور کرنے کے لیے آپریشن کرانا جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ اس طرح کا آپریشن دفعِ ضرورت وحاجت کے لیے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا مقصد اہواء وشہواتِ ناس کی تکمیل ہوتی ہے، اور یہ مشروع نہیں۔ (۴)

سوال: ۴- کسی انسان کے جسم میں پائے جانے والے عیب کی وجہ سے اسی کے جسم کے کسی حصہ کا گوشت یا چمڑا یا ہڈی یا کوئی دوسرا جز اسی کے جسم کے دوسرے حصہ میں لگایا جائے، تاکہ وہ عیب دور ہوجائے، یا کسی بیماری کے ازالہ کے لیے ایسا کیا جائے، تو کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب: ۴- کسی انسان کے جسم میں پائے جانے والے عیب کی وجہ سے، اس کے جسم کے کسی حصے کا گوشت، یا چمڑا، یا ہڈی، یا کوئی دوسرا جز، اسی کے جسم کے دوسرے حصے میں لگایا، تاکہ وہ عیب دور ہوجائے، دو حال سے خالی نہیں: یا تو عیب پیدائشی ہوگا، یا کسی حادثہ یا مرض کی وجہ سے پیدا ہوا ہوگا، پہلی صورت میں آپریشن درست نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ تغییر فی خلق اللہ میں داخل ہے، جو شرعاً ممنوع ہے (۵)، اور دوسری صورت میں شرعاً جائز ہوگا، کیوں کہ تغییر فی خلق اللہ نہیں، بلکہ حفظِ خلق اللہ ہے، جس کا بندہ مامور ومکلّف ہے۔ (۶)

سوال: ۵- جسمانی عیوب ونقائص دور کرنے کے لیے کسی طرح کی پلاسٹک

سرجری وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟

سوال:۶-کیا معمولی جسمانی کمی وبیشی کے لیے ایسے اقدامات مستحسن ہوں گے؟

سوال:۷- بعض دفعہ پلاسٹک سرجری اس مقصد سے ہوتی ہے کہ انسان کم عمر اورخوبصورت نظر آئے،تاکہ اچھا رشتہ لگ سکے،کیا اس مقصد کے لیے پلاسٹک سرجری کی شریعت اجازت دیتی ہے؟

سوال:۸- کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مجرم اپنی شناخت نہ ہو پانے، یا بعض مظلوم جنہیں کسی ظالم کی طرف سے شناخت کی صورت میں ظلم کا خطرہ ہوتا ہے اپنے کو چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کراتے ہیں،شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۶/۵/۷/۸- جسمانی عیوب ونقائص کودورکرنے،معمولی جسمانی کمی وبیشی،کم عمروخوبصورت نظر آنے،مظلوم کا شناخت سے بچنے کے لیے پلاسٹک سرجری کروانا،شرعاً ناجائز ہے۔(۷) (پلاسٹک سرجری فقہ اسلامی کی روشنی میں:ص/۴۸۹-۴۹۱،ط:ایفا)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولأمرنهم فليغيرن خلق الله﴾ . (سورة النساء : ۱۱۹)

ما في " تفسير القرطبي " : قال أبو جعفر الطبري : حديث ابن مسعود دليل على أنه لا يجوز تغيير شيء من خلقها الذي خلقها الله عليه بزيادة أو نقصان التماس الحسن لزوج أو غيره سواء فلجت أسنانها أو وشرتها أو كان لها من زائدة فأزالتها أو أسنان طوال فقطعت أطرافها لأن كل ذلك تغيير خلق الله . (۳۹۳/۵ ، فتح الباري : ۴۶۳/۱۰)

(۲) ما في " صحيح البخاري " : عن عبد الله بن مسعود قال : " لعن الله الواشمات والمستوشمات ، والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله ، ما لي لا ألعن من لعنه رسول الله ﷺ وهو ملعون في كتاب الله " .

(۸۷۹/۲ ، رقم : ۵۷۱۰ ، أحكام الجراحة الطبية :ص/۳۰۵، ۳۰۶)

(۳) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة﴾ . (سورة البقرة :۱۹۵)=

....

=ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : إيقاع النفس في الحظر والهلاک . (۱/۲۸۹)

مـا في " السيرة النبوية لابن هشام " : ان رسول اللّٰه ﷺ رمى عن قوسه حتى سيتها فأخذها قتادة بـن الـنـعـمـان فـكـانـت عنده وأصيبت يومئذ عين قتادة بن النعمان حتى وقعت على وجنته ، قال ابن إسـحـاق : فـحـدثـنـي عاصم بن عمرو بن قتادة : أن رسول اللّٰه ﷺ ردّها بيديه فكانت أحسن عينيه وأحدّهما . (۸۷/۳)

مـا فـي " الموافقات للشاطبي " : مجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل ، وقد قالوا : إنها مراعاة في كل ملة . (۳۲۶/۲ ، كتاب المقاصد)

ما في " الأشباه والنظائر لابن نجيم " : " الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة " . (۳۲۶/۱)

وفيه أيضًا : " المشقة تجلب التيسير " . (۲۷۶/۱) . " الضرر يزال " . (۳۰۵/۱)

(۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولأمرنهم فليغيرن خلق اللّٰه﴾ . (سورة النساء : ۱۱۹)

مـا فـي " تـفسيـر الـطبري " : (ولأمرنهم فليغيرن خلق اللّٰه) . وذلک لدلالة الآية الأخرى على أن ذلک مـعناه وهي قوله : (فطرة اللّٰه التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق اللّٰه ذلک الدين القيم) وإذا كـان ذلک مـعـنـاه دخـل في ذلک فعل كل ما نهى اللّٰه عنه من خصاء ما لا يجوز خصاؤه ، ووشم ما نهـى عـن وشـمه ووشره وغير ذلک من المعاصي ، ودخل فيه ترک كل ما أمر اللّٰه به ؛ لأن الشيطان لا شک أنـه يـدعـو إلـى جـمـيـع مـعـاصـي الـلّٰـه ويـنـهـى عن جميع طاعته ، فذلک معنى أمره نصيبه المفروض من عباد اللّٰه بتغيير ما خلق اللّٰه من دينه . (۱۸۳/۵)

مـا فـي " أحـكـام الـجـراحة الطبية " : وهذا النوع من الجراحة لا يشتمل على دوافع ضرورية ولا حـاجية ، بـل غـاية ما فيه تغيير خلقة اللّٰه تعالى ، والعبث بها حسب أهواء الناس ، وشهواتهم فهو غير مشروع ولا يجوز فعله . (ص/۱۹۳)

(۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولأمرنهم فليغيرن خلق اللّٰه﴾ . (سورة النساء : ۱۱۹)

مـا فـي " صحيح البخاري " : عن عبد اللّٰه بن مسعود قال : " لعن اللّٰه الواشمات والمستوشمات ، والـمتـنـمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق اللّٰه ، ما لي لا ألعن من لعنه رسول اللّٰه ﷺ وهو ملعون في كتاب اللّٰه " . (۸۷۹/۲ ، رقم : ۵۷۱۰ ، أحكام الجراحة الطبية :ص/۳۰۵، ۳۰۶)

مـا في " تفسير القرطبي " : قال أبو جعفر الطبري : حديث ابن مسعود دليل على أنه لا يجوز تغيير شيء من خلقها اللّٰه عليه بزيادة أو نقصان التماس الحسن لزوج أو غيره سواء فلجت أسنانها=

= أو وشرتها أو كان لها من زائدة أو أسنان طوال فقطعت أطرافها ، لأن كل ذلك تغيير خلق اللّٰه. (۳۹۳/۵)

(٦) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة﴾ . (سورة البقرة :١٩٥)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : إيقاع النفس في الحظر والهلاك . (١/٢٨٩)

ما في " الموافقات للشاطبي " : مجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل ، وقد قالوا : إنها مراعاة في كل ملة . (٣٢٦/٢ ، كتاب المقاصد)

ما في " السيرة النبوية لابن هشام " : ان رسول اللّٰه ﷺ رمى عن قوسه حتى سيتها فأخذها قتادة بن النعمان فكانت عنده وأصيبت يومئذ عين قتادة بن النعمان حتى وقعت على وجنته ، قال ابن إسحاق : فحدثني عاصم بن عمرو بن قتادة : أن رسول اللّٰه ﷺ ردّها بيديه فكانت أحسن عينيه وأحدّهما . (۸۷/۳)

(۷) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولأمرنهم فليغيرن خلق اللّٰه﴾ . (سورة النساء : ١١٩)

ما في " صحيح البخاري " : عن عبد اللّٰه بن مسعود قال : " لعن اللّٰه الواشمات والمستوشمات ، والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق اللّٰه ، ما لي لا ألعن من لعنه رسول اللّٰه ﷺ وهو ملعون في كتاب اللّٰه " . (٨٧٩/٢ ، رقم : ٥٧١٠ ، أحكام الجراحة الطبية :ص/٣٠٥ ،٣٠٦)

ما في " تفسير القرطبي " : قال أبو جعفر الطبري : حديث ابن مسعود دليل على أنه لا يجوز تغيير شيء من خلقها اللّٰه عليه بزيادة أو نقصان التماس الحسن لزوج أو غيره سواء فلجت أسنانها أو وشرتها أو كان لها من زائدة أو أسنان طوال فقطعت أطرافها ، لأن كل ذلك تغيير خلق اللّٰه . (۳۹۳/۵)

مصادر ومراجع

(التفسير)

(١) **الجامع لأحكام القرآن** : لأبي عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري القرطبي رحمه اللّٰه

(٢) **أحكام القرآن**: للإمام أبي بكر أحمد بن علي الرازي الجصاص رحمه اللّٰه

(٣) **أحكام القرآن**:على ضوء ما أفاده العلامة الشيخ التهانوى للشيخ ظفر أحمد العثماني والعلامة الشيخ المفتي محمد شفيع رحمهم اللّٰه

(۴) **روح المعاني**: للعلامة أبي الفضل شهاب الدين السيد محمود ألآلوسي رحمه اللّٰه

(۵) **البحر المحيط**: للإمام أثير الدين محمد بن يوسف بن علي بن يوسف بن حيان الغرناطي الأندلسي رحمه الله
(۶) **التفسير لابن كثير**: للإمام الجليل الحافظ عماد الدين أبي الفداء اسماعيل بن كثير الدمشقي رحمه الله
(۷) **التفسير المنير**: للدكتور وهبة الزحيلي رحمه الله
(۸) **تفسير المظهري**: للقاضي محمد ثناء الله العثماني الحنفي المظهري رحمه الله
(۹) **التفسير الكبير**: للإمام الفخر الدين الرازي رحمه الله
(۱۰) **جامع البيان في تفسير الطبري** : للإمام أبي جعفر محمد بن جرير الطبري رحمه الله
(۱۱) **التفسير ات الأحمديه**: للعلامة الشيخ الملا أحمد جيون اميتهوي رحمه الله
(۱۲) **تفسير ماجدي**: (اردو) للعلامة الشيخ عبد الماجد دريابادي رحمه الله

(الحديث)

(۱۳) **صحيح البخاري**: للإم محمد بن إسماعيل البخاري رحمه الله
(۱۴) **الصحيح لمسلم**: للإمام أبي الحسين مسلم بن الحجاج القشيري رحمه الله
(۱۵) **سنن أبي داود**: للإمام سليمان بن الأشعث السجستاني رحمه الله
(۱۶) **السنن الترمذي**: للإمام أبي عيسى محمد بن عيسى الترمذي رحمه الله
(۱۷) **سنن الكبرى**: للإمام أبي عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي رحمه الله
(۱۸) **سنن ابن ماجه**: للإمام أبي عبد الله محمد بن يزيد بن ماجه القزويني رحمه الله
(۱۹) **سنن الكبرى**: للإمام أبي بكر أحمد بن حسين بن علي البيهقي رحمه الله
(۲۰) **مشكوة المصابيح**: للشيخ محمد بن عبد الله الخطيب التبريزي البغدادي رحمه الله
(۲۱) **كنز العمال**: للعلامة الشيخ علاء الدين علي المتقي الهندي رحمه الله
(۲۲) **نصب الراية**: للعلامة جمال الدين أبي محمد عبد الله بن يوسف الزيلعي الحنفي رحمه الله
(۲۳) **فتح الباري**: شرح صحيح البخاري للإمام أحمد بن حجر العسقلاني رحمه الله
(۲۴) **مرقاة المفاتيح**: للعلامة الشيخ علي بن سلطان محمد القاري رحمه الله
(۲۵) **المعجم الكبير للطبراني**: للحافظ أبي القاسم سليمان بن احمد الطبراني رحمه الله
(۲۶) **المصنف**: للحافظ أبي بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني رحمه الله
(۲۷) **المستدرک على الصحيحين**: للإمام الحافظ أبي عبد الله الحاكم النيسابوري رحمه الله
(۲۸) **سنن الدارقطني** : للإمام الحافظ علي بن عمر الدار قطني رحمه الله

(الفقه)

(۲۹) **المبسوط**: للشيخ أبي بكر محمد بن أحمد بن أبي سهل السرخسي الحنفي رحمه الله
(۳۰) **رد المحتار**: للعلامة محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي رحمه الله
(۳۱) **الدر المختار**: للعلامة علاء الدين الحصكفي رحمه الله
(۳۲) **تنوير الأبصار**: للعلامة محمد بن عبد الله بن أحمد بن محمد بن ابراهيم رحمه الله

(۳۳) **البحر الرائق:** للشیخ زین الدین بن ابراهیم بن محمد المعروف بابن نجیم المصري الحنفي رحمه اللّٰه

(۳۴) **بدائع الصنائع:** للعلامة علاء الدين أبي بكر بن مسعود الكاساني الحنفي رحمه اللّٰه

(۳۵) **النتف في الفتاوى:** للشيخ أبي الحسن علي بن حسين ين محمد السغدي رحمه اللّٰه

(۳۶) **الاختيار لتعليل المختار:** للشيخ عبد اللّٰه بن محمود بن مودود الموصلي الحنفي رحمه اللّٰه

(۳۷) **الفتاوی الهندية:** للعلامة الهمام مولانا الشيخ نظام وجماعة من علماء الهند الأعلام رحمهم اللّٰه

(۳۸) **كتاب الخراج:** للإمام أبي يوسف صاحب أبي حنيفة رحمه اللّٰه

(۳۹) **شرح السير الكبير:** للإمام محمد بن أحمد السرخسي رحمه اللّٰه

(۴۰) **النظريات الفقهية:** للدكتور محمد الزحيلي

(۴۱) **المحيط البرهاني:** للعلامة الشيخ محمد بن أحمد بن عبد العزيز البخاري رحمه اللّٰه

(۴۲) **فتح القدير:** للإمام كمال الدين محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الهمام الحنفي رحمه اللّٰه

(۴۳) **تبيين الحقائق:** للإمام فخر الدين عثمان بن علي الزيلعي الحنفي رحمه اللّٰه

(۴۴) **أحكام الجراحة الطبية:** للدكتور محمد بن محمد المختار الشنقيطي

(۴۵) **النهر الفائق:** للإمام سراج الدين عمر بن ابراهيم بن نجيم الحنفي رحمه اللّٰه

(۴۶) **مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر:** للمحقق الفقيه عبد الرحمن بن محمد بن سليمان الكيبولي المعروف بشيخي زاده رحمه اللّٰه

(۴۷) **الموسوعة الفقهية:** وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية الكويت

(أصول الفقه)

(۴۸) **الأشباه والنظائر:** لابن نجيم الحنفي رحمه اللّٰه

(۴۹) **درر الحكام شرح مجلة الأحكام:** للعلامة علي الحيدر رحمه اللّٰه

(۵۰) **الموافقات:** للشيخ ابراهيم بن موسى اللخمي الغرناطي المالكي الشاطبي رحمه اللّٰه

(۵۱) **نور الأنوار:** للحافظ شيخ أحمد المعروف بملا جيون بن أبي سعيد بن عبيد اللّٰه رحمه اللّٰه

(۵۲) **كشف الأسرار شرح المصنف على المنار:** لأبي البركات عبد اللّٰه بن أحمد المعروف حافظ الدين النسفي رحمه اللّٰه

(۵۳) **عقود رسم المفتي:** لخاتمة الفقهاء المحققين العلامة السيد محمد أمين بن عمر ابن عابدين المعروف بالشامي رحمه اللّٰه

(۵۴) **الحسامي:** للشيخ الإمام حسام الدين محمد بن محمد بن عمر الأخسيكثي رحمه اللّٰه

(۵۵) **المقاصد الشرعية:** للشيخ نورالدين الخادمي

(قواعد الفقه)

(۵۶) **موسوعة القواعد الفقهية:** للشيخ الدكتور محمد صدقي بن أحمد البورنو أبوالحارث الغزي

(۵۷) **القواعد الكلية والضوابط الفقهية:** للأستاذ الدكتور محمد عثمان شبير

(۵۸) **جمهرة القواعد الفقهية:** للدكتور علي أحمد الندوي

(السيرة)

(۵۹) **السيرة النبوية:** للإمام أبي محمد عبد الملك بن هشام بن أيوب الحميري رحمه اللّٰه

مقالہ

(۱۹؍واں فقہی سمینار [ہانسوٹ، گجرات]، بتاریخ: ۲۷-۳۰؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ/ مطابق: ۱۲-۱۵؍فروری ۲۰۱۰ء)

سونے اور چاندی کا نصاب

سوال:۱- یہ بات ظاہر ہے کہ سونا اور چاندی کا نصاب منصوص ہے، اگر کوئی شخص سونے یا چاندی کی مقررہ مقدار کا مالک ہوجائے، تو اس پر اس مال کی زکوۃ واجب ہوجائے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اگر کسی شخص کے پاس نقد روپئے یا سامانِ تجارت ہو، تو زکوۃ واجب ہونے کے لیے پیمانہ سونے کا نصاب ہوگا، یا چاندی کا نصاب؟ یعنی اگر کسی شخص کے پاس مثلاً اتنی نقد رقم ہو، جس سے نصاب کے بقدر چاندی تو خرید کی جاسکتی ہے، لیکن نصاب کے بقدر سونا خریدا نہیں جاسکتا ہو، تو ایسے شخص پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس نقد رقم مالِ تجارت یا اموالِ زکوۃ کے علاوہ کوئی مال چاندی کے نصاب کی قیمت کا موجود ہو، مگر وہ سونے کے نصاب کی قیمت کو نہیں پہنچتا ہو، تو اس کے لیے زکوۃ لینا جائز ہوگا یا حرام؟

جواب:۱- سونا اور چاندی دونوں کا نصاب منصوص ہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ چاندی کے نصاب سے متعلق نصوص زیادہ ہیں، اور وہ قوت میں بھی فائق ہیں، یہی وجہ ہے کہ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، جب کہ سونے کے نصاب کی بابت کچھ اختلاف رہا ہے، بلکہ مشہور تابعی حضرت عطاء رحمہ اللہ کا بیان تو یہ ہے کہ عہد نبوت میں

چاندی ہی زیادہ رائج تھی، یعنی دراہم نہ کہ دینار۔ (۱)

اس لیے احقر کے نزدیک موجودہ دور میں وجوبِ زکوۃ اور حرمتِ زکوۃ کے لیے چاندی کے نصاب کو پیمانہ بنانا چاہیے، کیوں کہ یہ " أنفع للفقراء وأحوط للأغنياء" ہے۔ نیز اس میں شرعاً کوئی مضائقہ بھی نہیں، کیوں کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی کا پورا نصاب موجود ہو، تو اس کے حق میں یہی نصاب، نصابِ موجبِ زکوۃ ومحرّ مِ زکوۃ ہوگا۔ اور اگر کسی کے پاس سونے کا پورا نصاب موجود ہو، تو اس کے حق میں سونے کا نصاب ہی نصابِ موجبِ زکوۃ ومحرّ مِ زکوۃ ہوگا۔ البتہ کسی کے پاس یہ دونوں نصاب موجود نہ ہوں، بلکہ نقود یا اموالِ تجارت ہوں، تو وجوبِ زکوۃ وحرمتِ زکوۃ کے لیے چاندی کے نصاب کو پیمانہ بنایا جائے، کیوں کہ یہ فقراء کے لیے انفع اور اغنیاء کے لیے احوط ہوگا۔ (۲)

سوال: ۲- حنفیہ کے نزدیک اگر کسی شخص کے پاس کچھ مقدار سونے اور کچھ مقدار چاندی کی ہو، اور دونوں کا مجموعہ نصاب کے بقدر ہوجاتا ہو، تو زکوۃ واجب ہوجاتی ہے، البتہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس میں قیمت کا اعتبار ہے، اگر کسی کے پاس کچھ چاندی اور کچھ سونا ہو، اور دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہوجاتی ہو، تو موجودہ قیمت کے لحاظ سے امام صاحب کے یہاں زکوۃ واجب ہوجائے گی، جب کہ صاحبین ضم الاجزاء کے قائل ہیں، یعنی سونے اور چاندی میں سے ایک کی مقدار اس کے نصاب کے ایک تناسب کو پورا کرتی ہو، اور دوسرے کی مقدار اس کے نصاب کے بقیہ تناسب کو پورا کردیتی ہو، تب زکوۃ واجب ہوتی ہے، مثلاً: سونا اس کے نصاب کا ایک چوتھائی ہے، اور چاندی اس کے نصاب کا تین چوتھائی، تو اب زکوۃ

واجب ہوگی، موجودہ حالات میں امام صاحب رحمہ اللہ کے قول پر ممکن ہے کہ ایک تولہ سونا اور ایک تولہ چاندی میں زکوۃ واجب ہوجائے، اور سات تولہ صرف سونا ہو، تو زکوۃ واجب نہ ہو پائے، ایسی صورت میں کیا ضمِ نصاب گے مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ۲- اگر کسی شخص کے پاس کچھ مقدار سونا اور کچھ مقدار چاندی ہو، اور ان دونوں کا مجموعہ نصاب کے بقدر ہوجاتا ہو، تو زکوۃ واجب ہوجاتی ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں قیمت کا اعتبار ہے، یعنی کسی کے پاس کچھ چاندی اور کچھ سونا ہو، اور ان دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہوجاتی ہے، تو موجودہ قیمت کے لحاظ سے امام صاحب کے یہاں زکوۃ واجب ہوجائے گی، جب کہ صاحبین ضم الاجزاء کے قائل ہیں، یعنی سونے اور چاندی میں سے ایک کی مقدار اس کے نصاب کے ایک تناسب کو پورا کرتی ہو، اور دوسرے کی مقدار اس کے نصاب کے بقیہ تناسب کو پورا کردیتی ہے، مثلاً: سونا اس کے نصاب کا ایک چوتھائی ہے، اور چاندی اس کے نصاب کا تین چوتھائی، تو صاحبین کے نزدیک زکوۃ واجب ہوگی۔ (۳)

اس سلسلے میں امام صاحب کا قول ہی معتبر ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ ''أنفع للفقراء وأحوط للأغنیاء'' ہے، اور افتاء کا ضابطہ بھی یہی ہے کہ: جب کسی مسئلے میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ دونوں کے اقوال موجود ہوں، تو امام صاحب کا قول ہی مختار ہوتا ہے۔ (۴)

نوٹ: سوال ''سونے اور چاندی کا نصاب'' شق نمبر دو کے آخر میں استفسار کیا گیا ہے کہ، اگر کسی کے پاس کچھ چاندی اور کچھ سونا ہو، اور دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہوجاتی ہو، تو موجودہ قیمت کے لحاظ سے امام صاحب کے یہاں

زکوۃ واجب ہوجائے گی ،یعنی امام صاحب ضمِ نصاب قیمۃً کے قائل ہیں،اور صاحبین ضم الاجزاء کے قائل ہیں،یعنی دونوں نصابوں کے اجزاء کسی ایک نصاب کو پورا کرتے ہوں ،تو زکوۃ واجب ہوگی ، بعدہ ثمرۂ اختلاف کے طور پر یہ بات لکھی گئی کہ ''موجودہ حالات میں امام صاحب کے قول پر ممکن ہے کہ ایک تولہ سونا اور ایک تولہ چاندی میں زکوۃ واجب ہوجائے ، اور صرف سات تولہ سونا ہو،تو زکوۃ واجب نہ ہو پائے ، ایسی صورت میں کیا ضم نصاب کے مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے؟''

اس پر اشکال یہ ہے کہ جب صرف سات تولہ سونا ہے،تو اس میں نہ تو امام صاحب کے یہاں زکوۃ واجب ہوگی اور نہ ہی صاحبین کی نزدیک ،تو صاحبین کے قول کو کیسے اختیار کیا جاسکتا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ امام صاحب ضم اجزاء نصاب الی اجزاء نصاب آخر من حیث القیمۃ کے قائل ہیں، اور صاحبین ضم اجزاء نصاب الی اجزاء نصاب آخر،من حیث الاجزاء کے قائل ہیں، اور کسی بھی شیٔ کا ضم،شیٔ آخر کے وجود کا متقاضی ہے، جب کہ صورتِ مفروضہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ کسی کے پاس صرف سات تولہ سونا ہو،تو اس کا ضم نہ تو قیمۃً ممکن ہے اور نہ اجزاءً،تو وجوب زکوۃ میں صاحبین کے قول کو کس طرح سے اختیار کیا جاسکتا ہے؟ **فتأمل !** (موجودہ حالات میں سونا اور چاندی کا نصاب:ص/۶۲۹-۶۳۲،ط:ایفا)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " فقه الزكاة " : وأما النقود الذهبية (الدنانير) فلم يجئ في نصابها أحاديث في قوة أحاديث الفضة وشهرتها، ولذا لم يظفر نصاب الذهب بالإجماع كالفضة ،غير أن الجمهور الأكبر من الفقهاء ذهبوا إلى أن نصابه عشرون ديناراً، وروي عن الحسن البصري : أن نصابه أربعون ديناراً ، وروي عنه مثل قول الأكثرين ، ونصاب الذهب معتبر في نفسه وخالف في ذلک طاوس فاعتبر=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

= في نصابه التقويم بالفضة، فما بلغ منه ما يقوّم بمئتي درهم وجبت فيه الزكاة، وحكى مثله عن عطاء والزهري وسليمان بن حرب و أيوب السختياني . (ص/۱۷۷ ، زكاة الذهب والفضة)

(۲) ما في " الدر المختار مع رد المحتار" : ولوبلغ بأحدهما نصابا وخمسا وبالآخر أقل، قوّمه بالأنفع للفقير.سراج "درمختار". (۳/ ۲۲۹، كتاب الزكاة، باب زكاة المال)

ما في " الفقه الإسلامي وأدلته": ويرى كثير من العلماء العصر أن النقود تقدر بسعر الفضة احتياطا لمصلحة الفقراء ، ولأن ذلك أنفع لهم ، وأرى الأخذ بهذا الرأي ؛لأنه يفتى بما هو أنفع للفقراء.

(۳/ ۱۸۲۱ ، كتاب الزكاة، المبحث الخامس: المطلب الأول:زكاة النقود)

(۳) ما في " المبسوط للسرخسي ": ثم اختلفوا في كيفية الضم ، فقال أبو حنيفة رحمه الله تعالى : يُضم أحدهما إلى الآخر باعتبار القيمة. وقال أبو يوسف ومحمد رحمهما الله تعالى باعتبار الأجزاء. (۲/ ۲۵۹، كتاب الزكاة ، باب زكاة المال ، دار الكتب العلمية بيروت)

(۴) ما في " عقود رسم المفتي": وأما إذا خالفاه واتفقا على جواب واحد ، حتى صار هو في جانب، وهما في جانب، فقيل : يُرجّح قوله أيضاً، وهذا قول الإمام عبد الله بن المبارك، وقيل: يتخيّر المفتي، وقول السراجية : والأول أصح ، إذا لم يكن المفتي مجتهداً.

(ص/۱۲۴ ، الفتوى على قول الإمام ثم فثم ، ط : زكريا ديوبند)

❁......❁......❁

غیر مسلم ممالک میں عدالت کے ذریعہ طلاق

سوال:۱- شوہر غیر مسلم عدالت میں درخواست دیتا ہے کہ میں اپنے رشتۂ ازدواج کو ختم کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا میرے حق میں اس رشتہ کے انقطاع کا فیصلہ کردیا جائے، اوراس کے بعد عدالت ضابطہ کی کارروائی کرنے کے بعد طلاق وفرقت کا فیصلہ کردیتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟ اور کیا اس درخواست کو تفویض وتحکیم مانا جاسکتا ہے؟ اوراسی بنیاد پر غیر مسلم جج کا فیصلہ معتبر ہوگا؟

جواب:۱- اگر شوہر غیر مسلم عدالت میں درخواست دیتا ہے کہ میں اپنے رشتۂ ازدواج کو ختم کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا میرے حق میں اس رشتہ کے انقطاع کا فیصلہ کردیا جائے، اوراس کے بعد عدالت باضابطہ کارروائی کرنے کے بعد طلاق وفرقت کا فیصلہ کردیتی ہے، تو یہ صورت تحکیم کی ہے، جو شرعاً درست نہیں، کیوں کہ شرعاً غیر مسلم جج مسلمانوں کا حکم نہیں بن سکتا، لہٰذا غیر مسلم جج کا فیصلہ بھی غیر معتبر ہوگا۔ (۱)

سوال: ۲- دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ عورت کی طرف سے عدالت میں درخواست آتی ہے کہ میرا رشتۂ نکاح ختم کردیا جائے، عدالت شوہر کو بلاکر اس سے دستخط لیتی ہے کہ جو فیصلہ ہوگا وہ تم کو منظور کرنا ہوگا، اور کارروائی کے بعد علیحدگی کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اس صورتِ حال کا کیا حکم ہوگا؟ اورشوہر کے دستخط کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: ۲- اگر عورت غیر مسلم عدالت میں درخواست دیتی ہے کہ میرا رشتۂ ازدواج ختم کردیا جائے، اور عدالت شوہر کو بلاکر اس سے دستخط لیتی ہے، کہ جو فیصلہ ہوگا وہ تم کو منظور کرنا ہوگا، اور کارروائی کے بعد علاحدگی کا فیصلہ کردیا جاتا ہے، تو یہ

صورت بھی تحکیم کی ہے، جو شرعاً درست نہیں ہے (۲)، کیوں کہ صورتِ اولیٰ میں جب زوجین کی آپسی رضامندی کے باوجود تحکیمِ غیر مسلم جج درست نہیں، تو اس صورت میں جس میں جبراً شوہر سے دستخط لیجاتی ہے (۳)، بدرجۂ اولیٰ تحکیمِ غیر مسلم درست نہیں۔

سوال: ۳- تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کی درخواست کے بعد شوہر عدالت میں نہیں آیا، یا آیا تو مگر دستخط وتفویض پر تیار نہیں ہوا، اور عدالت نے حالات کا جائزہ لے کر تفریق کا فیصلہ کر دیا، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ جب کہ اس صورت میں جو فیصلہ ہوا ہے، اس کی بابت شوہر کی طرف سے کوئی آمادگی نہیں ہے۔

جواب: ۳- عورت نے عدالت میں درخواست دی، مگر شوہر عدالت میں نہیں آیا، یا آیا مگر دستخط وتفویض پر تیار نہیں ہوا، اور عدالت نے حالات کا جائزہ لیکر تفریق کا فیصلہ کر دیا، تو شرعاً فرقت واقع نہیں ہوگی، کیوں کہ شرعاً طلاق کا حق مرد حاصل ہے نہ کہ عورت کو، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''طلاق کا مالک وہ شخص ہے جس نے ساق یعنی پنڈلی کو لازم پکڑا''۔ (۴)

سوال: ۴- کیا مسئلے میں اس سے بھی کچھ فرق پڑسکتا ہے کہ جج اگر چہ غیر مسلم حکومت وغیر مسلم عدالت کا ہے، مگر مسلمان ہے، وہ اپنے عمومی فرائضِ منصبی کے تحت اس قسم کا کام بھی کرتا ہے، تو کیا اس کو ''مسلم حاکم وقاضی'' کی حیثیت دی جاسکتی ہے؟ اور اس حیثیت سے اس کے فیصلۂ فرقت کا اعتبار کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ۴- اگر غیر مسلم حکومت وغیر مسلم عدالت نے کسی مسلمان کو جج بنایا، اور اسے عمومی فرائضِ منصبی کے تحت فسخ وتفریق کا کام بھی سونپا ہو، تو اس کو مسلم حاکم وقاضی

کی حیثیت دی جائے گی[۵]، نیز اس صورت میں اس کا فیصلۂ فرقت بھی معتبر ہوگا، بشرطیکہ وہ شرعی بنیادوں پر مبنی ہو، کیوں کہ ایسا قاضی وحاکم جس کو مسلم حکومت عہدۂ قضاء پر فائز کرے، اور وہ غیر شرعی فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ نافذ ومعتبر نہیں ہوتا، تو جس قاضی وحاکم کو غیر مسلم حکومت وعدالت فسخ وتفریق کا کام سونپے اور وہ غیر شرعی بنیادوں پر فیصلہ کرے، تو اس کا فیصلہ بھی بدرجۂ اولیٰ نافذ ومعتبر نہیں ہوگا، جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جب مخالفِ اجماع کسی شئی کا فیصلہ کیا جائے تو وہ نافذ نہیں ہوتا ہے۔[۶]

اجماع دلائلِ شرعیہ میں سے ایک دلیل ہے، اور اس کے خلاف فیصلہ نافذ ومعتبر نہیں ہوتا، اور اس عدم اعتبار وعدم نفاذ کی علت ''اس فیصلہ کا غیر شرعی اصولوں پر مبنی ہونا ہے''، تو ہر ایسا فیصلہ جو غیر شرعی بنیادوں پر مبنی ہو وہ بھی نافذ ومعتبر نہیں ہوگا، نیز فقہ کا یہ قاعدہ ہے: کہ جو چیز فاسد پر مبنی ہو وہ خود بھی فاسد ہوتی ہے، اور جس چیز کی اساس وبنیاد صحیح ہو وہ خود بھی صحیح ہوتی ہے۔[۷]

والحجة علی ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الکریم ": ﴿ألم تر إلی الذین یزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إلیک وما أنزل من قبلک یریدون أن یتحاکموا إلی الطاغوت وقد أمروا أن یکفروا به ، ویرید الشیطٰن أن یضلّهم ضللاً بعیداً﴾ .... کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں، جو آپ پر نازل کی گئی ہے، اور آپ سے ماقبل نازل ہو چکی ہے، (لیکن) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں (بجائے اس کے کہ اُسے شریعت کی عدالت میں لائیں ''ماجدی'')، حالانکہ انہیں حکم مل چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کفر اختیار کریں، اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے۔ (سورة النساء: ۶۰)

وقوله تعالیٰ أیضاً: ﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکّموک فیما شجر بینهم﴾.... سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو، آپ کو حکم نہ بنالیں۔ (سورة النساء: ۶۵)=

....

=مفسرِ قرآن امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: المـراد بهذه الآية من تقدم ذكره ممن أراد التحاكم إلى الطاغوت ، وفيهم نزلت .(قرطبی:۵/۲٦٦، سورة النساء)

مـا فـي" التـفسيـر الـمنيـر" : كـانـت الآيـات السابقة تنديداً بموقف المنافقين الذين أعرضوا عن التحـاكـم إلـى الرسول وآثروا عليه التحاكم إلى الطاغوت ، وهنا أراد الله تعالىٰ تقرير مبدأ عام وهو فـرضية طاعة الرسول بل وكل رسول مرسل...... شیخ وہبہ زحیلی تفسیر منیر میں فرماتے ہیں کہ آیاتِ سابقہ میں ان منافقین کے موقف کی برائی ظاہر کی گئی ہے جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنانے سے اعراض کیا اور آپ کے مقابلہ طاغوت کو حکم بنانے کا فیصلہ کیا۔ (۱۴۴/۳)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''بعد وفات آپ کی شریعت حَکَم بننے کے لیے کافی ہے،فقہاء نے اس آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو کوئی اللہ یا اس کے رسول کے کسی حکم میں شک وشبہ کرے یا ماننے سے انکار کرے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے''۔ وفـي هذه الآية دلالة علىٰ أن من ردّ شيئاً من أوامر الله تعالىٰ أو أوامـر رسـول الـله صلى الله عليه وسلم فهو خارج من الإسلام ، سواء ردّه من جهة الشكّ فيه أو من جهة ترک القبول والامتناع من التسليم . "جصاص". (تفسير ماجدى مع ترجمه)

مـا فـي " الـمـوسـوعة الـفـقهية الكويتية " : شروط المحكّم : أن يكون أهلاً لولاية القضاء ، وعلى ذلک اتـفـاق الـمذاهب الأربعة .... ومن ذلک : أنه يشترط فى المحكّم الإسلام إن كان حكماً بين مسلمين ، أو كان أحدهما مسلماً. (۲۳۷/۱۰)

ما في " تبيين الحقائق للزيلعي ": فيشترط فيه (أي في الحكم) ما يشترط في القاضى . اهـ. زيلعي . (۱۱۸/۵ ، كتاب القضاء ، باب التحكيم ، دار الكتب العلمية بيروت)

وما في"حاشية الشلبي على التبيين " :(أهله أهل الشهادة) ...... قال الشلبي : وإنما شرط شرائط الشهـادة من الحرية والعقل والبلوغ والعدالة فى القضاء لأن القضاء ولاية كالشهادة بل القضاء ولاية عامة ، فلما اشترط في الشهادة من الصفات كان اشتراطها في القضاء أولى اهـ .

(۸۱/۵ ، كتـاب الـقـضـاء ، الـدر الـمختار مع الشامية :۲۳/۸ ، كتاب القضاء، الفتاوى الهندية: ۳۰۷/۳ ، كتاب أدب القاضي ، الباب الأول ..الخ ، مكتبه زكريا)

مـا فـي " الـحيلة الناجزة ": ولأن الكافر ليس بأهل للقضاء على المسلم كما هو مصرّح في جميع كتب الفقه. یعنی کافر مسلمان کے فیصلے کرنے کا مجاز نہیں ہے،جیسا کہ کتبِ فقہ میں وضاحت ہے۔

(ص/۲۰، مكتبه رضي ديوبند)

ما في " نوادر الفقه " : في الأحكام السلطانية للإمام الماوردي : فلا يجوز تقليد القضاء إلا لمن=

....

=كـمـلـت فيـه سبـع شـرائط : الذكورة والبلوغ والعقل والحرية والإسلام والعدالة والسلامة في السـمـع والبـصـر والـعـلـم ، وأمـا الإسـلام فـلأن الـفـاسـق الـمسـلم لا يجوز أن يلي فأولٰى أن لا يلي الـكـافـر...... وفـي حـاشية الأحـكـام السـلـطـانية : قال الله تعالى : ﴿ولن يجعل الله للكٰفرين على المؤمنين سبيلا﴾ . (۲/۲۹۲ ، ط: كراچی)

(فتاوی محمودیہ:۱۳/۱۷۰، باب الفسخ والتفریق، فتاوی رحیمیہ:۸/۳۷۷، کفایت المفتی:۶/۱۶۶، فتاوی عثمانی:۲/۴۵۹)

(۲) بحوالۂ سابق

(۳) مـا فـي " الـفتـاوى الهـندية ": رجل أكره بالضرب والحبس على أن يكتب طلاق امرأته فلانة فكتب امرأته فلانة بنت فلان طالق لا تطلق ، كذا في فتاوى قاضي خان .

(۱/۳۷۹ ، كتاب الطلاق ، الفصل السادس فی الطلاق بالكتابة)

ما في " رد المحتار " : وفي البحر أن المراد الإكراه على التلفظ بالطلاق ، فلو أكره على أن يكتب طلاق امرأته فكتب لا تطلق ، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا.

(۴/۴۴۰ ، كتاب الطلاق ، مطلب في الإكراه على التوكيل بالطلاق)

(فتاوی رحیمیہ:۸/۳۰۹، فتاوی مفتی محمود:۶/۸۲)

(۴) مـا فـي " الـقرآن الكريم " :﴿لا جناح عليكم إن طلقتم النسآء ما لم تمسوهنّ أو تفرضوا لهنّ فريضة﴾ . تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو جنہیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا طلاق دے دو۔

(سورة البقرة :۲۳۶)

ما في " أصول الشاشي " : قال صاحب أصول الشاشي : وظاهر في استبداد الزوج بالطلاق .

(ص/۲۲، فصل في المتقابلات ، ط: بلال بكڈپو دهلي)

مـا فـي " سـنـن ابن ماجة " : عن عكرمة عن ابن عباس قال : " أتى النبي ﷺ رجل فقال : يا رسول اللّٰـه ! سيدي زوّجني أمته وهو يريد أن يفرق بيني وبينها ، قال : فصعد رسول الله ﷺ المنبر فقال : يـا أيهـا الـنـاس ! مـا بـال أحـدكـم يزوّج عبده من أمته ثم يريد أن يفرق بينهما ، إنما الطلاق لمن أخذ بـالسـاق " . (۱/۱۵۱ ، بـاب طلاق العبد ، ط : بلال ديوبند ، فتح القدير:۳/۴۷۶ ، كتاب الطلاق ، فصل ويقع طلاق كل زوج اهـ . ط : بيروت)

مـا فـي " إنجاح الحاجة على هامش ابن ماجة " : قوله : " إنما الطلاق لمن أخذ بالساق " كناية عن الجماع أي إنما يملك الطلاق من يملك الجماع ، فليس للسيد جبر على عبده إذا أنكح أمته .

(۱/۱۵۱)=

....

....

....

....

....

=ما في " فقه السنة لسيد سابق " : جعل الإسلام الطلاق من حق الرجل وحده .

(۲/۲۸۲، كتاب الطلاق ، الطلاق من حق الرجل وحده ، ط : الفتح للإعلام العربي القاهرة)

ما في " الدر المنثور للسيوطي " : وأخرج عبد بن حميد وابن أبي حاتم عن أبي مالک ﴿وللرجال عليهنّ درجة﴾ . قال : يطلقها وليس لها من الأمر شيء .

(۱/۴۹۴ ، سورة البقرة/ الآية :۲۲۸ ، ط : بيروت)

ما في " التفسير الكبير للرازي " : والسابع : أن الزوج قادر على تطليقها ، وإذا طلقها فهو قادر على مراجعتها ، شاء ت المرأة أم أبت ، أما المرأة فلا تقدر على تطليق الزوج ، وبعد الطلاق لا تقدر على مراجعة الزوج ، ولا تقدر أيضًا على أن تمنع الزوج من المراجعة . (۲/۴۴۱ ، ط : علوم اسلاميه لاهور) (منتخبات نظام الفتاویٰ:۲/۲۴۵،فتاویٰ محمودیہ:۱۳/۱۷۰)

(۵) فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:''جہاں شرعی قاضی نہ ہواور مسلم جج کو گورنمنٹ نے اس جیسے مقدمات کا شرعی فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہو،اوروہ مسلم مجسٹریٹ شریعت کے مطابق فیصلہ کرے،تو اس کا فیصلہ بھی قضائے قاضی کے قائم مقام ہوجاتا ہے''۔

(۸/۳۸۳،کفایت المفتی:۶/۱۳۰،الحیلۃ الناجزۃ:ص۶۰،مکتبہ رضی دیوبند)

ما في " الدر المختار " : ويجوز تقلّد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو كافرًا .

(ص/۴۶۵ ، كتاب القضاء ، ط : دار الكتب العلمية بيروت)

(۶) ما في " قواعد الفقه " : إذا قضى بشيء مخالف للإجماع لا ينفذ . (ص/۵۷، قاعده : ۲۴)

(۷) ما في " موسوعة القواعد الفقهية " : المبني على الفاسد فاسد .... ما بني على فاسد أو باطل فهو فاسد وباطل . وذلک في التصرفات القولية والعقود ، وما كان أساسه صحيحًا كان صحيحًا . (۹/۴۳۹)

بیعِ تورّق کا شرعی حکم

سوال: عام بینک ضرورت مندوں کوسود پر قرض فراہم کرتے ہیں، یہ قرض بعض دفعہ معاشی مقاصد یا ایسی ضروریات کے لیے، لیے جاتے ہیں، جن میں مقروض کا مقصد کسی سامان کا حصول ہوتا ہے، جیسے کارخانہ کے لیے مشینیں، رہائشی ضرورت کے لیے گھر وغیرہ، اور بعض دفعہ قرض طلب کرنے والے کو نقد رقم کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے ملازمین کے لیے تن خواہیں علاج کے لیے ہسپتال کی فیس وغیرہ۔

اسلامی مالیاتی ادارے پہلی قسم کی مطلوبہ رقم کے لیے مضاربت، شرکت اور زیادہ تر مرابحہ یا اجارہ کا طریقہ استعمال کرتے ہیں، یعنی ضرورت مند شخص اگر کاروبار کے لیے رقم لینا چاہتا ہے، تو اسے پارٹنر بنا لیتے ہیں، یا بینک خود مطلوبہ اشیاء خرید کر کے ضرورت مند شخص کو زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتا ہے، اور اگر وہ شئ کرایہ پر لگائی جاسکتی ہو، تو وہ بعض اوقات کرایہ پر لگا دیتا ہے، لیکن دشواری اس وقت پیش آتی ہے، جب ضرورت مند شخص کو نقد روپیوں کی ضرورت ہو، کیوں کہ اگر نقد رقم پر نفع لیا جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ ربا ہو جائے گا۔......اس کے لیے اسلامی بینکوں نے ایک طریقہ ''تورُّق'' کا اختیار کیا ہے، جس میں بینک خریدار سے کوئی ایسی شئ فروخت کرتا ہے، جس کو بیچ کر ضرورت مند مطلوبہ رقم حاصل کر سکتا ہے، عملی طور پر اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً: ''الف'' کو ایک لاکھ روپئے کی ضرورت ہو، تو ضرورت مند بینک سے ایک لاکھ دس ہزار روپئے کا لوہا اُدھار خرید کرتا ہے، اور اسے ''ب'' سے ایک لاکھ روپئے نقد میں فروخت کر دیتا ہے، اس طرح ''الف'' کو ایک لاکھ روپئے کی رقم حاصل ہو جاتی

ہے، اور ’’ب‘‘ کو دس ہزار روپیہ نفع مل جاتا ہے، اور عام طور پر ’’ب‘‘ بھی بینک ہی سے منسلک ادارہ ہوتا ہے، اس طرح بالواسطہ اسے ہی دس ہزار روپئے نفع حاصل ہوتا ہے۔

تورّق کی اس صورت کا ذکر عام طور پر فقہائے حنابلہ کے یہاں ملتا ہے، جو بظاہر ’’بیع عینہ‘‘ سے قریب ہے، فرق یہ ہے کہ ’’بیع عینہ‘‘ میں خریدار جس شخص سے زیادہ قیمت پر اُدھار خریدتا ہے، اسی شخص سے کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے، تورّق میں ایک شخص سے زیادہ قیمت میں اُدھار ایک چیز خرید کرتا ہے، اور اس کے بجائے کسی اور شخص سے کم قیمت پر وہی چیز بیچ دیتا ہے۔......سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کے لیے ضرورت مندوں کو نقد رقم فراہم کرنے کے لیے اس طریقۂ کار کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیوں کہ شکل کے اعتبار سے یہ محض خرید وفروخت ہے، اور مقصد کے اعتبار سے قرض فراہم کی جانے والی رقم پر نفع حاصل کرنا ہے، احکامِ شریعت میں معاملات کی ظاہری شکل کی بھی اہمیت ہے، اور عاقدین کے مقاصد کی بھی۔

جواب: (الف): بیع تورّق کی ایک صورت یہ ہے کہ طالبِ قرض کو، نقد روپیہ قرض میں نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کے ہاتھوں قرض دینے والا شخص کسی چیز کو ادھار یا قسط وار بیچ دیتا ہے، اس شئ کی قیمت نقد قیمت سے زائد ہوتی ہے، جس کو مشتری قسطوں میں ادا کرتا رہتا ہے، اور جو چیز اس نے مقرض سے خریدی، وہ کسی اور شخص کے ہاتھ، قیمتِ خرید سے کم پر نقد بیچ دیتا ہے، اور اس نقد رقم سے اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے، بیع کی یہ صورت بلا کراہت درست وصحیح ہونی چاہیے۔ کیوں کہ اس میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں: (۱) مقرض کا اپنی شئ، مستقرض کے ہاتھوں ادھار یا قسط وار بیچنا، اور یہ قیمت، نقد قیمت سے زیادہ رکھنا شرعاً یہ دونوں امور جائز ہیں، کیوں کہ شارع نے بیعِ

سلم کی اجازت دی ہے، اور فقہاء نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ ادھار اور نقد قیمت میں تفاوت جائز ہے[۱]، یہ الگ بات ہے کہ نقد وادھار کی قیمت میں تفاوت خلافِ مروّت ہے۔[۲]

(۲) مستقرض جس نے مقرض سے ادھار شئی خریدی، اس کا اس شئی کو کسی اور کے ہاتھ قیمتِ خرید سے کم پر نقد قیمت میں بیچنا یہ امر بھی جائز ہے، کیوں کہ جب مشتری کو مبیع پر ملکیت حاصل ہوگئی، تو اسے اختیار ہے کہ وہ اپنی ملک کم قیمت میں فروخت کرے یا زیادہ میں، کیوں کہ یہ اختیار ملک کی مقتضیات میں سے ہے، کہ ہر مالک اپنی ملک میں تصرف کا جس طرح چاہے مختار ومجاز ہے۔[۳]

(ب): دوسری صورت یہ ہے کہ طالبِ قرض جس شخص یا ادارے سے زائد قیمت پر ادھار یا قسط وار چیز خریدتا ہے، اسی شخص یا اسی ادراے کو، یا ان دونوں سے منسلک کسی فرد یا ادارے کو، وہ چیز کم قیمتِ خرید پر نقد بیچ کر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، اس صورت میں ربا یعنی سود کا شبہ ہونے کی وجہ سے بیع میں کراہت پیدا ہوگی، مگر اس صورت کو بھی ضرورتاً بلا کراہت درست قرار دینا چاہیے، کیوں کہ آج کے زمانے میں قرضِ حسنہ ملنا بہت مشکل امر ہے، اور جس کو مال کی ضرورت ہوتی ہے وہ پریشان ہوجاتا ہے، اسے قرضِ حسنہ دینے والا کوئی شخص نہیں ملتا، جس کی وجہ سے وہ سودی قرض لیتا ہے، اور بسا اوقات بیعِ تورّق کی صورت (جو آج کل مروّج ہے) کو اختیار کرتا ہے، اس لیے ضرورتاً اس کی اجازت ہونی چاہیے، کیوں کہ بیعِ وفاء کی صورت بھی اس سے ملتی جلتی ہے، مگر متاخرین نے ضرورتاً اس کی اجازت دی ہے۔[۴]

(تورُّق اور اسلامی بینکوں کا مروجہ طریقۂ کار: ص/۴۰۰-۴۰۲، ط: ایفا)

....

والحجة على ما قلنا :

(ا) مـا فـي " جامع الترمذي " : عن أبي هريرة قال : نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة . قال الترمذي : وقد فسر بعض أهل العلم ، قالوا بيعتين في بيعة أن يقول : أبيعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين ولا يفارقه على أحد البيعتين فإذا فارقه على أحدهما فلا بأس إذا كانت العقد على واحد منهما . (ص۲۳۳، باب ما جاء في النهي بيعتين في بيعة ، ط : مكتبه بلال ديوبند)

مـا فـي " الـمبسـوط للسرخسي " : وإذا عقد العقد على أنه إلى أجل كذا بكذا ، وبالنقد بكذا ، أو قـال إلـى شهـر بـكـذا ، أو إلـى شهرين بكذا ، فهو فاسد ، لأنه لم يعاطه على ثمن معلوم ، ولنهي النبي ﷺ عـن شـرطيـن فـي بيـع .... وإذا افتـرقـا على هذا فإن كان يتراضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وأتما العقد عليه فهو جائز . (۱۳/۹، باب البيوع الفاسد ، ط : بيروت)

(۲) مـا فـي " سـنـن أبـي داود " : عـن علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه قال : " سيأتي على الناس زمان عـضـوض يعض الموسر على ما في يده ولم يؤمر بذلک ، قال الله تعالى : ﴿ولا تنسوا الفضل بينكم﴾ . ويباع المضطرون ، وقد نهى النبي ﷺ عن بيع المضطر . (ص/۴۷۹ ، باب بيع المضطر ، ط : بلال ديوبند)

مـا في " إعلاء السنن " : قال الشامي : وهو أن يضطرّ الرجل إلى طعام وشراب أو غيرها ، ولا يبيعه البـائـع إلا بأكثر من ثمنها بكثير ، وكذلک في الشراء منه .... قال الخطابي : إن عقد البيع مع الـضرورة على هذا الوجه جائز في الحكم ولا يفسخ ، إلا أن سبيله في حق الدِّين والمروءة أن لا يباع على هذا الوجه ، وأن لا يقتات عليه بما له ، ولكن يعاون ويقرض ويستمهل له إلى المسيرة .

(۱۴/۲۴۱، كتاب البيوع ، باب النهي عن بيع المضطر ، ط: بيروت)

(۳) ما في " شرح المجلة " : كل يتصرف في ملكه كيف ما شاء . (ص/۶۵۴، المادة : ۱۱۹۲)

(۴) ما في " رد المحتار " : وفي الخيرية : فيما لو أطلق البيع ولم يذكر الوفاء إلا أنه عهد إلى البائع أنه إن أوفى الثمن مثل الثمن يفسخ البيع معه ، أجاب : هذه المسئلة اختلف فيها مشايخنا على أقوال، ونـص فـي الـحـاوي الـزاهـدي أن الـفتـوى فـي ذلک أن البيـع إذا أطـلق ولم يذكر فيـه الوفاء إلا أن الـمشتـرى عهـد إلـى البائع أنه إن أوفى مثل ثمنه فإنه يفسخ معه البيع يكون باتاً حيث كان الثمن ثمن المثل أو بغبن يسير ، وبه أفتى في الحامدية أيضًا . (۷/۴۲۵ ، باب الصرف ، مطلب في بيع الوفاء)

ما في " فتاوى قاضي خان على هامش الهندية " : وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجـه الـمـواعـدة جاز البيع ولزمه الوفاء بالوعد ؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس . (۲/۱۶۵ ، فصل في شروط المفسدة)

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا:

سوال: ۱- کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اور افراطِ زر کی صورت میں اس کی قوتِ خرید تیزی سے گر جاتی ہے، کیا اس صورتِ حال کی وجہ سے شرعاً یہ صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً: قرض، مہر، پنشن، اُدھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تن خواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے، اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعے ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے، اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لیے ایسے معیار مقرر کرنا، جن کی بنیاد دقیق فنی اُصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز یہ کہ اس طرح سو روپئے کے بدلے پانچ سو روپئے کی ادائیگی بابِ ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی؟

جواب: ۱- دیون یعنی موخر مطالبوں، مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خرید وفروخت کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تن خواہوں کی ادائیگی کو سونے یا چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا، مستقل باہمی تنازعہ کا موجب ہے۔ وہ اس طرح کہ دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا دقیق فنی بنیادوں پر قائم ہے، عامۃ الناس کے لیے اس پر عمل ممکن نہیں، نیز ہوسکتا ہے کہ جس دن مستقرض بشکلِ روپیہ قرض لے، اس روز سونے چاندی کے مارکیٹ بند ہوں، جس کی وجہ سے بوقتِ وصولی قرض ان کی اصل قیمت معلوم نہ ہوسکے، اور بعد میں جب مستقرض ومقرض ان روپیوں کی مالیت کو سونے یا چاندی کی قیمتوں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہے، تو دونوں میں

یہ اختلاف پیدا ہو کہ جس وقت آپ نے یہ روپئے مجھے بطور قرض دیئے، اس وقت سونے یا چاندی کی یہ قیمت تھی، جس کی وجہ سے مجھے اس قدر سونے چاندی کی قیمت کی ادائیگی لازم ہے، اور مستقرض سونے چاندی کی قیمت اس سے کم بتلائے، اور آپس میں تنازعہ کھڑا ہو۔

نیز دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں سے وابستہ کرنا بابِ ربوا کو کھولنے کا ذریعہ ہے۔ وہ اس طرح کہ مثلاً آج بتاریخ ۱/۸/۱۴۳۱ھ۔ کو زید ''۱۷۲۰۰'' روپئے بکر کو ایک سال کی مدتِ ادائیگی پر بطور قرض دیدے، جس کی مالیت ایک تولہ سونے کی بقدر ہے، اب ممکن ہے کہ جب ایک سال پورا ہوجائے، تو سونے کے دام بڑھ کر ''۲۰۰۰۰'' روپئے فی تولہ ہوجائے، اس صورت میں بکر پر ''۱۷۲۰۰'' روپئے کی ادائیگی لازم ہونے کی بجائے ''۲۰۰۰۰'' روپئے کی ادائیگی لازم ہوگی، یعنی قرض پر حاصل کردہ ''۱۷۲۰۰'' روپئے پر ''۲۸۰۰'' زائد دینے ہوں گے، اور یہ سود ہے(۱)، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سال پورا ہونے پر سونے کے دام گھٹ کر ''۱۶۰۰۰'' فی تولہ ہوجائے، اور اس صورت میں بکر پر ''۱۷۲۰۰'' کی ادائیگی لازم ہونے کی بجائے ''۱۶۰۰۰'' کی ادائیگی لازم ہو، یعنی قرض پر حاصل کردہ ''۱۷۲۰۰'' میں ''۱۲۰۰'' کم دینے ہوں گے۔

سونے چاندی کی قیمت میں اس کمی وبیشی کے احتمال کی وجہ سے، قرض کی ادائیگی میں روپیوں کی مقدار موہوم ہے، یعنی ہوسکتا ہے کہ جو مقدار قرض میں لی اس سے زیادہ ادا کرنی پڑے، اور یہ بھی امکان ہے کہ جو مقدار قرض میں لی اس سے کم دینی پڑے، اور یہ قمار ہے۔(۲)

خلاصۂ کلام یہ کہ دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ

الناس کے لیے قابلِ عمل نہیں ہے، اور یہ ربوا وقمار کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ بن سکتا ہے، جب کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ ممنوع کا ذریعہ بھی ممنوع ہوا کرتا ہے۔ (۳)

سوال: ۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت، یا اُدھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں، اور بوقتِ ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

جواب: ۲- اس صورت کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی صورت کا ہے، البتہ اگر مہر وغیرہ کا تقرر عین سونا یا چاندی میں کیا جائے، اور ادائیگی کے وقت وہی مقررہ مقدار یا روپیوں کی شکل میں اس کی جو قیمت بھی بنتی ہو، اس کو ادا کیا جائے، تو یہ بلا تامل جائز ودرست ہوگا۔ (طویل مدتی قرض اور موجودہ کرنسی: ص/ ۳۳۹-۳۴۲، ط: ایفا)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿أحل الله البيع وحرم الربوا﴾ . (سورة البقرة : ۲۵۷)

ما في " صحيح مسلم " : عن جابر قال : لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه ، وقال : هم سواء " . (۲/۲۷ ، ط : بلال ديوبند)

ما في " التنوير مع الدر والرد " : الربا شرعًا : فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة . (تنوير) . (۷/۳۹۸ - ۴۰۱ ، ط: بيروت)

ما في " تبيين الحقائق " : هو فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال . (۴/۴۴۶ ، رمز الحقائق شرح كنز الدقائق : ۲/۳۲ ، البحر الرائق : ۶/۲۰۷ ، النهر الفائق:۳/۴۶۹ ، كتاب البيوع ، باب الربوا)

(۲) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطن فاجتنبوه لعلكم تفلحون﴾ . (سورة المائدة : ۹۰)

ما في " رد المحتار " : لأن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرى ، وسمي القمار قمارًا ؛ لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه،=

کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

سوال:۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریکِ کار ہو گئے، مگر انہوں نے الگ سے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا، تو والد کے متروکہ اس کاروبار میں ایسے لڑکوں کی کیا حیثیت ہے؟ پارٹنر کی، ملازم کی یا معاون کی؟

جواب:۱- اگر والد نے اپنے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا، بعد کو اس کے لڑکوں میں سے بعض والد کی خواہش پر شریک کار ہو گئے، الگ سے اپنا کچھ سرمایہ وغیرہ نہیں لگایا، تو ان کی حیثیت والد کے ساتھ معاون کی ہوگی۔[1]

سوال: ۲-اگر یہی صورت ہو، لیکن بچوں نے کاروبار کے کاموں میں شریک ہوتے ہوئے کچھ اپنا سرمایہ بھی والد کی اجازت سے داخل کیا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۲- اگر والد کے ساتھ لڑکے بھی کاروبار میں شریک ہوئے، اور اپنا سرمایہ بھی کاروبار میں لگایا، تو اس کی چند صورتیں ہوں گی:

ا)......لڑکے والد ہی کے ساتھ اکٹھا رہتے ہوں، اور کاروبار میں والد کو اپنا سرمایہ، تعاون کے طور پر دیا ہو، تو تمام سرمایہ والد کی ملکیت میں شمار ہوگا، اور لڑکے والد صاحب کے معاون سمجھے جائیں گے۔[2]

=وهو حرام بالنص . (۹/۵۷۷، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء، فصل في البيع)

ما في " معجم لغة الفقهاء " : القمار تعليق الملک على الخطر والمال من الجانبين . (ص/۳۶۹)

(۳) ما في " بدائع الصنائع " : الوسيلة إلى الحرام حرام . (۴۸۸/۶)

ما في " رد المحتار " : ما كان سببًا لمحظور فهو محظور . (۲۲۳/۵، ط : مكتبه نعمانيه)

۲)......کاروبار میں سرمایہ لگاتے وقت والد کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کیا ہو، تو یہ کاروبار میں شریک کی حیثیت سے شمار ہوں گے، اوران میں منافع کی تقسیم پہلے سے باہمی رضامندی سے طے شدہ شرح کے مطابق ہوگی۔ (۳)

۳)......اگر والد کے ساتھ لڑکا کاروبار میں معاون کے طور پر تھا، مگر اس نے اپنا کچھ سرمایہ باپ کو بطور قرض دیا تھا، تو وہ لڑکا باپ کا معاون ہی رہے گا، البتہ لڑکے نے جتنی رقم قرض کے طور پر دی تھی، اتنی رقم باپ سے لینے کا حقدار ہوگا۔ (۴)

سوال: ۳- اگر کاروبار کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمائے سے شروع کیا ہو، لیکن دکان پر اپنے والد کو بیٹھایا ہو، یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دکان کا نام رکھا ہو، تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۳-اگر کسی لڑکے نے اپنے ہی سرمایہ سے کاروبار شروع کیا ہو، لیکن دوکان پر اپنے والد کو بٹھایا ہو، یا تبرکاً اپنے والد کے نام پر دوکان کا نام رکھا ہو، تو اس کاروبار پر لڑکے کی ملکیت ہوگی، نہ کہ باپ کی، اس لیے کہ باپ کی ملک کے لیے اسبابِ ملک میں سے کوئی سبب نہیں ہے۔ (۵)

سوال: ۴- اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا، اور دوسرے بھائیوں نے کسبِ معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کیے، جب کہ آپس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کی کمائی سبھوں کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی، یا وہ تنہا ان کی ملکیت ہوگی؟

جواب: ۴-اگر ایک بھائی نے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹایا، اور دوسرے بھائیوں نے کسبِ معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کیے، درآں حالانکہ ان کی آپس میں تقسیم

نہیں ہوئی تھی، سب لوگوں کا کھانا پینا ایک ساتھ تھا، اور سب بھائی اپنی کمائی باپ کو دیدیتے ہوں، تو تمام مال باپ کا شمار ہوگا۔(۶)

سوال: ۵- اگر کسی وجہ سے والد کا کاروبار ختم ہوگیا، لیکن کاروبار کی جگہ، خواہ مملوکہ ہو، یا کرایہ پر حاصل کی گئی ہو، موجود ہو، اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو اب یہ کاروبار اس کی ملکیت میں ہوگا یا والد کی؟

جواب: ۵- اگر کسی شخص کا کاروبار کسی وجہ سے ختم ہوگیا، پھر اولاد میں سے کسی نے اپنا سرمایہ لگا کر اسی نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا، تو یہ کاروبار اسی لڑکے کی ملکیت شمار ہوگی، جس نے سرمایہ لگایا ہے، کیوں کہ نام تو محض ایک حقِ منفعت ہے جس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، البتہ اگر یہ نام رجسٹرڈ ہو تو چوں کہ ٹریڈ مارک (TRADE MARK) آج کل گاہکوں کی زیادہ رغبت یا بے رغبتی کا سبب بن گیا ہے، اس لیے فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق عوض لے کر اپنے اس حق کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے(۷)، لیکن محض ٹریڈ مارک (TRADE MARK) کی وجہ سے باپ کی ملک نہیں ہوگی، کیوں کہ باپ کی ملکیت کے ثبوت کے لیے، اسبابِ ملک میں سے کوئی سببِ شرعی موجود نہیں ہے۔(۸)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " شرح المجلة لسليم رستم باز " : إذا عمل رجل فی صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلک الرجل وولده يعدّ له معيناً له . (ص/ ۷۴۱ ، رقم المادة : ۱۳۹۸)

ما في " رد المحتار " : الأب وابنه يكتسبان فی صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إذا كان الإبن في عيال الأب لكونه معيناً له . (۳۹۲/۶ ، مطلب اجتمعا في دار واحدة الخ)

ما في " الفتاوى الهندية " : أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال =

....

=فالكسب كله للأب إذا كان الإبن في عيال الأب لكونه معيناً له .
(۳۲۹/۲ ، كتاب الشركة ، مطلب أب وابن يكتسبان ..الخ)

(۲) (حوالۂ سابق)

(۳) ما في " الموسوعة الفقهية الكويتية " : فشركة الأموال : عقد بين اثنين فأكثر على أن يتجروا في رأس مال لهم ، ويكون الربح بينهم بنسبة معلومة ، سواء علم مقدار رأس المال عند العقد أم لا ، لأنه يعلم عند الشراء ، وسواء شرطوا أن يشتركوا جميعًا في كل شراء وبيع ، أم شرطوا أن ينفرد كل واحد بصفقاته أم أطلقوا ، وليس حتما أن يقع العقد بلفظ التجارة ، بل يكفي معناها . (۳٦/۲٦ ، شركة)

ما في " المبسوط للسرخسي " : ثم يذكر فيما كان فيه من ربح فهو بينهما على قدر رؤوس أموالهما وما كان من وضيعة أو تبعة فكذلك اشتركا على ذلك في شهر كذا من سنة كذا .... فأما في المال العين إذا تساويا في رأس المال واشترطا أن يكون الربح بينهما أثلاثاً ، أو تفاوتاً في رأس المال فكان لأحدهما ألف وللآخر ألفان ، واشترطا أن يكون الربح بينهما نصفين يجوز عندنا . (۱۱/۱٦۸،۱٦۹ ، كتاب الشركة ، ط : بيروت)

ما في " الفتاوى الهندية " : أما الشركة بالمال فهي أن يشترك اثنان في رأس مال فيقولان اشتركنا فيه على أن نشتري ونبيع معا أو شيء أو طلقا على ما رزق الله عز وجل من ربح فهو بيننا على شرط كذا ، أو يقول أحدهما ذلك ويقول الآخر نعم ، كذا في البدائع .
(۳۰۲/۲ ، كتاب الشركة ، الباب الأول في بيان أنواع الشركة .. الخ)

(۴) ما في "بدائع الصنائع ": وأما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في المقرض للحال ، وثبوت مثله في ذمة المستقرض للمقرض للحال ، وهذا جواب ظاهر الرواية . (۵۱۹/٦ ، كتاب القرض ، ط : دار الكتاب ديوبند)

ما في " رد المحتار " : لا يحبس أصل وإن علا في دين فرعه بل يقضى القاضي دينه من عين ماله أو قيمته . (۱۱۱/۸ ، كتاب القضاء ، مطلب في حبس الصبي ، دار الكتاب ديوبند ، بدائع الصنائع : ۱۷۹/٦ ، دار الكتاب ديوبند)

(۵) ما في " الدر المختار مع الشامية " : اعلم أن أسباب الملك ثلاثة : ناقل كبيع =

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=وهبة ، وخلافة كإرث ، واصالة وهو الاستيلاء حقيقة بوضع اليد، أو حكما بالتهية كنصب شبكة لصيد . (۱۰/ ۴٦ ، كتاب الصيد ، دار الكتاب ديوبند)

(٦) ما في " رد المحتار " : وفي الخانية : زوّج بنية الخمسة في داره وكلهم في عياله ، واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير .

(٦/ ٣٩٢ ، فصل في الشركة الفاسدة ، دار الكتاب ديوبند)

(٧) ما في " الدر المختار مع الشامية " : لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة ، وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة ، المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، لكن أفتى كثير باعتباره ، وعليه فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال .

(٧/ ٢٥، ٢٦ ، كتاب البيوع ، مطلب لا يجوز الاعتياض .. الخ)

(٨) ما في " الدر المختار مع الشامية " : اعلم أن أسباب الملك ثلاثة : ناقل كبيع وهبة ، وخلافة كإرث ، وإصالة وهو الاستيلاء حقيقة بوضع اليد ، أو حكما بالتهية كنصب شبكة لصيد . الخ . (۱۰/ ۴٦ ، كتاب الصيد) (كفایت المفتی :٦/ ٦٧، فقہی مقالات :١/ ٢٢٠)

ایامِ قربانی میں کس مقام کا اعتبار ہوگا؟

سوال:۱- قربانی کے لیے وقت، نفسِ وجوب کا سبب ہے، یا وجوبِ ادا کا؟

جواب:۱- قربانی کے لیے وقت، وجوبِ ادا کا سبب ہے[۱]، اور نفسِ وجوب کا سبب صاحبِ نصاب ہونا ہے۔[۲]

سوال: ۲- ایامِ قربانی میں مقامِ قربانی کا اعتبار ہوگا، یا اس مقام کا جہاں قربانی کرنے والا مقیم ہو؟

جواب: ۲- ایامِ قربانی میں مقامِ قربانی کا اعتبار ہوگا[۳]، مضحّی کے مقام کا اعتبار نہیں ہوگا، البتہ وجوبِ ادا میں مضحی کے مقام کا اعتبار ہوگا، یعنی جب تک اس کے حق میں ۱۰/ویں ذی الحجہ کی صبح صادق نہیں ہوتی، اس پر قربانی کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی، اور نہ ہی اس کی طرف سے کسی اور ملک میں قربانی کرنا صحیح ہوگا، کیوں کہ قبل وجوب الاداء، ادا صحیح نہیں ہوتی، جیسا کہ تمام واجباتِ مؤقتہ کا حال ہے، کہ وہ اپنے اوقات سے پہلے واجب نہیں ہوتیں، اور نہ ہی ان کی ادا درست ہوتی ہے۔

سوال: ۳- کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ قربانی کے آغاز کے لیے تو ضروری ہو کہ قربانی کرنے والے شخص پر ۱۰/ذی الحجہ کی شب طلوع ہوگئی ہو، لیکن قربانی کا وقت ختم ہونے میں مقامِ قربانی کا اعتبار ہو؟ یعنی قربانی کرانے والے شخص کے یہاں ۱۲/ذی الحجہ ہو، اور جہاں قربانی کی جارہی ہو، وہاں ۱۳/ذی الحجہ ہو، تو اس روز قربانی کرنا درست نہ ہو؟

جواب: ۳- قربانی کا وقت ختم ہونے میں مقامِ قربانی ہی کا اعتبار ہوگا، لہٰذا اگر مضحّی کے یہاں ۱۲/ذی الحجہ ہو، اور جہاں قربانی کی جارہی ہو، وہاں ۱۳/ذی الحجہ ہو، تو

۱۳؍ذی الحجہ کو قربانی کرنا درست نہیں ہوگا، اور اس کے برعکس جائز ہوگا۔

والحجة على ما قلنا :

(١) ما في " صحيح مسلم " : عن البراء بن عازب رضي الله عنه قال : خطبنا رسول الله ﷺ في يوم نحر فقال : " لا يُضَحِّيَنَّ أَحَدٌ حَتّٰى يُصَلِّي " . (١٥٤/٢ ، كتاب الأضاحي)

ما في " البحر الرائق " : وأما شرائط أدائها فمنها: الوقت في حق المصرى بعد صلاة الإمام، وسببها طلوع فجر يوم النحر . (٣١٧/٨ ، كتاب الأضحية)

ما في " بدائع الصنائع " : وأما وقت الوجوب فأيام النحر ، فلا تجب قبل دخول الوقت لأن الواجبات الموقتة لاتجب قبل أوقاتها كالصلاة والصوم ..... وأيام النحر ثلاثة : يوم الأضحى ، وهو اليوم العاشر من ذي الحجة ، والحادي عشر والثاني عشر وذلك بعد طلوع الفجر من اليوم الأول إلى غروب الشمس من الثاني عشر . (١٩٨/٤ ، كتاب الأضحية)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : وسببها الوقت وهو أيام النحر . (٤٥٣/٩ ، ط : بيروت)

(٢) ما في " سنن ابن ماجة " : عن أبي هريرة رضي الله عنه ، أن رسول الله ﷺ قال : "من كان له سَعَةً ولم يضح فلا يقربن مصلانا " . (ص/٢٢٦ ، أبواب الأضاحي ، باب الأضاحي واجبة هي أم لا)

ما في " البحر الرائق " : ولها شرائط وجوب وشرائط أداء وصفة ، فالأول كونه مقيمًا موسرًا من أهل الأمصار والقرى والبوادي . (٣١٧/٨ ، كتاب الأضحية)

ما في " بدائع الصنائع " : وأما شرائط الوجوب منها الغنى ، لما روي عن رسول الله ﷺ أنه قال : " من وجد سعة فليضح " ، شرط عليه الصلاة والسلام السعة وهي الغنى . (١٩٦/٤)

ما في " التنوير مع الدر والرد " : فتجب التضحية على حر مسلم مقيم موسر عن نفسه .
(٤٥٤/٩ ، ط : بيروت ، الفتاوى الهندية : ٢٩٢/٥)

(٣) ما في " الدر المختار مع الشامية " : والمعتبر مكان الأضحية لا مكان من عليه ، فحيلة مصري أراد التعجيل – أن يخرجها خارج المصر ، فيضحي بها إذا طلع الفجر .... قوله : (والمعتبر مكان الأضحية) فلو كانت في السواد والمضحي في المصر جازت قبل الصلاة وفي العكس لم تجز .
(٤٦١/٩ ، كتاب الأضحية)

ما في " الهداية " : المعتبر في ذلك مكان الأضحية حتى لو كانت في السواد والمضحي في المصر يجوز كما انشق الفجر ، ولو كان على العكس لا يجوز إلا بعد الصلاة .
(٤٣٠/٤ ، كتاب الأضحية ، البحر الرائق : ٣١٧/٨)

خلاصہ جوابات

سونے اور چاندی کا نصاب

۱/......اگر کسی شخص کے پاس سونا یا چاندی دونوں میں سے کوئی بھی نصاب موجود نہ ہو، بلکہ نقود یا اموالِ تجارت ہوں، تو وجوبِ زکوۃ وحرمتِ زکوۃ کے لیے چاندی کے نصاب کو پیمانہ بنایا جائے گا، یعنی جس کے پاس نقود یا اموالِ تجارت ہوں اور ان کی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کو پہنچ جاتی ہو، تو ایسے شخص پر زکوۃ واجب ہوگی، اور زکوۃ لینا درست نہیں ہوگا، اور جس کے پاس یہ مقدار نہ ہو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی، اور اس کے لیے زکوۃ لینا جائز ہوگا۔

۲/......ضمِ نصاب کے مسئلہ میں امام صاحب کا قول ہی معتبر ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ انفع للفقراء واحوط للاغنیاء ہے۔

غیر مسلم ممالک میں عدالت کے ذریعہ طلاق

۱/......صورتِ اولیٰ تحکیم کی ہے جو شرعاً درست نہیں۔

۲/...... یہ صورت بھی تحکیم ہی ہے جو درست نہیں۔

۳/......فرقت واقع نہیں ہوگی۔

۴/......مسلم حاکم وقاضی کی حیثیت دی جائیگی، اور اس کا فیصلۂ فرقت بھی معتبر ہوگا۔

تورّق کا مسئلہ

ضرورتاً بیع تورّق کی اجازت ہونی چاہیے، کیوں کہ بیعِ وفاء کی صورت بھی اس سے ملتی جلتی ہے، مگر متاخرین نے ضرورتاً اس کی اجازت دی ہے۔

موجودہ دور میں کرنسی کی شرعی حیثیت

۱/...... دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں سے اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ الناس کے لیے قابلِ عمل نہیں ہے، اور ربوا وقمار کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ ہے۔

۲/...... دوسری صورت کا حکم بھی پہلی صورت ہی کی طرح ہے، البتہ اگر مہر وغیرہ کا تقرر عین سونا یا چاندی میں کیا جائے، اور ادائیگی کے وقت مقررہ مقدار یا روپیوں کی شکل میں اس کی جو قیمت بھی بنتی ہو، اس کو ادا کیا جائے، تو یہ عمل بلا تأمّل جائز ودرست ہوگا۔

کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت

۱/......لڑکوں کی حیثیت والد کے ساتھ معاون کی ہوگی۔

۲/...... یہ شق تین صورتوں پر مشتمل ہے، جو بالتفصیل جوابات میں مذکور ہیں، ان میں سے پہلی اور تیسری صورت میں معاون اور دوسری صورت میں شریک ہوں گے۔

۳/......کاروبار پر لڑکے کی ملکیت ہوگی نہ کہ باپ کی۔

۴/......تمام مال باپ کا شمار ہوگا۔

۵/......کاروبار اس لڑکے کی ملکیت شمار ہوگا جس نے سرمایہ لگا کر دوبارہ کاروبار شروع کیا۔

ایام قربانی میں کس مقام کا اعتبار ہوگا؟

۱/......قربانی کے لیے وقت وجوبِ ادا کا سبب ہے اور نفسِ وجوب کا سبب صاحبِ نصاب ہونا ہے۔

۲/......ایام قربانی میں مقامِ قربانی کا اعتبار ہوگا نہ کہ مضحّی کے مقام کا۔

۳/......ختمِ وقتِ قربانی میں مقامِ قربانی ہی کا اعتبار ہوگا، لہٰذا مضحّی کے یہاں ۱۲/ذی الحجہ اور مقامِ اضحیہ میں ۱۳/ذی الحجہ ہو، تو ۱۳/ذی الحجہ کو قربانی کرنا درست نہیں ہوگا۔

مقالہ

(۲۰ رواں فقہی سمینار[رام پور، یوپی]۲۹ ربیع الاول-۱ربیع الثانی/مطابق:۵-۷ مارچ ۲۰۱۱ء)

(۱) تفریح کے ذرائع اور اُن کا استعمال

سوال:۱- تفریح کا ایک طریقہ مزاح اور لطیفہ گوئی ہے، مزاح نثر میں بھی ہوتا ہے، اور نظم میں بھی، آج کل بعض پیشہ ور لطیفہ گو بھی ہوا کرتے ہیں، اور مزاح کے لیے مستقل مجلس یا مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد کیا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

[**الف**]: کیا شریعت میں مزاح جائز ہے، اور جائز ہے تو اس کی حدود کیا ہیں؟

جواب: [**الف**]:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ ہم مسلمانوں کے لیے زندگی کے ہر موڑ پر ایک کامل آئیڈیل ونمونہ ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں راتوں کی تاریکیوں اور خلوتوں میں اپنے رب ذوالجلال کے سامنے اتنا لمبا قیام فرمایا کرتے تھے، کہ قدمہائے مبارک پر ورم آجایا کرتا تھا، وہیں آپ جلوتوں میں طیبات کو پسند بھی فرماتے تھے، بسا اوقات فرحت وبشاشت کا اظہار بھی کر دیا کرتے، اور کبھی کبھی دل لگی ومزاق بھی فرماتے تھے، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''شمائل'' میں اس حدیث کی تخریج فرمائی ہے کہ: ''ایک بوڑھی عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور کہنے لگیں: اے اللہ کے رسول-صلی اللہ علیہ وسلم-! آپ میرے لیے دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت داخل فرمادے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جواب میں فرمایا: ''اے ام فلاں! جنت میں بوڑھی عورت داخل نہیں ہوگی''، جس پر وہ بوڑھی خاتون (اپنے متعلق یہ گمان کرکے کہ وہ ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگی) بے قرار ہوگئی اور رونے لگ گئی۔''...... جب آپ نے اسے بے قرار اور روتے ہوئے دیکھا، تو اس کے سامنے اپنے کلام کی غرض بیان کردی کہ: میرے کلام کی مراد یہ ہے کہ بوڑھی عورت، بوڑھی ہونے کی حالت میں ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اُسے دوبارہ پیدا فرمائیں گے، اور وہ جوان و باکرہ ہوکر جنت میں داخل ہوگی، اور آپ نے اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا: ﴿إنآ أنشأنٰهنّ إنشآءً O فجعلناهنّ أبكارًا O عُربًا أترابًا O﴾ .- ''ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو ایک اچھی اٹھان پر، پھر کیا ان کو کنواریاں، پیار دلانے والیاں ہم عمر۔'' (سورۂ واقعہ: ۳۵-۳۷)(۱)

علامہ ابوالبرکات رحمہ اللہ نے '' كتاب المراح في المزاح'' میں اسی طرح کی ایک حدیث تخریج فرمائی ہے کہ: ''ایک خاتون جسے ''ام ایمن'' کہا جاتا تھا، اپنے شوہر کے لیے کسی چیز کا سوال کرنے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، تو آپ نے اس سے فرمایا: تمہارا شوہر کون ہے؟ اس نے جواب دیا: فلاں، تو آپ نے فرمایا: اچھا وہ جس کی آنکھ میں سفیدی ہے؟ تو وہ کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! ان کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں، ان کی آنکھ میں سفیدی ہے، اب وہ خاتون گھر آکر اپنے شوہر کی آنکھوں پر غور کرنے لگ گئی، تو شوہر نے اس سے کہا: کیا بات ہے؟ تو اس نے عرض کیا: مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ آپ کی آنکھوں میں سفیدی ہے، تو شوہر نے کہا: کیا تو نہیں دیکھتی کہ میری آنکھوں کی سفیدی ان کی سیاہی سے زیادہ ہے۔''(۲)

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں وارد ہے کہ:
''ام سلیم'' کے ایک صاحب زادے جنہیں ''ابوعمیر'' کہا جاتا تھا، بسا اوقات جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو آپ اُن سے مزاح فرماتے تھے، ایک دن کا واقعہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حزین وغمگین حالت میں پایا، تو فرمایا: کیا بات ہے آج میں ابوعمیر کو غمگین دیکھتا ہوں؟ تو لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ان کا وہ چڑیا کا بچہ مرگیا جس سے وہ کھیلا کرتے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یہ کہہ کر آواز دینے لگے: '' **یا أبا عمیر ! ما فعل النغیر ؟** ''[۳]

نافع مولیٰ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: عبداللہ ابن عمر رضی اللہ اللہ تعالیٰ عنہما اپنی ایک آزاد کردہ باندی سے مزاح فرمایا کرتے تھے، اور اس سے کہا کرتے تھے: '' **خلقني خالق الکرام ، وخلقکِ خالق اللئام** ''. ''مجھے شریفوں کے پیدا کرنے والے نے پیدا فرمایا، اور تجھے کمینوں کے پیدا کرنے والے نے۔''، تو وہ آزاد کردہ خاتون غصہ ہوتی، چلاتی، اور رویا کرتی تھی، اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہنسا کرتے تھے۔[۴]

الغرض! ذخیرۂ احادیث پر نظر کرنے، اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب، مزاق ومزاح فرمایا کرتے تھے، جس سے اس کی اباحت واجازت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن مزاح ومزاق کی حدود ہیں:

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ایسی مزاح ومزاق منع ہے جس میں افراط ہو، یا ایسی مزاح منع ہے جس پر مداومت ہو، کیوں کہ اس طرح کی مزاح

انسان کو اللہ کی یاد اور مہماتِ دین میں تفکر سے مشغول کر دیتی ہے، اور ایسے مزاق کا ثمرہ قساوتِ قلبی، ایذا، کینہ اور سقوطِ تعظیم وتوقیر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ (۵)

(۲) اسی طرح ایسی مزاق جس میں کذب بیانی اور دروغ گوئی ہو، شرعاً جائز نہیں ہوگی، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہم سے مزاق فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: میں آپ لوگوں سے مزاق ضرور کرتا ہوں، مگر مزاق میں سچ بات ہی کہتا ہوں۔'' (۶)

سوال: [ب]:- مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہوں، یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا کیا جائز ہوگا؟

جواب: [ب]:- کئی کئی گھنٹوں کے مزاحیہ پروگراموں، یا مشاعرہ کو منعقد کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً مزاح فرمایا، لیکن اس کے لیے مستقلاً اس طرح کی مستقل کئی کئی گھنٹوں پر مشتمل مجلس منعقد نہیں کی، نیز اس طرح کے اتنے لمبے اور طویل مزاحیہ پروگرام منعقد کرنے میں انسان اپنے بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں سے غافل بھی ہو جاتا ہے، جب کہ اسلام نے ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دینے کا نہ صرف حکم دیا، بلکہ حقوق تلفی اور اس میں کوتاہی پر سخت وعید بیان فرمائی، ارشادِ ربانی ہے: ﴿ویلٌ للمطفِّفین ۝ الذین إذا اکتالوا علی الناس یستوفون﴾. (خرابی ہے گھٹانے والوں کی، وہ لوگ کہ جب ماپ کرلیں لوگوں سے، تو پورا بھرلیں)۔ (سورۃ التطفیف: ۱، ۲)

اسی طرح فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: '' فَأعْطِ کُلَّ ذِيْ حقٍّ حقَّهٗ'' کہ ہر

صاحب حق کو اس کا حق دینا واجب ہے۔ (صحيح بخاري: ۱/ ۲۶۴)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص کو، جس نے نماز میں رکوع وسجود کو جلدی جلدی ادا کیا، فرمایا: ”**لقد طفَّفتَ**“ تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کردی، فاروق اعظم کے اس قول کو نقل کر کے حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ”**لكل شيء وفاءٌ وتطفيفٌ**“۔ یعنی پورا حق دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے اس قول کو بنیاد بنا کر، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے، وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے، مزدور، ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے، اس میں سے وقت چرانا، کم کرنا بھی اس میں داخل ہے، وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے، اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے، اس میں عام لوگوں میں یہاں تک کہ اہلِ علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے، اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا، اعاذنا اللہ منہ۔“ (معارف القرآن: ۸/۶۹۴)

سوال: [ج]:- مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مبنی کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید وفروخت کرنا شرعی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟

جواب: [ج]:- مزاحیہ کہانیاں لکھنا، انہیں پڑھنا اور ایسی کہانیوں پر مشتمل کتابوں کو شائع کرنا، نیز ان کی خرید وفروخت شرعی نقطۂ نظر سے جائز عمل ہے، مگر اس کی حد یہ ہے کہ آدمی وقتاً فوقتاً اس طرح کی کہانیاں لکھیں اور پڑھیں، انہیں مستقل اپنا مشغلہ نہ بنائیں، کیوں کہ یہ ہماری زندگی کا مقصد اصلی نہیں ہے، بلکہ تفریحی چیز ہے، اور تفریحی چیزیں بقدر تفریح ہی ہونی چاہیے، نہ یہ کہ وہ مقصد اصلی پر غالب آ جائیں۔

سوال: [د]:- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا، اوراس کی اجرت وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: [د]:- لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی جب فی نفسہٖ جائز ہے، تو اس کو پیشہ یا ذریعۂ آمدنی بنانا جائز ہونا چاہیے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ پیشہ انسان کو یادِ خدا اور فرائضِ منصبی سے غافل نہ کردے، جیسا کہ ہر پیشہ میں شرط اولین ہے: ﴿**رِجَالٌ لا تلهيهم تجارةٌ ولا بيعٌ عن ذكرِ اللّٰه**﴾ .- ''ایسے لوگ جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈال دیتی ہے، نہ خرید (وفروخت) اللہ کی یاد سے، اور نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے۔'' (سورۃ النور:۳۷)......ورنہ جائز پیشہ بھی ناجائز ہوجاتا ہے۔

سوال:[ھ]:- تفریحِ طبع کے لیے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا، جس کا مقصد ہنسنا اور ہنسانا ہوتا ہے، کیا اس طرح کے ڈرامے لکھنا، اس کا پروگرام کرنا اور اسے دیکھنا درست ہے؟

جواب:[ھ]:- تفریحِ طبع کے لیے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا، لکھنا، اوراسے دیکھنا چند شرائط کے ساتھ درست ہے:

۱- اس ڈرامے میں کسی کے ساتھ سخریہ واستہزا نہ کیا گیا ہو۔ (۷)

۲- کسی کی عیب جوئی کرنا، سخت تنقید کا نشانہ بنانا، تہمت لگانا، اور کسی کو برے القاب سے پکارنا اس میں نہ پایا جاتا ہو۔ (۸)

۳- کسی کو دہشت زدہ وخوف زدہ نہ کیا جائے۔ (۹)

۴- لوگوں کو ہنسانے کے لیے دروغ گوئی سے کام نہ لیا گیا ہو۔ (۱۰)

۵- غیر اقوام کی مشابہت اختیار نہ کی گئی ہو۔ (۱۱)

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مزاحِ منہی عنہ وہ ہے، جس میں افراط ومداومت یعنی ہمیشگی ہو، کیوں کہ یہ شغل فی ذکر اللہ سے غفلت اور مہماتِ دین میں تفکر سے اعراض کا ذریعہ ہے، اور عموماً کثرتِ مزاح کی بنا پر قساوتِ قلبی وایذارسانی، حسد اور کینہ کا جنم ہوتا ہے، اور انسان کی ہیبت ووجاہت اور اس کا وقار لوگوں کے دلوں سے ختم ہوجاتا ہے۔''

(فتح الباری: ۱۰/۵۴۳، قضایا: ص/۲۰۰)

اسی طرح قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مزاحِ محمود کے متعلق احادیث پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ ایسا مزاح جس کی وجہ سے دلوں میں کینہ وحسد، نفرت وعداوت پیدا ہو، اور وہ مزاح گالی گلوچ اور فحش باتوں پر مشتمل ہو، یا اس کے ذریعے کسی آدمی کی عزتِ نفس وآبرو اور جان ومال پر حملہ کیا جائے، تو وہ مزاح غیر محمود ومذموم ہے، اور اس مزاح سے ہٹ کر ہے جو مزاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم (بعض مواقع پر) فرمایا کرتے تھے۔'' (قضایا: ص/۲۰۰)

اگر کوئی مزاحیہ ڈرامہ مذکورہ بالا شرائط، اور حافظ ابن حجر وقاضی عیاض رحمہما اللہ کے شرائط پر پوری طرح سے نہ اترتا ہو، تو وہ غیر محمود ومذموم ہوگا، لہٰذا اس کا منعقد کرنا اور اسے لکھنا بھی درست نہ ہوگا، لیکن اگر کوئی مزاحیہ پروگرام ان تمام فواحش وخرافات سے خالی ہے، تو اس کا منعقد کرنا اور اسے لکھنا اور دیکھنا درست ہوگا۔

سوال: [و]:- موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ہنسنا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست ونشیط رکھنے کے لیے بہت معاون فعل ہے، اس لیے خاص طور

پر ہنسنے کے پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں، جس میں بہت سے لوگ بے تکلف قہقہہ لگاتے ہیں، اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں، اس عمل کا شرعی حکم کیا ہے؟ وغیرہ۔

جواب: [و]:- ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ہنسنا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست ونشیط رکھنے کے لیے معاون فعل ضرور ہے، مگر ڈاکٹروں کی آراء نصوصِ شرعیہ سے ثابت، ممانعتِ کثرتِ ضحک کے مقابل دلیل نہیں بن سکتیں، کیوں کہ شریعت نے ہنسنے کی ایک حد مقرر کردی ہے، اور اس کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فليضحكوا قليلاً وليبكوا كثيرًا﴾ ۔''سو تھوڑے دن ہنس لیں اور پھر (آخرت میں) بہت دن روتے رہیں۔'' (سورة التوبة : ۸۲)

علامہ عبدالماجد دریا آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (قليلاً و كثيرًا) قلیل میں اشارہ اس دنیا کی عارضی حیثیت کی جانب ہے، اور کثیر میں آخرت کے دوام کی جانب۔

(تفسیر ماجدی مع ترجمہ قرآن: ص/ ۴۱۷)

حضرت ابن حاتم رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ: "**الدنيا قليل فليضحكوا فيها ما شاء وا ، فإذا انقطعت الدنيا وصاروا إلى الله فليستأنفوا البُكاء بُكاء لا ينقطع أبدًا**" . دنیا چند روزہ ہے، اس میں جتنا چاہو ہنس لو، پھر جب دنیا ختم ہوگی اور اللہ کے پاس حاضر ہوگے، تو رونا شروع ہوگا، جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

(تفسیر مظہری: ۴/ ۲۵۲، معارف القرآن مفتی محمد شفیع: ۴/ ۴۳۳)

نیز بمطابق فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم: ''زیادہ ہنسی دل کو مردہ کردیتی ہے۔''(۱۲)

پتہ چلا کہ اسلامی شریعت نے ہنسنے سے منع تو نہیں کیا، البتہ اس کی حد بندی کی ہے کہ

زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کردیتا ہے۔

نیز کثرتِ ضحک غفلت عن ذکر اللہ کا سبب بنتی ہے، اور بتکلف قہقہے لگانا اور بلا وجہ ہنسنا بھی انسان کی ہیبت ووقار اور وجاہت وعظمت کو گھٹا دیتا ہے، احنف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ''اے احنف! جو (بلا وجہ) زیادہ ہنستا ہے اس کی ہیبت کم ہو جاتی ہے۔''(۱۳)

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کثرتِ کلام بغیر ذکر اللہ کے دل کو سخت کردیتا ہے (۱۴)، اور ایک جگہ فرماتے ہیں: بہت زیادہ ہنسا، اور ہنسنے میں غلو کرنا وقار کو ختم کردیتا ہے (۱۵)، اور ضابطہ ہے کہ ''ذریعۂ محذور بھی محذور ہوتا ہے''(۱۶)، اس لیے ہنسنے ہنسانے کے پروگرام منعقد کرنا، اس میں بتکلف قہقہے لگانا، اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے رہنا، شرعاً جائز اور درست نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) تفریحی کھیل

سوال: ۲- تفریحی مقصد کے لیے مختلف قسم کے کھیل بھی مروج ہیں، جن میں بعض کھیل گھنٹ دو گھنٹہ کے ہوتے ہیں، اور بعض کھیل زیادہ وقت لیتے ہیں، بعض ایسے کھیل بھی ہوتے ہیں، جو انسان کی جان کے لیے خطرناک ہوتے ہیں، جیسے: باکسنگ، بعض کھیلوں میں جانوروں کو سخت تکلیف پہنچتی ہے، جیسے جانوروں کا باہمی مقابلہ موجودہ زمانے میں کھیل نے مستقل فن کی صورت اختیار کرلی ہے، سرکاری سطح پر اس کی مستقل وزارت ہوتی ہے، اور خاصا بجٹ اس مقصد کے لیے منظور کیا جاتا ہے، اس پس منظر میں واضح کیا جائے کہ:

[الف]:- کھیل کے طریقہ کے اعتبار سے کھیل کے جائز اور ناجائز ہونے کے کیا اصول ہیں؟

[ب]:- لباس و پوشاک کے سلسلے میں کھلاڑیوں کے لیے کن باتوں کی رعایت ضروری ہے؟

[ج]:- شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے کن کو جائز، کن کو ناجائز، کن کو مکروہ اور کن کو مستحب قرار دیا جاسکتا ہے؟

[د]:- کھیل کی جیت ہار میں اگر پیسے کی شرط ہو، تو کون سی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہوگی؟

[ھ]:- جو کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، تو ان کا کیا حکم ہوگا؟

[و]:- کھیل دیکھنے، نیز اس کے لیے ٹکٹ خریدنے کا کیا حکم ہوگا، کیا اس سلسلے میں کچھ تفصیلات بھی ہیں؟

جواب: ۲- [الف]: شریعتِ اسلامیہ میں وقت کی حفاظت اور بامقصد زندگی کے قیام کا حکم دیا گیا، لہو ولعب اور لغو کی ممانعت کی گئی، ممانعت کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ تفریح کی بھی ممانعت ہے، بلکہ شرعاً ایک حد تک مستحسن ومطلوب ہے، تاکہ اس تفریح کے ذریعے جسم وروح کی سستی دور ہوکر طبیعت میں نشاط وچستی، حوصلہ وہمت پیدا ہو، اور انسان مکمل طور پر زندگی کے اعلیٰ مقصد؛ عبادت کی طرف متوجہ ہوسکے، لہٰذا تفریحی کھیل کود کے سلسلے میں فقہاء وعلماء نے قرآن وحدیث سے چند ضوابط اخذ کئے ہیں:

۱- ایسا کھیل جس میں کوئی دینی ودنیوی مصلحت ومقصد نہ ہو، نہ اس کی غرض، غرضِ

صحیح ہو، بلکہ محض وقت گذاری ہو،تو ایسا کھیل ناجائز ہے۔

۲- ایسا کھیل جس میں کوئی مصلحتِ دنیوی یا اس کی غرض،غرضِ صحیح تو ہو،مگر اس کی ممانعت کتاب اللہ،سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو،تو وہ بھی ناجائز ہے۔

۳- ایسا کھیل جس میں لوگوں کے لیے مصلحت وفوائد تو ہوں،مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہو، کہ اس کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں، اور ان کا کھیلنا انسان کو اللہ کی یاد، نماز اور فرائضِ شرعیہ سے غافل کر دیتا ہے،تو یہ کھیل بھی ناجائز ہے۔

۴- ایسا کھیل جس کا مقصد دینی یا دنیوی مصلحت وفوائد کو حاصل کرنا ہو،تو مباح ہے، بشرطیکہ یہ کھیل کفار وفساق کا شعار نہ ہو، اور اس میں ہار جیت پر مال کی شرط نہ ہو۔ (۱۷)

[ب]: لباس وپوشاک کے سلسلے میں کھلاڑیوں کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کی رعایت ضروری ہے:

۱- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا جس میں مرد عورتوں، اور عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں،شرعاً جائز نہیں ہے۔ (۱۸)

۲- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا جس سے حلیہ اور وضع قطع اس طرح بدل جائے کہ غیر مسلموں سے بظاہر کوئی امتیاز باقی نہ رہے، یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں (اپنے حق میں) ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ چھو جائے گی۔''

(ولا ترکنوا) یہ رُکون یا جھکنا بہ اعتبار دوستی اور محبت اور شرکتِ احوال واعمال کے ہے۔ (تفسیر ماجدی: ص/۴۸۲)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''مراد ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو، اور ان کا کہا

نہ مانو''، ابنِ جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو''، ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو'' (قرطبی)، سدّی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظالموں سے مداہنت نہ کرو، یعنی ان کے برے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو''، عکرمہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو''، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا، یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔''[۱۹]

(معارف القرآن: ۴/۶۷۳)

۳- نیز کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا بھی شرعاً جائز نہیں ہے، جس میں ستر دکھائی دے[۲۰]، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا ہے (جو) تمہارے پردہ والے بدن کو چھپاتا ہے اور (موجب) زینت بھی ہے، اور تقویٰ کا لباس (اس سے بھی) بڑھ کر ہے۔''

آیت سے یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ لباس وحجاب مقاصدِ شرعی میں سے ہیں، اور برہنگی ونیم برہنگی کا فلسفہ خواہ اس کی تبلیغ یورپ اور امریکہ سے ہو رہی ہو، یا اس کی ترویج وحشی وغیر مہذّب قوموں میں ہو، بہر حال ایک شیطانی فلسفہ ہے۔ (تفسیر ماجدی: ص/ ۳۲۸)

عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری رحمہ اللہ اپنے والد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی مرد کسی مرد کی شرم گاہ کی طرف نہ دیکھے، اور نہ کوئی عورت کسی عورت کی شرم گاہ کی طرف دیکھے۔''[۲۱]

[ج]: شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے وہ کھیل جو آپسی جھگڑوں، تضییعِ اوقات، جوا اور قمار کا ذریعہ ہیں، سختی کے ساتھ منع کیے گئے ہیں، مثلاً:

چوسر، شطرنج، کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، تحریش بین البہائم؛ یعنی جانوروں کو آپس میں لڑانا، ویڈیو گیم، گوٹی، لوڈو اور تاش وغیرہ، ان تمام کھیلوں میں سوائے نقصانات کے دینی یا دنیوی کوئی فائدہ نہیں، اس لیے یہ سب ممنوع ہیں۔ (۲۲)

مروّجہ کھیلوں میں سے وہ کھیل جو جسم وروح کے نشاط کے ساتھ زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں معاون ہو، شریعت نے ایسے کھیل کی اجازت ہی نہیں، بلکہ ترغیب دی ہے، مثلاً: نشانہ بازی، سواری کی مشق، تیراکی کی مشق، پیدل دوڑنا (۲۳)، شریعت کے اصول وقوانین کی پاسداری کرتے ہوئے، ان سب چیزوں میں مسابقت کرنا جہاں اجر وثواب کا باعث ہے، وہیں روحانی وجسمانی ورزش بھی ہے۔

[د]: جس صورت میں شرکائے کھیل، شرکت کے لیے متعینہ رقم جمع کرتے ہیں، اور جو جیت جاتا ہے وہ اس رقم کا حق دار ہوتا ہے، اور ناکام ہونے والے کو اپنی جمع کردہ رقم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، تو پیسوں کی یہ شرط بوجہ قمار وخطر ناجائز اور ممنوع ہے۔ لیکن اگر کھلاڑیوں کو دیا جانے والا انعام وغیرہ تھرڈ پارٹی؛ یعنی کسی شخصِ ثالث کی طرف سے ہو، مثلاً: کوئی ادارہ، یا انجمن، یا تنظیم (Uniuns)، تو یہ شرط درست وجائز ہوگی۔ علامہ حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کھیل میں جانبین سے شرط لگائی جائے تو یہ حرام ہے، کیوں کہ یہ قمار ہے، ہاں! اگر فریقین کسی تیسرے شخص (ادارے، تنظیم یا انجمن) کو اپنا محلل بنالیں (جو جیتنے والے کو انعام دے گا)، تو یہ درست ہے۔'' (۲۴)

اسی طرح علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض نے ہار جیت کی صورت میں شرط کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ وہ کھیل میں

شرکت کرنے والوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص ہو، مثلاً: امام، جب کہ خود اس کا گھڑسوار اس کھیل میں شریک نہ ہو، اور جمہور نے جائز قرار دیا ہے کہ اگر کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کی طرف سے شرط ہو، تو درست وجائز ہے، اسی طرح کسی ثالث یعنی تھرڈ پارٹی کی طرف سے بھی درست ہے، بشرطیکہ اس کا کوئی کھلاڑی اس کھیل میں شریک نہ ہو، ورنہ پھر یہ صورت قمار کی ہوجائے گی۔''(۲۵)

[ھ]: اگر کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو، تو وہ کھیل ناجائز ومکروہِ تحریمی ہے، کیوں کہ شریعتِ اسلامیہ اپنے ماننے والوں کو اس طرح کا کھیل کھیلنے سے منع کرتی ہے، ''احکام القرآن للتھانوی'' میں کھیلوں کے سلسلے میں جو ضابطہ منقول ہے، وہ یوں ہے: ''ہر ایسا کھیل جو انسان کو اس پر واجب حقوق (خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد) سے غافل کردے، یا منکرات ومنہیاتِ شرعیہ پر مشتمل ہو، یا اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہوں، ناجائز ومکروہِ تحریمی ہے، اور شریعتِ اسلامیہ اپنے ماننے والوں کو اس طرح کا کھیل کھیلنے سے منع کرتی ہے۔'' (۲۰۱/۳)

نیز جس طرح مال کے سلسلے میں اِسراف وفضول خرچی حرام ہے، ایسے ہی تضییعِ اوقات بھی شرعاً حرام ہے، بلکہ علامہ یوسف قرضاوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''وقت کو ضائع کرنا مال کے ضائع کرنے کی حماقت وسفاہت سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے، کیوں کہ مال دوبارہ حاصل ہوسکتا ہے، لیکن وقت نکل جانے کے بعد دوبارہ نہیں لوٹتا۔''(۲۶)

[و]: اسٹیڈیم میں مختلف قسم کے کھیل اور ان کے میچ وغیرہ ہوتے ہیں، ان میچوں کو دکھانے کے لیے اسٹیڈیم کی انتظامیہ داخلہ کا ٹکٹ وصول کرتی ہے، ٹکٹ لے کر

اسٹیڈیم میں جانا اور میچ دیکھنا اس وقت جائز ہوگا، جب کہ اس میچ میں کھلاڑیوں کی پوشاک ایسا ہو، جس سے ستر پوشی ہوتی ہو، کھیلنے والے غیر محرم نہ ہوں، اور اسٹیڈیم میں خلافِ شرع اُمور انجام نہ دیئے جاتے ہوں، بے حیائی کے مظاہرے نہ ہوتے ہوں۔

اور اگر اسٹیڈیم میں غیر محرم کھیل رہے ہوں، یا ان کی ستر ڈھکی ہوئی نہ ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور خلافِ شرع اُمور انجام دیئے جا رہے ہوں، یا اسٹیڈیم میں کھیل کے علاوہ کوئی اور خلافِ شرع پروگرام ہو رہا ہو، تو پھر ایسی صورت میں اسٹیڈیم کے ٹکٹ لینا اور دینا دونوں جائز نہیں ہیں۔ لیکن چوں کہ اب یہ سب ممکن نہیں، اس لیے کہ وہاں تالیاں بجائی جاتی ہیں، سیٹیاں کسی جاتی ہیں، مزاق اُڑایا جاتا ہے، ایک دوسرے کی دل آزاری کی جاتی ہے، عورتیں اغل بغل میں نیم برہنہ لباس میں ہوتی ہیں، اور سب سے اہم بات یہ کہ وقت ضائع ہوتا ہے، جب کہ وقت سب سے قیمتی سرمایہ ہے، لایعنی کام میں آدمی مصروف رہتا ہے، نیز وہاں فاسقوں اور فاجروں کا اجتماع ہوتا ہے، اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه". آدمی کے عمدہ اخلاق میں یہ ہے کہ وہ لایعنی (فضول، بے سود، بے کار و غیر مفید) اُمور کو ترک کر دے [۲۷]، لہٰذا اولیٰ و بہتر یہ ہے کہ اسٹیڈیم میں نہ جائے۔[۲۸]

(۳) سیاحت وتفریح

سوال: ۳- موجودہ دور میں سیاحت ایک مستقل صنعت بن چکی ہے، بلکہ بعض ممالک کی آمدنی کے لیے سیاحت بنیادی وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے، اس لیے موجودہ دور میں سیاحت کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، اس تناظر میں حسبِ ذیل اُمور دریافت طلب ہیں:

[**الف**]: تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر، اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ بھی ہوتا ہے۔

[**ب**]: کیا ایسے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا درست ہے، جب کہ بعض علاقوں کا سفر جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے پُر خطر ہوتا ہے؟

[**ج**]: جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں از راہِ تفریح جانا، وہاں جانے والوں کے لیے سواری کرایہ پر لگانا، اور ایسے مقام پر اشیائے خورد ونوش فروخت کرنے کے لیے دکان لگانے کا کیا حکم ہے؟

[**د**]: آج کل ٹور پر لے جانے کے لیے مختلف تجارتی کمپنیاں قائم ہیں، جو آمد ورفت کے لیے ٹکٹ اور قیام کے لیے سہولتوں کا نظم کرتے ہیں، سفر کرنے والے حضرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو سیاحتی مقامات پر دادِ عیش دینے کے لیے جاتے ہیں، نیز شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، بعض کا مقصد مندروں، تیرتھ گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا، اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق

عبادت کرنا ہوتا ہے، کیا اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا جائز ہے؟

جــواب: ۳- تفریحی مقصد کے لیے آدمی جس شہر یا ملک کا سفر اختیار کر رہا ہے، وہ دو حال سے خالی نہیں، وہ شہر یا ملک کافر ہوگا یا اسلامی۔ اگر وہ کافر ملک ہے تو بغرضِ سیاحت وتفریح اس کا سفر اختیار کرنا درست نہیں ہے، اور اگر اسلامی ملک ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں۔ وہ اسلامی ملک یا تو منکرات وفواحشات اور برائیوں کا اڈہ ہوگا یا نہیں۔ اگر وہاں پر منکرات وفواحش اور جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، تو اس کا سفر اختیار کرنا درست نہیں ہے، ورنہ مباح ہے، بشرطیکہ کثیر رقوم کا صرفہ نہ ہوتا ہو، کیوں کہ اضاعتِ مال سے اسلام نے ہمیں منع کیا ہے۔ لیکن ضرورتِ داعیہ اور غرضِ صحیح (مثلاً حصولِ علم وفن، تجارت اور علاج وغیرہ) کی بنا پر بلادِ کفر اور ایسے اسلامی شہر وممالک (جہاں منکرات وفواحش ہوں) کا سفر کرنا، مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ درست ہے:

(۱) شعائرِ اسلام کی حفاظت ہو۔ (۲) اقامتِ دین بلادِ کفر میں ممکن ہو۔ (۳) بقدرِ ضرورت ہی بلادِ کفر میں مقیم رہے، بعد از انقضائے حاجت وضرورت اپنے ملک یا شہر واپس لوٹ جائے۔ (۴) انسان کے پاس اتنا علم ہو جس کے ذریعہ وہ (دین کے متعلق) شکوک وشبہات کو دور کرے۔ (۵) انسان کے پاس اتنا دین ہو جو اس کو شہوات سے روکے۔ (۶) سفر کی سخت ضرورت پیش آئی ہو۔

جن اعذار کی بنا پر سفر کی ضرورت پیش آئے وہ یہ ہیں: مثلاً: علاج، جب کہ وہ اس کے ملک یا شہر میں نہ ہوسکتا ہو۔ تحصیلِ علم وفن جب کہ وہ اس ملک میں مہیا اور دستیاب نہ ہو۔

۷- اگر سیاحت کا مقصد تفکر فی خلق اللہ ہے، تو ان اسلامی ممالک کا سفر اختیار کیا جائے، جہاں پر منکرات وفواحش کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، کیوں کہ بہت سے اسلامی

ممالک میں سیر وتفریح اور سیاحتی مقامات بن چکے ہیں۔

[الف]: تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر، اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا بلاضرورتِ داعیہ وبلاغرضِ صحیح جائز نہیں ہے، جب کہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ ہوتا ہو، کیوں کہ شریعتِ اسلامیہ نے ہمیں اضاعتِ مال سے منع فرمایا ہے، بلکہ قرآن مجید میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے، یعنی ناشکری اور کفرانِ نعمت میں شیطان کے مشابہ وہم سطح ہوتے ہیں۔ اور انسان کی مذمت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسے شیطان سے تشبیہ دے دی جائے، جو ساری برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ (کشاف، بحوالہ تفسیر ماجدی، تحت الآیۃ-۲۷، سورۃ الإسراء)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور مال کو فضولیات میں نہ اڑا، بیشک فضولیات میں اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں۔''(۲۹)

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حرام وناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی ''تبذیر'' ہے۔ اور جائز ومباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج وفقیر ہوجانے کا خطرہ ہوجائے، یہ بھی تبذیر میں داخل ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص اصل پونجی کو محفوظ رکھتے ہوئے، اس کے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے، تو وہ تبذیر میں داخل نہیں۔

(قاموس الفقہ: ۳/۴۱۱، معارف القرآن: ۵/۴۷۰، تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۴۸)

[ب]: شق (الف) میں مذکور تفصیل سے شق (ب) کا جواب بھی معلوم ہوجاتا ہے، کہ جن ملکوں یا شہروں کی طرف سفر کرنا درست ہے، اگر وہ علاقے جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ کے اعتبار سے پُر اعتماد ہیں، تو ان کی طرف خود بھی سفر کرنا اور

اپنے بال بچوں کو لے جانا درست ہے۔ اور اگر وہ علاقے پُرخطر ہیں تو خود سفر کرنا اور بچوں کو لے کر جانا بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرنا مقاصدِ شرعیہ خمسہ میں سے ایک مقصد ہے، جیسا کہ علامہ شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" **ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين ، والنفس ، والنسل ، والمال ، والعقل** ". (الموافقات في أصول الأحكام للإمام الشاطبي : ۴/۲ ، كتاب المقاصد ، المسئلة الأولى)

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة**﴾ ۔کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (سورۃ البقرۃ:۱۹۵)

﴿**ولا تقتلوا أنفسكم**﴾ ۔اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو۔ (سورۃ النساء:۲۹)

(ج): جس مقام پر مختلف علاقوں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں، وہاں عموماً بعض غیر شرعی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں، ایسی جگہوں میں از راہِ تفریح جانا درست نہیں ہے، نیز وہاں جانے والوں کے لیے سواری کرایہ پر لگانا، اور ایسے مقام پر اشیائے خورد ونوش فروخت کرنے کے لیے دوکان لگانا فی نفسہٖ تو جائز ہے (۳۰)، مگر قبیح لغیرہ یعنی تعاون علی الاثم کی بنا پر جائز نہ ہوگا (۳۱)، نیز ذریعۂ معصیت بھی معصیت ہوتا ہے۔ (۳۲)

[د]: تجارتی کمپنیوں کا ٹور اینڈ ٹراویلس قائم کرکے، سیاحین اور مسافرین کو ایک شہر سے دوسرے شہر، یا ایک ملک سے دوسرے ملک لے جانا فی نفسہٖ جائز ہے (۳۳)، لیکن اگر ان کمپنیوں کا مقصد ہی ان سیاحین ومسافرین کو دادِ عیش دلانا، شراب نوشی اور محرمات کا ارتکاب کرنا اور کروانا وغیرہ، اور مندروں او رتیرتھ گاہوں اور چرچوں کی

زیارت کرانا ہو، تو تعاون علی المعصیت [۳۴] اور قاعدہ: ''**الأمور بمقاصدها**''، [۳۵] کے پیشِ نظر اس طرح کی ٹور کمپنیاں قائم کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔

(۴) دستاویزی وتاریخی فلم

سوال: ۴- تفریحی مقاصد کے لیے جن وسائل کا استعمال کیا جاتا ہے، ان میں فلمیں بھی ہیں، فلموں سے فوراً ذہن ان فلموں کی طرف جاتا ہے، جو آج کل سنیما ہالوں میں دکھائی جاتی ہیں، ان کا ناجائز اور حرام ہونا ظاہر ہے، کیوں کہ یہ فحشاء ومنکرات کو پھیلانے کا ذریعہ ہیں، لیکن فلم اصل میں تصویر کشی یا عکس بندی کا نام ہے، اور ان کا استعمال مخربِ اخلاق مقاصد کے علاوہ کے لیے بھی ہوتا، یا ہوسکتا ہے، چنانچہ دستاویزی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں، اسی طرح تاریخی فلمیں بھی ہوتی ہیں، تعلیمی مقاصد کے لیے بھی فلمیں بنائی جاتی ہیں، مثال کے طور پر قرآن میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، اگر متعلقہ آیات کو پڑھتے ہوئے ان مقامات کو طلبہ اسکرین پر دیکھیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے ان کے اندر اس مضمون کا زیادہ اِدراک پیدا ہوسکتا ہے، اس پس منظر میں اس امر کی وضاحت فرمائیں کہ کیا مذکورہ مقاصد کے لیے فلمیں بنائی جاسکتی ہیں؟ نیز تعلیمی مقاصد کے لیے ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے؟ اور اگر کیا جاسکتا ہے، تو اس کے لیے کیا شرائط ہوں گی؟

جواب: ۴- دستاویزی، تاریخی اور تعلیمی مقاصد کے لیے فلم بنانا، تاکہ مشہور وعبقری شخصیات اور تاریخی مقامات کو اسکرین پر دیکھ کر، طلبہ کو اس مضمون میں زیادہ سے زیادہ اِدراک پیدا ہوسکے، اس وقت جائز اور درست ہے جب کہ اس میں ذی

روح اور جان داروں کی تصویر سازی وتصویر کشی نہ کی گئی ہو، کیوں کہ ذی روح کی تصویر کشی اور تصویر سازی بلاضرورتِ شدیدہ حرام ہے۔(۳۶)

(۵) کارٹون

سوال: ۵- موجودہ دور میں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کارٹون بنائے جاتے ہیں، کارٹون کے ذریعے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ کارٹونسٹ کا اشارہ کس کی طرف ہے، لیکن انسانی صورت کے خدوخال اس میں پوری طرح واضح نہیں ہوتے ہیں، کارٹون میں ایک پہلو تفریح اور مزاح کا بھی ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

[**الف**]: کیا کارٹون بنانا جائز ہے؟ یا اس کا بھی تصویر میں شمار ہوگا؟

[**ب**]: کارٹون بنانا اس وقت ایک نفع بخش ذریعہ آمدنی بھی ہے، تو کیا اس کو ذریعہ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لیے ملازمت کرنا درست ہوگا؟

جواب: ۵- اولاً یہ بات واضح ہو کہ تصویر کشی وتصویر سازی بلاضرورتِ شدیدہ حرام ہے۔ رہی بات کارٹونی تصویر کی، تو کارٹون دو طرح کا ہوتا ہے:

۱- وہ کارٹون جس میں ذوی الارواح میں سے کسی کی ہیئت بنائی جائے، مثلاً: انسان یا حیوان، اس کا حکم ذوی الارواح کی تصویر کی طرح ہے، لہٰذا اس طرح کے کارٹونوں کو دعوت وتبلیغ، تعلیم وتادیب اور شخصیات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بنانا اور شائع کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ کسی غایتِ صالحہ ومقصدِ صالح کی خاطر وسیلۂ فاسدہ کا سہارا نہیں لیا جاسکتا، جیسا کہ کسی شخص کا انفاق فی سبیل اللہ کی خاطر سودی کاروبار کرنا، یا چوری اور ڈاکہ زنی کرنا شرعاً وعقلاً جائز نہیں ہے۔

۲- ایسی تصویر بنائی جائے جو مقطوع الرأس ہو، یا موضعِ سر پر دائرہ یا اس کے مشابہ کوئی نشان وغیرہ لگایا جائے، تاکہ چہرے کے نشانات وعلامات مٹ جائیں، یا وہ تصویر انسان وحیوان کی ہیئت پر نہ بنائی گئی ہو، تو اس طرح کے کارٹونس بنانے میں کوئی حرج ومضائقہ نہیں ہے، کیوں کہ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " **إنما الصورة الرأس ، فإذا قطع فلا بأس** " کہ اصل تصویر سر ہے، جب سر کو قطع کردیا جائے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

(المصنف لإبن أبي شيبة: ۱۲/۲۳۷، رقم : ۲۵۸۰۸، ط : المجلس العلمي أفريقية)

[**الف/ب**]: کارٹون کی مذکورہ تقسیم سے سوال نامہ میں مذکور شق (الف وب) کا جواب معلوم ہوجاتا ہے، کہ اگر کارٹون ذوی الارواح کی ہیئت پر ہے، تو اس کا بنانا جائز نہیں ہے، اور اس کا شمار بھی ممنوع تصویر سازی میں ہوگا۔ نیز ذوی الارواح کا کارٹون بنانا اور اس کو ذریعۂ آمدنی بنانا، اور اس مقصد کے لیے ملازمت کرنا بھی شرعاً جائز اور درست نہیں ہوگا۔

(٦) ڈرامہ

سوال: ٦- جیسے کہانیاں لکھی جاتی ہیں، اور فرضی حکایتیں مرتب کی جاتی ہیں، اسی طرح ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ ڈراما بھی ہے، جس میں مختلف افراد بطورِ کردار کے شامل ہوتے ہیں، اور وہ متعین جملوں کو ادا کرتے ہیں، آج کل دینی مدارس کے پروگراموں میں بھی مکالمات کی صورت مروج ہوگئی ہے، یہ بھی اس میں شامل ہے، ڈرامہ غیر اخلاقی مقاصد کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے، اور بہتر مقاصد کے لیے بھی، لیکن اس میں جو کچھ کہا جاتا ہے، یا ڈرامہ میں شامل مختلف لوگوں کے درمیان جو رشتے ظاہر کیے

جاتے ہیں، وہ عام طور پر فرضی ہوتے ہیں، البتہ سامعین کو اس سے دھوکہ نہیں ہوتا، اور وہ بھی اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرے کے مفاسد پر تنقید کے لیے ڈرامے اسٹیج کیے جاسکتے ہیں؟

جواب: ۶- آج کل دینی مدارس اور اصلاحی پروگراموں میں جو مکالمات اور ڈرامے منعقد کیے جاتے ہیں، ان میں معاشرے کے مفاسد پر تنقید اور خرابیوں پر مطلع کرکے، ان کے اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے، شرعاً اس طرح کے مکالمات اور ڈرامے جائز اور درست ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس میں ضروریاتِ دین وعقائد پر زد نہ پڑتی ہو، اور محرماتِ شرعیہ میں سے کسی محرم کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، مثلاً: تالیاں پیٹنا، سیٹیاں بجانا[۳۷]، اور کسی کی تحقیر وتذلیل کرنا وغیرہ۔[۳۸]

(تفریح وسیاحت؛ اس کے جائز وسائل وشرعی ضوابط: ص/۳۰۶-۳۲۳، ط: ایفا)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " شمائل الترمذي " : عن الحسن قال : أتت عجوز النبي ﷺ فقالت : يا رسول الله ! أدع الله أن يدخلني الجنة ، فقال : يا أم فلان ! " إن الجنة لا تدخلها وهي عجوز، إن الله تعالى يقول : ﴿إنا أنشأنهن إنشآء ، فجعلنهن أبكارًا﴾ " . (ص/۱۶ ، باب ما جاء في صفة مزاح رسول الله ﷺ ، قضايا اللهو والترفية لمادون رشيد: ص/۱۹۴ ، ۱۹۵ ، فصل في الملاهي النفسية)

(۲) (كتاب المراح في المزاح :ص/۱۳، قضايا اللهو والترفية :ص/۱۹۵ ، فصل في الملاهي النفسية)

(۳) ما في " صحيح البخاري " : عن أنس قال : ..... وكان لي أخ يقال له أبو عمير ...... وكان إذا جاء قال : " يا أبا عمير ! ما فعل النغير ؟ " الخ . (ص/۱۰۹۱ ، رقم :۶۲۰۳، كتاب الأدب ، باب الكنية للصبي قبل أن يولد للرجل ، ط : دار احياء التراث العربي بيروت ، سنن الترمذي :۱۹/۲ ، أبواب البر والصلة ، باب ما جاء في المزاح ، ط : مكتبه بلال ديوبند ، قضايا اللهو والترفية : ص/۱۹۷)

(۴) (ذكره أبو البركات في " المراح في المزاح " :ص/۳۱ ، قضايا اللهو والترفية : ص/۱۹۳ ، فصل في الملاهي النفسية)=

....

=(۵) (فتح الباري لإبن حجر العسقلاني : ۱۰/۵۴۳ ، قضايا اللهو والترفية لمادون رشيد: ص/۲۰۰)

(۶) ما في " شمائل الترمذي " : عن أبي هريرة قال : قالوا : يا رسول الله ! إنك تداعبنا ؟ (يعني تمازحنا) قال : " إني لا أقول إلا حقًّا " . (ص/۱۶ ، باب ما جاء في المزاح ، الأدب المفرد للبخاري:ص/۲۶۰ ، قضايا اللهو والترفية :ص/۱۹۶ ، الملاهي النفسية)

(۷) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا لا يسخر قوم من قوم عسٰى أن يكونوا خيرًا منهم ولا نسآء من نسآء عسٰى أن يكنّ خيرًا منهن ، ولا تلمزوٓا أنفسكم ولا تنابزوا بالألقاب بئس الاسم الفسوق بعد الإيمان ومن لم يتب فأولٰئك هم الظٰلمون O﴾ . –" اے ایمان والو! نہ مردوں کو مَردوں پر ہنسنا چاہیے، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتوں کو عورتوں پر (ہنسنا چاہیے) کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارو، ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی برا ہے، اور جو (اب بھی) توبہ نہ کریں گے وہی ظالم ٹھہریں گے۔

(سورة الحجرات : ۱۱)

علامہ عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یعنی کسی کو کیا خبر کہ اللہ کے نزدیک بہتر اور قابلِ عزت کون ہے، ہنسنے والا ہے یا وہ جس پر ہنسا جا رہا ہے، اس احساس کو بیدار کر کے قرآن نے گویا معاشرہ اسلامی کے اندر تمسخر و تفضیح کی جڑ ہی کاٹ دی ہے، تعلیم ہمارے ہاں کی یہ تھی اور عمل یہ ہے کہ دوسرے پر ہنسنا، بنانا، علانیہ اس کی رسوائی کرنا، عیب نہیں، بلکہ داخلِ ہنر ہو گیا۔

(تفسیر ماجدی مع ترجمۂ قرآن:ص/۱۰۳۲)

ما في " تفسير ماجدي " : (لا يسخر) "تمسخر" وہ ہنسی ہے، جس سے دوسرے کی تحقیر و دل شکنی و دل آزاری ہو، اور وہ حرام ہے۔ (ص/۱۰۳۲)

ما في " فتح الباري " : وقوله : (لا يسخر) نهى عن السخرية وهو فعل الساخر ، وهو الذي يهزأ منه ، والسخرية تسخير خاص ، والسخرية سياقة الشيء إلى الفرض المختص به قهرًا ، فورد النهي عن استهزاء المرء الآخر تنقيصًا له مع احتمال أن يكون في نفس الأمر خيرًا منه ، وقد أخرج مسلم عن أبي هريرة رفعه في إثناء حديث : " بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم " . (۱۰/۵۶۹ ، باب قوله تعالى : يآ أيها الذين اٰمنوا لا يسخر قوم . الخ)=

....

=ما في " صحيح البخاري " : عن ابن عمر رضي الله عنهما قال : قال النبي ﷺ بمنىً : .... " فإن اللّٰه حرّم عليكم دماء كم وأموالكم وأعراضكم ، كحُرمة يومكم هذا ، في شهركم هذا ، في بلدكم هذا " . (ص/۱۰۸٦ ، رقم :٦۰٤٣)

وما في " صحيح البخاري " : عن عبد اللّٰه بن زمعة قال : " نهى النبي ﷺ أن يضحَكَ الرجلُ مما يخرُجُ من الأنفس" . الخ . (ص/۱۰۸٦ ، رقم : ٦۰٤٢ ، باب قول اللّٰه تعالى : يآأيها الذين اٰمنوا لا يسخر قوم . الخ)

ما في " احياء علوم الدين " : امام غزالی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق " سخريه " کہتے ہیں" توهين وتحقير" اورعیوب ونقائص پر بطور تضحیک تنبیہ کرنے کو، کبھی یہ باتیں فعلاً (عملاً) ہوتی ہیں، اور کبھی قولاً وحکایۃً ہوتی ہیں، اور کبھی کبھار ایماء واشارے کے ذریعے سے بھی ہوتی ہیں۔ (۱۳۱/۳)

نیز سخریہ کا انجام اخروی بھی برا ہے، حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ﴿إن الذين أجرموا كانوا من الذين آمنوا يضحكون، وإذا مروا بهم يتغامزون ، وإذا انقلبوا إلى أهلهم انقلبوا فكهين، وإذا رأوهم قالوا إن هؤلاء لضآلون، وما أرسلوا عليهم حافظين، فاليوم الذين آمنوا من الكفار يضحكون﴾۔

ترجمہ:......اور جولوگ مجرم تھے وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے، اور جب ان کے سامنے گذرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارہ کرتے جاتے تھے، اور جب اپنے گھروں کو جاتے تھے تو دل لگیاں کرتے ، اور جب انہیں دیکھتے تو کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ کیسے بھٹکے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ لوگ ان پر نگراں کر کے نہیں بھیجے گئے ، سو آج ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے۔ (سورة التطفيف:۲۹ تا ۳٤)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿يٰويلتنا ما لهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة إلا أحصاها﴾ –''ہماری کم بختی اس نامۂ اعمال کی تو عجیب حالت ہے کہ اس نے (کوئی گناہ) نہ چھوٹا چھوڑا، نہ بڑا، بغیر اس کو قلمبند کئے ہوئے۔'' (سورة الكهف : ٤۹)

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (الصغيرة) سے مراد مومن کے ساتھ استہزاء کرنا، اس پر ہنسنا، اور (الكبيرة) سے مراد مومن کا استہزاء کر کے اس پر قہقہے لگا کر ہنسنا۔ (ابن أبي الدنيا :ص/۳۸۲ ، قضايا اللهو والترفية لمادون رشيد: ص/۲۰٤ – ۲۰٦)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کفار ومشرکین اور منافقین کے رد میں سورۂ بقرہ میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وإذا لقوا الذين اٰمنوا قالوآ اٰمنا وإذا خلوا إلى شيٰطينهم قالوآ إنا معكم إنما نحن مستهزؤون ، اللّٰه يستهزئ=

....

=بهم ويمدهم في طغيانهم يعمهون﴾ . - ’’اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لا چکے ہیں، اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو محض بنا رہے تھے، انہیں اللہ بنا رہا ہے اور وہ انہیں ڈھیل دے رہا ہے، (تو) وہ اپنی سرکشی میں سرگردان ہو رہے ہیں۔‘‘ (سورة البقرة: ۱۴، ۱۵)

آیتِ مذکورہ میں مشرکین ومنافقین استہزاء مع المومنین کیا کرتے تھے، اسی استہزاء کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہی میں بھٹکتا چھوڑا، اور آگے فرمایا کہ اللہ بھی ان مستہزئین کے ساتھ استہزاء کر رہا ہے، ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔

استہزاء کے معنی تمسخر کرنے، ہنسی اڑانے، بنانے کے ہیں۔ (تفسیر ماجدی مع ترجمہ قرآن: ص/۱۰)۔ (اللّٰـه يستهزئ بهم) یعنی ان کے تمسخر کو انہیں پر پلٹے دیتا ہے۔ (بحوالہ سابق)

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کشتی بناتے وقت ان کا تمسخر کیا، تو انہوں نے فرمایا تھا: ﴿إن تسخروا منا فإنا نسخر منكم كما تسخرون﴾ . - ’’اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی تم پر ہنستے ہیں جیسا کہ تم ہنستے ہو۔‘‘ (سورة هود : ۳۸)

یعنی جس طرح تم آج ہم پر ہنس رہے ہو کل تم پر ہنسیں گے، جب تم دنیا میں غرق اور آخرت میں عذاب میں مبتلا ہو رہے ہوگے۔ (ماجدی: ص/۴۶۶) پھر اس کے بعد اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے طوفان کے ذریعہ ہلاک وبرباد کر دیا، جیسا کہ طوفانِ نوح کا واقعہ مشہور ہے۔

(۸) ما في " القرآن الكريم ": ﴿ولا تلمزوا أنفسكم ولا تنابزوا بالألقاب﴾ . - ’’اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارو۔‘‘ (سورة الحجرات : ۱۱)

" لـمـز " لغۃً طعن وتشنیع اور کچوکہ لگانے، تنبیہ کرنے کو کہتے ہیں، اور بسا اوقات طعن وتشنیع کرنا مارنے اور پیٹنے سے زیادہ سخت ہوتا ہے، کسی نے کہا ہے: ؎

تیر کا تلوار کا زخم تو گھاؤ بھرا لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا

جـراحـات السنـان لهـا التيـام ولا يـلـتـام مـا جـرح الـلـسـان

" تـنـابز القاب " کہتے ہیں اپنے بھائی کو کسی ایسے لقب سے پکارنا کہ اسے برا محسوس ہو، اور وہ اس کو ناپسند کرتا ہو، اسے تکلیف ہوتی ہو، پس لمز اور تنابز القاب تغییر نفوس اور عداوت علی الاخوۃ یعنی آپس میں عداوت ونفرت پھیلنے کا ذریعہ ہے، نیز ادب اور ذوقِ اعلیٰ کے منافی بھی ہے۔

(الحلال والحرام للقرضاوي: ص/۲۹۲، قضايا اللهو والترفية: ص/۲۰۷)=

....

=بقول علامہ عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ: ''لقب'' کے معنی یہاں برے نام کے ہیں، یعنی کسی شخص کو ایسے نام سے پکارنا جو اسے ناگوار ہو۔''واللقب هنا إسم مكروه عند السامع ''. (ابن العربي) (ماجدی:ص/۱۰۳۲)

(۹) ترويع المسلم وإفزاعه......مسلمان کو خوفزدہ ودہشت زدہ کرنا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: '' **لا يحل لمسلم أن يروّع مسلمًا** ''. کہ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو خوفزدہ ودہشت زدہ کرے۔ (**أبوداود ، رقم :۵۰۰۴ ، كتاب الأدب ، باب من يأخذ الشيء على المزاح ، مسند أحمد :۳۲۶/۵ ، غاية المرام :ص/۲۵۷**)

من جملہ مزاحِ محرم کی اقسام میں یہ بھی ہے کہ: مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرے، خواہ وہ چھری ہو یا تلوار، یا نیزہ ہو یا بندوق، یا اس کے علاوہ کسی تیز دھاردار آلات میں سے ہو، جن کو لڑائی کے وقت یا کسی چیز کے کاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ:

''عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں جارہے تھے، ان میں سے ایک صاحب سو گئے، تو بعض لوگوں نے ان کو جاکر پکڑ لیا، تو وہ صحابی گھبرا گئے، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' **لا يحل لمسلم أن يروّع مسلمًا** ''۔(حوالہ سابق)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' **من أشار إلى أخيه بحديدةٍ ، فإن الملائكة تلعنه حتى وإن كان أخاه لأبيه وأمه** '' ۔کہ جو شخص اپنے بھائی کی طرف دھاردار چیز سے اشارہ کرے تو ملائکہ اس پر لعنت کرتے ہیں حتی کہ وہ اس (حرکت) سے باز آجاوے، اگرچہ وہ اس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ (**أخرجه مسلم:۲۱۹/۸، رقم :۲۶۱۶، كتاب البر والصلة ، باب النهي عن الإشارة بالسلاح إلى المسلم ، ط : دار احياء التراث العربي بيروت ، جامع الترمذي :۳۹/۲ ، أبواب الفتن ، باب ما جاء في إشارة الرجل على أخيه بالسلاح ، ط: مكتبه بلال ديوبند ، مسند أحمد :۲۵۶/۲ ، و: ۵۰۵**)

حدیث مذکورہ سے پتہ چلا کہ ترویع وافزاعِ مسلم ہر حال میں حرام ہے، خواہ حقیقۃً ہو یا ہزلاً (مزاقاً)، نیز ایسے شخص پر ملائکہ کا لعنت کرنا اس کی تحریم پر دال ہے، اسی طرح (وإن كان أخاه لأبيه وأمه) سے پتہ چلا کہ کسی اجنبی یا غیر قریبی سے تو دور لیکن حقیقی بھائی سے بھی اس طرح کا مزاح درست نہیں ہے، جب کہ حقیقی بھائی کے ساتھ مزاق سے وہ متہم نہیں پھر بھی مزاق سے منع کیا گیا۔(قضایا:ص/۲۰۸)=

....

=اوراس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک آدمی مزاق ومزاح میں کسی پر ہتھیار اٹھائے اور شیطان اس کو مار دے (اس کے ہاتھ کو کھینچ دے)، اور سامنے والا زخمی ہوجائے، تو پھر اس صورت میں اس کا ٹھکانہ جہنم کا گڑھا ہے۔

ما في " صحيح البخاري " : قال رسول الله ﷺ : " فإنه لا يدري لعلَ الشيطانَ يُنزِعُ في يده فيقع في حُفرةٍ من النار". (ص/۱۲۵۱، رقم :۷۰۷۲، ط : دار احياء التراث العربي بيروت ، فتح الباري : ۲۶/۱۳ ، كتاب الفتن ، باب قول النبي ﷺ من حمل علينا السلاح فليس منا ، صحيح مسلم :۲۱۹/۸ ، رقم :۲۶۱۷ ، كتاب البر والصلة ، باب النهي عن الإشارة بالسلاح)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاقاً کسی کا سامان چھپانے سے بھی منع فرمایا، ارشاد ہے:" لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعبًا جادًّا ، فمن أخذ عصا أخيه فليرُدَّها إليه "۔ کہ تم میں سے کوئی (مزاقاً وافزاعاً) اپنے (مسلم) بھائی کا عصا نہ لے، اور جو شخص اپنے بھائی کا عصا لے لے تو اسے چاہیے کہ اس کو لوٹا دے۔

(أخرجه الترمذی: ۳۹/۲ ، أبواب الفتن ، باب ما جاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلمًا ، وأبوداود برقم : ۵۰۰۳ ، كتاب الفتن ، وأحمد :۲۲۱/۴، قضايا : ص/۲۰۸،۲۰۹)

(۱۰) الكذب لإضحاک الناس ......لوگوں کو ہنسانے کے لیے دروغ گوئی سے کام لینا۔

حضرت بہز بن حکیم اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ويلٌ للذي يُحَدِّثُ بالحديث ليُضحِک به القوم فيكذب ، ويل له ! ويل له ! " کہ ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے دروغ گوئی سے کام لیتا ہے، اس لیے ہلاکت ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے۔

(أبوداود ، رقم :۴۹۹۰ ، كتاب الأدب ، باب في التشديد في الكذب ، جامع الترمذي : كتاب الزهد ، باب ما جاء من تكلم بالكلمة ليضحک الناس ، سنن الدارمي : ۲۰۶/۲، رقم :۲۷۰۵، الاستئذان ، باب في الذي يكذب ليضحک به القوم ، مسند أحمد :۳/۵ ، فيض القدير للمناوي : ۳۶۸/۶ ، رقم : ۹۶۴۸ ، ط: دار المعرفة بيروت)

حدیث مذکورہ ایسے حرمتِ افعال واقوال پر نصِ صریح ہے، جو لوگوں کو ہنسانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

نیز حدیث میں کلمہ "ویل" مکرر لانے میں اس کی ہلاکت کی شدت کو بتلانا مقصود ہے، اس لیے کہ صرف دروغ گوئی بھی ہر برائی کی جڑ ہے، اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے، اور پھر اوپر سے کذب کے ساتھ ایسا ضحک شامل ہو جس سے دلوں پر مردنی چھا جاتی ہے، نسیان پیدا ہوتا ہے، لاپرواہی، طیش، حماقت وبزدلی اور سبک سری جنم لیتی ہے، تو اس کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے، اس لیے حکماء کا قول ہے کہ...... "بر سبیل سخف (حقارت) مزاحیہ =

....

=ومزاحیہ باتیں کہنا نہایت ہی برا ہے۔''

(ویـل لـلـذي یـحدث فیکذب) في حدیثه لیضحک به القوم ویل له ، ویل له ، کرره إیذاناً بشـدة هـلـکته ، وذلک لأن الکذب وحده رأس کل مذموم وجماع کل فضیحة فإذا انضم إلیـه استـجـلاب الـضـحـک الـذي یمیت القلب ویجلب النسیان ویورث الرعونة کان أقبح القبائح ، ومن ثم قال الحکماء : إیراد المضحکات علی سبیل السخف نهایة القباحة .

(فیض القدیر للمناوي : ۳۶۸/۶ ، تحت رقم : ۹۶۴۸)

نیز اس طرح کی مزاحیہ مجالس اور ڈراموں کے پروگراموں میں جب معینہ اشخاص کی جھوٹ موٹ برائیاں اور ان کے عیوب افشاء کیے جائیں تو اشاعتِ کذب کی بناء پر حق و باطل کا اختلاط لازم آئے گا، اسی مصلحت کے پیش نظر اسلام نے جھوٹ کو بالکلیہ حرام قرار دیا اور اس پر انجامِ بد کی سخت وعید بھی سنادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

" (عـلـیـکـم بـالـصـدق) ، إن الـصدق یهدي إلی البِرّ ، وإن البرَّ یهدي إلی الجنة ، وإن الرجل لیصدُقُ حتی یکونَ صدیقاً ، (وإیاکم والکَذِبِ) ، إن الکَذِبَ یهدي إلی الفُجُورِ ، وإن الفجورَ یهدي إلی النارِ ، وإن الرجل لیَکذِبُ حتی یُکتَبَ عند اللّٰه کذاباً " .

(صـحـیـح البـخـاري: ص/۱۰۹۴ ، رقم : ۲۰۹۴ ، کتاب الأدب ، باب قوله تعالیٰ : یآ أیها الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰه وکونوا مع الصادقین ، وما ینهی عن الکذب ، صحیح مسلم : ۲۱۰/۸ ، رقم : ۲۶۰۷ ، کتاب البر والصلة ، باب قبح الکذب وحسن الصدق وفضله ، ط : دار احیاء التراث العربي بیروت ، قضایا اللهو والترفیة: ص/۲۱۰ ، ۲۱۱)

عـن أبـي وائـل عند مسلم وأبي داود والترمذي : " علیکم بالصدق ، فإن الصدق " وفیه : "وإیاکم والـکـذب ، فـإن الـکذب ..... الخ " . (فتح الباري : ۶۲۴/۱۰ ، کتاب الأدب ، باب قوله تعالیٰ : یآ أیها الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰه وکونوا مع الصادقین ، وما ینهی عن الکذب ، ط : دار السلام الریاض)

(۱۱) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مـن تشبـه بـقوم فهو منهم" ۔کہ"جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ بھی انہیں میں سے ہے۔" (أبوداود: ص/۵۹۹ ، کتاب اللباس ، باب لباس الشهرة ، ط : قدیمي)

(۱۲) رواه ابـن مـاجة عـن أبـي هـریرة بلفظ : " لا تکثروا الضحک فإن کثرة الضحک تمیت القلب " . وفیه : رواه القضاعي عن أبي هریرة مرفوعًا ، وللعسکري عن أبي هریرة=

....

=رفعه .... " ولا تكثر الضحک فإن كثرة الضحک تميت القلب " .

(كشف الخفاء للعجلوني : ۹۸/۲، تحت رقم :۱۹۱۳ ، حرف الكاف ، اتحاف السادة للمتقين الزبيدي : ۱۴۷/۵ ، و : ۳۹۴/۷)

ما في " فتح الباري " : فقد روى البخاري في الأدب المفرد ، وابن ماجه من وجهين عن أبي هريرة رفعه : " لا تكثر الضحک فإن كثرة الضحک تميت القلب " .

(۱۲۱/۱۰ ، كتاب الأدب ، باب التبسم والضحک ، دار السلام الرياض)

(۱۳) ما في " كشف الخفاء للعجلوني " : وإن الأحنف قال : قال لي عمر : يا أحنف ! "من كثر ضحكه قلّت هيبته " . (۲۴۵/۲ ، تحت رقم : ۲۵۹۱ ، حرف الميم)

(۱۴) ما في " فتح الباري " : " كثرة الكلام بغير ذكر الله تقسى القلب " . (۴۴۶/۱۰)

(۱۵) ما في " فتح الباري " : والمكروه من ذلک إنما هو الإكثار منه أو الإفراط فيه ، لأنه يذهب الوقار. (۱۲۱/۱۰)

(۱۶) (هدايه : ۴۶۶/۴ ، بدائع : ۴۸۸/۶ ، ۲۶۸/۱، شامي : ۲۲۳/۵ ، فتح الباري : ۵۰۱/۱۰ ، تحت رقم :۵۹۷۵)

(۱۷) ما في " تكملة فتح الملهم " : اعلم أن الشريعة المصطفوية السمحة البيضاء لا تمنع الارتفاقات والمصالح التي فطرت عليها الطبيعة البشرية ولا ترتضي الرهبانية والتبتل بل تقتضي المدنية والمعاشرة الصالحة ...... ومن المعلوم أن من الحاجة المفطور عليها الإنسان تمرين البدن وترويح القلب وتفريحه ساعة فساعة ومن هنا قال عليه الصلاة والسلام : " روحوا القلوب ساعة فساعة " . [أخرجه أبو داود في مراسيله] .... وحاصل الكلام أن ترويح القلب وتفريحه وكذا تمرين البدن من الارتفاقات المباحة والمصالح البشرية التي لا تمنعها الشريعة السمحة برأسها . نعم . تمنع الغلو والانهماک فيها بحيث يضر بالمعاش أو المعاد .... فالضابط في هذا الباب عند مشايخنا الحنفية المستفاد من أصولهم وأقوالهم : .... أن اللهو المجرد الذي لا طائل تحته وليس له=

....

=غرض صحيح مفيد في المعاش ولا لمعاد حرام أو مكروه تحريمًا . وهذا أمر مجمع عليه في الأمة متفق عليه بين الأئمة ..... وما كان فيه غرض ومصلحة دينية أو دنيوية فإن ورد النهي عنه من الكتاب أو السنة [كما في النرد شير] كان حرامًا أو مكروهًا تحريمًا ... وألفيت تلك المصلحة والغرض لمعارضتها للنهي الماثور حكمًا بأن ضرره أعظم من نفعه . وهذا أيضًا متفق عليه بين الأئمة .... وأما ما لم يرد فيه النهي عن الشارع وفيه فائدة ومصلحة للناس فهو بالنظر الفقهي على نوعين : الأول : ما شهدت التجربة بأن ضرره أعظم من نفعه ومفاسده أغلب على منافعه وأنه من اشتغل به ألهاه عن ذكر الله وحده وعن الصلوات والمساجد التحق ذلك بالمنهي عنه لاشتراك العلة فكان حرامًا أو مكروهًا . والثاني : ما ليس كذلك فهو أيضًا إن اشتغل به بنية التلهي والتلاعب فهو مكروه ، وإن اشتغل به لتحصيل تلك المنفعة وبنية استجلاب المصلحة فهو مباح بل قد يرتقي إلى درجة الاستحباب أو أعظم منه . (۴/۴۳۴ ، كتاب الشعر ، باب تحريم اللعب بالنرد شير ، حكم الألعاب في الشريعة ، أحكام القرآن للتهانوي :۳/۱۹۹، ۲۰۰ ، ۲۰۱ ، سورة لقمان :٦)

(معارف القرآن:۷/۲۳،کھیل کوداور تفریح کی شرعی حیثیت:ص/۱۳)

(۱۸) ما في " صحيح البخاري " : عن ابن عباس رضي الله عنهما قال : " لعن رسول الله ﷺ المتشبهين من الرجال بالنساء ، والمتشبِّهات من النساء بالرجال " . (ص/۱۰٦٦ ، كتاب اللباس ، باب المتشبهون بالنساء والمتشبهات بالرجال ، رقم : ۵۸۸۵)

ما في " فتح الباري " : قوله : (لعن رسول الله ﷺ المتشبهين) قال الطبري : المعنى لا يجوز للرجال التشبه بالنساء في اللباس والزينة التي تختص بالنساء ولا العكس .

(۱۰/۴۰۹ ، شرح ابن بطال: ۹/۱۵۱، رقم :۵۴۹۵ ، ط : دار الكتب العلمية بيروت)

(۱۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تركنوٓا إلى الذين ظلموا فتمسّكم النار﴾ .

(سورة هود :۱۱۳)

ما في " حاشية القونوي على تفسير البيضاوي " : قال ابن عباس : أي لا تميلوا ،=

....

=والركون المحبة والميل بالقلب ، وقال أبو العالية : لا ترضوا بأعمالهم ، وقال عكرمة : لا تطيعوهم ؛ قال البيضاوي : لا تميلوا إليهم أدنى ميل ، فإن الركون هو الميل اليسير كالتزيي بزيهم وتعظيم ذكرهم . (۱۰/۲۲٦ ، التفسير المظهري :۴/۴۳۰)

ما في " مشكوة المصابيح " : عن ابن عباس قال : قال رسول الله ﷺ : " أبغض الناس إلى الله ثلاثة : ملحد في الحرم ، مبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ، ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق ليهريق دمه " . (ص/۲۷)

ما في " سنن أبي داود " : عن ابن عمر قال : قال رسول الله ﷺ : " من تشبه بقوم فهو منهم " . (ص/۵۹۹ ، كتاب اللباس ، باب لباس الشهرة)

ما في " موسوعة تكملة فتح الملهم " : " إن اللباس الذي يتشبه به الإنسان بأقوام كفرة ، لا يجوز لبسه لمسلم إذا قصد به التشبه بهم " . (۱۰/ ۷۷ ، كتاب اللباس والزينة)

(۲۰) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يٰبني اٰدم قد أنزلنا عليكم لباسًا يُّواري سواٰتكم وريشًا ولباس التقوىٰ ذٰلک خير﴾ . (سورة الأعراف :۲٦)

ما في " التفسير الماجدي " : قال كثير ميں العلماء : هذه الآية دليل على وجوب ستر العورة . (قرطبي) يدل على فرض ستر العورة لإخباره أنه أنزل علينا لباسًا يواري سوآتنا . (جصاص) . وقد اتفقت الأمة على معنى ما دلت عليه الآية من لزوم فرض ستر العورة . (جصاص) . (ص/۳۲۸)

ما في " مسند أحمد " : عن عقبة بن علقمة قال : سمعت عليًا يقول : قال رسول الله ﷺ: " الركبة من العورة " . إسناده ضعيف . (۲/۱۸۷، وابن الجوزي في التحقيق: ۱/۳۲۲ ، سنن الدار قطني : ۱/۲۳۷ ، باب الأمر بتعليم الصلاة والقرب عليها وحد العورة التي يجب سترها)

ما في " الاختيار لتعليل المختار " : (وستر العورة) وأما ستر العورة فلقوله تعالى : ﴿يٰبني اٰدم خذوا زينتكم عند كل مسجد﴾ . (سورة الأعراف: ۳۱) . (وعورة الرجل ما تحت سرته إلى تحت ركبته) لقوله عليه السلام : " عورة الرجل ما دون سرته حتى يجاوز ركبتيه " .

(۱/۲۸ ، ۲۹، باب ما يفعل قبل الصلاة)

ما في " منية المصلي " : وأما الشرط الثالث : " فهو ستر العورة " . (ص/۲۳)=

....

=ما في " الدر المختار مع الشامية " : والرابع ستر عورته .... ووجوبه عام ، ولو في الخلوة على الصحيح . (در مختار) . (۷۵/۲ ، كتاب الصلاة ، باب شروط الصلاة ، مطلب في ستر العورة)

(۲۱) ما في " صحيح مسلم " : عن عبد الرحمن بن أبي سعيد الخدري رضي اللّٰه عنه ، عن أبيه أن رسول اللّٰه ﷺ قال : " لا ينظر الرجل إلى عورة الرجل ، ولا المرأة إلى عورة المرأة " . الخ . (۱۵۴/۱ ، كتاب الحيض ، باب تحريم النظر إلى العورات)

ما في " تكملة فتح الملهم " : قوله : (ولا ينظر) الخ . ... وفيه بيان تحريم النظر إلى ما لا يجوز ، وعورة الرجل ما بين سرته وركبتيه ، وكذلك عورة المرأة في حق المرأة وفي حق محارمها ، وأما المرأة في حق الرجل الأجنبي فجميع بدنها عورة إلا وجهها وكفيها عند الحاجة ، كسماع إقرار أو خطبة ..... وفي الدر المختار : وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال ، لا لأنه عورة ، بل لخوف الفتنة ، كمسه ، وإن أمن الشهوة لأنه أغلظ ، ولا يجوز النظر إليه بشهوة كوجه أمرد . اهـ . ... وقال الحافظ ابن القيم رحمه اللّٰه : ...... فإن العورة عورتان : عورة في الصلاة ، وعورة في النظر ، فالحرة لها أن تصلي مكشوفة الوجه والكفين ، وليس لها أن تخرج في الأسواق ومجامع الناس كذلك ، واللّٰه أعلم . (۱۴۰/۳ ، تحت رقم : ۷۶۲، ط : دار احياء التراث العربي بيروت)

ما في " شرح النووي على هامش مسلم " : قال النووي رحمه اللّٰه : وأما أحكام الباب ففيه تحريم نظر الرجل إلى عورة الرجل ، والمرأة إلى عورة المرأة ، وهذا لا خلاف فيه ، وكذلك نظر الرجل إلى عورة المرأة ، والمرأة إلى عورة الرجل حرام بالإجماع . (۱۵۴/۱)

(۲۲) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطٰن فاجتنبوه لعلكم تفلحون﴾ . –"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس نری گندی باتیں ہیں شیطان کے کام سو اس سے بچے رہو تا کہ فلاح پاؤ۔ (سورۃ المائدۃ:۹۰)

مفسر زمخشری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حرمتِ خمر ومیسر کے متعدد طریقے قرآن نے اسی آیت میں جمع کر دیئے:

(۱) آیت کی ابتدا کلمۂ حصر "اِنما" سے کی، یعنی ان چیزوں کی بس یہی کل حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، (۲) ان دونوں چیزوں کا ذکر انصاب واز لام جیسی مسلّم گندی چیزوں کے ساتھ کیا، (۳) انہیں "رجس" قرار دیا، (۴) انہیں عملِ شیطان ٹھہرایا، (۵) صاف صاف ان سے اجتناب کا حکم دیا، (۶) ان سے احتراز کو موجب=

....

=فلاح بتلا دیا،(۷)ان کی دینی ودنیوی مضرتوں کا ذکر کیا۔ (تفسیر ماجدی:ص/۲۶۹)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله بغير علم﴾ . -''اورکوئی انسان ایسا بھی ہے جواللہ سے غافل کرنے والی باتیں خرید کرتا ہے،تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے(دوسروں کو) گمراہ کرے۔'' (سورة لقمان : ٦)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:" لهو الحديث هو الغناء وأشباهه " ۔یعنی اس سے مراد ہے گانا اوراس کے مشابہ چیزیں، گویا ہر بیکار، غیر مفید مشغلہ اس کے تحت میں داخل ہے، جوحق کی طرف سے غفلت، بے رغبتی پیدا کرنے والا ہو،اس کے تحت میں آجاتا ہے۔ (تفسیر ماجدی:ص/۸۲۷)

ما في " المعجم الأوسط للطبراني " : عن عمر بن الخطاب قال : قال رسول الله ﷺ : "كل لهو يكره إلا ملاعبة الرجل امرأته ، ومشيه بين الهدفين ، وتعليمه فرسه " .

(٥/ ٢٣٦ ، رقم :٢١٨٣)

ما في " رد المحتار " : " كل لهو المسلم حرام " .

(٩/ ٥٦٦ ، كتاب الحظر والإباحة ، باب الاستبراء وغيره)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : والمحرم المكروه من الملاهي الرائجة في عصرنا هي كل لهو اشتمل على القمار أي لهو كان ، فإن القمار والميسر حرام بنص القرآن والنرد والشطرنج والأربعة عشر (بالهندية جوسر) واللعب بالحمام وما يقال له (تاش) إذا لم يكن فيه تعليم علم مفيد أو كان يفضي إلى الإلهاء ، أو اشتمل على القمار ، وما يلعب به الصبيان من الجواز والبوتام والكرات الزجاجية (كوليان) وأمثالها فإنها تشتمل على القمار ، فالواجب على أوليائهم أن يمنعوهم عنها ، وكذلک ما يقال له في عرفنا (كنكوا) سواء تشتمل على القمار أم لا ، وكذا التحريش بين البهائم والطيور واللعب بالناريات (آتش بازي) وأمثالها فإنها كلها لو لم يتضمن معاصي ومنكرات لا تخلو عنها عادة فهي في نفسها من اللهو المجرد الذي وقع الإجماع على تحريمه أو كراهته . (٢٠٢/٣)

ما في " سنن أبي داود " : عن ابن عباس رضي الله عنهما قال : " نهى رسول الله ﷺ عن التحريش بين البهائم " . -''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو باہم بھڑکانے سے منع فرمایا۔'' (ص/۳۴۶)=

....

=اس کا مطلب یہ ہے کہ جانوروں کو بھڑ کا کر لڑایا نہ جائے، جیسا کہ مینڈھے، مرغ، بٹیر، کتے اور اونٹ وغیرہ لڑائے جاتے ہیں، یہ بڑی بے رحمی اور تماش بینی کی بات ہے کہ جانوروں کو لڑا کر لطف اندوزی کی جائے، پھر اس پر شرطیں بھی لگائی جاتی ہیں، اور ہزار ہا روپئے کی قمار بازی ہوتی ہے۔
(فضل المعبود شرح سنن ابی داود:۴/ ۵۸، رقم:۲۵۶۲، مکتبہ المصباح، اردو بازار لاہور)
(اسی طرح) آج کل تانگے دوڑانے، کتوں کی دوڑ وغیرہ پر ہزاروں لاکھوں روپئے کی شرطیں لگائی جاتی ہیں، جو خالصۃً قمار بازی ہیں، لہٰذا جائز نہیں۔ (فضل المعبود:۴/ ۶۵، ۶۶، رقم:۲۵۷۴)

ما في " بذل المجهود " : التحريش هو الإغراء وتهييج بعضها على بعض كما يفعل بين الجمال والكباش والديوک وغيرها ، وإنما نهى عن ذلک لأنه من الملاهي ، وفيه إيلام الدواب وإهلاكهم ، وإن كان شرط من الجانبين فهو قمار أيضًا .

(۹/ ۱۳۷ ، كتاب الجهاد ، باب في التحريش بين البهائم)

ما في " سنن أبي داود " : عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه ، أن رسول الله ﷺ قال : " من لعب بالنرد فقد عصى الله ورسوله " .- ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نرد کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔'' (سنن ابن ماجہ) (فضل المعبود:۵/ ۶۵۹، رقم:۴۹۲۶)

وفيه أيضًا : عن بريدة عن النبي ﷺ قال : " من لعب بالنَّرْدِ شِيُرَ فكأنما غَمَسَ يده في لَحمِ خنزيرٍ وَدَمِهِ " .- ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نرد شیر کا کھیل کھیلا، گویا اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون میں ڈبودیا۔'' (مسلم وابن ماجہ)
(فضل المعبود:۵/ ۶۵۹، رقم:۴۹۲۷)

(سنن أبي داود : ص/ ۶۷۵ ، كتاب الأدب ، باب في النهي عن اللعب بالنرد)

ما في " السنن الكبرى للبيهقي " : عن جعفر بن محمد عن أبيه عن علي رضي الله عنه ، أنه كان يقول : " الشطرنج هو ميسر الأعاجم " . (۱/ ۳۵۸ ، رقم : ۲۰۹۲۸)

وفيه أيضًا : عن ابن عمر رضي الله عنهما أنه سئل عن الشطرنج فقال: " هو شر من النرد".

(۱۰/ ۳۵۹ ، كتاب الشهادات ، باب الاختلافات بالشطرنج)

ما في " سنن أبي داود " : عن أبي هريرة رضي الله عنه : أن رسول الله ﷺ رأى =

....

=رجلاً يتبع حمامة فقال : " شيطان يتبع شيطانة " . (ص/۶۷۵)

ما في " الموسوعة الفقهية الكويتية " : ومن اللعب المكروه اللعب بالطير والحمام ؛ لأنه لا يليق بأصحاب المروء ات والإدمان عليه قد يؤدي إلى إهمال المصالح ، ويشغل عن ذكر العبادات والطاعات ، ومن اللعب المحرم كل لعبة فيه قمار ؛ لأنها من الميسر الذي أمر الله تعالى باجتنابه ..... اللعب بالنرد محرم عند جمهور الفقهاء ...... أجمع المسلمون على أن اللعب بالشطرنج حرام إذا كان على عوض أو تضمن كذبًا أو ضررًا أو غير ذلک من المحرمات . (۲۶۹/۳۵)

ما في " قضايا اللهو والترفية لمادون رشيد " : إن الله تعالى علل تحريم الخمر والميسر بكونهما منشأ عداوة والكراهية بين المسلمين ، وذريعة لا ختلاف القلوب وزرع الحقد والكراهية فيما بين أفراد المجتمع المسلم . وقرن الميسر بالأنصاب والأزلام والخمر ، وأخبر عن وجوه المفسدة المقتضية للتحريم فيها ، وهي ما يوقعه الشيطان بين أهلها من العداوة والبغضاء ومن الصد عن ذكر الله وعن الصلاة . (ص/۱۶۲)

(۲۳) ما في " سنن أبي داود " : عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : "لا سَبْقَ إلا في خُفٍّ أو حَافِرٍ أو نَصْلٍ " . *''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' آگے بڑھنے کا انعام یا مقابلہ صرف اونٹوں میں، گھوڑوں میں یا تیروں میں جائز ہے۔''* (*ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد*) (أبو داود : ص/۳۴۸ ، كتاب الجهاد ، باب في السبق ، فضل المعبود : ۶۵/۴ ، رقم : ۲۵۷۴)

ما في " السنن الكبرى للبيهقي " : " كل شيء ليس من ذكر الله فهو سهو ولهو إلا أربع : مشي الرجل بين الغرضين ، وتأديبه فرسه ، وتعلمه السباحة ، وملاعبته أهله " .

(۲۶/۱۰ ، رقم : ۱۹۷۴۱ ، كتاب السبق والرمي)

وما في " سنن أبي داود " : عن أبي رافع قال : قلت : يا رسول الله ! أللولد علينا حق كحقنا عليهم ؟ قال : " نعم ! حق الولد على الوالد أن يعلمه الكتابة والسباحة والرمي وأن يورثه طيبًا" . (۲۶/۱۰ ، رقم : ۱۹۷۴۲)

ما في " الجامع الصغير " : " خير لهو المؤمن السباحة وخير لهو المرأة المغزل " .=

....

=(ص/۲۴۸ ، رقم : ۴۰۷۶)

وما في " الجامع الصغير " : " أحب اللهو إلى الله تعالى إجراء الخيل والرمي " .

(ص/۲۰ ، رقم : ۲۱۶)

ما في " سنن أبي داود " : عن عائشة أنها كانت مع النبي ﷺ في سفر قالت : " فسابقته فسبقته على رجليَّ ، فلما حملتُ اللحم سابقته فسبقني فقال : هذه بتلك السَّبْقَةِ " . — "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ وہ کسی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، فرماتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوڑ لگائی اور آگے نکل گئی، پھر جب میرا جسم ذرا بھاری ہوگیا، تو ایک بار پھر دوڑ لگائی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے، اور فرمایا: "آج کی یہ دوڑ اس سے پہلی دوڑ کا جواب ہے۔" (فضل المعبود: ۶۷/۴، رقم :۲۵۷۸، كتاب الجهاد ، باب في السبق على الرِجل)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : وحاصل الكلام أن ترويح القلب وتفريحه ، وكذا تمرين البدن من الارتفاقات المباحة والمصالح البشرية لا تمنعها الشريعة السمحة برأسها ، نعم ! تمنع الغلو والانهماک فيها بحيث يضر بالمعاش أو المعاد ، وهذا هو السر في إباحة بعض الملاهي في بعض الأحيان ، فإن هذا اللهو على هذه النية والغرض لم يبق لهوًا بل عاد مصلحة وفائدة كما سبق في الأحاديث المذكورة من إباحة السباحة والرماية والانتضال بالقوس والمسابقة بالإبل والبهائم وإجراء الخيل وملاعبة الأهل فإنها وإن كانت في صورة اللهو ولكنها لما كان الاشتغال فيها على غرض صحيح ومصالح معاشية أو معادية خرجت عن اللهوية حقيقة فأبيحت وربما استحبت . (۱۹۶/۳)

ما في " التنوير مع الدر والرد " : ولا بأس بالمسابقة في الرمي والفرس والإبل وعلى الأقدام ، لأنه من أسباب الجهاد فكان مندوبًا .... وأما السباق بلا جعل فيجوز كل شيء كما يأتي . (التنوير مع الدر) . وفي الشامية : وأما المسابقة بالبقر والسفن والسباحة فظاهر كلامهم الجواز ، ورمي البندي والحجر كالرمي بالسهم ، وأما إشالة الحجر باليد وما بعده فالظاهر أنه إن قصد به التمرن والتقوى على الشجاعة لا بأس به .

(۴۹۴/۹ ، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في البيع)

ما في " الموسوعة الفقهية " : فمن اللعب المباح المسابقة المشروعة على الأقدام =

....

=والسفن ونحو ذلک ..... ومن اللعب المستحب المناضلة على السهام والرماح والمزاريق وكل نافع في الحرب . (۲۶۸/۳۵)

(۲۴) ما في " الدر المختار مع الشامية " : قال العلامة الحصكفي : وحرم لو شرطا فيها من الجانبين ، لأنه يصير قمارًا ، إلا إذا أدخلا محللاً بينهما بفرس كفء لفرسيهما . (درمختار) . (۵۷۷/۹ ، ۵۷۸ ، المحيط البرهاني في الفقه النعماني : ۵۴/۶)

ما في " تبيين الحقائق " : ولو قال واحد من الناس لجماعة من الفرسان أو للإثنين : فمن سبق فله كذا من مال نفسه ، أو قال للرماة : من أصاب الهدف فله كذا جاز ، لأنه من باب التنفيل ، فإذا كان التنفيل من بيت المال كالسلب ونحوه يجوز . (۴۶۷/۷ ، مسائل شتى)

(۲۵) ما في " فتح الباري " : واتفقوا على جوازها بعض بشرط أن يكون من غير المتسابقين كالإمام حيث لا يكون له معهم فرس ، وجوز الجمهور أن يكون من أحد الجانبين من المتسابقين ، وكذا إذا كان معهما ثالث محلل بشرط أن لا يخرج من عنده شيئًا ليخرج العقد عن صورة القمار . الخ . (۸۹/۶ ، رقم :۲۸۷ ، كتاب الجهاد والسير ، باب :۵۸)

ما في " فتح الملهم " : وأما المسابقة بعوض وهي المراهنة فلها صورة مختلفة ، الأول أن يكون العوض كالجائزة المقدمة من غير المتسابقين ، كالإمام أو غيره ، وهذا جائز بالإجماع .... وقال ابن التين : ..... الفسكل . (۳۲۴/۹ ، رقم : ۴۸۲ ، شرح النووي على مسلم : ۴۹۹/۶ ، رقم : ۴۸۲۰ ، الموسوعة الفقهية : ۱۲۸/۲۴ ، أحكام المسابقات في الشريعة الإسلامية وتطبيقاته المعاصر: ص/۲۱۵ ، ط : دار النفائس الأردن)

(۲۶) ما في " الألعاب الرياضية لعلي حسين أمين يونس " : يقول الدكتور يوسف القرضاوي حفظه الله : والحق أن السفه في إنفاق الأوقات أشد خطرًا من السفه في إنفاق الأموال ...... لأن المال إذا ضاع قد يعود ، والوقت إذا ضاع لا عوض له .

(ص/۳۲۰ ، ط : دارالنفائس الأردن)

(۲۷) ما في " القرآن الكريم" : ﴿أفحسبتم أنما خلقنكم عبثًا وأنكم إلينا لا ترجعون﴾ . - ’’ہاں تو کیا تمہارا خیال تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بلا مقصد پیدا کر دیا ہے، اور تم ہمارے پاس لوٹا کر لائے نہ جاؤ گے؟ ‘‘(سورة المؤمنون :۱۱۵)=

....

=ما في " كنز العمال " : قال النبي ﷺ : " من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه " .

(۳۵۵/۳ ، رقم : ۸۲۸۱ ، جمع الجوامع : ۳۹۳/٦ ، رقم : ۲۰۰۰٦)

(۲۸) ما في " الفتاوى الهندية " : ولا تجوز الإجارة على شيء من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشيء من اللهو ، وعلى هذا الحداء وقراء ة الشعر وغيره ، ولا أجر في ذلک ، وهذا كله قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد رحمهم اللّٰه تعالى .

(۴۴۹/۴ ، كتاب الإجارة ، الفصل الثالث)

ما في " المجموع شرح المهذب " : ولا تجوز على المنافع المحرمة ؛ لأنه يحرم فلا يجوز أخذ العوض عليه كالميتة والدم . (۳/۱۵)

ما في " المقاصد الشرعية للخادمي " : " إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما ، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجباً " . (ص/۴٦)

وما في اعلام الموقعين : " وسيلة المقصود تابعة للمقصود وكلاهما مقصود " .

(۱۷۵/۳ ، فصل في سد الذرائع)

(۲۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تبذر تبذيرًا ○ إن المبذّرين كانوآ إخوان الشيٰطين﴾ . (سورة الإسراء : ۲٦ ، ۲۷)

ما في " التفسير الكبير " : والتبذير في اللغة : إفساد المال وإنفاقه في السرف . (۳۲۸/۷)

"تبذیر" کے معنی فضول خرچی کے ہیں، فضول خرچی سے مراد یہ ہے کہ ناجائز اور غلط مصارف میں پیسہ خرچ کیا جائے، یا جائز مصرف میں۔ (قاموس الفقہ: ۴۱۰/۲، مکتبہ نعیمیہ دیوبند)

ما في " صحيح البخاري " : وعن المغيرة بن شعبة قال : قال النبي ﷺ : " إن اللّٰه حرَّمَ عليكم عُقُوقَ الأمهاتِ ، وَوَأْدَ البَنَاتِ ، ومنَعَ وَهَاتِ ، وكرِهَ لكم قِيلَ وقَالَ ، وكثرةَ السُؤالِ ، وإضاعةَ المالِ " . (۳۲۴/۱ ، رقم : ۲۴۰۸ ، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر الخ ، باب ما ينهى عن إضاعة المال ، وأيضًا : ص/۱۰۷۷ ، رقم : ۵۹۷۵ ، كتاب الأدب ، باب عقوق الوالدين من الكبائر ، ط : دار احياء التراث العربي بيروت)

ما في " فتح الباري " : قوله : (وإضاعة المال) وقد قال الجمهور : إن المراد به السرف في إنفاقه . (۸٦/۵)=

....

=وما في " فتح الباري " : قوله : (وإضاعة المال) تقدم في الاستقراض أن الأكثر حملوه على الإسراف في الإنفاق ، وقيده بعضهم بالإنفاق في الحرام ، والأقوى أنه ما أنفق في غير وجهه المأذون فيه شرعًا ، سواء كانت دينية أو دنيوية فمنع منه ؛ لأن اللّٰه تعالى جعل المال قيامًا لمصالح العباد ، وفي تبذيرها تفويت تلك المصالح ، إما في حق مضيعها وإما في حق غيره ...... والحاصل في كثرة الإنفاق ثلاثة أوجه : الأول : إنفاقه في الوجوه المذمومة شرعًا فلا شك في منعه ، والثاني : إنفاقه في الوجوه المحمودة شرعًا ، فلا شك في كونه مطلوبًا بالشرط المذكور ، والثالث : إنفاقه في المباحات بالأصالة كملاذ النفس .... وفيه : وأما إضاعة المال في المعصية فلا يختص بارتكاب الفواحش ، بل يدخل فيها سوء القيام على الرقيق والبهائم حتى يهلكوا . ... وقال السبكي الكبير في " الحلبيات " : الضابط في إضاعة المال أن لا يكون لغرض ديني ولا دنيوي ، فإن انتفيا حرم قطعًا .

(۱۰/ ۵۰۱ ، ۵۰۲ ، تحت رقم :۵۹۷۵، كتاب الأدب ، باب عقوق الوالدين من الكبائر)

(۳۰) ما في " كتاب الكسب للإمام الفقيه محمد بن حسن الشيباني رحمه اللّٰه " : ثم المكاسيب أربعة : الإجارة ، والتجارة ، والزِّراعة ، والصّناعة ، وكل ذلك في الإباحة سواء عند جمهور الفقهاء رحمهم اللّٰه تعالى .

(ص/ ۲۸۱، ط : مركز الدراسات الفقهية والاقتصادية القاهرة)

ما في " حاشية كتاب الكسب " : قال السرخسي : المكاسب أربعة : الإجارة والتجارة والزراعة والصناعة ، وكل ذلك في الإباحة سواء .... قال النووي : قال النبي ﷺ : "ما أكل أحد طعامًا قطُّ خيرًا من أن يأكل من عمل يده ، وإن نبي اللّٰه داود عليه السلام كان يأكل من عمل يده " . فهذا صريح في ترجيح الزراعة والصنعة ، لكونهما من عمل يده . اهـ . (ص/۲۱۸، ۲۸۲ ، أنواع المكاسب)

(۳۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . (سورة المائدة:۲)

(۳۲) ما في " المقاصد الشرعية للخادمي " : " إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمةً إذا كان المقصد محرماً ، وتكون واجبةً إذا كان المقصد واجباً " . (ص/۴۶) =

....

=ما في " الدر المختار مع الشامية " : وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرًا ؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره . وقيل : يكره لإعانته على المعصية . (درمختار) .
وفي الشامية : قوله : (وجاز) أي عنده لا عندهما . اهـ .
(۹/۴۷٦، ۴۷۷ ، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في البيع ، ط : دار الكتاب ديوبند)

(۳۳) ما في " كتاب الكسب " : ثم المكاسيب أربعة : الإجارة ، والتجارة ، والزِّراعة ، والصّناعة ، وكل ذلک في الإباحة سواء عند جمهور الفقهاء رحمهم اللّٰه تعالى .
(ص/ ۲۸۱، ط: مركز الدراسات الفقهية والاقتصادية القاهرة)

وما في " حاشية كتاب الكسب " : قال السرخسي : المكاسب أربعة : الإجارة والتجارة والزراعة والصناعة ، وكل ذلک في الإباحة سواء .... قال النووي : قال النبي ﷺ : "ما أكل أحد طعاماً قطُّ خيرًا من أن يأكل من عمل يده ، وإن نبي اللّٰه داود عليه السلام كان يأكل من عمل يده " . فهذا صريح في ترجيح الزراعة والصنعة ، لكونهما من عمل يده . اهـ . (ص/۲۱۸ ، ۲۸۲ ، أنواع المكاسب)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : " الأصل في الأشياء الإباحة حتى يدل الدليل على عدم الإباحة " . (۱/ ۲۵۲ ، ۲۵۳)

ما في " هامش الأشباه " : قوله : (الأصل في الأشياء الخ) ذكر العلامة قاسم بن قطلوبغا في بعض تعاليقه أن المختار أن الأصل الإباحة عند جمهور أصحابنا .... ودليل هذا القول قوله تعالى : ﴿خلق لكم ما في الأرض جميعًا﴾ .
(۱/ ۲۵۲، ۲۵۳، ط : مكتبه فقيه الأمت ديوبند)

(۳۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . اورگناہ میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔(سورة المائدة: ۲)
مرشد تھانوی نے فرمایا کہ یہیں سے معلوم ہوا کہ حسن وقبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے، اور مشائخ اہل تربیت کے ہاں اسی قاعدہ پر عمل ہے، یہیں سے وجوب ان مجلسوں میں شرکت کا نکل آیا جن کا مقصد اشاعتِ دین ونصرتِ دین ہے، اور حرمت ان اجتماعی اداروں میں شرکت کی نکل آئی جن سے بے دینی یا بدعملی کی تائید ہوتی ہو۔
(تفسیر ماجدی:ص/۲۳٦)

....

=(۳۵) (الأشباه والنظائر لإبن نجيم الحنفي رحمه اللّٰه : ۱/۱۱۳)

(۳۶) ما في " صحيح البخاري " : قال رسول اللّٰه ﷺ : " إن أشد الناس عذابًا عند اللّٰه المصورون " . (۲/۸۸۰ ، كتاب اللباس ، باب عذاب المصورين يوم القيامة ، صحيح مسلم : ۲/۲۰۱ ، كتاب اللباس والزينة ، باب تحريم تصوير صورة الحيوان)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : قال القرطبي : يدل على المنع من تصوير شيء أي شيء كان . (۱۴/۲۷۴)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : لا تمثالَ إنسان أو طير . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (أو طير) لحرمة تصوير ذي الروح . (۹/۵۱۹، الحظر والإباحة ، فصل في اللبس)

ما في " شرح النووي على هامش مسلم " : قال أصحابنا وغيرهم من العلماء : " تصوير صورة الحيوان حرام شديد ، وهو من أكبر الكبائر ؛ لأنه متوعد عليه بهٰذا الوعيد الشديد المذكور في الأحاديث ، وسواء صنعه بما يمتهن أو بغيره ، فصنعته حرام بكل حال ؛ لأن فيه مضاهاة لخلق اللّٰه تعالى ، وسواء كان في ثوب أو بساط أو درهم أو دينار أو فلس أو إناء أو حائط أو غيرها . (۲/۱۹۹ ، كتاب اللباس والزينة ، باب تحريم صورة الحيوان ، رد المحتار : ۲/۴۱۶ ، كتاب الصلاة ، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها ، مطلب : إذا تردد الحكم بين سنة وبدعة كان ترك السنة أولى)

(۳۷) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وما كان صلوتهم عند البيت إلا مكآء وتصدية﴾ .–''اور (خود) ان کی نماز (ہی) خانہ (کعبہ) کے پاس کیاتھی بجز سیٹی بجانے اورتالی بجانے کے''۔(سورة الأنفال : ۳۵) اس آیت میں صاف تشبیہ اعمال مشرکین کے ساتھ ہے۔ (تفسیر ماجدی:ص/۳۸۱)

ما في " تأويلات أهل السنة للماتريدي " : قال أبو عوسجة : المكاء شبه الصفير ، والتصدية ضرب اليدين وهو من الصدى من الصوت . (۵/۱۹۴، ۱۹۵)

ما في " الدر المنثور في التفسير المأثور " : عن ابن عمر قال : المكاء الصفير ، والتصدية التصفيق . (۳/۳۳۲، ۳۳۳)

ما في " فتح القدير للشوكاني " : وقيل : المكاء الضرب بالأيدي والتصدية الصياح . (۱/۲۸۵)=

....

....

....

....

....

=ما في " تفسير النسفي لأبي البركات " : إنهم كانوا يطوفون بالبيت عراة وهم مشكبون بين أصابعهم يصفرون فيها ويصفقون . (۱/۶۴۳ ، ۶۴۴)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : " كره كل لهو ..... أي كل لعب وعبث .... والإطلاق شامل لنفس الفعل كالرقص والسخرية والتصفيق ، فإنها كلها مكروهة ؛ لأنها زي الكفار " . (۹/۵۶۶ ، كتاب الحظر والإباحة)

(۳۸) ما في " جامع الترمذي " : عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : "المسلم أخو المسلم ، لا يخونه ، ولا يكذبه ، ولا يخذله ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ عرضه وماله ودمه ؛ التقوىٰ ههنا ؛ بحسب امرئٍ من الشر أن يحقر أخاه المسلم " .

(۲/۱۴ ، أبواب البر والصلة ، باب ما جاء في شفقة المسلم على المسلم)

ما في " جامع الترمذي " : قوله عليه السلام : " ومن ستر على مسلم في الدنيا ستره الله عليه في الدنيا والآخرة " . (۲/۱۴ ، أبواب البر ، باب ماجاء في الستر على المسلمين)

ما في " مشكوة المصابيح " : وعن ابن عمر قال : صعد رسول الله ﷺ المنبر ، فنادىٰ بصوت رفيع ، فقال : " يا معشر من أسلم بلسانه ولم يفض الإيمان إلى قلبه ! لا تؤذوا المسلمين ، ولا تعيروهم ، ولا تتبعوا عوراتهم ؛ فإنه من يتبع عورة أخيه المسلم يتبع الله عورته ، ومن يتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله " . رواه الترمذي .

(ص/۴۲۸ ، ۴۲۹ ، باب ما ينهى عنه من التهاجر ، الفصل الثاني)

❁❁❁

تلخیص جوابات

(۱)

(الف): بہ چند شرائط مزاح جائز ہے۔

(ب): مزاحیہ پروگراموں کا منعقد کرنا جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو، یا مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرنا ناجائز ہے۔

(ج): بہ چند شرائط جائز ہے۔

(د): لطیفہ گوئی یا مزاح نویسی کو پیشہ بنالینا اور اس کی اجرت وصول کرنا بہ چند شرائط جائز ہونا چاہیے۔

(ھ): تفریح طبع کے لیے مزاحیہ ڈرامے کے پروگرام منعقد کرنا جس کا مقصد ہنسنا اور ہنسانا ہوتا ہے، بہ چند شرائط جائز ہونا چاہیے۔

(و): بہ تکلف قہقہہ لگاتے رہنا اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے رہنا شرعاً مکروہ ہے۔

(۲)

(الف): تفریحی کھیل کود کے سلسلے میں فقہاء وعلماء نے قرآن وحدیث سے چند ضوابط اخذ کئے ہیں:

۱- ایسا کھیل جس میں کوئی دینی ودنیوی مصلحت ومقصد نہ ہو، نہ اس کی غرض، غرضِ صحیح ہو، بلکہ محض وقت گذاری ہو تو ایسا کھیل ناجائز ہے۔

۲- ایسا کھیل جس میں کوئی مصلحتِ دنیوی ہو یا اس کی غرض، غرضِ صحیح تو ہو، مگر اس کی

ممانعت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، تو وہ بھی ناجائز ہے۔

۳- ایسا کھیل جس میں لوگوں کے لیے مصلحت وفوائد تو ہوں، مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہو کہ اس کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں، اوران کا کھیلنا انسان کو اللہ کی یاد، نماز اور فرائضِ شرعیہ سے غافل کر دیتا ہے، تو یہ کھیل بھی ناجائز ہے۔

۴- ایسا کھیل جس کا مقصد دینی یا دنیوی مصلحت وفوائد کو حاصل کرنا ہو تو مباح ہے، بشرطیکہ یہ کھیل کفار وفساق کا شعار نہ ہو، اوراس میں ہار جیت پر مال کی شرط نہ ہو۔

(ب): لباس وپوشاک کے سلسلے میں کھلاڑیوں کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کی رعایت ضروری ہے:

۱- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا جس میں مرد عورتوں اور عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں، شرعاً جائز نہیں ہے۔

۲- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا جس سے حلیہ اور وضع قطع اس طرح بدل جائے کہ غیر مسلموں سے بظاہر کوئی امتیاز باقی نہ رہے، یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

۳- کھلاڑیوں کا ایسا لباس پہننا بھی شرعاً جائز نہیں ہے، جس میں ستر دکھائی دے۔

(ج): شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مروجہ کھیلوں میں سے شطرنج، کبوتر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی، تحریش بین البہائم یعنی جانوروں کو آپس میں لڑانا، ویڈیو گیم، گوٹی، لوڈو اور تاش وغیرہ، ممنوع ہیں۔ اوران کے علاوہ کھیل مثلاً نشانہ بازی، سواری کی مشق، پیدل دوڑنا وغیرہ مستحب ہونا چاہیے۔

(د): جس صورت میں شرکاء کھیل، شرکت کے لیے متعینہ رقم جمع کرتے ہیں اور جو جیت جاتا ہے وہ اس رقم کا حقدار ہوتا ہے، اور ناکام ہونے والے کو اپنی جمع کردہ رقم

سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، تو پیسوں کی یہ شرط بوجہ قمار وخطر ناجائز اور ممنوع ہے، لیکن اگر کھلاڑیوں کو دیا جانے والا انعام وغیرہ تھرڈ پارٹی یعنی کسی شخص ثالث کی طرف سے ہو، مثلاً کوئی ادارہ، یا انجمن، یا تنظیم (Uniuns) تو یہ شرط درست وجائز ہوگی۔

(ھ): اگر کھیل اپنے طریقہ اور لباس کے اعتبار سے محرمات پر مشتمل نہ ہو، لیکن اس میں کھیلنے والوں اور کھیل دیکھنے والوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہو تو وہ کھیل ناجائز ومکروہ تحریمی ہے۔

(و): اگر کھیل ممنوع ہے یا فی نفسہٖ جائز ومباح ہے، مگر محرماتِ شرعیہ میں سے کسی محرم پر مشتمل ہو، تو اس طرح کے کھیلوں کے ٹکٹوں کی خرید وفروخت ممنوع ومکروہِ تحریمی ہوگی۔

(۳)

(الف): تفریحی مقصد کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا بلا ضرورتِ داعیہ وبلا غرضِ صحیح جائز نہیں ہے، جب کہ اس میں کثیر رقوم کا صرفہ ہوتا ہو، کیوں کہ شریعتِ اسلامیہ نے ہمیں اضاعتِ مال سے منع فرمایا ہے۔

(ب): اس طرح کے سفر میں بال بچوں کو ساتھ رکھنا بالخصوص جب کہ اس میں جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے خطرہ ہو، درست نہیں ہے، کیوں کہ جہاں القاء نفس فی التہلکۃ منع ہے وہیں القاء نفسِ غیر بھی ممنوع ہے۔

(ج): مکروہِ تحریمی ہے۔

(د): جو لوگ سیاحتی مقامات پر دادِ عیش دینے کے لیے جاتے ہیں، نیز شراب اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اسی طرح جن لوگوں کا مقصد مندروں، تیرتھ

گاہوں اور چرچوں کی زیارت کرنا اور وہاں اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کرنا ہوتا ہے، ان کی آمد ورفت کے لیے ٹکٹ اور قیام کی سہولت کی غرض سے ٹور کمپنی قائم کرنا اعانت علی المعصیت کی وجہ سے مکروہِ تحریمی ہونا چاہیے، اور ان کے علاوہ کے لیے جائز ودرست ہے۔

(۴)

دستاویزی، تاریخی اور تعلیمی مقاصد کے لیے فلم بنانا، تاکہ مشہور وعبقری شخصیات اور تاریخی مقامات کو اسکرین پر دیکھ کر، طلباء کو اس مضمون میں زیادہ سے زیادہ ادراک پیدا ہوسکے، اس وقت جائز اور درست ہے جب کہ اس میں ذی روح اور جانداروں کی تصویر سازی وتصویر کشی نہ کی گئی ہو، کیوں کہ ذی روح کی تصویر کشی اور تصویر سازی بلا ضرورتِ شدیدہ حرام ہے۔

(۵)

(الف، ب): اگر کارٹون ذوی الارواح کی ہیئت پر ہے تو اس کا بنانا جائز نہیں ہے، اور اس کا شمار بھی ممنوع تصویر سازی میں ہوگا، نیز ذوی الارواح کا کارٹون بنانا اور اس کو ذریعۂ آمدنی بنانا اور اس مقصد کے لیے ملازمت کرنا بھی شرعاً جائز اور درست نہیں ہوگا۔

(۶)

بہتر کاموں کی ترغیب اور معاشرہ کے مفاسد پر تنقید کے لیے ڈرامے اسٹیج کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ اس میں ضروریاتِ دین وعقائد پر زد نہ پڑتی ہو، اور محرماتِ شرعیہ میں

سے کسی محرّم کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، مثلاً تالیاں پیٹنا، سیٹیاں بجانا، اور کسی کی تحقیر وتذلیل وغیرہ۔

O0O0O0O0O

مصادر ومراجع

رقم	اسماء الکتب	اسماء المصنفین	المکتبة	الفن
۱	القرآن الکریم			
۲	الجامع لأحکام القرآن	أبوعبداللہ أحمد الأنصاري القرطبيؒ	الغزالی دمشق/مؤسسة مناہل العرفان	التفسیر
۳	تفسیر المظہري	القاضي محمد ثناء اللہ فانی فتیؒ	مکتبہ زکریا دیوبند	// //
۴	الدر المنثور في التفسیر المأثور	جلال الدین السیوطیؒ	دار الکتب العلمیة	// //
۵	تأویلات أہل السنة للماتریدی	ابومنصور محمد بن محمد	// // // //	// //
۶	فتح القدیر فی علم التفسر	محمد بن علي بن محمد الشوکانیؒ	دار الکتب العلمیة بیروت	// //
۷	تفسیر النسفي	أبوالبرکات عبداللہ النسفیؒ	مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور	// //
۸	أحکام القرآن للتھانوي	مفتی محمد شفیع	بإدارة القرآن والعلوم الإسلامیة کراتشی	// //
۹	حاشیة القونوي علی البیضاوي	عصام الدین اسماعیل بن محمد الحنفیؒ	دار الکتب العلمیة بیروت	// //
۱۰	معارف القرآن	مفتی محمد شفیعؒ	فرید بکڈ پو نیو دہلی	// //
۱۱	تفسیر ماجدی مع ترجمہ قرآن	علامہ عبدالماجد دریابادی	تاج کمپنی	// //
۱۲	صحیح البخاری	أبوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاريؒ	مکتبہ بلال دیوبند	الحدیث
۱۳	الصحیح لمسلم	أبوالحسن مسلم بن الحجاج القشیريؒ	مکتبہ بلال دیوبند	// //
۱۴	السنن لأبي داود	أبوداود السجستانیؒ	مکتبہ بلال دیوبند	// //
۱۵	مشکوٰة المصابیح	ولی الدین الخطیب التبریزي البغداديؒ	یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند	// //

۱۶	المصنف لابن أبی شیبۃ	عبداللہ بن محمد بن أبی شیبۃؒ	مکتبہ امدادیہ ملتان	// //
۱۷	السنن للترمذی	أبوعیسی محمد بن عیسی	مکتبہ بلال دیوبند	// //
۱۸	الجامع الصغیر	جلال الدین السیوطیؒ	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۱۹	بذل المجھود	خلیل أحمد السہارنفوري	دارالبشائر الإسلامیۃ	// //
۲۰	کنز العمال	علاء الدین علی متقی الہنديؒ	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۲۱	المعجم الأوسط للطبرانی	أبوالقاسم سلیمان بن أحمد الطبرانیؒ	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۲۲	السنن الدارمی	عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی	دارالإیمان سہارنفور	// //
۲۳	مسند الإمام أحمد	احمد بن حنبلؒ	دارالحدیث قاہرہ	// //
۲۴	جمع الجوامع	جلال الدین السیوطیؒ	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۲۵	شرح صحیح المسلم	محی الدین النووی	داراحیاء التراث العربی	// //
۲۶	تکملۃ فتح الملہم	شبیر أحمد العثمانیؒ، محمد تقي العثمانی	داراحیاء التراث العربي/ اشرفیہ دیوبند	// //
۲۷	فتح الباری	ابن حجر العسقلانی	دارالسلام ریاض	// //
۲۸	السنن الکبری للبیہقی	أبوبکر البیہقیؒ	دارالکتب العلمیۃ/ ادارہ تألیفات اشرفیہ ملتان	// //
۲۹	فیض القدیر	عبدالرؤف المناویؒ	دارالمعرفۃ بیروت	// //
۳۰	شمائل الترمذي	أبوعیسی محمد بن عیسیؒ	مکتبہ بلال دیوبند	// //
۳۱	الأدب المفرد للبخاري	أبوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاريؒ		// //
۳۲	کشف الخفاء للعجلوني	اسماعیل بن محمد الجرّاحی العجلونیؒ	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۳۳	شرح ابن بطال علی البخاري	أبوالحسن علی بن خلف ابن بطال	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۳۴	فضل المعبود شرح أبي داود	مولانا منظور احمد پاکستان	مکتبۃ المصباح اردو بازار، لاہور	// //
۳۵	اعلام الموقعین	ابن قیم الجوزیۃؒ	داراحیاء التراث العربي	الأصول
۳۶	الأشباہ والنظائر	ابن نجیم المصري الحنفيؒ	فقیہ الأمت دیوبند	// //
۳۷	المقاصد الشرعیۃ	نورالدین الخادمی	داراشبیلیا للنشر والتوزیع	// //
۳۸	الموافقات في أصول الأحکام	أبواسحاق الشاطبیؒ	دارالمعرفۃ بیروت	// //

۳۹	ردالمحتار (المعروف بالشامی)	محمد أمین الشہیر بابن عابدین الشامیؒ	دار الکتب العلمیۃ/ دار الکتاب دیوبند	الفقہ
۴۰	الدرالمختار مع ردالمحتار	علاء الدین الحصکفیؒ	دار الکتب العلمیۃ بیروت	// //
۴۱	بدائع الصنائع	شیخ علاء الدین الکاسانی	دار الکتاب دیوبند	// //
۴۲	الفتاوی الہندیۃ	نظام وجماعۃ من علماء الہند الأعلام	مکتبہ زکریا دیوبند	// //
۴۳	الموسوعۃ الفقہیۃ	وزارۃ الأوقاف والشؤن الإسلامیۃ	وزارۃ الأوقاف والشؤن الإسلامیۃ کویت	// //
۴۴	المجموع شرح المہذب	ابوزکریا محی الدین النووی	داراحیاء التراث العربی بیروت	// //
۴۵	الاختیار لتعلیل المختار	ابن المودود حنفیؒ	دارارقم بیروت/ قدیمی کتب خانہ کراچی	// //
۴۶	المحیط البرہانی	محمود بن أحمد البخاریؒ	داراحیاء التراث بیروت	// //
۴۷	تبیین الحقائق	فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ	دار الکتب العلمیۃ بیروت	// //
۴۸	الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدي	الإمام برہان الدین المرغینانیؒ	قدیمی	// //
۴۹	منیۃ المصلي	علامہ سدید الدین کاشغریؒ		// //
۵۰	کتاب الکسب	محمد بن حسن الشیبانیؒ	مرکز الدراسات الفقہیۃ والاقتصادیۃ القاہرہ	متفرقات
۵۱	الألعاب الریاضیۃ	علی حسین أمین یونس	دار النفائس الأردن	// //
۵۲	قاموس الفقہ	خالد سیف اللہ الرحمانی حفظہ اللہ	مکتبہ نعیمیہ دیوبند	// //
۵۳	المراح في المزاح	أبوالبرکات		// //
۵۴	ابن أبي الدنیا	الحافظ أبوبکر القریشیؒ		// //
۵۵	الحلال والحرام	الدکتور یوسف القرضاوي		// //
۵۶	غایۃ المرام			// //
۵۷	اتحاف السادۃ المتقین	مرتضی الزبیدي		// //
۵۸	احیاء علوم الدین	أبوحامد الغزالی	دار المعرفۃ بیروت	// //

مقالہ

(۲۱/رواں سمینار، [اندور، ایم پی]:۳-۵/مارچ ۲۰۱۲ء)

شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح

خلع (TRANSACTION)

سوال: ۱- خلع کی فقہی واصطلاحی تعریف کیا ہے؟

جواب: ۱- صاحبِ ''تنویر الابصار'' محمد بن عبد اللہ بن احمد بن محمد بن ابراہیم تمرتاشی رحمہ اللہ خلع کی تعریف یوں فرماتے ہیں: ''خلع یا اس طرح کے کسی اور لفظ سے نکاح کو ختم کردینا جو عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہو''۔ (۱)

عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الاختیار لتعلیل المختار'' میں خلع کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ''عورت کے عطا کردہ مال کے عوض رشتۂ زوجیت کو ختم کرنا''۔ (۲)

فقیہ، عالم بن علاء الاندریتی رحمہ اللہ ''تاتارخانیہ'' میں بحوالہ سغناقی رقم طراز ہیں: ''مرد کا ملکِ نکاح کے مقابلہ عورت سے مال لے کر لفظ خلع کے ذریعہ اسے نکاح سے جدا کردینا'' خلع ہے۔ (۳)

علامہ وہبی سلیمان غاوجی خلع کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں: ''ملکِ نکاح کے

مقابلہ میں مال لینا، یالفظِ خلع کے ذریعہ ملکِ نکاح کوختم کردینا''خلع ہے۔[۴]

خلع کی مذکورہ بالاتعریفات سے اتنی بات واضح ہوجاتی ہے کہ:

''عورت سے کچھ لےکراس کونکاح سے آزادکردینے کانام خلع ہے''۔[۵]

سوال: ۲- بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کوطلاق دینے کا حق حاصل ہے،اسی طرح عورت کوخلع لینے کاحق حاصل ہے، یہ بات کس حدتک درست ہے؟

جواب: ۲- بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جیسے مرد کوطلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت عام حالات میں بھی ہر وقت خلع کا حق رکھتی ہے، مرد چاہے یا نہ چاہے،تو یہ بات درست نہیں ہے۔ہاں! جب تخالفِ طبائع یامزاجوں کی عدمِ ہم آہنگی یاکسی اوروجہ سے زوجین میں نباہ دشوار ہوجائے اورشوہر طلاق پرآمادہ نہ ہو،تو شرعاً عورت کے لیے خلع لینا جائز ہے،بشرطیکہ تعدی ونشوزعورت کی جانب سے نہ ہو[۶]، کیوں کہ خلع باجماعِ امت زوجین کاایک ایسامعاملہ ہے، جوزوجین کی باہمی رضامندی پرموقوف ہوتا ہے۔[۷]--البتہ حیثیتِ خلع میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وفقہائے مجتہدین کااختلاف ہے کہ خلع کی حیثیت طلاق کی ہے یا فسخ کی؟ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت سعیدابن مسیّب، حسن بصری، عطاء، قاضی شریح، شعبی، ابراہیم نخعی، جابرابن زید،امام مالک، امام ابوحنیفہ،سفیان ثوری، امام اوزاعی رحمہم اللہ،اورصحیح قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کامسلک بھی یہی ہے کہ ''خلع''طلاق ہے۔

لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ

عنہ، طاؤس، عکرمہ، امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور اور داؤد ظاہری رحمہم اللہ کا کہنا یہ ہے کہ ''خلع'' فسخ نکاح ہے، اور اس پر طلاق کے احکام جاری نہیں ہوں گے، امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم مذہب بھی یہی تھا، لیکن پھر انہوں نے پہلے مذہب کو اختیار کرلیا تھا۔ (فقہی مقالات:۲/۱۴۲،۱۴۳)(۸)

اسی طرح آیت کریمہ:﴿وللرجال علیھنّ درجة﴾ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض معاملات میں جو اختیارات مرد کو حاصل ہیں وہ عورت کو حاصل نہیں ہیں(۹)، اسی لیے مرد کو بغیر معاوضہ دیئے طلاق دینے کا اختیار حاصل ہے، جب کہ عورت معاوضہ ادا کیے بغیر طلاق حاصل نہیں کرسکتی، علامہ ابن رشد مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بہر حال خلع تو جمہور اس بات پر متفق ہیں کہ وہ طلاق ہی ہے''۔(۱۰)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے:

''طلاق کا مالک وہی شخص ہے جسے حقِ جماع حاصل ہے''۔(۱۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ جس طرح طلاق دینے کا حق مرد کو حاصل ہے، اسی طرح خلع بھی اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ شوہر راضی نہ ہو۔

سوال: ۳- اگر عورت کے پاس شوہر کی ظلم وزیادتی کے سلسلے میں بیّنہ فراہم نہ ہوں، تو اس کے گلوخلاصی کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: ۳-اگر عورت شوہر کی جانب سے شدید حد تک متنفر ہو؛ لیکن شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو، اور عورت کے پاس شوہر کی ظلم وزیادتی کے سلسلے میں بینہ فراہم نہ ہوں، تو اس کی گلوخلاصی کی صورت یہ ہوگی کہ حنفی قاضی کو جب تحقیقِ حال کے بعد شواہد

وثبوت سے یہ ظن غالب ہوجائے، کہ عورت اپنے دعوی میں سچی ہے، تو امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر ان کی تصریحات کے مطابق فیصلہ دے۔

(ماخوذ از: کتاب الفسخ والتفریق: ص/ ۱۴۸، مکتبہ امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ)

ان کی تصریحات اس بارے میں یہ ہیں: ''مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو مار پیٹ کرکے، یا مثلاً کسی ناجائز کام کے کرنے پر مجبور کرکے ضرر پہنچائے، تو عورت کو حق ہے کہ اپنا معاملہ قاضی کے پاس لے جائے، اور اس کو حق ہے کہ قاضی سے شوہر کی تادیب اور زجر کا مطالبہ کرے، تاکہ وہ عورت کو تکلیف پہنچانے سے باز رہے، اسی طرح اس کو یہ بھی حق ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق دیئے جانے کا مطالبہ کرے، تو اگر عورت قاضی سے مطالبہ کرے کہ اس کے شوہر کو ایذا رسانی سے روکا جائے، تو قاضی اولاً شوہر کو سمجھائے، اس کو یہ بتائے کہ شوہر پر اپنی بیوی کے ساتھ بہترین معاشرت واجب ہے، اور اس کو بتائے کہ عورت کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں دونوں کے درمیان علیحدگی ہوسکتی ہے، جس کے نتیجہ میں بچہ ضائع ہوجائے گا اگر ہو، پھر اگر وعظ ونصیحت سے فائدہ ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر عورت دوبارہ قاضی کے پاس آئے اور اس کو بتائے کہ شوہر اپنی مار پیٹ سے باز نہیں آیا ہے، اور معاملہ واضح نہ ہو، تو قاضی دو حکم بھیجے گا، ان دونوں پر واجب ہوگا کہ زوجین کے درمیان اصلاحِ حال اور آپس میں محبت اور حسنِ معاشرت پر دونوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ تحقیق کریں کہ زوجین میں سے کس کی طرف سے دوسرے کے حق میں زیادتی ہوتی ہے، اگر زیادتی شوہر کی طرف سے ہو، تو دونوں حکم شوہر کی طرف سے زوجہ کو بلا معاوضہ طلاق دے دیں گے، اور اگر زیادتی بیوی کی طرف سے ہو، تو حکمین

کو دو چیزوں میں ایک کا اختیار ہے: اول یہ کہ حکمین شوہر کو بیوی کے معاملہ میں امین بنائے، یعنی دونوں حکم شوہر کو بیوی کے ساتھ انصاف کرنے اور حسنِ معاشرت میں امین بنائیں گے۔ دوم یہ کہ عورت کی طرف سے معاوضہ لے کر دونوں کے درمیان تفریق کر دیں، اور جائز ہے کہ یہ معاوضہ عورت کے مہر سے جس کو اس نے اپنے شوہر سے لیا ہے کم ہو، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ اس کے مہر کے برابر یا اس سے زیادہ ہو۔

اور اگر حکمین یہ محسوس کریں کہ زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، تو پھر اگر یہ ممکن ہو کہ وہ جان سکیں کہ کس کی طرف سے زیادتی زیادہ ہے، تو جس کی طرف سے زیادتی زیادہ ہوگی، وہی تنہا زیادتی کرنے والا سمجھا جائے گا۔

اور اگر حکمین کے لیے یہ جاننا ممکن نہ ہو، کہ ان دونوں میں سے کس کی زیادتی زیادہ ہے، یا یہ معلوم ہو کہ ہر ایک کی زیادتی دوسرے کے حق میں برابر ہے، تو مذہب میں دو رائیں ہیں: اول یہ کہ حکمین کی ذمہ داری ہے کہ زوجہ کو بلا معاوضہ طلاق دے دیں، دوسری یہ کہ ان دونوں کی ذمہ داری ہے کہ معاوضہ لے کر طلاق دیں۔ اسی دوسری رائے کے مطابق اکثر علماء کا عمل ہے"۔[۱۲] (ماخوذ از: کتاب الفسخ والتفریق: ص/ ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱)

سوال: ۴- "شقاق" سے کیا مراد ہے؟

جواب: ۴- "شقاق" کے معنی عداوت، دشمنی، مخالفت کے ہیں، اور چوں کہ یہ باب مفاعلۃ کا مصدر ہے، اس لیے اس کے معنی ہیں "باہم شقاق میں اس حالت پر ہو جانا کہ ایک شخص ایک شق پر ہو، یعنی ایک سرے پر ہو، اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو، یعنی دوسرے سرے پر ہو"۔ یعنی دو آدمیوں کے درمیان شقاق (عداوت، دشمنی، مخالفت) نے انتہائی صورت اختیار کر لی ہو، اسی کو امام راغب نے اپنی کتاب

''مفردات القرآن'' میں ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے: " **الشقاق المخالفة وكونك في شق غير شق صاحبك** "۔ ''شقاق کے معنی مخالفت کے ہیں، یعنی تم ایک طرف ہو، تو تمہارا ساتھی دوسرے کنارہ۔'' (مفردات القرآن اردو: ص/ ۵۴۶)[۱۳]

علامہ عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شقاق سے مراد ''ایسی کشمکش جسے وہ (میاں بیوی) باہم نہ سلجھا سکیں۔''

(تفسیر ماجدی: ص/ ۱۹۱، حاشیہ نمبر: ۵۳۹)

سوال: ۵- کیا قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس سلسلے میں حنفیہ اور دوسرے فقہاء کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

جواب: ۵- قاضی شقاق کی وجہ سے خلع کا فیصلہ نہیں کرسکتا، جیسا کہ صاحب '' احکام القرآن'' ابوبکر الجصاص رحمہ اللہ، قرآنِ کریم کی آیت: ﴿**وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها**﴾ کے تحت تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: '' کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ اور اجماعِ امت سے یہ بات ثابت ہے کہ حاکمِ وقت عورت سے مال لے کر، اس کے شوہر کو دینے، اور مرد کی توکیل ورضا کے بغیر اس کی بیوی پر ایقاعِ طلاق کا اختیار نہیں رکھتا''[۱۴]، کیوں کہ اگر حاکم کو یہ اختیار ہوتا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیوی سے " **أتردّين عليه حديقته؟** " سے استفہام اور شوہر کو " **طلّقها** " یا " **خلِّ سبيلها** " نہ فرماتے، بلکہ خود نکاح فسخ فرما دیتے[۱۵]، البتہ جب مالکیہ کے نزدیک تحکّمِ شقاق کی بنا پر حکمین کو بدونِ توکیل تفریق بین الزوجین کا اختیار ہے، اور حکمین اپنی مصلحت کے مطابق جمع وتفریق کا فیصلہ کرسکتے ہیں[۱۶]، درآں حالانکہ حکمین یہ حاکم ہی کے نائب ہوتے

ہیں، اور جب حکمین کو بدونِ توکیل ورضا تفریق کا اختیار حاصل ہے، تو ان کے نزدیک قاضی کو یہ حق بدرجۂ اولیٰ حاصل ہونا چاہیے۔

سوال:۶- (الف): جن حضرات کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، ان کے یہاں کیا قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے؟ کیا حکمین کی کوشش کے بعد ہی خلع معتبر ہوگا؟ یا قاضی خود فیصلہ کرسکتا ہے؟ (ب): اور کیا ایک حکم کا تقرر بھی کافی ہوگا؟

جواب: ۶- (الف): جن حضرات (مالکیہ) کے نزدیک خلع شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں، ان کے یہاں قاضی کی طرف سے حکمین کا مقرر کیا جانا ضروری ہے۔[۱۷]

البتہ جب مالکیہ کے نزدیک تحکّمِ شقاق کی بنا پر حکمین کو بدونِ توکیل تفریق بین الزوجین کا اختیار ہے، اور حکمین اپنی مصلحت کے مطابق جمع وتفریق کا فیصلہ کرسکتے ہیں، درآں حالانکہ حکمین یہ حاکم ہی کے نائب ہوتے ہیں، تو حکمین کی کوشش سے پہلے بھی خود قاضی کو فیصلۂ خلع کا اختیار ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ امر معقول نہیں ہوگا، کہ نائبینِ قاضی تو خلع وتفریق کا اختیار رکھیں، اور خود قاضی اس اختیار سے محروم ہو۔

(ب): اگر ایک ہی حکم مقرر کیا جائے، یا زوجین ایک ہی شخص کے حکم ہونے پر متفق ہو جائیں، تو بھی کافی ہے، اس کا فیصلہ نافذ ہوگا، لیکن بہتر یہ ہے کہ دو حکم مقرر کیے جائیں۔[۱۸]

سوال:۷- اگر حنفیہ کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے، تو کیا اس مسئلے میں ضرورۃً کسی اور مکتبِ فکر کی طرف عدول کیا جاسکتا ہے؟

جواب:۷- زن وشوہر کے شقاق کی صورت میں جب عورت قاضی کے یہاں

مقدمہ دائر کرے، اور جائز شکایت کی بنا پر شوہر سے تنگ آ کر تفریق کا مطالبہ کرے، تو حنفی قاضی معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر، ان کی تصریحات کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ: ''جب کسی مسئلہ کی بابت مذہبِ امام میں کوئی قول موجود نہ ہو، تو مذہبِ مالک کی طرف رجوع کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ دیگر مذاہب کی بہ نسبت مذہبِ امام سے اقرب ہے''۔ (۱۹)

اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' میں رقم طراز ہیں: ''اگر کسی عورت کا شوہر کسی طریقہ سے نہ مانے اور خلع وغیرہ ممکن نہ ہو، اور عورت صبر کی متحمل بھی نہ ہو، تو ایسی صورت میں مجبوراً مذہبِ مالکیہ کے مطابق دین دار مسلمانوں کی پنچائیت میں معاملہ پیش کرنے کی گنجائش ہے، اور اس پنچائیت میں کم از کم تین دین دار افراد شامل ہوں، اور واقعہ کی تحقیق کے بعد بموافقِ شرع فیصلہ کر دیں، تو یہ فیصلہ، فیصلۂ قاضی کے قائم مقام ہوگا۔'' (ص/۶۳) (شقاق بین الزوجین کی وجہ سے فسخ نکاح: ص/۲۰۳-۲۱۵، ط: ایفا)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " التنوير مع الدر والرد " : (هو إزالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو في معناه) . (رد المحتار : ۸۳/۵، ۸۵، ۸۷، كتاب الطلاق ، باب الخلع ، ط : بيروت ، الفقه الحنفي في ثوبه الجديد : ۲۲۶/۲، الخلع ، فتح القدير : ۱۸۸/۴ ، باب=

....

= الخلع ، ط : بيروت ، العناية شرح الهداية : ۵۱۹/۲ ، باب الخلع ، البناية شرح الهداية :۲۹۱/۵ ، باب الخلع ، ط: مكتبه رشيديه كوئٹه ، فتح باب العناية بشرح النقاية :۱۴۲/۲ ، فصل في الخلع ، ط: دار الأرقم بيروت ، تحقيق وتعليق على شرح الزيادات :۴۶۹/۲ ، باب الخلع بالمال ، مجمع الأنهر:۱۰۲/۲ ، باب الخلع ، الدر المنتقى شرح الملتقى مع مجمع الأنهر : ۱۰۱/۲ ، باب الخلع ، تبيين الحقائق :۱۸۲/۳ ، البحر الرائق : ۱۱۹/۴ ، النهر الفائق : ۴۳۵/۲ ، ط: دار الإيمان سهارنفور ، الفتاوى الهندية : ۴۸۸/۱ ، الباب الثامن في الخلع وما في حكمه ، شرح العيني على الكنز المسمى بـ " رمز الحقائق " : ۱۶۲/۱ ، باب في بيان أحكام الخلع ، دراسة وتحقيق على مجمع البحرين :ص/۵۸۰ ، فصل في الخلع ، موسوعة الفقه الإسلامي المعاصر:۴۸۲/۲ ، أحكام خاصة بالنشوز والخلع ، التوضيح في الجمع بين المُقنع والتنقيح :۱۰۱۵/۳ ، ط : المكتبة المكية ، موسوعة الفقه الإسلامي للتويجري :۲۲۶/۴ ، الخلع)

ما في " كتاب التعريفات للجرجاني " : الخَلعُ : إزالة ملك النكاح بأخذ المال .

(ص/۱۰۵ ، باب الخاء ، ط : بيروت)

(۲) ما في " الاختيار لتعليل المختار " : وفي الشرع : إزالة الزوجية بما تعطيه من المال .

(۲۱۶/۳ ، باب الخلع ، ط : دار الرسالة العالمية ، و: ۱۵۶/۳ ، ط : دار المعرفة بيروت ، الفقه الحنفي وأدلته :۲۲۴/۲ ، باب الخلع ، الجوهرة النيرة :۲۱۵/۲ ، كتاب الخلع)

ما في " معجم لغة الفقهاء " : الخلع : .... طلاق الرجل زوجته على مال تبذله له .

(ص/۱۹۹ ، ط : إدارة القرآن كراتشي ، المصباح المنير للفيّومي : ص/۶۸ ، ط : مكتبة لبنان ، عون المبعود :ص/۹۸۷ ، باب في الخلع ، تحت رقم :۲۲۳۰)

(۳) ما في " الفتاوى التاتارخانية " : وفي السغناقي : هو عبارة عن أخذ مال من المرأة بإزاء ملك النكاح بلفظ الخلع .

(۲۸/۳ ، الفصل السادس عشر في الخلع ، ط :دار الإيمان سهارنفور)

ما في " الموسوعة الفقهية " : (فعند الحنفية) : أخذ مال من المرأة بإزاء ملك النكاح بلفظ الخلع . (۲۳۴/۱۹ ، خلع)

(۴) ما في " الكافي في الفقه الحنفي " : الخلع شرعًا : أخذ المال بإزاء ملك النكاح أو إزالة ملك النكاح بلفظ الخلع . (۱۰۱۷/۳ ، الخلع ، ط : مؤسسة الرسالة بيروت)=

....

=(۵) (قاموس الفقه :۳/۳۶۲ ، خلع ، ط : كتب خانه نعيميه ديوبند)

(۶) (إمداد الأحكام :۴/۲۴۷ ، فتاوى محموديه :۱۳/ ۳۴۱ ، ط : كراچى)

(۷) ما في " المبسوط للسرخسي " : (والخلع جائز عند السلطان وغيره) لأنه عقد يعتمد التراضي كسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض ، وللزوج ولاية إيقاع الطلاق ، ولها ولاية التزام العوض . (۶/۲۰۲ ، ط : بيروت ، و:۶/۱۷۳ ، ط : مطبعة السعادة ، المغني لإبن قدامة الحنبلي :۷/۵۲، ط : مطبعة دار المنار ، الجامع لأحكام القرآن للقرطبي :۳/۱۳۸ ، ط : دار الكتب المصرية ، كتاب الأم للشافعي :۵/۲۰۰، ط : مكتبة الكليات الأزهرية)

ما في " بدائع الصنائع " : قال الإمام الكاساني رحمه الله تعالى : وأما ركنه فهو الإيجاب والقبول ، لأنه عقد على الطلاق بعوض ، فلا تقع الفرقة ، ولا يستحق العوض بدون القبول .

(۴/۳۱۵ ، كتاب الطلاق ، ط : بيروت ، رد المحتار :۵/۸۸ ، باب الخلع ، ط : بيروت)

(فتاویٰ عثمانی :۲/۴۴۵ ، کفایت المفتی :۶/۱۶۷، ط: دار الاشاعت کراچی ، احسن الفتاویٰ :۵/۳۸۴، إمداد المفتیین المعروف بعزیز الفتاویٰ:۲/۵۵۴)

(۸) ما في " نصب الراية للزيلعي " : رواه عبد الرزاق في " مصنفه " حدثنا ابن جريج عن داود بن أبي عاصم عن سعيد بن المسيب أن النبي ﷺ جعل الخلع تطليقة . انتهى . وكذلك رواه ابن أبي شيبة . (۳/۳۴۸ ، كتاب الطلاق ، باب الخلع ، ط : دار الإيمان سهارنفور)

ما في " الفقه الحنفي وأدلته " : روي عن علي وعثمان وابن مسعود رضي الله عنهم : أن الخلع تطليقة بائنة . {شرح السنن لأبي داود للحطابي} . وبه قال الحسن البصري وإبراهيم النخعي وعطاء بن السائب وشريح والشعبي ومكحول والزهري ، وبه قال الثوري وأبو حنيفة وأصحابه ، وكذلك قال مالك والأوزاعي والشافعي في أحد قوليه وهو أصحهما . والله أعلم . وروى عبد الرزاق في مصنفه بسنده إلى سعيد بن المسيب : أن النبي ﷺ جعل الخلع تطليقة . (۲/۲۲۴، ۲۲۵، باب الخلع ، ط : إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراتشي ، تفسير ابن كثير : ۱/۲۷۵، المكتبة التجارية الكبرى ، بداية المجتهد : ۲/۶۹، بذل المجهود : ۸/۲۲۷، ۲۲۸ ، رقم :۲۲۱۳، كتاب الطلاق ، باب الخلع ، معالم السنن شرح سنن أبي داود: ۳/۲۱۹، ۲۲۰، رقم : ۱۰۸۹ ، كتاب الطلاق ، باب الخلع ، عون المعبود :ص/۹۸۷ ، رقم : ۲۲۲۷، باب في=

....

= الخلع ، المُبدع في شرح المُقنع :۲۲۷/۷، الخلع طلاق بائن)

ما في " موسوعة مسائل الجمهور في الفقه الإسلامي " : جمهور العلماء على أن الخلع طلاق وأكثرهم على أنه طلقة واحدة بائنة لا يملک الزوج فيها رجعة . روي ذلک عن سعيد بن المسيب والحسن وعطاء وقبيصة وشريح ومجاهد وأبي سلمة بن عبد الرحمن والنخعي والشعبي والزهري ومكحول وابن أبي نجيح ومالک والأوزاعي والثوري وأصحاب الرأي والشافعي في الجديد وأحمد في إحدى الروايتين ، وحكاه عن أكثر أهل العلم من الصحابة وغيرهم الإمام الترمذي . وذهب آخرون إلى أنه فسخ ، وهو قول ابن عباس وطاوس وعكرمة وإسحاق وأبي ثور والشافعي في القديم وأحمد في رواية وداود وابن المنذر . (۷۱۸/۲، ۷۱۹ ، باب في الخلع هل هو فسخ أم طلاق ؟ رقم المسئلة :۱۲۳۸)

ما في " تحفة الفقهاء " : الخلع طلاق عندنا . (۱۹۹/۲ ، باب الخلع)

ما في " الفتاوى الهندية " : وشرطه شرط الطلاق .

(۵۱۵/۱ ، مجمع الأنهر :۱۰۱/۲ ، باب الخلع)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : وشرطه كالطلاق . (۸۸/۵، باب الخلع ، ط : بيروت، تبيين الحقائق :۱۸۲/۳ ، الخلع ، حاشية الشلبي على التبيين :۱۸۲/۳ ، ط : بيروت ، العناية شرح الهداية :۵۱۹/۲ ، البناية شرح الهداية :۲۹۱/۵)

(۹) وما في " الدر المنثور " : وأخرج عبد بن حميد وابن أبي حاتم عن أبي مالک ﴿وللرجال عليهنّ درجة﴾ . قال : يطلقها وليس لها من الأمر شيء . کہ مرد عورت کوطلاق دے سکتا ہے لیکن عورت کواس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔

(۴۹۴/۱ ، سورة البقرة/ الآية : ۲۲۸ ، ط : دار الكتب العلمية بيروت)

ما في " تفسير القرطبي " : (قال الماوردي) : له رفع العقد دونها . کہ ’’عقدِ نکاح کوختم کرنے کا اختیار صرف مردکو ہے عورت کونہیں۔‘‘(۱۲۵/۳ ، دار الكتب المصرية)

(۱۰) ما في " كتاب الأم للشافعي " : وإنما جعلناها تطليقة لأن الله تعالى يقول : ﴿الطلاق مرّتان﴾ . فعقلنا من الله تعالى أن ذلک إنما يقع بإيقاع الزوج ، وعلمنا أن الخلع لم يقع إلا بإيقاع الزوج .... وقال أيضًا : وكذلک سيد العبد إن خالع عن عبده بغير إذنه ،=

....

= لأن الخلع طلاق ، فلا يكون لأحد أن يطلق عن أحد . (۱۹۸/۵، ۲۰۰)

ما في " الإنصاف للمرداوي " : الرابعة : قال الأزجي في نهايته : يتفرع على قولنا : " الخلع فسخ أو طلاق " .... فإن قلنا : الخلع فسخ لا يصح ذلک . وإن قلنا : هو طلاق صح . (۲۹۱/۸، كتاب الخلع ، الخلع فسخ أو طلاق)

ما في " بداية المجتهد " : وأما نوع الخلع فالجمهور على أنه طلاق .

(۶۹/۲، مكتبة مصطفى البابي ، تفسير ابن كثير : ۲۷۵/۱) (فقہی مقالات)

(۱۱) ما في " القرآن الكريم " :﴿لا جناح عليكم إن طلقتم النسآء ما لم تمسوهنّ أو تفرضوا لهنّ فريضة﴾ . " تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو جنہیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا طلاق دے دو۔" (سورة البقرة : ۲۳۶)

ما في " أصول الشاشي " : قال صاحب أصول الشاشي : نصٌّ في حكم من لم يسم لها مهر ، وظاهر في استبداد الزوج بالطلاق . (ص/۲۲، فصل في المتقابلات ، مكتبه بلال بكڈپو دهلی)

ما في " سنن ابن ماجة " : عن عكرمة عن ابن عباس قال :" أتى النبي ﷺ رجل فقال : يا رسول الله ! سيدي زوّجني أمته وهو يريد أن يفرق بيني وبينها ، قال : فصعد رسول الله ﷺ المنبر ، فقال : يا أيها الناس ! ما بال أحدكم يزوّج عبده من أمته ثم يريد أن يفرق بينهما ، إنما الطلاق لمن أخذ بالساق " . (۱۵۱/۱ ، باب طلاق العبد ، مكتبه بلال ديوبند ، فتح القدير : ۴۷۶/۳ ، كتاب الطلاق ، فصل ويقع طلاق كل زوج ...الخ)

ما في " إنجاح الحاجة على هامش ابن ماجة " : قوله : " إنما الطلاق لمن أخذ بالساق " كناية عن الجماع أي إنما يملک الطلاق من يملک الجماع ، فليس للسيد جبر على عبده إذا أنكح أمته . (۱۵۱/۱)

ما فی " فقه السنة للسيد سابق " : جعل الإسلام الطلاق من حق الرجل وحده .(۲۸۲/۲، كتاب الطلاق ، الطلاق من حق الرجل وحده ، ط : الفتح للإعلام العربي القاهرة)

وما في " التفسير الكبير للرازي " : والسابع : أن الزوج قادر على تطليقها ، وإذا طلقها فهو قادر على مراجعتها ، شاء ت المرأة أم أبت ، أما المرأة فلا تقدر على تطليق الزوج ، وبعد الطلاق لا تقدر على مراجعة الزوج ، ولا تقدر أيضًا على أن تمنع الزوج من=

....

= المراجعة . کہ ''شوہر عورت کو طلاق دینے پر قادر ہے اور طلاق دینے کے بعد رجوع بھی کرسکتا ہے، عورت چاہے یا نہ چاہے، لیکن عورت نہ شوہر کو طلاق دے سکتی ہے، نہ طلاق کے بعد شوہر سے رجوع کرسکتی ہے، اور نہ شوہر کو رجوع سے روک سکتی ہے''۔ (۲/ ۴۴۱ ، ط : مکتبه علوم اسلامیه لاهور)

(منتخبات نظام الفتاویٰ:۲/ ۲۴۵،فتاویٰ محمودیہ:۱۳/ ۱۷۰)

(۱۲) ما في '' الأحوال الشخصية '' : ومذهب المالكية أن الزوج إذا كان يضار زوجته بالضرب ونحوه كالإكراه على فعل أمر حرام ، كان لها أن ترفع أمرها إلى القاضي ، وكان لها أن تطلب من القاضي تأديبه وزجره ليكف أذاه عنها كما أن لها أن تطلب التطليق منه ، فإن طلبت من القاضي كفه عنها وعظه أول الأمر فبين له ما يجب على الزوج من حسن معاشرة زوجته وما عسى أن يترتب على سوء العشرة من التفريق الشمل وضياع الولد إن كان فإن أجدت الموعظة فبها ، وإن جاء ته ثانية تخبره أنه لم ينته ضربه ، فإن استمر الأشكال بينهما بعث حكمين ويجب على حكمين أن يسعيا في إصلاح ذات بينهما وتأليف قلبيهما على المودة وحسن المعاشرة ، فإن تعذر عليهما ذلک نظرا فيمن تجيء الإساءة من جهته إلى صاحبه ، فإن كانت الإساءة تأتي من قبل الزوج طلقا الزوجة عليه بغير عوض ، وإن كانت الإساءة تأتي من قبل الزوجة كان لهما أحد أمرين : الأول ؛ أن يأتمنا الزوج عليها بمعنى أنهما يجعلانه أمينًا عليها بالعدل وحسن العشر . والثاني ؛ أن يفرقا بينهما بعوض يأخذانه منها ، ويجوز أن يكون هذا العوض يكون هذا لعوض أقل من صداقها الذي أخذته كما يجوز أن يكون مساويًا لصداقها وأن يكون أكثر منها . وإن وجدا أن كل واحد منهما يشارک الآخر في الإساءة إلى صاحبه ، فإن استطاعا أن يعلما أيهما أشد إساءة إلى صاحبه كان أشدهما إساءة كأنه المسيء وحده وإن لم يمكنهما معرفته أيهما أشد إساءة أو عرفا إن إساءة كل واحد منهما إلى صاحبه مثل إساءة صاحبه إليه ، ففي المذهب رأيان أولهما أن على الحكمين أن يطلقا الزوجة بغير عوض وثانيهما إن عليهما أن يطلقا بعوض ، وجرى على هذا الرأي الثاني أكثر علمائهم . (ص/۴۰۷ ، بحواله كتاب الفسخ والتفريق :ص/۱۴۸، ۱۴۹)

ما في '' الموسوعة الفقهية '' : نص المالكية على أن الزوجة إذا أضرّ بها زوجها كان لها طلب الطلاق منه لذلک ، سواء تكرّر منه الضرر أم لا ، كشتمها وضربها ضربًا مبرّحًا =

....

=..... وهل تطلق بنفسها هنا بأمر القاضي أو يطلق القاضي عنها ؟ قولان للمالكية .

(۵۷/۲۹ ، طلاق ، التفريق لسوء المعاشرة ، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير : ۳۴۵/۲ ، ط : دار الفكر بيروت)

ما في " المدونة الكبرى " : قال مالك : الأمر الذي يكون فيه الحكمان إنما ذلک إذا فتح ما بين الرجل وامرأته حتى لا يثبته بينهما بيّنة ولا يستطاع أن يتخلص إلى أمرهما ، فإذا بلغا ذلک بعث الوالي رجلاً من أهلها ورجلاً من أهله عدلين فنظر في أمرهما واجتهد ، فإن استطاعا الصلح أصلحا بينهما وإلا فرقا بينهما ، ثم يجوز فراقهما دون الإمام ، وإن رأيا أن يأخذ من مالها حتى يكون خلعاً فعلا . (۲۶۷/۲ ، كتاب إرخاء الستور ، ما جاء في الحكمين)

ما في " التاج والإكليل لمختصر خليل على هامشه " : قوله : (وإن أشكل بعث حكمين) . المتيطي : إذا عمي على الإمام خبرهما وطال عليه تكررهما ولم يتبين له من الظالم منهما لم يمنعه أن ينظر في أمرهما . قال في المدونة : إن لم يصل لمعرفة الضار منهما أرسل الحكمين . نظر نوازل ابن سهل . قال ابن عرفة في بعث الحكمين بمجرد تشاجر الزوجين وشكوى أحدهما الآخر ولا بينة إن تكررت شكواهما بعثهما لهما .

(۲۶۳/۵ ، ۲۶۴ ، كتاب النكاح ، فصل في القسم بين الزوجات)

ما في " الموسوعة الفقهية " : إذا أشكل الأمر بين الزوجين ولم يُدر ممن الإساءة منهما ، واستمرّ الإشكال بعد إسكانها بين قوم صالحين ، أو كانت بينهم ابتداء أو لم يمكن السكنى بينهم أو إذا اشتد الخلاف والشقاق والعداوة بينهما ، ودام التسابّ والتضارب وفحُش ذلک ، وتمادى الشرّ بينهما وخشي أن يُخرجهما إلى العصيان بعث القاضي الحكمين .

(۳۰۸/۴۰ ، نشوز ، بدائع الصنائع : ۳۳۴/۲ ، أحكام القرآن للجصاص : ۲۶۹/۲ ، ط : دار الفكر ، تفسير القرطبي : ۱۷۵/۵ ، ط : دار الكتاب العربي ، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير : ۳۴۴/۲ ، ط : دار الفكر بيروت ، مغني المحتاج شرح منهاج الطالبين : ۲۶۱/۳ ، ط: دار الفكر ، المغني مع الشرح الكبير : ۱۶۶/۸ ، ط : دار الكتاب العربي ، كشاف القناع : ۲۱۱/۵ ، ط: دار الفكر)

(۱۳) ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : قوله تعالى : ﴿وإن تولوا فإنما هم=

....

= في شقاق﴾ . {البقرة :۱۳۷ } قال زيد بن أسلم : الشقاق المنازعة . وقيل : الشقاق المجادلة والمخالفة والتعدي ، وأصله من الشق وهو الجانب ، فكأن كل واحد من الفريقين في شق غير شق صاحبه .... وقيل : إن الشقاق مأخوذ من فعل ما يشق ويصعب ، فكأن كل واحد من الفريقين يحرص على ما يشق على صاحبه . (۱۴۲/۲)

وفيه أيضًا : قوله تعالى : ﴿وإن خفتم شقاق بينهما﴾ ...... فكأن كل واحد من الزوجين يأخذ شقًّا غير شق صاحبه ، أي ناحية غير ناحية صاحبه . (۱۷۴/۵)

ما في " تفسير المظهري " : قوله تعالى :﴿شقاق﴾ . يعني العداوة والخلاف ، لأن كلا من الأعداء يفعل ما يشق على صاحبه أو يميل إلى شق آخر غير شق مختار لصاحبه .
(۳۱۳/۲ ، مكتبة زكريا بكڈپو ديوبند)

ما في " روح المعاني " : الشقاق ؛ الخلاف والعداوة واشتقاقه من الشق وهو الجانب ، لأن كلا من المتخالفين في شق غير شق الآخر . (۳۹/۴ ، مكتبه زكريا ديوبند)

ما في " البحر المحيط لأبي حيان الغرناطي " : الشقاق ؛ المشاقة . (۳۴۳/۳)

ما في " مدارک التنزيل وحقائق التاويل المعروف بـ تفسير النسفي " : والشقاق ؛ العداوة والخلاف ، لأن كلا منهما يفعل ما يشُقُّ على صاحبه ، أو : يميل إلى شقّ ، أي : ناحية غير شقّ صاحبه . (۳۵۶/۱ ، مكتبه رحمانيه لا هور)

ما في " فتح القدير للشوكاني " : وأصله أن كل واحد منهم يأخذ شقًّا غير شق صاحبه : أي ناحية غير ناحيته . (۳۷۷/۱)

ما في " التفسير المنير للزحيلي " : قوله تعالى : ﴿شقاق﴾ نزاع وخصام أو خلاف ، كأن كلا منهما في شقّ وجانب . (۵۶/۳ ، مكتبة رشيدية كوئٹه)

ما في " الموسوعة الفقهية الكويتية " : الشقاق هنا ؛ هو النزاع بين الزوجين ، سواء أكان بسبب من أحد الزوجين أو بسببهما معًا ، أو بسبب أمر خارج عنهما . (۵۴/۲۹)

ما في " المغني المحتاج " : الشقاق : بكسر الشين ، أي الخلاف والعداوة بينهما مأخوذ من الشِّقِّ ، وهو الناحية إذ كل واحد صار في ناحية ، وذلک بأن دام بينهما التّسابُّ والتضاربُ وفحش ذلک . (۲۶۱/۳ ، دار الفكر بيروت)=

....

=(۱۴) ما في ” أحكام القرآن للجصاص “ : وقال اللّٰه تعالى : ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا لا تأكلوآ أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بهآ إلى الحكّام﴾ { البقرة :۱۸۸ } ، فأخبر تعالى أن الحاكم وغيره سواء في أنه لا يملك أخذَ مالِ أحدٍ ودفعَه إلى غيره . وقال النبي ﷺ : ” لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيبةٍ من نفسه “ . وقال ﷺ : فمن قضيتُ له من حق أخيه بشيء فإنما أقطعُ له قطعةً من النار “ . فثبت بذلك أن الحاكم لا يملك أخذ مالها ودفعه إلى زوجها ، ولا يملك إيقاع طلاقٍ على الزوج بغير توكيله ولا رضاه ؛ وهذا حكم الكتاب والسنة وإجماع الأمة في أنه لا يجوز للحاكم في غير ذلك من الحقوق إسقاطه ونقله عنه إلى غيره من غير رِضا من هو له . (۲/ ۲۴۱، باب الحكمين كيف يعملان ، سورة النساء ، الآية/۳۵)

وما في ” أحكام القرآن للجصاص “ : ﴿فابعثوا حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها﴾ . وحظر اللّٰه على الزوج أخذَ شيء مما أعطاها إلا على شريطة الخوف منهما ألا يقيما حدود اللّٰه ، فأباح حينئذٍ أن تفتدي بما شاءت وأحل للزوج أخذه ، فكيف يجوز للحكمين أن يُوقعا خلعًا أو طلاقًا من غير رضاهما ، وقد نص اللّٰه على أنه لا يحل له أخذ شيء مما أعطى إلا بطيبة من نفسها ولا أن تفتدي به ، فالقائل بأن للحكمين أن يخلعا بغير توكيل من الزوج مخالفٌ لنصِّ الكتاب . (۲/ ۲۴۱، سورة النساء ، الآية/۳۵)

ما في ” روح المعاني “ : قال العلامة الآلوسي : وقيل : ليس لهما ذلك ، وروي ذلك عن الحسن ، فقد أخرج عبد الرزاق وغيره أنه قال : إنما يبعث الحكمان ليصلحا ويشهدا على الظالم بظلمه ، وأما الفرقة فليست بأيديهما ، وإلى ذلك ذهب الزجاج ، ونسب إلى الإمام الأعظم . (۵/ ۲۷ ، دار احياء التراث العربي بيروت ، و: ۴/ ۴۰ ، مكتبه زكريا بكڈپو ديوبند)

ما في ” الموسوعة الفقهية “ : ذهب الحنفية إلى أن مهمة الحكمين الإصلاح لا غير ، فإذا نجحا فيه فبها ، وإلا تركا الزوجين على حالهما ليتغلبا على نزاعهما نفسيهما ، إما بالمصالحة ، أو بالصبر ، أو بالطلاق ، أو بالمخالعة ، وليس للحكمين التفريق بين الزوجين إلا أن يفوّض الزوجان إليهما ذلك ، فإن فوّضاهما بالتفريق بعد العجز عن التوفيق ، كانا وكيلين عنهما في ذلك ، وجاز لهما التفريق بينهما بهذه الوكالة .

(۲۹/ ۵۴ ، طلاق ، مهمة الحكمين)=

....

=ما في " الفتاوى التاتارخانية " : وفي شرح الطحاوي : ثم الاختلاف إذا وقع بين الزوجين فالسنة فيه أن يجتمع أهل الرجل وأهل المرأة ليصلحا بينهما ، فإن لم يجتمعا على الصلح فليس إلى الحكمين التفريق بينهما ، فإن طلقها جاز ، وإن خلعها جاز .
(۲۹/۳، الفصل السادس عشر في الخلع)

ما في " بداية المجتهد ونهاية المقتصد " : وقال الشافعي وأبوحنيفة وأصحابهما : ليس لهما أن يفرقا إلا أن يجعل الزوج إليهما التفريق . (۱۴۰/۳، باب في بعث الحكمين)

ما في " كتاب الفقه على المذاهب الأربعة " : الحنفية والشافعية قالوا : ليس للحكمين حق تطليق الزوجة ، لأن الولاية على الطلاق مختصة بالأزواج أو من ينوب عنهم ، والمال من حق الزوجة في الخلع ، فإذا أناب الزوج الحكمين في الطلاق كان لهما ذلک على الوجه السابق في مبحث الإنابة في الطلاق . (۳۳۷/۴ ، مبحث هل الخلع جائز أو ممنوع؟ وما دليل ذلک؟ دار احياء التراث العربي بيروت)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وذهب الشافعية إلى أنه إن اشتد الشقاق بين الزوجين بعث القاضي حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها ، وهما وكيلان لهما في الأظهر ، وفي قول : هما حاكمان مولّيان من الحاكم ، فعلى الأول : يشترط رضاهما ببعث الحكمين ، فيوكل الزوج حكمه حكمها ببذل عوض وقبول طلاق ، ويفرق الحكمان بينهما إن رأياه صواباً ، وإن اختلف رأيهما بعث القاضي اثنين غيرهما ، حتى يجتمعا على شيء ، وعلى القول الثاني : لا يشترط رضا الزوجين ببعثهما ويحكمان ، بما يريانه مصحلة من الجمع أو التفريق . (۵۵/۲۹)

ما في " المغني المحتاج شرح منهاج الطالبين " : فإن اشتد الشقاق بعث حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها ، وهما وكيلان لهما ، وفي قولٍ مولَّيان من الحاكم ، فعلى الأول يشترط رضاهما فيؤكل حكمه بطلاق وقبول عوض خلع ، وتؤكل حكمها ببذل عوض وقبول طلاق به {منهاج الطالبين} . وفي شرحه المغني المحتاج : فيؤكل الزوج إن شاء حكمه بطلاق وقبول عوض خلع ، وتؤكل الزوجة إن شاء ت حكمها ببذل عوض للخلع وقبول طلاق به .... ويفرق الحكمان بينهما إن رأياه صواباً ، وإن اختلف رأيهما بعث القاضي اثنين غيرهما حتى يجتمعا على شيء اهـ . (۲۶۱/۳ ، ط : دار الفكر بيروت)=

....

=(۱۵) ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قال الإمام أبوبكر الجصاص الرازي رحمه اللّٰه تعالى : لو كان الخلع إلى السلطان شاء الزوجان أو أبيا إذا علم أنهما لا يقيمان حدود اللّٰه لم يسألهما النبي ﷺ عن ذلک ولا خاطب الزوج بقوله : اخلعها ، بل كان يخلعها منه ويرد عليه حديقته وإن أبيا أو واحد منهما كما لما كانت فرقة المتلاعنين إلى الحاكم لم يقل للملاعن خلّ سبيلها بل فرق بينهما . (۱/۳۹۵ ، بحواله أحسن الفتاوى:۵/۳۸۶)

سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانی منقول ہے کہ ــــ ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حَکَم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں، جب یہ حَکَم تجویز کردیئے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟ سن لو! اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہوجاؤ تو ایسا ہی کرلو، اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہوسکتی یا قائم نہیں رہ سکتی، اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہوجائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے تو ایسا ہی کرلو، یہ سن کر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حَکَم قانونِ الٰہی کے موافق جو فیصلہ کردیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے، لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حَکَم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کردیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں بھی ان حکمین کو ایسا ہی اختیار دینا چاہیے جیسا عورت نے دے دیا۔

اس واقعہ سے بعض ائمہ مجتہدین نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ ان حکمین کا بااختیار ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فریقین سے کہہ کر ان کو بااختیار بنوایا، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حکمین کا بااختیار ہونا امر شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور فریقین سے رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی، فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حکمین بااختیار نہیں ہوتے، ہاں! میاں بیوی ان کو مختار بنادیں تو بااختیار ہوجاتے ہیں۔

(معارف القرآن:۲/۴۰۴، ۴۰۵، فرید بکڈپو نیو دہلی، قاموس الفقہ :۳/۳۶۶)

ما في " أحكام القرآن الكريم للطحاوي " : حدثنا صالح بن عبد الرحمن ، قال : حدثنا سعيد بن منصور ، قال : حدثنا هشيم ، قال : حدثنا منصور وهشام ، عن ابن سيرين ، عن عبيدة السلماني قال : جاء رجل وامرأة إلى علي رضي اللّٰه عنه ، ومع كل واحد منهما=

....

= فئام من الناس ، وقد نشزت على زوجها فقال : ابعثوا حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها ، ففعلوا ، فقال علي للحكمين : أتدرين ما عليكما ؟ قالا : وما عليها ؟ قال : عليكما إن رأيتما أن تجمعا جمعتما ، وإن رأيتما أن تفرقا فرقتما . فقالت المرأة : رضيت وسلمت ، وقال الرجل : أما بالفرقة فلا / أرضي ، فقال له علي : ليس ذلک إليک ، لست ببارح حتى ترضى ما رضيت . [أخرجه الطبري في تفسيره :۵/۱۷ ، وعبد الرزاق في المصنف :۶/۵۱۲ ، رقم :۱۱۸۸۳ ، والبيهقي في السنن :۷/۳۰۶] قال الطحاوي : أفلا ترى أن عليًّا رضي الله عنه لم يجعل إلى الحكمين أن يفرقا بين الزوج وامرأته ، والزوج يأبى ذلک حتى يجعله الزوج إليهما . فدل ذلک أنه لا يكون إليهما بالتحكيم المطلق حتى يبين ذلک لهما فيه . (الجزء الثاني من الجلد الأول:ص/۴۴۲ ، ۴۴۳ ، طبعة إستانبول)

(۱۶) ما في " الموسوعة الفقهية " : وذهب المالكية إلى أن واجب الحكمين الإصلاح أولا ، فإن عجزا عنه لتحكّم الشقاق كان لهما التفريق بين الزوجين دون توكيل ، ووجب على القاضي إمضاء حكمهما بهذا التفريق إذا اتفقا عليه وإن لم يصادف ذلک اجتهاده .

(۲۹/۵۴ ، كذا في المدونة الكبرى :۲/۲۶۷ ، كتاب إرخاء الستور ، ما جاء في الحكمين ، ط : بيروت)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : وأن للحكمين التطليق دون توكيل ، وهو قول مالک والأوزاعي وإسحاق ، وروي عن عثمان وعلي وابن عباس ، وعن الشعبي والنخعي ، وهو قول الشافعي ، لأن الله تعالى قال : ﴿فابعثوا حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها﴾ . وهذا نص من الله سبحانه بأنهما قاضيان لا وكيلان ولا شاهدان . (۵/۱۷۶ ، الآية/۳۵ ، سورة النساء ، جامع الأحكام الفقهية للقرطبي :۲/۲۸۵ ، مسألة : الحكمان المرسلان من قبل السلطان للإصلاح بين الزوجين لهما أن يفرقا بين الزوجين ، رقم المسئلة :۱۲۳۵)

ما في " بداية المجتهد ونهاية المقتصد " : واختلفوا في تفريق الحكمين بينهما إذا اتفقا على ذلک هل يحتاج إلى إذن من الزوج أو لا يحتاج إلى ذلک ؟ فقال مالک وأصحابه : يجوز قولهما في الفرقة والاجتماع بغير توكيل الزوجين ولا إذن منهما في ذلک .

(۳/۱۴۰ ، باب في بعث الحكمين ، المكتبة المدنية بديوبند)=

....

=ما في " جامع الأحكام الفقهية للقرطبي " : وجعله مالك ومن تابعه من باب طلاق السلطان على المَولى والعنين . (۲۸٦/۲، مسألة : الحكمان المرسلان من قبل السلطان للإصلاح بين الزوجين لهما أن يفرقا الخ ، المسئلة :۱۲۳۵)

ما في " بداية المجتهد ونهاية المقتصد " : ومالك يشبه الحكمين بالسلطان ، والسلطان يُطلّق بالضرر عند مالك إذا تبين . (۱۴۱/۳، باب في بعث الحكمين)

(۱۷) ما في " الموسوعة الفقهية " : ونص جمهور فقهاء المالكية والشافعية على أن بعث الحكمين واجب على الحاكم أو القاضي ، لأن آية بعث الحكمين محكمة غير منسوخة ، فالعمل بها واجب ، ولأنه من باب دفع الظلمات ، وهو من الفروض العامة على القاضي . (۳۰۹/۴۰، نشوز ، الخطاب ببعث الحكمين وحكمه)

ما في " مواهب الجليل لشرح مختصر خليل " : قوله : (وإن أشكل بعث حكمين) . اللخمي : إذا اختلف الزوجان وخرجا إلى ما لا يحل من المشاتمة والوثوب كان على السلطان أن يبعث حكمين ينظران في أمرهما وإن لم يترافعا ويطلبا ذلك منه .

(۲٦۳/۵، ۲٦۴، كتاب النكاح ، فصل في القسم بين الزوجات ، وكذا في التاج والإكليل لمختصر خليل على هامش مواهب الجليل :۲٦۳/۵، ۲٦۴، كتاب النكاح ، فصل في القسم بين الزوجات ، جواهر الإكليل شرح مختصر خليل : ۳۲۸/۱، دار الفكر، نهاية المحتاج :۳۸۵/٦، مصطفى الحلبي ، مغنى المحتاج شرح المنهاج :۲٦۱/۳، دار الفكر، كتاب الأم للشافعي : ۱۹۴/۵، دار المعرفة بيروت)

(۱۸) ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : ويجزئ إرسال الواحد ، لأن اللّٰه سبحانه حكم في الزنا بأربعة شهود ، ثم قد أرسل النبي ﷺ إلى المرأة الزانية أُنيسًا وحده .... وكذلك قال عبد الملك في المدونة . قلت : وإذا جاز إرسال الواحد فلو حكّم الزوجان واحدًا لأجزأ ، وهو بالجواز أولى إذا رضيا بذلك ...... فإن أرسل الزوجان حكمين وحكمًا نفذ حكمهما ، لأن التحكيم عندنا جائز ، وينفُذ فعل الحكم في كل مسئلة .

(۱۷۷/۵، ۱۷۸، جامع الأحكام الفقهية للقرطبي :۲۸٦/۲، مسألة جواز تحكيم الواحد بين الزوجين الخ ، رقم المسئلة : ۱۲۳۷)=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=ما في " المدونة الكبرى " : قلت : فإذا كان ذلک منهم إلى رجل واحد اجتمعوا عليه ، هل يكون بمنزلة الحكمين لهما جميعًا ؟ قال : نعم ، إنما هي من أمورهما التي لو أخذها دون من يحكم فيها كان ذلک لهما جميعًا ، فكذلک هي إلى من جعلاها إليه إذا كان يستأهل أن يكون ممن يجعل ذلک إليه . (۲/۲٦۷، ۲٦۸، كتاب إرخاء الستور ، ما جاء في الحكمين)

ما في " الموسوعة الفقهية " : اختلف الفقهاء في إقامة حكم واحد بين الزوجين في حال الشقاق ، فقال المالكية : للزوجين إقامة حكم واحد من غير رفع للحاكم يكون عدلا رشيدًا ذكرًا فقيهًا بما بُعث له ويفعل ذلک الحكم ما يفعله الحكمان من الإصلاح أو التطليق بغير مال أو بمال . (۳۱۴/۴۰ ، إقامة حكم واحد ، نشوز)

(۱۹) ما في " حاشية ابن عابدين " : وذكر الفقيه أبو الليث في " تأسيس النظائر " أنه إذا لم يوجد في مذهب الإمام قول في مسألة يُرجع إلى مذهب مالک ، لأنه أقرب المذاهب إليه. (۶۵۲/۹، قسم الأحوال الشخصية ، مكتبة دار الثقافة والتراث بدمشق سوريا)

مصادر ومراجع

رقم	أسماء الكتب	أسماء المصنفين	المكتبة	الفن
۱	القرآن الكريم			
۲	الجامع لأحكام القرآن	أبوعبدالله أحمد الأنصاري القرطبي	مكتبة الغزالي دمشق/ مؤسسة مناهل العرفان	التفسير
۳	تفسير المظهري	القاضي محمد ثناء الله فاني فتي	مكتبة زكريا ديوبند	// //
۴	الدر المنثور في التفسير المأثور	جلال الدين السيوطي	دار الكتب العلمية بيروت	// //
۵	فتح القدير في علم التفسر	محمد بن علي بن محمد الشوكاني	دار الكتب العلمية بيروت	// //
۶	تفسير النسفي	أبوالبركات عبدالله النسفي	مكتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور	// //
۷	روح المعاني	أبوالفضل شهاب الدين محمد الآلوسي	دار احياء التراث/ مكتبة زكريا ديوبند	// //
۸	البحر المحيط	أثير الدين محمد بن يوسف الغرناطي	دار احياء التراث العربي	// //
۹	التفسير الكبير	الإمام فخر الدين الرازي الشافعي	مكتبة علوم اسلاميہ لاہور	// //
۱۰	تفسير ابن كثير/مختصر تفسيره	الحافظ عماد الدين بن كثير الدمشقي/ صابوني	المكتبة التجارية الكبرى/ دار القرآن الكريم	// //
۱۱	معارف القرآن	مفتي محمد شفيع	فريد بكڈ پو نيو دہلی	// //
۱۲	تفسير ماجدی مع ترجمہ قرآن	علامہ عبدالماجد دریابادی	تاج كمپنی لاہور	// //
۱۳	التفسير المنير	الدكتور وهبة الزحيلي	مكتبة رشيديہ كوئٹہ	// //
۱۴	أحكام القرآن	أبوجعفر الأزدي الطحاوي	طبعة إستانبول	// //
۱۵	أحكام القرن	أبوبكر أحمد بن علي الجصاص الرازي	المكتبة الشيخ الهند بديوبند	// //
۱۶	السنن لإبن ماجة	أبوعبدالله محمد بن يزيد بن ماجه القزويني	مكتبة بلال ديوبند	الحديث
۱۷	إنجاح الحاجة على ابن ماجة	عبدالغني المجددي الدهلوي المدني	// // // //	// //
۱۸	بذل المجهود شرح أبي داود	الشيخ خليل أحمد السهارنفوري	دار البشائر الإسلامية	// //

۱۹	معالم السنن شرح أبي داود	أبوسليمان حمد بن محمد الخطابي البُستي	دارالكتب العلمية بيروت	// //
۲۰	عون المعبود شرح أبي داود	أبوعبدالرحمٰن شرف الحق عظيم آبادي	بيت الأفكار الدولية بيروت	// //
۲۱	نصب الراية	جمال الدين أبومحمد عبدالله الزيلعي	دارالإيمان سهارنفور	// //
۲۲	كتاب المبسوط	أبوبكر محمد بن أحمد السرخسي الحنفي	دارالكتب العلمية بيروت/ مطبعة السعادة	الفقه والفتاوى
۲۳	تنوير الأبصار (مع الدر والرد)	محمد بن عبدالله التمرتاشي	دارالكتب العلمية بيروت	// //
۲۴	حاشية ابن عابدين (ردالمحتار)	محمد أمين الشهير بابن عابدين الشامي	دارالثقافة والتراث دمشق، سوريا/ بيروت	// //
۲۵	تحفة الفقهاء	العلامة علاء الدين السمرقندي	دارالكتب العلمية بيروت	// //
۲۶	بدائع الصنائع	علاء الدين أبوبكر بن مسعود الكاساني	// // // //	// //
۲۷	البحر الرائق	زين الدين بن إبراهيم (ابن نجيم)	// // // //	// //
۲۸	تبيين الحقائق	فخر الدين عثمان بن علي الزيلعي	// // // //	// //
۲۹	حاشية الشلبي على التبيين	العلامة الشيخ الشلبي	// // // //	// //
۳۰	النهر الفائق	سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم	دارالإيمان سهارنفور	// //
۳۱	رمز الحقائق (شرح الكنز)	بدرالدين أبومحمد محمود العيني	إدارة القرآن كراتشي باكستان	// //
۳۲	فتح القدير	كمال الدين محمد المعروف بابن الهمام	دارالكتب العلمية بيروت	// //
۳۳	العناية شرح الهداية	أكمل الدين البابرتي الحنفي	دارالكتب العلمية بيروت	// //
۳۴	البناية شرح الهداية	بدرالدين أبومحمد محمود العيني	مكتبہ رشيديہ كوئٹہ	// //
۳۵	فتح باب العناية بشرح النقاية	نورالدين أبوالحسن علي الهروي القاري	دارالأرقم بيروت	// //
۳۶	الاختيار لتعليل المختار	عبدالله بن محمود بن مودود الموصلي	دارالرسالة العالمية	// //
۳۷	الفتاوى التاتارخانية	الفقيه عالم بن العلاء الأندريتي	دارالإيمان سهارنفور	// //
۳۸	الكافي في فقه الحنفي	الشيخ وهبي سليمان غاوجي	مؤسسة الرسالة بيروت	// //
۳۹	مجمع الأنهر	عبدالرحمٰن بن محمد الشهير بشيخي زاده	دارالكتب العلمية بيروت	// //
۴۰	الدرالمنتقى شرح الملتقى	محمد الحصني الشهير بالعلاء الحصكفي	// // // //	// //
۴۱	الفتاوى الهندية	شيخ نظام وجماعة من علماء الهند الأعلام	زكريا/ رشيديہ	// //
۴۲	الجوهرة النيرة شرح القدوري	أبوبكر بن علي بن محمد الحدادالزبيدي	دارالكتب العلمية بيروت	// //

۴۳	الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید	عبدالحمید محمود طهماز	دارالقلم دمشق، سوریا	// //
۴۴	الفقہ الحنفی وأدلتہ	الشیخ محمد سعید الصاغرجي	إدارۃ القرآن کراتشي	// //
۴۵	الفقہ علی المذاہب الأربعۃ	عبدالرحمٰن بن معوض الجزیري	داراحیاء التراث العربي	// //
۴۶	موسوعۃ مسائل الجمهور	الدکتور محمد نعیم محمد ہاني ساعي	مکتبۃ دارالسلام القاہرۃ	// //
۴۷	الموسوعۃ الفقہیۃ	وزارۃ الأوقاف والشئون الإسلامیۃ کویت	وزارۃ الأوقاف کویت	// //
۴۸	موسوعۃ الفقہ الإسلامي	محمد بن إبراہیم بن عبداللہ التویجری	بیت الأفکار الدولیۃ	// //
۴۹	موسوعۃ الفقہ الإسلامي المعاصر	الأستاذ الدکتور عبدالحلیم عویس	دارالوفاء	// //
۵۰	فقہ السنۃ	السید سابق	دارالفتح للإعلام العربي قاہرۃ	// //
۵۱	تعلیق شرح الزیادات	الدکتور قاسم أشرف	دارالإیمان سہارنفور	// //
۵۲	دراسۃ وتحقیق علی مجمع البحرین	إلیاس قبلان	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۵۳	التوضیح في الجمع بین المقنع والتنقیح	أحمد بن محمد بن أحمد الشویکي	مکتب مکیہ مکۃ مکرمۃ	// //
۵۴	المدونۃ الکبری	الإمام مالک بن أنس الأصبحي	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۵۵	بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد	الإما أبوالولید بن رشد القرطبي	المکتبۃ المدنیۃ بدیوبند/ مصطفیٰ البابي	// //
۵۶	حاشیۃ الدسوقي علی الشرح الکبیر	بحوالۃ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	دارالفکر بیروت	// //
۵۷	الأحوال الشخصیۃ	بحوالۃ کتاب الفسخ والتفریق		// //
۵۸	جامع الأحکام الفقہیۃ للقرطبي	فرید عبدالعزیز الجندی	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
۵۹	مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل	أبوعبداللہ محمد بن محمد الحطاب الرعیني	// // // //	// //
۶۰	التاج والإکلیل لمختصر خلیل	أبوعبداللہ محمد بن یوسف المواق	// // // //	// //
۶۱	جواہر الإکلیل لمختصر خلیل	بحوالۃ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	دارالفکر بیروت	// //
۶۲	کتاب الأم	محمد بن إدریس بن عباس بن عثمان	دارالمعرفۃ بیروت/ مکتبۃ الکلیات الأزہریۃ	// //
۶۳	نہایۃ المحتاج	بحوالۃ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	مصطفیٰ الحلبي	// //
۶۴	کشاف القناع	بحوالۃ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	دارالفکر بیروت	// //
۶۵	المغني المحتاج شرح منہاج الطالبین	محمد بن أحمد الشربیني شمس الدین	دارالفکر بیروت	// //
۶۶	المغني لإبن قدامۃ	عبداللہ بن أحمد بن محمد بن قدامۃ	دارالمنار/ مکتبۃ القاہرۃ	// //

٦٧	الإنصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف	علاء الدین أبوالحسن المرداوي حنبلی	احیاء التراث العربی	// //
٦٨	المُبدِع في شرح المُقنع	أبو إسحاق برہان الدین بن مفلح حنبلی	المکتب الإسلامي بیروت	// //
٦٩	فتاوی محمودیہ	مفتی محمود حسن گنگوہی	جامعہ فاروقیہ کراچی	// //
٧٠	منتخبات نظام الفتاوی	مولانا نظام الدین أعظمی	اسلامک فقہ اکیڈمي انڈیا	// //
٧١	أحسن الفتاوی	مفتی رشید أحمد پاکستانی	دارالإشاعت دیوبند/ بنگلہ اسلامک اکیڈمي	// //
٧٢	إمداد الأحکام	ظفر أحمد عثماني/عبدالکریم گمتھلوی	مکتبہ زکریا دیوبند	// //
٧٣	فتاوی عثماني	مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ نعیمیہ دیوبند/ معارف القرآن کراچي	// //
٧٤	کفایت المفتی	مفتی کفایت اللہ دہلوي	دارالإشاعت کراچی	// //
٧٥	إمداد المفتیین (عزیز الفتاوی)	مفتی عزیز الرحمٰن	مکتبہ زکریا بکڈ پو دیوبند	// //
٧٦	الحیلۃ الناجزۃ	حکیم الأمت أشرف علي تھانوي	مکتبہ رضي دیوبند	// //
٧٧	کتاب الفسخ والتفریق	مولنا عبدالصمد رحمانی	مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ	// //
٧٨	فقہی مقالات	مفتی تقی عثمانی	میمن اسلامک پبلیشرز کراچی	// //
٧٩	قاموس الفقہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	مکتبہ نعیمیہ دیوبند	// //
٨٠	أصول الشاشي		مکتبہ بلال بکڈ پو دہلی	أصول الفقہ
٨١	معجم لغۃ الفقہاء	محمد رواس قلعہ جي حامد صادق	إدارالقرآن کراچي	اللغات
٨٢	کتاب التعریفات	السید شریف الجرجانی	دارالکتب العلمیۃ بیروت	// //
٨٣	المصباح المنیر	أحمد بن محمد بن علي الفیومی المقری	مکتبۃ لبنان	// //
٨٤	مفردات القرآن اردو	إمام راغب أصفہانی	اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور	// //
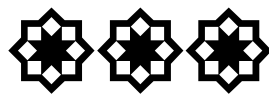
مقالہ

(۲۲؍واں فقہی سمینار[امروہہ، یوپی]۲۷-۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ/مطابق: ۹-۱۱؍مارچ ۲۰۱۳ء)

الیکشن سے مربوط شرعی مسائل

سوال:۱- ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:۱- شرعاً ووٹ کی حیثیت شہادت[۱]، شفاعت (سفارش)[۲] اور وکالت[۳] کی سی ہے، گویا کہ جس شخص کو ووٹ دیا جاتا ہے، اس کے حق میں ملک وملت کے خیر خواہ ہونے کی شہادت دی جاتی ہے، متعلقہ امیدوار کو وکیل اور نمائندہ بنایا جاتا ہے۔

سوال: ۲- اگر ووٹ شہادت کے درجے میں ہے، تو اس کا حکم شرعی کیا ہوگا؟ ووٹ دینا صرف جائز ہوگا یا مستحب یا واجب؟

جواب: ۲- [الف]: باعتبارِ حیثیتِ اُولیٰ (شہادت) اگر ووٹر پر کسی ایک امیدوار کی اہلیت اور صداقت ودیانت منکشف ہوجائے، اور ووٹر کو یہ شرحِ صدر ہو کہ متعلقہ امیدوار بہتر صلاحیت کا حامل ہے، تو پھر اپنے ووٹ (حق رائے دہی) کا استعمال واجب ہے۔[۴]

[ب]: باعتبار دیگر حیثیات (شفاعت[۵]، وکالت[۶]) مذکورہ صفات کے حامل امیدوار کے حق میں ووٹنگ امرِ مستحب ہے۔

سوال: ۳- الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۳- عام حالات میں اسلامی مزاج کے مطابق عہدہ واقتدار کی طلب غیر مستحسن ہے، کیوں کہ عہدہ کی طلب وحرص (۷) اور مسابقت ایک ایسی لذت ہے کہ اگر عہدہ چھن جائے، تو پھر حسرتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (۸)

لیکن اگر طلبِ عہدہ کے پیچھے کسی حظّ نفس کا دخل نہ ہو، بلکہ محض انسانیت کا درد، امانت ودیانت کے ساتھ مفاداتِ عامہ کے تحفظ کا جذبہ کارفرما ہو، نیز انسانوں کو صحیح فائدہ پہنچانا ،خلقِ خدا کو جبر وظلم سے نجات دلانا اور شرور وفتن سے بچانا مقصد ہو، فساق وفجار کے منتخب ہونے سے معاشرہ میں بے دینی کی ترویج کا خطرہ ہو، اوراس عہدہ ومنصب کے لائق دیگر افراد موجود نہ ہوں، بلکہ تنہا وہی شخص اس عہدہ کے لیے موزوں ہو، تو اب اس پر مذکورہ تمام مقاصد کے حصول کے لیے الیکشن میں اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا واجب ہے (۹)، البتہ وہ شخص ازخود پرچۂ اُمیدواری داخل نہ کرے، بلکہ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں پرچۂ نامزدگی داخل کریں، تاکہ وہ طلبِ عہدہ میں متہم نہ ہو۔ (۱۰)

سوال: ۴- غیر مسلم ملکوں میں اور بہت سے مسلم ملکوں میں بھی قانون ساز ادارے مخالفِ شریعت قوانین بھی بناتے ہیں، ایسی صورت میں ان اداروں کا ممبر بننا درست ہوگا یانہیں؟ خاص کر ان حالات میں کہ ہندوستان کے موجودہ قانون کے مطابق اگر کوئی پارٹی اپنے ممبروں کے لیے وہیپ جاری کردے، تو وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہوجاتا ہے، اور اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔

جواب: ۴- جن غیر مسلم و مسلم ملکوں میں قانون ساز ادارے مخالف شرع قوانین بناتے ہیں، وہاں مسلمانوں کے لیے ان اداروں کا ممبر بننا درست ہونا چاہیے، اور ایسے ممبر شخص کو چاہیے کہ جمہوری حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے، خلافِ شرع قانون سازی کے خلاف آواز اٹھاتا رہے۔ (۱۱)

رہی یہ بات کہ بسا اوقات پارٹی کی طرف سے وھیپ (Party whip) جاری ہونے پر، ایسا شخص پارٹی پالیسی کے مطابق ووٹ دینے کا پابند ہوتا ہے، اور اپنی ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا اختیار نہیں رکھتا، تو یہ خصوصی صورت ہوتی ہے، عمومی نہیں، اور اعتبار غلبہ کا ہوتا ہے شاذ و نادر کا نہیں (۱۲)، اور فقہ کا قاعدہ ہے: "**الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف**" کہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان گوارا کرلیا جاتا ہے (۱۳)، مذکورہ اداروں کا ممبر بننا یہ ضررِ اخف ہے، اور ممبر نہ بن کر اُمت کو بڑے خطرات اور نقصانِ عظیم میں ڈالنا یہ ضررِ اشد ہے، لہٰذا ضررِ اخف (ممبر بننے) کا ارتکاب کر کے ضررِ اشد (امت کو نقصان عظیم میں ڈالنے) سے بچا جائے گا۔

سوال: ۵- جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوں، انہیں دستور سے وفاداری کا حلف اُٹھانا پڑتا ہے، اور دستور میں بہت سی دفعات خلافِ شریعت بھی ہوتی ہیں، تو یہ عمل کہاں تک درست ہوگا؟

جواب: ۵- جو لوگ قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں، جب انہیں حلف دلایا جاتا ہے، اس وقت حلف میں دستور کی تمام دفعات تفصیلاً مذکور نہیں ہوتیں، بلکہ اجمالی طور پر دستور سے وفاداری کا حلف دلایا جاتا ہے، تو مسلم ممبر کو چاہیے کہ وہ

حلف اٹھاتے وقت اپنے دل میں انہی دفعات کے ساتھ وفاداری کی نیت (توریہ) کرے، جو موافقِ شرع ہیں، نہ کہ ان دفعات کی جو شریعت کے خلاف ہیں، اس طرح حلف اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔ (۱۴)

سوال: ۶- بعض عیسائی ملکوں میں ہر ممبر کو بائبل پر حلف لینا پڑتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، تو کیا مسلم ارکان کے لیے یہ عمل درست ہوگا؟

جواب: ۶- یہاں بھی توریہ والی صورت اختیار کی جاسکتی ہے، کہ بائبل کی جو باتیں غیر محرف ہیں، حلف لیتے وقت دل میں صرف ان کی نیت کرے، نہ کہ محرف کی۔ (حوالہ سابق)

سوال: ۷- بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالفِ اسلام، یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، کیا ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا جائز ہوگا؟

جواب: ۷- بعض سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کے منشور کی بعض دفعات مخالف اسلام یا مسلم مفادات کے مغایر ہوتی ہیں، ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا باعتبارِ عموم درست ہونا چاہیے۔ (۱۵)

سوال: ۸- جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں، اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمان کی مخالفت شامل ہو، یا کسی مسلمان کے لیے اس پارٹی میں شریک ہونا جائز ہوگا؟ نیز اگر کسی کی نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہو کر اس کے ایجنڈے کو بدلنے

کی کوشش کرے گا، تو کیا اس کے لیے اس پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش ہوگی؟

جواب: ۸- جو سیاسی پارٹیاں کھلے طور پر مسلم دشمن ہیں اور ان کے منشور میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شامل ہے، اور کسی شخص کی یہ نیت ہو کہ وہ پارٹی میں شریک ہوکر اس کے ایجنڈے کو بدلنے کی کوشش کرے گا، تو ایسی پارٹی میں شامل ہونے کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، کیوں کہ اس طرح کی پارٹیوں میں شرکت اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں تعاوُن کے مترادف ہے، جو شرعاً ممنوع ہے۔ (۱۶)

سوال: ۹- ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرنا جائز ہوگا؟ جب کہ اسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز ایک احساس یہ بھی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی مرتکز نہیں ہوتی ہے، وہاں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلمان مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے، اور اس سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اُٹھا لیتی ہیں۔

جواب: ۹- ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت کا قائم کرنا، جب کہ اُسے سیکولر ایجنڈے کے تحت ہی کام کرنا پڑتا ہے، نیز جب یہ احساس بھی ہے، بلکہ مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی مرتکز نہیں ہوتی، اور مسلم سیاسی جماعت کا قیام مسلم مخالف ووٹ کو متحد کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے فرقہ پرست تنظیمیں فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت کا قائم کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ دفعِ ضرر جلبِ منفعت سے اَولیٰ ومقدم ہے۔ (۱۷)

سوال: ۱۰- ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ الیکشن میں خواتین کا کیا کردار ہونا

چاہیے؟ کیا نہیں ووٹنگ میں حصہ لینا چاہیے، کیا ان کے لیے الیکشن میں امیدوار بننا جائز ہے؟ کیا وہ قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں؟ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندوستان میں تیزی سے یہ رجحان پنپ رہا ہے کہ سیاست میں عورتوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جائے، اس کے لیے مختلف ریاستوں میں اور مختلف سطحوں پر خواتین کے لیے سیٹیں ریزرو کی جارہی ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں پنچایت کی سطح پر پچاس فی صد سیٹیں عورتوں کے لیے ریزرو کردی گئی ہیں، اورلوک سبھا سے پارلیمنٹ میں خواتین کے لیے ۳۳ ؍فی صد ریزرویشن کا بل پیش کیا جاچکا ہے؟ اورقوی امید ہے کہ مستقبل میں یہ قانون کی شکل اختیار کرلے۔

جـــــــواب: ۱۰- **[الف]:** خواتین انتخابات کے موقع پر اپنا حق رائے دہی (ووٹ) کا استعمال کرسکتی ہیں (۱۸)، بشرطیکہ پردہ اور دیگر امورِ شرعیہ کا لحاظ وخیال کریں، ورنہ ارتکابِ معصیت سے ووٹ کا ترک افضل ہے، حضرت مفتیٔ اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”عورتوں کا ووٹر بننا ممنوع نہیں ہے، ہاں! ووٹ دیتے وقت شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا۔“(۱۹)

[ب]: بطور امیدوار کھڑا ہونا عورتوں کے لیے مستحسن نہیں ہے، کیوں کہ اس میں ضروریاتِ شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت عورتوں کے لیے متعذر ہے (۲۰)، لیکن اگر ضروریاتِ شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت ممکن ہو، تواس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ (۲۱)

[ج]: عورتیں قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں، البتہ ضروریاتِ شرعیہ کی رعایت

بھی لازم ہوگی، جیسا کہ ''کفایت المفتی'' کے ایک سوال وجواب سے مستفاد ہوتا ہے:

''**سوال:** کونسلوں اوراسمبلیوں میں جہاں مسلم عورتوں کی نشست محفوظ ہوعورتوں کاممبر بننا جائز ہے یانہیں؟ **جواب:** عورتوں کا کونسل میں جانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا، لیکن اگر جائیں، تو حجاب کے ساتھ جانا ضروری ہوگا۔'' (۹/۴۱۸، عورتوں کا کونسل میں جانا)

نیز ''فتاویٰ حقانیہ'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

''اس پُرفتن دور میں حالات کے پیشِ نظر عورت کو اسمبلی یا پارلیمنٹ کی رُکنیت حاصل کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، اس لیے کہ موجودہ حالات میں انتخابات کے لیے مہم چلانے کے دوران عورت کے لیے پردہ برقرار رکھنا مشکل نظر آتا ہے، تاہم اگر عورت انتخابات میں اس طرح حصہ لے کہ شرعی پردے کا خاص خیال رہے، اور کسی غیر شرعی امور کا ارتکاب نہ کرے، تو اس صورت میں عورت کے لیے انتخاب لڑنا اور پارلیمنٹ میں اس کو رکنیت دینا شرعاً جواز کی گنجائش ہے، اس لیے کہ ارکانِ اسمبلی و پارلیمنٹ عوام اور قوم کی طرف سے اُن کے وکلاء ہوتے ہیں، اور عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ کسی فرد کی وکیل بنے۔''[۲۲] (۲/۳۱۷-۳۱۸)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في '' التنوير وشرحه مع الشامية '' : (هي) لغة خبر قاطع – وشرعًا : (إخبار صدق لإثبات حق) . فتح . (تنوير مع الدر) وفي الشامية : قال في البحر : هي اخبار عن مشاهدة وعيان لا عن تخمين وحسبان . (۱۱/۷۷ ، كتاب الشهادات ، دار الكتب العلمية بيروت)

(فتاویٰ بینات: ۳/۵۰۶-۵۰۷، کتاب الامارة والقضاء، ووٹ کی شرعی حیثیت، فتاویٰ حقانیہ: ۲/۳۰۲، کتاب السیاسة، ووٹ کی شرعی حیثیت)

ما في '' درر الحكام شرح مجلة الأحكام '' : الشهادة هي الإخبار صدقًا عن يقين وعيان=

....

=بلفظ من الشهادة . (٣٤٦/٤ ، تعريف الشهادة ونصابها ، تحت مادة : ١٦٨٤)

ما في " العناية شرح الهداية " : وهي في اللغة عبارة عن الإخبار بصحة الشيء عن مشاهدة وعيان ...... وفي اصطلاح أهل الفقه : عبارة عن إخبار صادق في مجلس الحكم بلفظ الشهادة . الخ . (٢٣١/٤ ، كتاب الشهادات ، ط : بيروت)

(٢) ما في " الموسوعة الفقهية " : الشفاعة هي التوسط بالقول في وصول شخص إلى منفعة دنيوية أو أخروية أو إلى إخلاص من مضرة كذلك . (١٣١/٢٦ ، روح المعاني : ١٤٣/٤ ، سورة النساء ، الآية/٨٥) (فتاویٰ حقانیہ:٣٠٢/٢، کتاب السیاسۃ، ووٹ کی شرعی حیثیت)

(٣) ما في " حاشية الجوهرة النيرة " : الوكالة عقد تفويض ينيب فيه شخص شخصًا آخر عن نفسه في التصرف . (٦٣٦/١ ، كتاب الوكالة ، تحقيق الياس قبلان)

ما في " العناية شرح الهداية " : وفي اصطلاح الفقهاء : عبارة عن إقامة الإنسان غيره مقام نفسه في تصرف معلوم ، وهي عقد جائز بالكتاب وهو قوله تعالى : ﴿فابعثوٓا أحدكم بورقكم هذهٖٓ إلى المدينة﴾ [الكهف : ١٩] ولم يلحقه النكير .

(٣٢٢/٤ ، كتاب الوكالة ، اللباب في شرح الكتاب للميداني : ١٣٨/٢ ، ط : احياء التراث العربي ، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة : ١٣٥/٣ ، مباحث الوكالة ، تعريفها)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : (وهو إقامة الغير مقام) نفسه .... (في تصرف جائز معلوم) . (٣٦٥/١١-٣٦٦ ، كتاب الوكالة ، الموسوعة الفقهية : ٥/٤٥ ، وكالة ، تبيين الحقائق : ٢٥٤/٤ ، ط : دار الكتاب الإسلامي)

(جواہر الفقہ :٢٩٣/٢-٢٩٤، مکتبہ تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند، فقہی مقالات:٢٨٩/٢، میمن اسلامک پبلیشرز کراچی، جدید فقہی مسائل:٢٦٥/١-٢٦٦، کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ کلاتھ مارکیٹ راولپنڈی، المسائل المہمۃ:٢/ ١٨٥، فتاویٰ بینات:٥٠٦/٣-٥٠٧، کتاب الامارۃ والقضاء، فتاویٰ حقانیہ: ٣٠٢/٢، کتاب السیاسۃ، فتاویٰ اشاعت العلوم غیر مطبوعہ: رقم الفتویٰ:١٤٢-رج:٢)

(٤) ما في " القرآن الكريم " : ﴿كونوا قوّامين لله شهدآء بالقسط﴾ . [المائدة :٧] ﴿كونوا قوّامين بالقسط شهدآء لله﴾ . [نساء :١٣٥] ﴿وأقيموا الشهادة لله﴾ . [طلاق :٢] ﴿ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه اٰثم قلبه﴾ . [البقرة:٢٨٣]=

....

=ما في " المعجم الأوسط للطبراني " : عن أبي بردة ، عن أبيه ، عن النبي ﷺ قال : " من كتم شهادةً إذا دُعي إليها كان كمن شهد بالزّور " . ''جس کسی کوشہادت کے لیے بلایا جائے پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا''۔

(۱۵٦/۳ ، رقم الحديث :۴۱٦۷ ، بيروت ، جمع الفوائد : ۲٦۲/۱)

ما في " صحيح مسلم " : عن زيد بن خالد الجهني ، أن النبي ﷺ قال : " ألا أخبركم بخير الشهداء ، الذي يأتي بشهادته قبل أن يُسألها " . ''کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کردے''۔

(۲۹٦/٦ ، رقم الحديث : 1719/ ۴۴٦۵ ، كتاب القضاء ، باب بيان خير ا لشهود ، احياء التراث العربي ، جمع الفوائد : ۲٦۱/۱)

(فقہی مقالات:۲/ ۲۸۹-۲۹۱، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل اوران کا شرعی حل:ص/ ٦۹-۷۰)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : ﴿ولا يأب الشهداء إذا ما دُعوا﴾ ..... فإذا كانت الفسحة لكثرة الشهود والأمن تعطّل الحق فالمدعو مندوب وله أن يتخلّف لأدنى عذر ، وإن تخلّف لغير عذر فلا إثم عليه ولا ثواب له ، وإذا كانت الضرورة وخيف تعطل الحق أدنى خوف قوى الندب وقرب من الوجوب ، وإذا علم أن الحق يذهب ويتلف بتأخر الشاهد عن الشهادة فواجب عليه القيام بها لا سيما ان كانت محصّلة وكان الدعاء إلى أدائها. (۳۹۸/۳ ، سورة البقرة : ۲۸۲)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : وقوله تعالى : ﴿ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه اثم قلبه﴾ .... فهو عموم في سائر الشهادات التي يلزم الشاهد إقامتها وأداء ها ، وهو نظير قوله تعالى : ﴿وأقيموا الشهادة لله﴾ . [الطلاق :۲] وقوله : ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا كونوا قوّامين بالقسط شهدآء لله ولو علىٓ أنفسكم﴾ . [النساء :۱۳۵] فنهى الله تعالى الشاهدَ بهذه الآيات عن كتمان الشهادة التي تركها يؤدّي إلى تضييع الحقوق .

(۲۴۸/۱ ، سورة البقرة ، الآية/۲۸۳)

وفيه أيضًا : وقوله تعالى : ﴿وأقيموا الشهادة لله﴾ فيه أمر بإقامة الشهادات عند الحكام على الحقوق كلها ...... فانتظم ذلک معنيين : أحدهما الأمر بإقامة الشهادة ، والآخر=

....

= أن إقامة الشهادة حق لله تعالى ، وأفاد بذلک تأكيده والقيام به .

(۶۱۰/۳ ، سورة الطلاق ، الآية/۲)

ما في " العناية شرح الهداية " : قال : (الشهادة فرض تلزم الشهود الخ) أداء الشهادة فرض يلزم الشهود بحيث لا يسعهم كتمانه أكّد الفرض بوصفين وهو اللزوم وعدم سعة الكتمان دلالة على تأكّده . (۲۳۱/۴ ، كتاب الشهادات)

(۵) ما في " تفسير المظهري " : ﴿من يشفع شفاعة حسنة﴾ راعى بها حق مسلم ودفع بها عنه ضررًا أو جلب نفعًا لوجه الله تعالى ﴿يكن له﴾ أي للشافع ﴿نصيبٌ منها﴾ وهو ثواب الشفاعة ، قال مجاهد : هي شفاعة بعضهم لبعض ويؤجر الشفيع على شفاعته وإن لم يُشفّع ، كذا روى ابن أبي حاتم وغيره عن الحسن ، وعن أبي موسى قال : كان النبي ﷺ إذا جاءه رجل يسئل أو طلب حاجة أقبل علينا بوجهه فقال : " اشفعوا تؤجروا ويقضي الله على لسان نبيه ما شاء " متفق عليه . (۳۸۷/۲ ، سورة النساء ، الآية/۸۵ ، التفسير الكبير للرازي : ۱۵۹/۴ ، روح المعاني : ۱۴۳/۴ - ۱۴۴)

ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : ﴿تَرْكُ الإحْسَانِ لا يكُوْنُ إسَاءَ ةً﴾ .
''احسان کوترک کرنا گناہ نہیں ہوتا۔'' (ص/۱۴۴ ، قاعدة : ۸۷ ، شرح السير الكبير : ۱۱۰/۳ ، باب ما يحمل عليه الفيء وما يركبه الرجل من الدواب ، قواعد الفقه : ص/۷۰ ، قاعدة : ۸۲)

(۶) ما في " العناية شرح الهداية " : وفي اصطلاح الفقهاء : عبارة عن إقامة الإنسان غيره مقام نفسه في تصرف معلوم ، وهي عقد جائز بالكتاب وهو قوله تعالى : ﴿فابعثوٓا أحدكم بورقكم هذهٓ إلى المدينة﴾ [الكهف : ۱۹] ولم يلحقه النكير . (۳۲۲/۴ ، كتاب الوكالة ، اللباب في شرح الكتاب للميداني : ۱۳۸/۲ ، ط : احياء التراث العربي ، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة : ۱۳۵/۳ ، مباحث الوكالة ، تعريفها ، الأصول والقواعد للفقه الإسلامي : ص/۱۴۴ ، القاعدة : ۸۷)

(۷) ما في " مشكوة المصابيح " : عن عبد الرحمن بن سمرة قال : قال لي رسول الله ﷺ : " لا تسأل الامارة فإنک إن أُعطِيتَها عن مسئلة وُكِلتَ إليها ، وإن أُعطيتها عن غير مسئلة أُعِنتَ عليها " . متفق عليه . ''عبدالرحمٰن بن سمرۃ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عہدہ کی طلب مت کرو، اگر تم کو بلا طلب عہدہ مل جائے تو اللہ کی نصرت تم پر نازل=

....

= ہوگی، اور طلب کے بعد کوئی عہدہ حاصل کروتو اس کے ذمہ دار تم خود قرار پاؤ گے۔‘‘

(ص/ ۳۲۰ ، کتاب الإمارة والقضاء ، الفصل الأول ، قديمي)

ما في ’’ مشكوة المصابيح ‘‘ : عن أبي موسى قال : دخلت على النبي ﷺ أنا ورجلان من بني عمّي فقال أحدهما : يا رسول اللّٰه ! أمِّرنا على بعض ما ولّاک اللّٰه وقال الآخر مثلَ ذلک فقال : ’’ إنا واللّٰه لا نولّي على هذا العمل أحدًا سأله ولا أحدًا حرص عليه ‘‘ . وفي رواية : قال : ’’ لا نستعمل على عملنا من أراده ‘‘ . متفق عليه . ’’حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اور میرے دو چچازاد بھائی خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، اور دونوں نے یکے بعد دیگرے حضور ﷺ سے کسی عہدہ کی درخواست کی، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم اللہ کی قسم یہ ذمہ داری ہرگز کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کرتے جو اس کا طلب گار یا امیدوار ہو۔‘‘

(ص/ ۳۲۰ ، کتاب الإمارة والقضاء ، الفصل الأول ، قديمي)

(۸) ما في ’’ مشكوة المصابيح ‘‘ : عن أبي هريرة عن النبي ﷺ : ’’ إنكم ستحرصون على الإمارة وستكون ندامة يوم القيامة فنعم المرضعة وبئست الفاطمة ‘‘ . رواه البخاري . ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عنقریب تم عہدوں کی مسابقت میں کود پڑو گے، حالانکہ یہ قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگا، دودھ دینے والا اور لذت بخش عہدہ بہت اچھا لگتا ہے، لیکن جب عہدہ چھن جاتا ہے اور دودھ کا تھن منہ سے نکل جاتا ہے، تو اتنا ہی برا لگتا ہے، پھر کیا حاصل ایسی لذتوں کا جن کے بعد حسرتوں کا سامنا کرنا پڑے۔‘‘

(ص/ ۳۲۰ ، کتاب الامارة والقضاء ، الفصل الأول ، قديمي)

ما في ’’ مشكوة المصابيح ‘‘ : عن أبي هريرة قال : قال رسول اللّٰه ﷺ : ’’ تجدون من خير الناس أشدّهم كراهية لهذا الأمر حتى يقع فيه ‘‘ . متفق عليه . ’’حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ہمیشہ دیکھو گے کہ اچھے لوگ اس دوڑ سے دور بھاگتے ہیں جب تک کہ اس میں مبتلا نہ ہو جائیں۔‘‘ (ص/ ۳۲۰ ، کتاب الإمارة والقضاء ، الفصل الأول ، قديمي)

(۹) ما في ’’ البحر الرائق ‘‘ : وليس النهي عن السؤال على إطلاقه بل مقيد بأن لا يتعين للقضاء أما إن تعين بأن لم يكن أحد غيره يصلح للقضاء وجب عليه الطلب صيانة لحقوق المسلمين ودفعا لظلم الظالمين . (۴۵۹/۶ ، کتاب القضاء ، بیروت ، فتح القدير : ۲۴۴/۷،=

....

=الفتاوى البزازية على هامش الهندية : ۵/ ۱۳۱ ، الأحكام السلطانية للماوردي : ص/۷۵)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿اجعلني على خزآئن الأرض إني حفيظ عليم﴾ . ''(یوسف نے) کہا مجھے ملک کے پیداواروں پر مامور کردیجیے میں دیانت (بھی) رکھتا ہوں علم (بھی) رکھتا ہوں۔'' (سورة يوسف : ۵۵)

ما في " التفسير الماجدي " : ''یعنی ایسے بڑے اور ذمہ دارانہ عہدہ کے لیے ضرورت دو ہی چیزوں کی ہوتی ہے، ایک دیانت وامانت، دوسرے اس کام سے واقفیت، سوجھ میں یہ دونوں وصف موجود ہیں، حضرت یوسف کا عہدہ گویا آج کل کی اصطلاح میں وزیر مال (ریونیو منسٹر)، اور وزیر خزانہ (فنانس منسٹر) کا جامع تھا۔ اجعلنی علی خزائن الارض۔...... مفسرین نے لکھا ہے کہ جب مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری، تو اپنے کو عہدہ ومنصب کے لیے پیش کردینا ناجائز نہیں، یہاں تک کہ غیر مسلم نظام حکومت کے ماتحت بھی عہدہ ومنصب قبول کرلینا مطلق صورت میں حرام نہیں۔ انی حفیظ علیم۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی کو واقف کرنے کے لیے اپنے فضل وکمال کو بیان کردینا بالکل جائز ہے۔...... مرشد تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں دلالت ہے کہ منصب وحکومت کی درخواست جب کہ اس میں مخلوق کا نفع ہو اور خود اپنا یہ ضرر نہ ہو کہ غیر اللہ میں مشغول ہوجائے قادح کمال نہیں۔'' (ص/ ۴۹۷، سورۂ یوسف، آیت نمبر: ۵۵، حاشیہ نمبر: ۱۱۰)

ما في " بيان القرآن للتهانوي " : اجعلني الخ – ''معلوم ہوا کہ جب کسی کام کی لیاقت اپنے اندر منحصر دیکھے خود اس کی درخواست جائز ہے مگر مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری۔'' (۲/ ۲۵۴، ادارہ تالیفات اشرفیہ پاکستان)

ما في " معارف القرآن " : ''اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں، تو اس کے لیے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی درخواست کرے، مگر اپنے جاہ ومال کے لیے نہیں، بلکہ خدمتِ خلق کے لیے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے [قرطبی]۔'' (۵/ ۹۱)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : لو علم إنسان من نفسه أنه يقوم بالحق في القضاء أو الحسبة ولم يكن هناک من يصلح ولا يقوم مقامه لتعين ذلک عليه ، ووجب أن يتولاها ويسأل ذلک ، ويخبر بصفاته التي يستحقها به من العلم والكفاية وغير ذلک ، كما قال يوسف عليه السلام ؛ فأما لو كان هناک من يقوم بها ويصلح لها وعلم بذلک فالأولى ألا يطلب ، لقوله عليه السلام لعبد الرحمن : " لا تسأل الإمارة " فإن في سؤالها والحرص عليها مع العلم بكثرة آفاتها وصعوبة التخلص منها دليل على أنه يطلبها لنفسه ولأغراضه . الخ .... الرابع : – أنه رأى ذلک فرضا متعينا عليه ؛ لأنه لم يكن هنالک غيره ، وهو الأظهر . والله اعلم . (۹/ ۲۱٦ – ۲۱۷)

ما في " روح المعاني " : ﴿إني حفيظ﴾ لها ممن لا يستحقها .... وفيه دليل على جواز مدح الإنسان نفسه بالحق إذا جهل أمره ، وجواز طلب الولاية إذا كان الطالب ممن يقدر على إقامة =

....

=العدل وإجراء أحكام الشريعة وإن كان من يد الجائر أو الكافر ، وربما يجب عليه الطلب إذا توقف على ولايته إقامة واجب مثلا . (۸/۸ ، الآية/۵۵)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : فقال يوسف : ﴿اجعلني على خزآئن الأرض إني حفيظ عليم﴾ ، فوصف نفسه بالعلم والحفظ . وفي هذا دلالة على أنه جائز للإنسان أن يصف نفسه بالفضل عند من لا يعرفه ، وأنه ليس من المحظور من تزكية النفس في قوله تعالى : ﴿فلا تزكوا أنفسكم﴾ [النجم : ۳۲] . (۲۲۵/۳ ، مطلب : يجوز للإنسان أن يصف نفسه بالفضل عند من لا يعرفه)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿رب هب لي مُلكا لا ينبغي لأحد من بعدي إنک أنت الوهّاب﴾ . (سورة صٓ : ۳۵)

ما في " أحكام القرآن لإبن العربي " : ... كيف سأل سليمان الملک ، وهو من ناحية الدنيا ؟ قال علماؤنا : إنما سأله لُيقيم فيه الحق ، ويستعين به على طاعة الله ، كما قال يوسف: ﴿اجعلني على خزائن الأرض ، إني حفيظ عليم﴾ . كما تقدمت الإشارة إليه . (۱۶۴۹/۲)

ما في " أحكام القرآن للتهانوي " : ويستدل بالآية على أحكام : .... الأول جواز طلب الملک والمنزلة في الدنيا إذا كان الغرض صالحًا ، كما وقع من نبي الله يوسف عليه السلام حيث قال : ﴿اجعلني على خزآئن الأرض إني حفيظ عليم﴾ وكما طلب سليمان عليه السلام ملكا لا ينبغي لأحد من بعده . الخ . (۴۳/۴، جواز طلب الملک والجاه لغرض صالح)

(۱۰) علامہ کاسانی کتاب آداب القاضی میں تحریر فرماتے ہیں:

''عہدۂ قضا کے طالب کو منصبِ قضا دینا ناجائز نہیں ہے، اگر اس میں اس عہدہ کی واقعی اہلیت موجود ہو تو باتفاق فقہاء ایسے شخص کو عہدۂ قضا دینا درست ہے، البتہ بہتر ہے کہ ایسے شخص کے بجائے کسی ایسے شخص کو تلاش کیا جائے جس میں عہدہ کی طلب نہ ہو، اس لیے کہ طلب کی بنا پر انسان اپنے حق میں متہم ہوجاتا ہے۔'' " وأما ترک الطلب فليس بشرط لجواز التقليد بالإجماع ، فيجوز تقليد الطالب بلا خلاف ، لأنه يقدر على القضاء بالحق ، لكن لا ينبغي أن يقلد ، لأن الطالب يكون متهمًا " .

(۹۱/۹ ، كتاب آداب القاضي ، فصل في من يصلح للقضاء ، بيروت)

(غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اوران کا شرعی حل:ص/ ۵۵)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اگر واقع میں وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے، یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت ودیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا ہے تو اس=

....

= کا یہ عمل کسی حدتک درست ہے، اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کردے۔'' (جواہر الفقہ :۲/۲۹۱،مطبوعہ دیوبند، غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اوران کا شرعی حل:ص/۵۶،فتاویٰ حقانیہ:۲/۳۱۵،انتخابات میں خود امیدوار بننا)

(۱۱) ما في " معارف القرآن " : ''ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلاف شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کرلے تو اگر چہ اس کافر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم وجور کا اندیشہ قوی ہو تو بمجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہوجاتی ہے، جس میں خود کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیوں کہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اعانت کا فائدہ حاصل ہوجائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین صحابہ وتابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم وجابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کرلینا ثابت ہے [قرطبی ومظہری]۔'' (۹۲/۵)

(۱۲) ما في " قواعد الفقه " : " العبرة للغالب الشائع لا للنادر " . [مجلة استنبول] (ص/۹۱، القاعدة :۱۸۴، درر الحكام : ۱/۵۰ ، المادة : ۴۱ ، القواعد الفقهية :ص/۱۳۰ ، ۲۲۷ ، شرح القواعد :ص/۲۳۵، جمهرة القواعد : القاعدة : ۱۸۴۱ ، القواعد الكلية والضوابط الفقهية : ص/۲۶۷ ، شرح السير الكبير :۱۹۵/۴ ، باب ما يحل للمسلمين أن يدخلوه دار الحرب من التجارات ، الأصول والقواعد للفقه الإسلامي :ص/۲۰۴، القاعدة : ۱۹۶)

(۱۳) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : اَلضَّرَرُ الأَشَدُّ يُزَالُ بِالضَّرَرِ الأَخَفِّ . (ص/۱۸۹، القاعدة : ۱۸۰، الأشباه والنظائر : ۱/۳۱۵، القاعدة الخامسة : الضرر يزال ، ط : فقيه الأمت ديوبند ، درر الحكام : ۱/۴۰ ، المادة : ۲۷ ، قواعد الفقه :ص/۸۸ ، القاعدة : ۱۶۵ ، القواعد الفقهية :ص/۲۵۰ – ۲۷۶ ، شرح القواعد :ص/۱۹۹ ، شرح السير الكبير : ۱۴/۵ ، باب من الرهن يأخذه المسلمون والمشركون منهم)

(۱۴) ما في " الموسوعة الفقهية " : التورية : وهي أن تُطلِق لفظا ظاهرا (قريبا) في معنى تُريدَ به معنى آخر (بعيدا) يتناوله ذلک اللفظ لكنه خلاف ظاهره . [المصباح المنير :ص/۲۵۷] (۱۲/۲۴۸ ، تعريض)=

....

=ما في " معجم لغة الفقهاء " : التورية : من ورّى ؛ إرادة المتكلم بكلامه أمرا خفيا غير الظاهر منه (Dissimulation). (ص/١٥١)

ما في " رياض الصالحين للنووي " : اعلم أن الكذب وإن كان أصله محرما فيجوز في بعض الأحوال بشروط قد أوضحتها في كتاب " الأذكار " . ومختصر ذلک أن الكلام وسيلةٌ إلى المقاصد فكل مقصود محمود يمكن تحصيله بغير الكذب يحرم الكذب فيه وإن لم يمكن تحصيله إلا بالكذب جاز الكذب . ثم إن كان تحصيل ذلک المقصود مباحا كان الكذب مباحا ، وإن كان واجبا كان الكذب واجبا ، فإذا اختفى مسلم من ظالم يريد قتله أو أخذ ماله وسئل انسان عنه وجب الكذب بإخفائه . وكذا لو كان عنده وديعة وأراد ظالم أخذها وجب الكذب بإخفائها ، والأحوط في هذا كله أن يُورّى ، ومعنى التورية : أن يقصد بعبارته مقصودا صحيحا ليس هو كاذبا بالنسبة إليه ، وإن كان كاذبا في ظاهر اللفظ ، وبالنسبة إلى ما يفهمه المخاطَبُ ، ولو ترک التورية وأطلق عبارة الكذب فليس بحرام في هذا الحال . واستدل العلماء بجواز الكذب في هذا الحال بحديث أم كلثوم رضي الله عنها أنها سمعت رسول الله ﷺ يقول : " ليس الكذّاب الذي يُصلح بين الناس فينمي خيرا أو يقول خيرا " . [متفق عليه] زاد مسلم في رواية : قالت أم كلثوم : " ولم أسمعه يرخّص في شيء مما يقول الناس إلا في ثلاث : تعني ؛ الحربَ ، والإصلاحَ بين الناس ، وحديث الرجل امرأته ، وحديث المرأة زوجها " . (ص/٢٤٨، باب بيان ما يجوز من الكذب ، ط : دار القاسم الرياض ، رياض الصالحين :ص/٣٥٢، ط : فيصل پبليكشنز)

ما في " صحيح البخاري " : عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : " لم يكذب إبراهيم عليه السلام إلا ثلاث كذبات : ثنتين منهنّ في ذات الله عزّ وجلّ ، قوله : ﴿إني سقيم﴾ [الصافات : ٨٩] وقوله : ﴿بل فعله كبيرهم هذا﴾ [الأنبياء : ٦٣] وقال : بينا هو ذاتَ يوم وسارةُ ، إذ أتى على جبّار من الجبابرة فقيل له : إن هاهنا رجلا معه امرأة من أحسن الناس ، فأرسل إليه فسأله عنها ، فقال : من هذه ؟ قال: أختي ، فأتى سارةَ ، قال : يا سارةُ ليس على وجه الأرض مؤمن غيري وغيرَكِ ، وإن هذا سألني فأخبرته أنک أختي فلا تُكذِّبيني . الخ . الحديث .

(ص/٤٧٥، رقم : ٣٣٥٨، كتاب أحاديث الأنبياء ، باب قول الله تعالى : =

....

=﴿واتخذوا إبراهيم خليلا﴾ [النساء :۱۲۵] ، احياء التراث العربي بيروت ، صحيح مسلم : ۴۵۸/۷ ، كتاب الفضائل ، باب من فضائل إبراهيم الخليل ﷺ ، رقم :۶۰۹۷، 2371 ، بيروت)

ما في '' عمدة القاري '' : وما جاء في هذا إنما هو على التورية وطريق المعاريض . (۳۸۳/۱۳ ، كتاب الصلح ، باب ليس الكاذب الذي يصلح بين الناس ، رقم :۲۶۹۲ ، ط : كوئٹه)

ما في '' فتح الباري '' : واتفقوا على جواز الكذب عند الاضطرار .

(۳۶۹/۵ ، ط: دار السلام الرياض)

ما في '' شرح صحيح مسلم للنووي '' : قوله : (قال ابن شهاب : ولم أسمع يرخص في شيء مما يقول الناس كذب إلا في ثلاث – الحرب والإصلاح بين الناس ، وحديث الرجل امرأته وحديث المرأة زوجها) قال القاضي : لا خلاف في جواز الكذب في هذه الصور . واختلفوا في المراد بالكذب المباح فيها ما هو فقالت طائفة : هو على إطلاقه وأجازوا قول ما لم يكن في هذه المواضع للمصلحة ، وقالوا : الكذب المذموم ما فيه مضرة واحتجوا بقول إبراهيم ﷺ : ﴿بل فعله كبيرهم﴾ [الأنبياء :۶۳] ﴿إني سقيم﴾ [الصافات : ۸۹] وقوله : ''إنها أختي '' . وقول منادي يوسف ﷺ : ﴿أيتها العير إنكم لسارقون﴾ [يوسف : ۷۰] قالوا : ولا خلاف أنه لو قصد ظالم قتل رجل هو عنده مختف وجب عليه الكذب في أنه لا يعلم أين هو ؟ وقال آخرون منهم الطبري : لا يجوز الكذب في شيء أصلا قالوا : وما جاء من الإجابة في هذا المراد به التورية واستعمال المعاريض لا صريح الكذب مثل أن يعد زوجته أن يحسن إليها ويكسوها كذا ، وينوي إن قدر الله ذلك . وحاصله أن يأتي بكلمات محتملة يفهم المخاطب منها ما يطيب قلبه ، وإذا سعى في الإصلاح نقل عن هؤلاء إلى هؤلاء كلاما جميلا ، ومن هؤلاء إلى هؤلاء كذلک وورّى ، وكذلک في الحرب بأن يقول لعدوه : مات إمامكم الأعظم ، وينوي إمامهم في الأزمان الماضية أو غدا يأتينا مدد أي طعام ونحوه، هذا من المعاريض المباحة فكل هذا جائز ، وتأولوا قصة إبراهيم ويوسف وما جاء من هذا على المعاريض ، والله أعلم . (۲۰۸/۸–۲۰۹، رقم :۲۶۰۵، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الكذب وبيان المباح منه ، ط : احياء التراث العربي بيروت)

ما في '' تكملة فتح الملهم '' : قوله : (ليس الكذاب الذي يصلح بين الناس) به استدل=

....

= من أجاز الكذب الصريح للإصلاح بين الناس وفي المحاربة مع أعداء الله ، وقال الآخرون : المأذون فيه ليس بصريح الكذب ، وإنما هو التعريض والتورية والكناية التي ظاهرها مخالف للواقع وباطنها المراد ليس كذلك . (۳۲۲/۱۱ ، رقم :۲۵۷٦-۲٦۰۵)

ما في " فتح الملهم " : .... قال شيخ مشايخنا الأنور رحمه الله في كتاب الصلح من فيض الباري [۳ : ۳۹٦] : " واعلم أن الكذب جائز في بعض الأحوال عند الشافعية ، أما الحنفية فلا أراهم يجوزونه صراحة في موضع . نعم ! وسّعوا بالكنايات والمعاريض وأمثالهما" . وقال النووي : " الظاهر إباحة حقيقة الكذب في الأمور الثلاثة ، لكن التعريض أولى .... والمذهب عندنا أنه ليس المراد به الكذب المحض فإن ذلك لا رخصة فيه ، وإنما المراد استعمال المعاريض ، وهو نظير ما روي أن إبراهيم عليه السلام كذب ثلاث كذبات ، والمراد أنه تكلم بالمعاريض ، إذ الأنبياء معصومون عن الكذب المحض .

وكذلك يمكن حمل حديث محمد بن مسلمة على التورية والتعريض ، ويقول شيخنا العثماني في إعلاء السنن [۱۲ : ٦۰] : " الظاهر من السياق أنه طلب الإذن في المعاريض . الخ . (۲۹/۹، كتاب الجهاد والسير ، باب جواز الخداع في الحرب ، حكم الكذب في الحرب ، رقم :۴۵۱۴ – ۱۷۳۹ ، ط : دار المؤيد ، احياء التراث ، فيض الباري :۱۰۱/۴ ، رقم :۲٦۹۲ ، دار الكتب العلمية بيروت ، رد المحتار : ۲۱۲/۹-۲۱۳ ، كتاب الحظر والإباحة ، باب الاستبراء وغيره ، ط: بيروت)

ما في " شرح صحيح مسلم للنووي " : وأما قوله ﷺ : (ثنتين في ذات الله تعالى وواحدة في شأن سارة) فمعناه أن الكذبات المذكورة إنما هي بالنسبة إلى فهم المخاطب والسامع ، وأما في نفس الأمر فليست كذبا مذموما لوجهين : أحدهما أنه ورّى بها فقال في سارة أختي في الإسلام وهو صحيح في باطن الأمر . الخ . (۴۵۸/۷ ، تفسير المظهري : ۱۳۳/٦-۱۳۴ ، سورة الأنبياء ، الآية/٦۳ ، معارف القرآن : ۱۹۷/٦-۲۰۱)

ما في " معارف القرآن " : ''مصالح دینیہ کے لیے توریہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔'' (۱۹۷/٦-۲۰۱،مستفاد)

ما في " حاشية ابن عابدين " : لأنه حيث أمكن إحياء الحق بالتعريض ، وهو أن يريد المتكلم ما هو خلاف المتبادر من كلامه كان أولى من الكذب الصريح . فافهم . =

....

=(۲۵۳/۸ ، بـاب الـولي ، قسم الأحوال الشخصية ، تحقيق وتعليق للدكتور حُسام الدين بن محمد صالح فرفور ، ط : دار الثقافة والتراث دمشق ، سورية)

(۱۵) ما في " قواعد الفقه " : " العبرة للغالب الشائع لا للنادر " . [مجلة استنبول]

(ص/۹۱، القاعدة :۱۸۴، درر الحكام : ۵۰/۱ ، المادة : ۴۱ ، القواعد الفقهية :ص/۱۳۰ ، ۲۲۷ ، شرح القواعد :ص/۲۳۵، جمهرة القواعد : القاعدة : ۸۴۱ ، القواعد الكلية والضوابط الفقهية : ص/۲۶۷ ، شرح السير الكبير :۱۹۵/۴ ، باب ما يحل للمسلمين أن يدخلوه دار الحرب من التجارات ، الأصول والقواعد للفقه الإسلامي :ص/۲۰۴، قاعدة : ۱۹۶)

(۱۶) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . (سورة المائدة : ۲)

ما في " روح المعاني " : فيعم النهي ما هو من مقولة الظلم والمعاصي ويندرج فيه النهي عن التعاون على الاعتداء والانتقام .... وعن ابن عباس رضي اللّٰه تعالى عنهما وأبي العالية أنهما فسرا الإثم بترك ما أمرهم به وارتكاب ما نهاهم عنه . (۸۵/۴)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قوله تعالى : ﴿وتعاونوا على البر والتقوى﴾ يقتضي ظاهره إيجاب التعاون على كل ما كان طاعة للّٰه تعالى ؛ لأن البر هو طاعة اللّٰه ، وقوله تعالى : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ نهي عن معاونة غيرنا على معاصي اللّٰه تعالى . (۳۸۱/۲)

ما في " مختصر تفسير ابن كثير " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ قال الحافظ عماد الدين الدمشقي : نهاهم عن التناصر على الباطل والتعاون على المأثم والمحارم . (۴۷۸/۱)

ما في " التفسير المنير " : ولا تتعاونوا على الإثم وهو الذنب .... والمعصية : وهي كل ما منعه الشرع ، أو حاك في الصدر وكرهت أن يطلع عليه الناس، ولا تتعاونوا على التعدي على حقوق غيركم ، والإثم والعدوان يشمل كل الجرائم التي يأثم فاعلها ، ومجاوزة حدود اللّٰه بالاعتداء على القوم ، واتقوا اللّٰه بفعل ما أمركم به واجتناب ما نهاكم ﴿إن اللّٰه شديد العقاب﴾ لمن عصى وخالف .

(۴۱۸/۷ ، الوفاء بالعقود ومنع الاعتداء ، والتعاون على الخير وتعظيم شعائر اللّٰه)

ما في " تفسير المظهري " : يعني لا تعاونوا على ارتكاب المنهيات ولا على الظلم لتشفي صدوركم بالانتقام . (۴۸/۳)=

....

=ما في " التفسير لإبن كثير " : يأمر تعالى عباده المؤمنين بالمعاونة على فعل الخيرات وهو البر ، وترک المنكرات وهو التقوى وينهاهم عن التناصر على الباطل والتعاون على المآثم والمحارم .
(۱/ ۴۷۸)

(۱۷) ما في " شرح المجلة لسليم رستم الباز " : درء المفاسد أولى من جلب المنافع ، أي إذا تعارض مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة . (۳۲/۳)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " :درء المفاسد أولى من جلب المصالح ، فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً . (۱/۳۲۲ ، الفن الأول ، القاعدة الخامسة : الضرر يزال، درر الحكام : ۱/۴۱ ، المادة : ۳۰ ، قواعد الفقه :ص/۸۱ ، القاعدة :۱۳۳ ، جمهرة القواعد الفقهية: ۲/۷۳۳ ، رقم القاعدة : ۱۸۹ ، ترتيب اللآلي في سلک الأمالي :ص/۱۹۱ ، القواعد الفقهية : ص/۱۷۰ ، شرح القواعد : ص/۲۰۵ ، القواعد الكلية والضوابط الفقهية : ص/۱۸۲، الأصول والقواعد للفقه الإسلامي :ص/۱۷۱، القاعدة :۱۴۴)

(۱۸) ما في " القرآن الكريم " : ﴿فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان﴾ . (سورة البقرة : ۲۸۲)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : ﴿فرجل وامرأتان﴾ .... فأفادنا إثبات هذا الإسم للرجل والمرأتين حتى يعتبر عمومه في جواز شهادتهما مع الرجل في سائر الحقوق .... فقال أبوحنيفة وأبويوسف ومحمد وزفر وعثمان البتي : " لا تقبل شهادة النساء مع الرجال لا في الحدود ولا في القصاص ، وتقبل فيما سوى ذلک من سائر الحقوق " . (۱/۶۰۸)

(۱۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ أيها النبي قل لأزواجک وبنٰتک ونسآء المؤمنين يدنين عليهنّ من جلابيبهنّ﴾ . (الأحزاب : ۵۹)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قال أبو بكر : هذه الآية دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبيين وإظهار الستر والعفاف عند الخروج ؛ لئلا يطمع أهل الريب فيهن .
(۳/۴۸۶)

وما في " القرآن الكريم " : ﴿وقل للمؤمنٰت يغضضنَ من أبصارهنّ﴾ . (سورة النور : ۳۱)

ما في " تفسير المظهري " : لا يجوز للمرأة إبداء وجهها لرجل ذي اربة غير الزوج والمحرم ، فإن عامة محاسنها في وجهها ، فخوف الفتنة في النظر إلى وجهها أكثر منه في النظر إلى سائر أعضائها، وإن كان المراد بها مواضع الزينة فمعنى الاستثناء إلا ما ظهر منها عند الضرورات ، ضرورة الخروج لقضاء الحوائج ، أو ضرورة الاستشهاد ، ونحو ذلک يدل على عدم جواز إبداء المرأة=

=وجهها . (۶/۳۷۷)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : أمر الله سبحانه وتعالى المؤمنين والمؤمنات بغضّ الأبصار عما لا يحل ، فلا يحل للرجل أن ينظر إلى المرأة ، ولا المرأة إلى الرجل ، فإن علاقتها به كعلاقته بها ، وقصدها منه كقصده منها . (۱۲/۲۲۷)

ما في " جامع الترمذي " : قال رسول الله ﷺ : " المرأة عورة ، فإذا خرجت استشرفها الشيطان" . (۱/۲۲۱)

ما في " كنز العمال " : قال عليه الصلاة والسلام : " ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة". (۱۶/۱۶۳)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : " الضرورات تبيح المحظورات " . " الضرورة تتقدر بقدر الضرورة " . (۱/۳۰۷ - ۳۰۸)

(کفایت المفتی:۹/۳۴۹،عورت کا ووٹر بننا الخ،فتاویٰ حقانیہ:۲/۳۱۲،عورت کے لیے ووٹ کا حق استعمال کرنا)

(۲۰) (کفایت المفتی:۹/۳۴۹،کتاب السیاسیات،ط:دارالاشاعت کراچی)

(۲۱) ما في " القواعد الفقهية " : " الحكم إذا ثبت بعلة زال بزوالها " . (ص/۱۸۸)

ما في " نور الأنوار مع قمر الأقمار " : فأينما وجدت العلة وجدت الحرمة . (ص/۱۵۳)

ما في " أحسن الحواشي على هامش أصول الشاشي " : يدار الحكم على تلك العلة. [أصول الشاشي] قوله : (على تلك العلة) أي يدار الحكم على تلك العلة وجودًا وعدمًا ، يعني يوجد حكم النص عند وجوده وينعدم عند عدمه . (ص/۴۷ ، مبحث الثاني بدلالة النص)

(۲۲) ما في " بداية المجتهد ونهاية المقتصد " : وشرط الوكيل أن لا يكون ممنوعًا بالشرع من تصرفه في الشيء الذي وُكِّلَ فيه .

(۴/۱۰۵ ، كتاب الوكالة ، الباب الأول في أركانها ، المكتبة المدنية بديوبند . الهند)

ما في " فتح القدير لإبن الهمام " : وأما الذكورة فليست بشرط إلا للقضاء في الحدود والدماء فتقضي المرأة في كل شيء إلا فيهما . (۶/۳۵۷ ، كتاب أدب القاضي)

بیع وفاء

سوال:۱- بیع وفا کی بنیادی شکل یہ ہے کہ ایک آدمی ضرورت مند ہوتا ہے، غیر سودی قرض ملتا نہیں، اور سودی قرض لینا نہیں چاہتا، تو وہ اپنے کسی سامان (زمین وجائداد وغیرہ) کا سودا یوں کرتا ہے، کہ تم اتنی قیمت میں اس کو لے لو، اور اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کرنے کے حال میں ہوں، تو یہ سامان تم مجھ کو اسی قیمت پر دے دینا، کسی دوسرے سے مت بیچنا۔

معاملہ یہ ہے کہ خرید وفروخت سے بیچی جانے والی شئے بیچنے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، اور خریدنے والا اس کا مکمل مالک بن جاتا ہے، اور خرید کردہ شئے میں اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ کچھ بھی کرے؛ بیچے، ہبہ کرے، کرایہ پر دے وغیرہ، اور فروخت کردہ شئے سے سابق مالک وفروخت کنندہ کا کوئی واسطہ نہیں رہ جاتا، بیع وفا کا معاملہ اس سلسلے میں اس سے مختلف ہے، تو اس بیع کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم کیا ہے؟

یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید وبند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں؟ اگر شرعاً منعقد اور درست ہے، تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

[الف]: بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، اس کا کیا حکم ہوگا؟

[ب]: مالکِ اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟

[ج]: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے، تو اس سے فائدہ اُٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

[د]: خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے، تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا؟ اور اگر مزید قیمت لے، تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب:۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید وبند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے، اور ایسی بیع کے حکم میں ہے، جو اپنے بعضے احکام میں مفید اور بعض میں غیر مفید ہے، نیز اس بیع میں جو خاص قید وبند لگائی جاتی ہے گرچہ وہ قواعدِ شرعیہ کے مخالف ہے، مگر تعارف وتعاملِ ناس کی وجہ سے یہاں قواعد شرعیہ متروک ہوں گے۔ ویسے تو اس کے جواز وعدمِ جواز میں شدید اختلاف رہا، امام ظہیر الدین اور صدر الشہید رحمہما اللہ وغیرہ اس کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، امام ابوشجاع، امام علی، امام ابن نجیم، امام بیہقی، علامہ سغدی، قاضی حسن ماتریدی اور امام مرغینانی رحمہم اللہ وغیرہ اس کو حاجتِ ناس کے پیش نظر استحساناً، اور عرفِ عام حادث کا قضیہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں۔ (۱)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اصولاً عدمِ جواز کو ثابت کیا ہے، اور بوقتِ ضرورت جواز پر عمل کی اجازت دی ہے (۲)، اور محدثِ سہارنپوری علامہ خلیل احمد رحمہ اللہ نے جائز قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ: دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور بیع مع الشرط کی قید نہ لگائی جائے، تا کہ فقہائے متأخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے۔ (۳) (محقق ومدلل جدید مسائل:۱/۲۹۹-۳۰۰)

[الف]: بیع وفاء کی صورت میں یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، یہ شرط، شرطِ لازم ہے، اور کسی دوسرے کو بیچنا جائز

نہیں ہے۔جیسا کہ بیع بالوفاء کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ ورعاہ رقمطراز ہیں:

''اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ فاسد ہے، اکثر فقہاء کرام اس عقد (مسئلے) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جب کہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے، اور مشتری کو بھی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیچ دے، اور ردالمحتار میں اس کے متعلق کئی اقوال نقل کیے ہیں، لیکن جو قول جامع ہے اس کو بایں طور ذکر کرتے ہیں:'' قوله : (وقيل بيع يفيد الانتفاع به) هذا محتمل لأحد القولين : الأول : أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا يملك بيعه . قال الزيلعي في الإكراه : وعليه الفتوى . الثاني : القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ – صحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البيع – ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه ، وسقط الدَّين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوّز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها . قال في البحر : وينبغي أن لا يعدل في الإفتاء عن القول الجامع . وفي النهر : والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي '' . (شامي :۳۴۲/۴ ، باب الصرف ، ۲۷۶/۵ ، ط : سعيد ، البحر :۸/۶ ، تبيين :۱۸۳/۵) [الفتاوى الهندية : ۲۰۸/۳–۲۰۹ ، ط : دار الفكر ، شامي :۲۴۶/۴–۲۴۷ ، ط : احياء التراث و بولاق ، الموسوعة الفقهية : ۲۶۱/۹ ، بيع الوفاء ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۱۱۱/۱ ، المادة : ۱۱۸ ، البيوع])

اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع وفا میں مشتری کو بیع – رہن – وقف

وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں، اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہٰذا جن حضرات نے اِسے عقدرہن قرار دیا ہے(۴) ان کے نزدیک تو مشتری کا فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے(۵)، اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔(۶)

(فتاویٰ عثمانی:۳/ ۱۰۸، کتاب البیوع، فصل فی أنواع البیوع المختلفۃ، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

[ب]: مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

[ج]: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

[د]: خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو یہ بیع صحیح نہ ہوگی، اور اگر مزید قیمت لے تو یہ سود ہوگا(۷)، آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔(۸)

سوال: ۲- اگر اس کو رہن قرار دیا جائے، تو؛

[**الف**]: جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے، اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اُٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

[**ب**]: اگر خریدار اس طریقے پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو، تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

[**ج**]: اس عرصے میں خریدار اس شئے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ

داری وغیرہ) حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟

[د]: خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟ اور بیچے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

جواب: ۲- اگر اس کو رہن قرار دیں تو......،

[الف]: جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز وحرام ہوگا۔ (۹)

[ب]: اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو، تو (رہن قرار دیئے جانے کی صورت میں) یہ عقد اجارہ شرعاً درست نہیں، کیوں کہ شئ واحد میں عقد رہن واجارہ دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔ (۱۰)

[ج]: اس عرصہ میں خریدار اس شئ سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ (۱۱)

[د]: خریدار جب اس کا مالک نہیں تو بیچنے کا حق اُسے کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ (۱۲)

سوال: ۳- آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقمِ ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً: ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپئے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے، تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپئے ماہانہ ہونا چاہیے، لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپئے کرایہ لینے پر آمادہ ہوجاتا ہے، کیوں کہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لیے زرِ ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہوجاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زرِ ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی؟ یا امانت ورہن کی؟ اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کی

جانے والی کمی جائز ہوگی؟ یا اسے قرض پر فائدہ اُٹھانا سمجھا جائے گا؟

جواب: ۳- زرِضمانت کی حیثیت رہن کی ہے، قرض وامانت کی نہیں، لہٰذا اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہے، البتہ اس صورت میں مالک دکان یا مکان کو اس کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی، خواہ کرایہ دار اس کی اجازت دے، کیوں کہ رہن سے انتفاع کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ (۱۳)

رہی یہ بات کہ کرایہ دار اور مالک مکان ودکان دونوں کی ضرورتیں پھر کس طرح پوری ہوں گی؟ تو اس کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ زرِضمانت کے طور پر دی جانے والی رقم کو پیشگی کرایہ کے طور پر دے دیا جائے اور وہ اس سے اپنے کرایہ کی متعینہ رقم بتدریج منہا کرتا جائے، اس طرح مالک مکان ودکان کو کاروبار کے لیے ایک بڑی رقم بنام پیشگی کرایہ حاصل ہوگی، اور کرایہ دار کی دکان یا مکان کی ضرورت بھی پوری ہوگی (۱۴)، اور کرایہ کی پیشگی رقم وصول ہونے کی وجہ سے مکان یا دکان کے مروجہ کرایہ میں کمی کرنا شرعاً جائز بھی ہے۔ (۱۵)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " البحر الرائق " : وصورته : أن يقول البائع للمشتري بعت منک هذا العين بدين لک عليّ على أني متى قضيت الدين فهو لي أو يقول البائع بعتک هذا بكذا على أني متى دفعت لک الثمن تدفع العين إلي . (۶/۱۱ ، كتاب البيع ، باب خيار الشرط ، تبيين الحقائق : ۶/۲۳۷ ، كتاب الإكراه ، رد المحتار : ۷/۵۴۵ ، مطلب في بيع الوفاء)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : والقول السادس في بيع الوفاء : إنه صحيح لحاجة=

....

= الناس فرارًا من الربا ، وقالوا : ما ضاق على الناس أمر إلا اتسع حكمه . (در مختار) .
(۷/ ۵۵۱ ، كتاب البيوع ، باب الصرف ، مطلب : قاضي خان من أهل التصحيح والترجيح)

ما في " تبيين الحقائق " : ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعضَ أحكامه منهم الإمام نجم الدين النسفي فقال : اتفق مشايخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه وهو الانتفاع به دون البعض وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه ، والقواعد قد تترك بالتعامل وجوّز الاستصناع لذلك ...... وقال صاحب النهاية : وعليه الفتوى .
(۵/ ۱۸۴ ، ط : دار الكتاب الإسلامي)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وذهب بعض المتأخرين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء جائز مفيد لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالمبيع دون بعضها وهو البيع من آخر ، وحجتهم في ذلك : أن البيع بهذا الشرط تعارفه الناس وتعاملوا به لحاجتهم إليه فرارا من الربوا ، فيكون صحيحا لا يفسد البيع باشتراطه فيه وإن كان مخالفا للقواعد ، لأن القواعد تترك بالتعامل ، كما في الاستصناع . (۹/ ۲۶۰-۲۶۱ ، بيع الوفاء ، البحر الرائق : ۶/ ۸ ، دار الكتاب الإسلامي)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : " الأمر إذا ضاق اتسع وإذا اتسع ضاق " . (۱/ ۳۰۴ ، الأشباه والنظائر للسيوطي : ۱/ ۱۶۵ ، قواعد الفقه : ص/ ۶۲ ، قاعدة : ۴۸ ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۱/ ۳۶ ، المادة : ۱۸ ، شرح القواعد الفقهية : ص/ ۱۶۳ ، رد المحتار : ۱/ ۱۸۹)

(۲) (امدادالفتاویٰ: ۳/ ۱۰۸-۱۰۹، کتاب البیوع، بیع بالوفاء، مکتبہ دارالعلوم کراچی)

(۳) (ایضاح النوادر: ص/ ۷۶-۷۹، ط: فریدبکڈ پو پرائیویٹ لمٹیڈ)

(۴) ما في " رد المحتار " : البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالا للربوا وسموه بالوفاء فهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكه وهو ضامن لما أكل من ثمره . الخ . (۴/ ۳۴۶)

(کتاب الفتاوی : ۵/ ۲۸۰، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، قاموس الفقہ : ۲/ ۳۶۶ ، ۳۶۷، بیع الوفاء، فتاویٰ امارت شرعیہ: ۱/ ۲۴۴، کتاب البیوع)

ما في " تبيين الحقائق " : منهم الإمام ظهير الدين والصدر الشهيد حسام الدين والصدر السعيد تاج الإسلام فجعلوه فاسدا باعتبار شرط الفسخ ...... ومنهم من جعله رهنا منهم السيد الإمام أبوشجاع والإمام علي السغدي والإمام القاضي حسن الماتريدي قالوا لما شرط عليه أخذه عند قضاء الدين أتى بمعنى الرهن .... فإذا كان رهنا لا يملكه ولا ينتفع به . الخ . (۵/ ۱۸۴ ، ط : دار الكتاب الإسلامي)=

....

=مـا في " الموسوعة الفقهية " : وذهب أبوشجاع وعلي السغدي والقاضي أبو الحسن الماتريدي مـن الـحنفية إلى : أن بيع الوفاء رهن وليس ببيع فثبت له جميع أحكام الرهن فلا يملكه المشتري ولا ينتفع به . (۲۶۱/۹ ، البحر الرائق : ۸/٦ ، ط : دار الكتاب الإسلامي)

مـا فـي " الـفتـاوى الهندية " : البيع الذي تعارف أهل زماننا احتيالا للربوا وسموه بيع الوفاء هو في الحقيقة رهن ، وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن لا يملكه ولا يطلق له الانتفاع إلا بإذن مالكه . ولا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام ، كذا في الفصول العمادية ، وعليه فتوى السيد أبي شجاع السمرقندي وفتوى القاضي على السغدي ببخارى وكثير من الأئمة على هذا . كذا في المحيط . (۲۰۹/۳، ط : دار الفكر)

مـا في " موسوعة فتاوى المعاملات المالية " : الرأي الشرعي : بعد الاطلاع على البحوث الواردة إلـى المجمع بخصوص موضوع (بيع الوفاء) وبعد الاستماع للمناقشات التي دارت حول بيع الوفاء وحـقيـقته : " بيع المال ، بشرط أن البائع متى ردّ الثمن يرد المشتري إليه المبيع " . **تقرر** : أولا ؛ أن حـقيـقة هـذا البيع (قرض جرّ نفعًا) ، فهو تحايل على الربا ، وبعدم صحته قال جمهور العلماء . ثانيًا ؛ يـرى الـمـجمع أن هذا العقد غير جائز شرعًا . **المصدر** : مـنـظـمة المؤتمر الإسلامي – مجمع الفقه الإسلامي – قرارات وتوصيات مجلس مجمع الفقه الإسلامي – الدورة الأولى حتى الدورة الثامنة – جدة . (۲۲۷/۷ ، حكم بيع الوفاء ، مركز الدراسات الفقهية والاقتصادية ، ط : دار السلام بالقاهرة)

ما في " الفقه الإسلامي وأدلته " : وبيع الوفاء عند الحنفية (وهو أن يبيع المحتاج إلى النقود عقارًا ، على أنه متى وفى الثمن ، استرد العقار) يأخذ غالبا أحكام الرهن ؛ لأنه هو مقصود العاقدين .

(۱۳٦/۱ ، دار الفكر سورية بدمشق)

(۵) مـا في " تبيين الحقائق " : ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه ومنهم الإمـام نـجم الدين النسفي فقال : اتفق مشايخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه وهـذا الانتـفـاع به دون البعض وهو البيع لحاجة الناس إليه لتعاملهم فيه ...... وقال صاحب النهاية : وعليه الفتوى . (۱۸۴/۵ ، ط : دار الكتاب الإسلامي)

مـا فـي " الـمـوسـوعة الـفقهية " : وذهب بعض المتأخرين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء جـائـز مفيد لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالمبيع دون بعضها وهو البيع من آخر ، وحجتهم في ذلک : أن البيع بهذا الشرط تعارفه الناس وتعاملوا به لحاجتهم إليه فرارا من الربوا ، فيكون صحيحا لا يفسد البيع باشتراطه فيه وإن كان مخالفا للقواعد ، لأن القواعد تترک بالتعامل ، كما في=

....

= الاستصناع . (۹/۲۶۰–۲۶۱ ، بيع الوفاء ، البحر الرائق : ۸/۶ ، دار الكتاب الإسلامي)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : ومن هذا القبيل بيع الأمانة المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة . اهـ . (ص/۱۳۰)

وما في " الأشباه والنظائر " : ومنها الإفتاء بصحة بيع الوفا حين كثر الدين على أهل بخارى وهكذا بمصر وسمّوه بيع الأمانة والشافعية يسمّونه الرهن المعاد .

(ص/۱۴۹– ۱۶۱ ، ايضاح النوادر: ص/۶۷–۶۹، ط: فريد بكڈپو پرائيويٹ لمٹيڈ)

(۶) ما في " فتاوى قاضي خان على هامش الهندية " : وعندهما : هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك . وإن ذكرا البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد ، لأن المواعيد قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس . (۲/۱۶۵ ، فصل في الشروط المفسدة ، مكتبه رشيديه كوئٹه ، ومكتبه زكريا ديوبند ، الفتاوى الهندية :۳/۲۰۹ ، ط : دار الفكر ، البحر الرائق : ۸/۶ ، دار الكتاب الإسلامي ، شامي : ۷/۲۸۱ ، كتاب البيوع ، باب البيع الفاسد ، مطلب في البيع بشرط فاسد ، الأشباه والنظائر :۳/۲۳۷، الفن الثاني ، الحظر والإباحة ، ط : إدارة القرآن كراچی ، مرقاة المفاتيح : ۸/۶۱۴ ، كتاب الآداب ، باب الوعد ، الفصل الثاني ، مكتبه رشيديه ، الموسوعة الفقهية : ۹/۲۴۷ ، بيع وشرط)

(فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۲۵۵،کراچی،احسن الفتاویٰ:۶/۵۰۷،کتاب البیوع،بیع بالوفاء)

(۷) ما في " القرآن الكريم " : ﴿أحل اللّٰه البيع وحرّم الربوا﴾ . [سورة البقرة : ۲۷۵] . ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا اتقوا اللّٰه وذروا ما بقي من الربوآ إن كنتم مؤمنين ، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللّٰه ورسوله﴾ . (سورة البقرة : ۲۷۸ – ۲۷۹)

ما في " صحيح مسلم " : عن جابر رضي اللّٰه عنه قال : " لعن رسول اللّٰه ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه ، وقال : هم سواء " . (۲/۲۷ ، سنن ابن ماجة : ۱/۱۶۵ ، باب التغليظ في الربا ، سنن أبي داود : ۲/۴۷۳ ، كتاب البيوع ، صحيح البخاري : ۱/۲۸۰ ، كتاب البيوع)

ما في " فتح الملهم " : قوله : (وموكله) يعني الذي يؤدي الربا إلى غيره ، فإثم عقد الربا والتعامل به سواء في كل من الآخذ والمعطي ، ثم أخذ الربا أشد من الإعطاء ، لما فيه من التمتع بالحرام .

(۷/۵۷۴ ، باب لعن آكل الربا وموكله)

ما في " مرقاة المفاتيح " : (آكل الربا) أي أخذه وإن لم يأكل ، وإنما خص بالأكل لأنه أعظم أنواع الانتفاع . (۶/۴۲ ، عون المعبود : ص/۱۴۳۵ ، كتاب البيوع ، باب آكل=

....

= الربا وموكله، رقم :۳۳۳۳)

ما في " رد المحتار " : هو لغة : مطلق الزيادة ..... فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال . (۳۰۱/۷، البحر الرائق : ۳۱۰/۷)

ما في " تبيين الحقائق " : والربا محرم بالكتاب والسنة وإجماع الأمة ، أما الكتاب فقوله تعالى : ﴿وأحل الله البيع وحرم الربوا﴾ . وأما السنة فما روي عن ابن مسعود : " أن النبي ﷺ لعن آكل الربا وموكله ، وكاتبه ، وشاهديه ، وقال : هم سواء " .

(۴۴۷/۴ ، كتاب البيوع ، باب الربا)

ما في " الموسوعة الفقهية " : قال الماوردي : إن الربا لم يحل في شريعة قط ، لقوله تعالى: ﴿وأخذهم الربا وقد نهوا عنه﴾ يعني في الكتب السابقة . [المجموع : ۳۹۱/۹] ، ودليل التحريم من الكتاب قول الله تعالى : ﴿وأحل الله البيع وحرم الربوا﴾ . (۵۱/۲۲)

ما في " موسوعة فتح الملهم مع التكملة " : عن علي مرفوعًا قال : قال رسول الله ﷺ : " كل قرض جر منفعة فهو ربا " . (۵۷۴/۱ ، كتاب المساقات والمزارعة ، اعلاء السنن : ۱۴/ ۵۶۷ ، كتاب الحوالة ، باب كل قرض جر منفعته فهو ربا ، فيض القدير : ۴۴۸۷/۹ ، رقم : ۶۳۳۶ ، الجامع الصغير للسيوطي : ص/۳۹۴ ، عن علي ، رقم : ۶۳۳۶ ، السنن الكبرى للبيهقي : ۵۷۱/۵)

ما في " رد المحتار " : وفي الأشباه : كل قرض جر نفعاً حرام . اهـ . (۳۹۵/۷)

(۸) ما في " فتاوى قاضي خان على هامش الهندية " : وعندهما : هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك . وإن ذكرا البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد ، لأن المواعيد قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس .

(۱۶۵/۲ ، فصل في الشروط المفسدة ، مكتبه رشيديه كوئٹه ، ومكتبه زكريا ديوبند ، الفتاوى الهندية :۳۰۹/۳ ، ط : دار الفكر ، البحر الرائق : ۸/۶ ، دار الكتاب الإسلامي ، شامي : /۲۸۱/۷ ، كتاب البيوع ، باب البيع الفاسد ، مطلب في البيع بشرط فاسد ، الأشباه والنظائر :۲۳۷/۳، الفن الثاني ، الحظر والإباحة ، ط : إدارة القرآن كراچی ، مرقاة المفاتيح : ۶۱۴/۸ ، كتاب الآداب ، باب الوعد ، الفصل الثاني ، مكتبه رشيديه ، الموسوعة الفقهية : ۲۴۷/۹ ، بيع وشرط)

(فتاویٰ محمودیہ:۲۵۵/۱۶، کراچی، احسن الفتاویٰ:۵۰۷/۶، کتاب البیوع، بیع بالوفاء)

(۹) ما في " رد المحتار " : ولا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه ، وإن أذن=

....

= لـه الـراهـن ، لأنه أذن له فی الربا ، لأنه يستوفي دينه كاملاً ، فتبقى له المنفعة فضلاً ، فيكون ربا ، وهـذا أمـر عـظيـم . (۱۰/۸۳ ، ط : دار الـكـتـب الـعـلـمية بيروت ، الفلك المشحون في الانتفاع بـالـمـرهـون : ص/۱۳ ، مـلـحـقة بـمـجـموعة رسائل اللكنوي :۱۳/۳ ، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة: ۲۸۴/۲ ، مبحث الانتفاع بالمرهون)

مـا فـي " النتف في الفتاوى " : قال : ولا يجوز في الرهن تسعة أشياء : الرهن لا يباع ، ولا يوهب ، ولا يتـصـدق بـه ، ولا يـرهـن ، ولا يـودع ، ولا يعار ، ولا يؤاجر ، ولا يستعمل ، ولا ينتفع به بوجه من الوجوه . (ص/۷۷۰ ، كتاب الرهن ، ما لا يجوز فی الرهن)

ما في " بدائع الصنائع " : لأن المرتهن لا يجوز له الانتفاع بالرهن أصلا .

(۱۴۵/۶ ، دار الكتاب العربي بيروت)

مـا فـي " البـحـر الرائق لإبن نجيم " : ولا ينتفع المرتهن استخداما وسكنى ولبسا وإجارة وإعارة ، لأن الـرهـن يـقتضي الحبس إلى أن يستوفي دينه دون الانتفاع . (۴۳۸/۶ ، كتاب الرهن ، رشيديه ، ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر : ۲۷۳/۴ ، كتاب الرهن ، الموسوعة الفقهية : ۲۶۱/۹)

مـا في " شرح مختصر الطحاوي " : ولا يجوز أجر الرهن ، ولا يخرج من يد المرتهن إلا بعد قضاء الدين ، ولا ينتفع به وذلك لأن في إجارته استحقاق يد المرتهن ، وفي ذلك إبطال الرهن .

(۱۴۹/۳ ، بحوالہ آپ کے مسائل اوران کاحل: ۲۰۷/۷)

(۱۰) مـا فـي " رد الـمحتار " : أما الإجارة فالمستأجر إن كان هو الراهن فهی باطل ، وإن كان هو المرتهن وجدد القبض للإجارة بطل الرهن . (۱۳۰/۱۰)

مـا فـي " بـدائـع الـصنائع " : وكذلك لو آجره من المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد الـمـرتهـن الـقبـض لـلإجـارـة، أمـا صحة الإجارة وبطلان الرهن فلما ذكرنا ، وأما لحاجة إلى تجديد القبض فلأن القبض دون قبض الإجارة فلا ينوب عنه . (۱۸۲/۸ ، كتاب الرهن)

مـا فـي " الـنتف فـي الـفتـاوى" : ولا يجوز فی الرهن تسعة أشياء : الرهن لا يباع ، ولا يوهب ، ولا يتـصـدق بـه ، ولا يـرهـن ، ولا يـودع ، ولا يـعـار ، ولا يـؤاجـر ، ولا يستـعمل ، ولا ينتفع به بوجه من الوجوه. (ص/۷۷۰ ، كتاب الرهن) (فتاویٰ اشاعت العلوم غیر مطبوعہ، رقم الفتویٰ:۱۳۰-رج:۱)

(۱۱) ما في " بدائع الصنائع " : لأن المرتهن لا يجوز له الانتفاع بالرهن أصلا .

(۱۴۵/۶ ، دار الكتاب العربي بيروت)

ما في " البحر الرائق " : ولا ينتفع المرتهن استخداما وسكنى ولبسا وإجارة وإعارة ،=

....

= لأن الرهن يقتضي الحبس إلى أن يستوفي دينه دون الانتفاع .

(۴۳۸/۲ ، كتاب الرهن ، رشيديه)

ما في " ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر " : وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن ولا إجارته ولا إعارته . (۲۷۳/۴ ، كتاب الرهن ، الموسوعة الفقهية : ۲۶۱/۹ ، النتف في الفتاوى : ص/۳۷۰ ، كتاب الرهن)

(۱۲) ما في " النتف في الفتاوى" : ولا يجوز في الرهن تسعة أشياء : الرهن لا يباع ، ولا يوهب ، ولا يتصدق به ، ولا يرهن ، ولا يودع ، ولا يعار، ولا يؤاجر ، ولا يستعمل ، ولا ينتفع به بوجه من الوجوه . (ص/۳۷۰ ، كتاب الرهن)

(۱۳) ما في " بدائع الصنائع " : لأن المرتهن لا يجوز له الانتفاع بالرهن أصلا .

(۱۴۵/۲ ، ط : دار الكتاب العربي)

ما في " البحر الرائق " : ولا ينتفع المرتهن استخداما وسكنى ولبسا وإجارة وإعارة ، لأن الرهن يقتضي الحبس إلى أن يستوفي دينه دون الانتفاع . (۴۳۸/۲ ، كتاب الرهن ، رشيديه)

ما في " ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر " : وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن ولا إجارته ولا إعارته . (۲۷۳/۴ ، كتاب الرهن ، الموسوعة الفقهية : ۲۶۱/۹)

ما في " النتف في الفتاوى" : ولا يجوز في الرهن تسعة أشياء : الرهن لا يباع ، ولا يوهب ، ولا يتصدق به ، ولا يرهن ، ولا يودع ، ولا يعار ، ولا يؤاجر ، ولا يستعمل ، ولا ينتفع به بوجه من الوجوه . (ص/۳۷۰ ، كتاب الرهن)

(۱۴) (فتاویٰ اشاعت العلوم غیر مطبوعہ: رقم الفتویٰ : ۱۸۰، رج:۲، فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیۃ : ۱۶۵/۲، الدر المختار مع الشامیۃ: ۵۴۷/۷، فتاویٰ محمودیہ: ۲۵۵/۱۶)

(۱۵) (امداد الفتاویٰ: ۱۶۳/۳)

تلخیص جوابات

ووٹ

۱- شرعاً ووٹ کی حیثیت شہادت، شفاعت (سفارش) اور وکالت کی سی ہے۔

۲- **(الف):** باعتبار حیثیتِ شہادت بعض حالات میں ووٹ (حق رائے دہی) کا استعمال واجب ہے۔

(ب): باعتبار شفاعت ووکالت ووٹنگ امرِ مستحب ہے۔

۳- عام حالات میں اسلامی مزاج کے مطابق عہدہ واقتدار کی طلب غیر مستحسن ہے، اور مخصوص حالات میں واجب ہے۔

۴- جن غیر مسلم ومسلم ملکوں میں قانون ساز ادارے مخالف شرع قوانین بناتے ہیں وہاں مسلمانوں کے لیے ان اداروں کا ممبر بننا درست ہونا چاہیے۔

۵- جو مسلم ممبر قانون ساز اداروں کے رکن منتخب ہوتے ہیں، تو حلف لیتے وقت وہ دل میں صرف انہی دفعات کی نیت (توریہ) کرے جو موافقِ شرع ہیں۔

۶- بائبل کی جو باتیں غیر محرف ہیں، حلف لیتے وقت دل میں صرف ان کی نیت (توریہ) کرے، نہ کہ محرف کی۔

۷- ایسی پارٹیوں میں شریک ہونا، ان کی طرف سے انتخاب لڑنا اور ان کی حکومت میں شامل ہونا باعتبار عموم درست ہونا چاہیے۔

۸- اس طرح کی پارٹیوں میں شرکت اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں تعاون کے مترادف ہے، جو شرعاً ممنوع ہے۔

۹- ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیاسی جماعت کا قائم کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ دفعِ ضرر جلبِ منفعت سے اَولیٰ ومقدم ہے۔

۱۰- (الف): خواتین انتخابات کے موقع پر اپنا حق رائے دہی (ووٹ) کا استعمال کرسکتی ہیں، بشرطیکہ پردہ اور دیگر امور شرعیہ کا لحاظ وخیال کریں، ورنہ ارتکابِ معصیت سے ووٹ کا ترک افضل ہے۔

(ب): عورتوں کے لیے بطور امیدوار کھڑا ہونا غیر مستحسن ہے، لیکن اگر ضروریاتِ شرعیہ کی رعایت کے ساتھ کونسل یا اسمبلی کی شرکت ممکن ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

(ج): عورتیں قانون ساز اداروں کی ممبر بن سکتی ہیں، البتہ ضروریاتِ شرعیہ کی رعایت بھی لازم ہوگی۔

بیع وفاء

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید وبند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے، اور ایسی بیع کے حکم میں ہے، جو اپنے بعضے احکام میں مفید اور بعض میں غیر مفید ہے۔

(الف): بیع وفا کی صورت میں یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، یہ شرط، شرطِ لازم ہے، اور کسی دوسرے کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

(ب): مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

(ج): خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(د): خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو یہ بیع صحیح نہ ہوگی، اور اگر مزید قیمت لے تو یہ سود ہوگا۔

۲- اگر اس کو رہن قرار دیں تو......،

(الف): جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز وحرام ہوگا۔

(ب): رہن قرار دیئے جانے کی صورت میں یہ عقد اجارہ شرعاً درست نہیں، کیوں کہ شئ واحد میں عقد رہن واجارہ دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔

(ج): اس عرصہ میں خریدار اس شئ سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

(د): خریدار جب اس کا مالک نہیں تو اُسے بیچنے کا حق بھی حاصل نہیں ہوگا۔

۳- زرِ ضمانت کی حیثیت رہن کی ہے، لہٰذا اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہے۔

کتابیات

کتب تفاسیر

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
۱	تفسیر المظہری	قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی	مکتبہ زکریا دیوبند
۲	روح المعانی	امام شہاب الدین سید محمد محمود آلوسی بغدادی	//
۳	تفسیر الکبیر	امام فخر الدین رازی شافعی	علوم اسلامیہ اردو بازار لاہور
۴	التفسیر المنیر	دکتور وہبہ زحیلی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۵	مختصر تفسیر ابن کثیر	محمد علی الصابونی	دار القرآن الکریم دمشق
۶	الجامع لاحکام القرآن	امام ابوعبد اللہ احمد انصاری قرطبی	مکتبۃ الغزالی دمشق
۷	احکام القرآن	ابوبکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی	مکتبۃ الریاض الحدیثۃ
۸	احکام القرآن	امام ابوبکر بن علی رازی جصاص	مکتبہ شیخ الہند دیوبند
۹	بیان القرآن	حکیم الامت علامہ تھانوی	ادارہ تالیفات اشرفیہ
۱۰	معارف القرآن	مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب	فرید بکڈپو دیوبند
۱۱	تفسیر ماجدی اردو	علامہ عبد الماجد دریابادی	

کتب احادیث

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
۱۲	صحیح بخاری	امام ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری	مکتبہ بلال دیوبند/ بیروت
۱۳	صحیح مسلم	امام ابوالحسن مسلم بن حجاج قشیری	//
۱۴	شرح صحیح مسلم للنووی	امام ابوزکریا محی الدین یحی بن شرف النووی	احیاء التراث العربی بیروت
۱۵	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی	مکتبہ بلال دیوبند
۱۶	جامع ترمذی	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسی ترمذی	مکتبہ بلال/ بیروت
۱۷	سنن ابن ماجہ	امام ابن ماجہ قزوینی	مکتبہ بلال دیوبند
۱۸	مشکوۃ المصابیح	شیخ ولی الدین خطیب تبریزی بغدادی	یاسر ندیم اینڈ کمپنی
۱۹	معجم اوسط طبرانی	//	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۲۰	سنن کبری بیہقی	امام ابوبکر احمد بن حسین بن علی بیہقی	//

۲۱	فیض القدیر للمناوی	شیخ عبدالرؤف المناوی	دارالمعرفۃ بیروت
۲۲	کنز العمال	علامہ علاء الدین علی متقی ھندی	//
۲۳	فیض الباری شرح البخاری	علامہ شیخ انور شاہ کشمیری	مکتبہ شیخ الہند/ بیروت
۲۴	فتح الباری شرح البخاری	امام حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی	دارالسلام ریاض
۲۵	عمدۃ القاری شرح البخاری	امام بدرالدین عینی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۲۶	تکملۃ فتح الملہم	علامہ شیخ شبیر احمد عثمانی/ شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی	داراحیاء التراث العربی
۲۷	عون المعبود	شیخ ابوعبدالرحمٰن شرف الحق عظیم آبادی	بیت الافکار/ احیاء التراث
۲۸	مرقاۃ المفاتیح	علامہ شیخ ملا علی قاری حنفی	مکتبہ اشرفیہ دیوبند/ رشیدیہ
۲۹	شرح مختصر الطحاوی	بحوالہ آپ کے مسائل اوران کا حل	(تخریج شدہ ایڈیشن)
۳۰	جمع الفوائد	بحوالہ فقہی مقالات	
۳۱	الجامع الصغیر	امام جلال الدین سیوطی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۳۲	اعلاء السنن	علامہ شیخ ظفر احمد عثمانی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۳۳	ریاض الصالحین	امام ابوزکریا محی الدین یحی بن شرف النووی	دارالقاسم ریاض/ فیصل پبلیکشنز

کتب فقہ وفتاویٰ عربی

۳۴	تنویر الابصار مع الدر والرد	امام محمد بن عبداللہ تمرتاشی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۳۵	ردالمحتار (شامی)	علامہ محمد امین ابن عابدین شامی	بیروت
۳۶	فتح القدیر	محقق ابن ہمام حنفی	//
۳۷	البحر الرائق	علامہ زین الدین (ابن نجیم حنفی)	//
۳۸	تبیین الحقائق	امام فخر الدین عثمان بن علی زیلعی	//
۳۹	بدائع الصنائع	ملک العلماء شیخ علاء الدین کاسانی	دارالکتاب العربی بیروت
۴۰	الفتاوی الہندیۃ	شیخ نظام وجماعت علماء ہند	زکریا/ رشیدیہ/ دارالفکر
۴۱	الفتاوی البزازیۃ علی الہندیۃ	امام حافظ الدین محمد بن محمد (ابن بزاز)	//
۴۲	فتاوی قاضی خان علی الہندیۃ	امام فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی	مکتبہ زکریا/ مکتبہ حقانیہ
۴۳	الفقہ الاسلامی وأدلتہ	دکتور وہبہ زحیلی	دارالفکر سوریہ بدمشق
۴۴	الموسوعۃ الفقہیۃ	وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ	وزارۃ الاوقاف کویت

۴۵	حاشیۃ الجوہرۃ النیرۃ	تحقیق الیاس قبلان	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۴۶	النتف فی الفتاوی	امام ابوالحسن علی بن حسین سغدی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۴۷	اللباب فی شرح الکتاب	شیخ عبدالغنی الغنیمی المیدانی	احیاء التراث العربی
۴۸	الفقہ علی المذاہب الأربعۃ	عبدالرحمٰن بن محمد عوض الجزیری	احیاء التراث العربی
۴۹	بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد	محمد بن احمد القرطبی	المکتبۃ المدنیہ بدیوبند الہند
۵۰	موسوعۃ فتاوی المعاملات المالیۃ	مرکز الدراسات الفقہیۃ والاقتصادیۃ	دار السلام بالقاہرۃ
۵۱	ملتقی الابحر مع مجمع الأنہر	ابراہیم بن محمد بن ابراہیم حلبی حنفی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۵۲	الاحکام السلطانیہ للماوردی	بحوالہ غیر مسلم ملکوں میں آپ کے مسائل اوران کا شرعی حل	
۵۳	العنایہ شرح الہدایہ	امام شیخ اکمل الدین بابرتی حنفی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۵۴	الفلک المشحون فی الانتفاع بالمرہون ملحقۃ مجموعہ رسائل لکنوی	علامہ شیخ عبدالحی لکھنوی	ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی

کتب فقہ وفتاویٰ اردو

۵۵	فتاویٰ محمودیہ	علامہ مفتی محمود حسن گنگوہی	فاروقیہ کراچی
۵۶	فتاویٰ بینات	مجلس دعوت وتحقیق اسلامی	مکتبہ بینات بنوری ٹاؤن
۵۷	احسن الفتاوی	علامہ مفتی رشید احمد پاکستانی	دار الاشاعت دیوبند
۵۸	امداد الفتاوی	علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	دار العلوم کراچی
۵۹	فتاوی حقانیہ	علامہ مفتی عبدالحق پاکستانی	دار العلوم حقانیہ پاکستان
۶۰	کتاب الفتاوی	علامہ شیخ خالد سیف اللہ رحمانی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۶۱	فتاوی عثمانی	علامہ مفتی محمد تقی عثمانی	معارف القرآن کراچی
۶۲	کفایت المفتی	علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی	دار الاشاعت کراچی
۶۳	فتاوی امارت شرعیہ	ابوالمحاسن سجاد	امارت شرعیہ پٹنہ
۶۴	آپ کے مسائل اوران کا حل	علامہ مفتی محمد یوسف لدھیانوی شہید	مکتبہ نعیمیہ دیوبند (جدید)
۶۵	فتاوی اشاعت العلوم اکل کوا	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا (غیر مطبوعہ)
۶۶	فقہی مقالات	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	زمزم بکڈپو دیوبند
۶۷	جدید فقہی مسائل	شیخ خالد سیف اللہ رحمانی	رشیدیہ/ مدینہ کلاتھ مارکیٹ راولپنڈی

۶۸	قاموس الفقہ	شیخ خالد سیف اللہ رحمانی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۶۹	جواہر الفقہ	علامہ مفتی شفیع احمد عثمانی	تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند
۷۰	المسائل المہمہ	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا
۷۱	محقق ومدلل جدید مسائل	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا
۷۲	ایضاح النوادر	مفتی شبیر صاحب قاسمی	فرید بکڈپو
۷۳	غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل......	مفتی اختر امام عادل قاسمی	مکتبہ جامعہ ربانی، سمستی پور، بہار

کتب اصول فقہ وقواعد فقہ

۷۴	الاشباہ والنظائر	علامہ زین الدین (ابن نجیم حنفی)	مکتبہ فقیہ الامت دیوبند/ اِدارۃ القرآن کراچی
۷۵	شرح المجلۃ	شیخ سلیم رستم باز البنانی	داراحیاء التراث العربی
۷۶	درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام	شیخ علی حیدر استنبول ترکی	دارالجیل بیروت
۷۷	الاصول والقواعد للفقہ الاسلامی	شیخ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	الہدی پبلیکیشنز نئی دہلی
۷۸	ھامش اصول الشاشی	مولوی حافظ محمد برکت اللہ فرنگی محلی	مکتبہ بلال بکڈپو دہلی
۷۹	نور الانوار مع قمر الاقمار	شیخ احمد ملاجیون	یاسر ندیم اینڈ کمپنی
۸۰	جمہرۃ القواعد الفقہیۃ	دکتور علی احمد الندوی	شرکۃ الراجحی المصرفیۃ
۸۱	قواعد الفقہ	شیخ مفتی عمیم احسان مجددی برکتی	اشرفی بکڈپو دیوبند
۸۲	القواعد الکلیۃ والضوابط الفقہیۃ	محمد عثمان شبیر	دارالنفائس اردن
۸۳	ترتیب اللآلی فی سلک الأمالی	محمد بن سلیمان (ناظر زادہ)	مکتبۃ الرشد ریاض
۸۴	القواعد الفقہیۃ	علی احمد الندوی	دارالقلم دمشق، سوریہ
۸۵	شرح القواعد الفقہیۃ	شیخ احمد بن محمد الزرقاء	دارالقلم دمشق، سوریہ

کتب متفرقہ

۸۶	شرح السیر الکبیر	امام محمد بن الحسن الشیبانی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۸۷	المصباح المنیر	احمد بن محمد علی المقری الفیومی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۸۸	معجم لغۃ الفقہاء	محمد رواس قلعہ جی/ حامد صادق قنیبی	اِدارۃ القرآن کراچی

مقالہ

(۲۳/رواں فقہی سمینار [جمبوسر بھروچ، گجرات] ۲۸، ۲۹/ربیع الثانی -۱/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ/ مطابق: ۱-۳/مارچ ۲۰۱۴ء)

عقد استصناع

سوال: ۱- موجودہ دور میں کس طرح کی اشیاء میں عقد استصناع جاری ہوسکتا ہے، اوراس سلسلے میں اُصول کیا ہوگا؟

جواب: ۱- موجودہ دور میں استصناع اُن تمام چیزوں میں جاری ہوگا، جن کا لوگوں کے درمیان تعامل جاری ہو۔[۱]

سوال: ۲- استصناع خود بیع ہے یا وعدۂ بیع؟

جواب: ۲- استصناع عقد بیع (لازم) ہے، وعدۂ بیع نہیں![۲]

سوال: ۳- ظاہر ہے کہ استصناع میں خریدار جس چیز کو خریدتا ہے، وہ عقد کے وقت معدوم ہوتی ہے، تو جیسے وہ ایک معدوم شئے کو خرید کررہا ہے، کیا مبیع (مصنوع) کو وجود میں آنے سے پہلے وہ اسے کسی اور سے، اور پھر یہ دوسرا خریدار کسی تیسرے شخص سے فروخت کرسکتا ہے؟ اور سلسلہ وار بیع کی تمام صورتیں بیع معدوم سے مستثنیٰ ہوں گی؟ آج کل خاص کر فلیٹس کی خرید وفروخت میں کثرت سے ایسی بات پیش آتی ہے۔

جواب: ۳- بیع استصناع میں جب تک شئے تیار کرکے مشتری کے سپرد اور حوالہ نہ کی جائے، تو اس وقت تک مشتری کی ملک نہ ہونے اور شئے کے معدوم ہونے کی بنا پر،

اس کا آگے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، ہاں! البتہ اُس شئے کی خرید وفروخت محض پہلی مرتبہ ہی ہو، تو پھر بیع استصناع کے طور پر جائز اور درست ہے۔ (۳)

نوٹ-: آج کل بیع استصناع میں مصنوع (مبیع) کے معدوم ہونے کی صورت میں بھی محض قانونی اجازت اور کاغذات کو بنیاد بنا کر اُسے آگے بیچنا، اُس پر دلالی کرنا اور کمیشن لینا درست سمجھا جاتا ہے، جب کہ یہ ہر دو اُمور شرعاً ناجائز اور ممنوع ہیں، جن سے اجتناب واحتراز لازم ہے (۴)- یہی نظریہ ہمارے دارالافتاء (جامعہ اکل کوا) کا بھی ہے۔

رہی بات فلیٹس کی! تو اگر کسی شخص نے فلیٹس خریدا اور فلیٹ ابھی بن کر تیار نہ ہوا، تو وہ شخص اس فلیٹ کو کسی اور کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتا، کیوں شرعِ اسلامی نے اس چیز کی بیع سے منع کیا ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئی (۵)، لیکن اگر فلیٹ تیار ہو چکا ہو، تو اس کو فروخت کرسکتا ہے، چاہے زیادہ قیمت میں یا کم قیمت میں، خواہ ابھی یہ فلیٹ اس کے قبضہ میں نہ آیا ہو، کیوں کہ اموالِ غیر منقولہ کو قبل القبض بھی فروخت کیا جاسکتا ہے۔ (۶)

سوال: ۴- استصناع کا تعلق صرف ان اشیاء سے ہے، جو اموالِ منقولہ کے قبیل سے ہیں، یا اموالِ غیر منقولہ جیسے بلڈنگ وغیرہ سے بھی ہے؟

جواب: ۴- استصناع کا تعلق اموالِ منقولہ وغیر منقولہ دونوں کے قبیل سے ہے۔ (۷)

سوال: ۵- اسلامی مالیاتی ادارے استصناع کو بطورِ استثمار استعمال کرنے کے لیے ایک ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں، جسے وہ استصناع موازی یا متوازی کہتے ہیں،

یہ معاملہ بنیادی طور پر تین فریقوں کے درمیان ہوتا ہے، جس میں مالیاتی ادارے کی حیثیت درمیانی فریق کی ہوتی ہے، ادارہ ایک شخص سے آرڈر حاصل کرتا ہے، اور دوسرے شخص کو خود آرڈر دیتا ہے، اور دونوں کی قیمت میں ایسا فرق رکھتا ہے کہ پہلے شخص سے جو زیادہ رقم حاصل ہو، وہ اس کا نفع ہو جائے، اس صورت میں شرعاً کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

جواب: ۵- اس صورت میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، کیوں کہ صانع کے ذمہ یہ بات ہوتی ہے کہ جس قسم کی مواصفات کی چیز مستصنع نے طلب کی ہے، وہ اس کو فراہم کرے، لیکن اگر صانع کے لیے مستصنع کی مواصفات والی چیز بنانا- ناممکن ومشکل ہو، اور وہ بالکل انہی مواصفات کی چیز بازار سے خرید کر لادے، تو فقہائے کرام کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ دونوں عقد منفصل ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ مشروط نہ ہوں، ایک دوسرے پر موقوف نہ ہوں، ایک کی ذمہ داریاں دوسرے کی ذمہ داریوں کے ساتھ گڈمڈ نہ کی جائیں۔ (۸) (انعام الباری: ۶/۱۸۹)

سوال: ۶- **(الف)**: عقد استصناع میں بعض دفعہ صانع کو ایک مناسب رقم بطورِ بیعانہ کے دینی پڑتی ہے، اگر صانع (بائع) آرڈر کے مطابق مال تیار کر دے، لیکن خریدار اس کو لینے سے مکر جائے، تو بائع اس رقم کو ضبط کر سکتا ہے، یا اس سے اپنے نقصان کی تلافی کر سکتا ہے؟

(ب): واضح ہو کہ عام طور پر ایسی صورتوں میں مطلوبہ ڈیزائن کے مطابق کثیر مقدار میں کسی چیز کی تیاری کا آرڈر دیا جاتا ہے، اگر خریدار بعد میں مکر جائے، تو بائع کے لیے اس کو فروخت کرنا بہت دشوار ہوتا ہے، کیوں کہ ضروری نہیں کہ اس ڈیزائن یا

معیار کی چیز مارکیٹ میں دوسرے لوگوں کو بھی مطلوب ہو۔

جواب: ۶-(الف): اگر خریدار آرڈر کے مطابق تیار کردہ مال لینے سے مُکر جائے، تو صانع (بائع) بیعانہ کی رقم کو ضبط کر کے اپنے نقصان کی تلافی نہیں کرسکتا(۹)، البتہ مکمل اجرت وصول ہونے تک عین شئے کو روک سکتا ہے۔(۱۰)

(ب): صانع یعنی بائع کو اس دشواری سے بچانے کے لیے بیعانہ کی رقم کے ذریعہ تلافیٔ نقصان (جو کہ حرام وممنوع ہے) سے بہتر صورت یہ ہے کہ-: فی زماننا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قولِ مفتیٰ بہ کے بجائے، غیر معروف وغیر مفتیٰ بہ قولِ امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ پر عمل کیا جائے، یعنی عقدِ استصناع کو لازم قرار دیا جائے، اور مستصنع کو خیارِ رؤیت حاصل نہ ہو، جیسا کہ متعدد معاصر علمائے کرام نے بھی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ترجیح دی ہے(۱۱)۔(امام صاحب کے نزدیک عقد استصناع میں مستصنع کو خیارِ رؤیت بھی ملتا ہے)۔(۱۲)

سوال:۷- (الف): اگر کسی چیز کا آرڈر دیا جائے، اور مصنوع کے لیے موجودہ مٹیریل خود خریدار فراہم کردے، تو یہ ''عقد'' استصناع کے حکم ہوگا یا اجارہ کے؟ عقد استصناع میں اگر آرڈر کے مطابق چیز نہ پائی جائے، تو خریدار کو ردّ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، کیا اس صورت میں بھی آرڈر دینے والے کو اس کا حق حاصل ہوگا؟

(ب): اور اگر آرڈ دینے والے کو اس کا قبول کرنا ضروری ہو، تو مکمل طور پر آرڈر کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے، کیا وہ صانع سے اس کا جرمانہ وصول کرسکتا ہے؟

جواب: ۷- **(الف)**: اگر کسی چیز کا آرڈر دیا جائے اور مصنوع کے لیے موجودہ مٹیریل خود خریدار فراہم کر دے، تو یہ عقد-اجارہ کے حکم میں ہوگا۔ (۱۳)

(ب): جب یہ عقد ''اجارہ'' کے حکم میں ہوا، تو مستصنع یعنی آرڈر دینے والا- مستاجر، اور صانع یعنی کاریگر- اجیر مشترک ہوا، اور اجیر مشترک اگر مطلوبہ آرڈر کے مطابق چیز نہ بنائے، تو پھر خریدار کو اختیار حاصل ہوگا، اور مکمل آرڈر کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں جو نقصان ہوا ہے، صانع سے اُس کا جرمانہ وصول کرسکتا ہے۔ (۱۴)

سوال: ۸- عقد استصناع میں مبیع کی حوالگی کی تاریخ مقرر ہوجائے، مگر بائع اسے وقت پر فراہم نہ کر پائے، تو کیا خریدار اس کا تاوان وصول کرسکتا ہے؟ واضح ہو کہ بعض اوقات خریدار اسی مقررہ تاریخ کے لحاظ سے اپنے گاہک سے معاملہ طے کرتا ہے، اگر بائع مقررہ وقت پر مبیع تیار کر کے حوالہ نہ کرے، اور اسے بروقت مارکیٹ سے وہی شئے حاصل کر کے اپنے گاہک کو دینی پڑے، تو اس کو مارکیٹ سے گراں قیمت پر یہ شئے خرید کرنی پڑتی ہے، اور دوہرا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، ایک تو اس نے وہ سامان زیادہ قیمت پر خرید کیا، دوسرے جب خود اس کا آرڈر موصول ہوگا، تو اب اس شئے کو فروخت کرنا دشوار ہوجائے گا، اور نیا خریدار تلاش کرنا ہوگا۔

جواب: ۸- استصناع کے باب میں فقہ کی متداول کتب، مذکورہ سوال کے جواب میں خاموش نظر آتی ہیں، البتہ اجارہ کے اندر فقہائے کرام نے بصورتِ تاخیر تاوان وصول کرنے کی شرط کو جائز قرار دیا ہے (۱۵)، اور عقد استصناع چوں کہ عقدِ اجارہ سے کافی مشابہ ہے، اس لیے اسی پر قیاس کرتے ہوئے اگر استصناع کے اندر

دونوں فریق اس بات پر متفق ہوجائیں کہ مطلوبہ شئے کی فراہمی میں تاخیر کی صورت میں فی یوم اتنی متعین قیمت کم ہوجائے گی، تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے، خصوصًا آج کے دور میں کہ جدید اور بڑے منصوبوں میں مقررہ وقت میں ذرا سی تاخیر بھی خریدار کے لیے عظیم مالی خسارے اور پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " دررالحكام شرح مجلة الأحكام " : كل شيء تعومل استصناعه يصحّ فيه الاستصناع على الإطلاق . (مجلة) . (۱/۴۲۳ ، المادة : ۳۸۹)

وفيه : أي أن الاستصناع صحيح في كل ما تعومل به عادة وعرفًا كالأواني المعدنية والنحاسية والإخفاف وغيرها من الأشياء . (۱/۴۲۳)

وفيه أيضًا : يلزم أن يكون الاستصناع في الأشياء المتعامل فيها . (۱/۴۲۲ ، خلاصة الفصل)

(۲) ما في " دررالحكام شرح مجلة الأحكام " : الاستصناع بيع وليس بوعد مجرد .

(۱/۴۲۲ ، خلاصة الفصل)

ما في " عقد البيع للزرقاء " : الاستصناع عقد مع ذي صنعة على عمل شيء معين .... والراجح في الاجتهاد الحنفي أنه بيع للعين الموصى بصنعها لا لعمل الصانع . اهـ . (ص/۱۵۳ ، الفرع الثاني ، الاستصناع ، ط ؛ دار القلم دمشق)

وما في هامش " عقد البيع " : قال الشيخ الزرقاء : قد رجحنا ذكر الاستصناع هنا مع أنواع البيع ، لأن حقيقته بيع المصنوع المطلوب قبل صنعه فهو نوع من البيع المطلوب فيه عمل من البائع ، فعقد البيع أليق مناسبة له من عقود العمل . (ص/۱۵۳)

ما في " درر الحكام شرح مجلة الأحكام " : الاستصناع عقد مقاولة مع أهل الصنعة على أن يعملوا شيئًا فالعامل صانع والمشتري مستصنع والشيء مصنوع . (۱/۱۱۴) (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۶۴، ط؛ مکتبہ فیصل دیوبند دہلی، انعام الباری:۶/۱۸۱، مالی معاملات پر غرر کے اثرات:ص/۶۹)

(۳) ما فی " المبسوط للسرخی " : وإذا استصنع الرجل عند الرجل خفين أو قلنسوة أو طستاً أو كوزاً من أوانی النحاس فالقياس أن لا يجوز .... ولكنا نقول : نحن تركنا القياس لتعامل الناس فی ذلک ، فإنهم تعاملون من لدن رسول الله ﷺ إلى يومنا هذا من غير نكير منكر ، وتعامل الناس من غير نكير أصل من الأصول كبير . (۱۲/۱۶۵ ، كتاب البيوع)

ما في " الكافي في فقه الحنفي " : الاستصناع شرعًا : أن يقول لصاحب خف أو صفار (نحاس):=

....

=اصنع لي طوله كذا ، وسعته كذا مما تعورف .... وقد تعارف الناس اليوم الاستصناع في البيوع ، فيعرض المقاول مشروع ، عمارة فيها بيان سعة كل شقة وغرفها ، وطول الغرف وعرضها ونوع مواد البناء المختلفة ونوع البلاط والدهان ، ويطلب كذا ، وأن يسلمها بتاريخ كذا وكذا ، ويبين ثمن الشقة وأنه يطلب ثمنها على أقساط كذا وكذا إلى تمام البناء ، فهل يعد استصناعاً ، إذا تحقق انتفاء ما يجلب النزاع والحاجة إليه ما سة ، أرى أنه إذا انتفى التنازع والخلاف فلا بأس به للعادة . (۳/۱۴۴۳ ، كتاب البيوع ، الاستصناع)

ما في " الهداية " : وإن استصنع شيئاً من ذلك (أي في طست أو قمقمة و خف وغيره) بغير أجل جاز استحساناً للإجماع الثابت بالتعامل ، وفى القياس لا يجوز ، لأنه بيع المعدوم ، والصحيح أنه يجوز بيعاً لا عدة ، والمعدوم قد يعتبر موجوداً حكماً . (۳/۸۴، كتاب البيوع ، باب السلم)

(۴) ما في " الموسوعة الفقهية " : للمبيع شروط ؛ هى أن يكون المبيع موجوداً حين العقد ، فلا يصح بيع المعدوم ، وذلك باتفاق العلماء . (۹/۱۴ ، البيع)

ما في " درر الحكام شرح مجلة الأحكام " : المال هو يميل إليه طبع الإنسان ويمكن ادخاره إلى وقت الحاجة منقولاً أو غير منقولاً ..... وكما كان المعدوم لا يمكن احرازه ولا ادخاره فليس بمال ، والبيع بما ليس بمال باطل ، فبيع المعدوم باطل . [۱/۱۷۷ ، المادة : ۱۹۷]

(المسائل المهمة : ۴/۱۵۲ ، ۱۵۳)

(۵) ما في " الموسوعة الفقهية " : للمبيع شروط هي أن يكون المبيع موجودًا حين العقد فلا يصح بيع المعدوم وذلك باتفاق الفقهاء . (۹/۱۴ ، البيع)

ما في " درر الحكام شرح مجلة الأحكام " : المال هو يميل إليه طبع الإنسان ويمكن ادخاره إلى وقت الحاجة منقولاً أو غير منقولاً .... ولما كان المعدوم لا يمكن إحرازه ولا ادخاره فليس بمال والبيع بما ليس بمال باطل فبيع المعدوم باطل . (۱/۱۷۷ ، المادة :۱۹۷)

(٦) وفيه أيضًا : للمشتري أن يبيع المبيع للآخر قبل قبضه إن كان عقاراً وإلا فلا .

(۱/۲۳۷ ، المادة :۲۵۳)

ما في " الهداية " : ويجوز بيع العقار قبل البقض عند أبي حنيفة وأبي يوسف . (۲/۷۴ ، كتاب البيوع ، باب التولية ، مجمع الأنهر: ۳/۱۱۳ ، كتاب البيوع ، باب المرابحة والتولية ، البحر الرائق :٦/۱۹۳ ، كتاب البيوع ، باب المرابحة والتولية ، فصل ، المسائل المهمة :۲/۱۹۰ ، ۱۹۱)

(۷) ما في " درر الحكام شرح مجلة الأحكام " : كل شيء تعومل استصناعه يصحّ فيه=

....

= الاستصناع على الإطلاق . (مجلة) . (۱/۴۲۳ ، المادة : ۳۸۹)

وفيه : أي أن الاستصناع صحيح في كل ما تعومل به عادة وعرفًا كالأواني المعدنية والنحاسية والإخفاف وغيرها من الأشياء . (۱/۴۲۳)

وفيه أيضًا : يلزم أن يكون الاستصناع في الأشياء المتعامل فيها . (۱/۴۲۲ ، خلاصة الفصل)

ما في " المبسوط للسرخى " : وإذا استصنع الرجل عند الرجل خفين أو قلنسوة أو طستاً أو كوزاً من أوانی النحاس فالقياس أن لا يجوز .... ولكنا نقول : نحن تركنا القياس لتعامل الناس فی ذلک ، فإنهم تعاملون من لدن رسول الله ﷺ إلی یومنا هذا من غیر نکیر منکر ، وتعامل الناس من غیر نکیر أصل من الأصول کبیر . (۱۲/۱۶۵ ، کتاب البیوع)

(۸) ما في " الفتاوی الهندية " : والأصح أن المعقود عليه المستصنع فيه ، ولهذا لو جاء به مفروغًا عنه لا من صنعته قبل العقد جاز . كذا في الكافي . (۳/۲۰۸ ، کتاب البیوع ، الباب التاسع عشر في القرض والاستقراض والاستصناع ، انعام الباری : ۶/۱۸۷ ، کتاب البیوع ، باب النجار)

(۹) ما في " إعلاء السنن " : عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ نهی عن بیع العربان ، قال مالک : وذلک فیما نری ، والله تعالی أعلم ، یشتري الرجل العبد أو الوليدة أو يتكاری الدابة ، ثم يقول للذي اشتری منه أو تكاری منه : أعطیتک ديناراً أو درهماً أو أكثر من ذلک أو أقل علی أني أخذت السلعة أو ركبت ما تكاريت منک ، فالذي أعطیتک من ثمن السلعة أو من كراء الدابة ، وإن تركت ابتياع السلعة أو كراء الدابة فما أعطيتک لک باطل بغير شيء . (۱۴/۱۹۷ ،کتاب البیوع ، باب النهي عن بيع العربان ، رقم الحديث : ۴۶۷۲ ، الفقه الإسلامي وأدلته : ۵/۳۴۳۴ ، بيع العربون ، الموسوعة الفقهية : ۹/۹۳ ، ۹۴)

ما في " حجة الله البالغة " : ونهی عن بیع العربان أن يقدم إليه شيء من الثمن ، فإن اشتری حسب من الثمن وإلا فهو له مجاناً وفيه معنی الميسر . (۲/۱۹۱ ، البيوع المنهي عنها ، بيوع فيها معن الميسر ، ط؛ دار المعرفة بيروت ، بداية المجتهد ونهاية المقتصد : ۳/۲۱۸ ، کتاب البیوع ، الباب الرابع في بيوع الشروط والثنيا ، محقق ومدلل جديد مسائل : ۱/۳۱۰ ، رقم المسئلة : ۲۹۶)

(۱۰) ما في " المختصر القدوري " : وكل صانع لعمله أثر في العين كالقصار والصباغ فله أن يحبس العين بعد الفراغ من عمله حتی يستوفی الأجرة . (ص/۱۰۴ ، کتاب الإجارة)

(۱۱) ما في " الغرر وأثره في العقود " : قال الدكتور الشيخ صديق محمد الأمين الضرير : "والعمل برأي أبي يوسف أولی من العمل بالرأيين الصحيحين في المذهب في نظري ، لأنه=

....

= لا ضـرر فيـه عـلى المتعاقدين ، وهو أبعد عن الغرر ، وذلک لأنه في حالة ثبوت الخيار لا يدري كل من الصنانع والمستصنع هل يتم العقد أم لا ؟ وهذا غرر يمكن تجنّبه بجعل العقد لازمًا إلا إذا قدم الصانع شيئًا مخالفًا للوصف فثبت للمشتري الخيار لفوات الوصف " . (ص/۲٦۷)

مـا في " مجلة مجمع الفقه الإسلامي " : قال الشيخ مصطفى أحمد الزرقاء : " لزم اختيار قول أبي يوسف رحمه الله في هذا ؛ مراعاة لمصلحة الوقت " . (ص/۲/۲۳۲ ، بحث الدكتور مصطفى الزرقاء، الدورة السابعة ، العدد السابع ، الجزء الثاني – السنة : ۱۴۱۲هـ – ۱۹۹۲م)

وفيـه أيضًا : قال الدكتور الشيخ على محي الدين القره داغى : " والذي يظهر لنا رجحانه هو القول بأن عقد الاستصناع عقد لازم كما هو رواية عن أبي يوسف " . (ص/۳٦۳)

ومـا فـي " مـجلة مجمع الفقه الإسلامي " : " إن عقد الاستصناع وهو عقد وارد على العمل والعين في الذمة للطرفين إذا توفرت فيه الأركان والشروط .

(ص/۷۷۷ ، بحواله مالی معاملات پر غرر کے اثرات:ص/۶۹– ۷۱)

مـا في " الموسوعة الفقهية " : وذهب أبويوسف إلى أنه إن تمّ صُنعه وكان مطابقًا للأوصاف المتفق عـليهـا يـكـون عـقدًا لازمًا ، وأما إن كان غيرَ مطابقٍ لها فهو غير لازم عند الجميع لثبوت خيار فوات الوصف . (۳/۳۲۹ ، استصناع ، الآثار العامة للإستصناع)

مـا في " درر الحكام شرح المجلة الأحكام العدلية " : وإذا انعقد الاستصناع فليس لأحد العاقدين الرجوعُ وإذا لم يكن المصنوع على الأوصاف المطلوبة المبيّنة كان المستصنع مُخيّرًا .

(المادة : ۳۹۲)

وفـي درر الـحـكـام : فـإذا انـعقد – فليس لأحد العاقدين على رواية أبي يوسف الرجوع عنه بدون رضاء الآخر . (المادة:۳۷۵) . (۱/۴۲۴ ، ط ؛ دار الجيل)

(۱۲) (انعام البارى : ۶/۱۸۱– ۱۸۶ ، كتاب البيوع ، باب النجار)

(۱۳) (انـعـام البـارى : ۶/۱۸۷ ، كتـاب البيـوع ، بـاب الـنجار ، تحت رقم الحديث : ۲۰۹۴، ط؛ مكتبة الحراء ، كورنگى كراچى)

(۱۴) مـا فـي " مـختـصـر الـقـدوري " : والأجـراء عـلـى ضربين ؛ أجير مشترک وأجير خاص ؛ فـالمشترک من لا يستحق الأجرة حتى يعمل كالصباغ والقصّار ، والمتاع أمانة في يده إن هلک لم يـضـمـن شيـئًـا عند أبي حنيفة وقالا رحمهما الله يضمنه وما تلف بعمله كتخريق الثوب من دقه وزلق الحمّال وانقطاع الحبل الذي يشدّ به المُكاري الحمل . اهـ . =

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=(ص/۱۰۲، کتاب الإجارة ، ط ؛ مکتبه بلال بکڈپو دهلی)

وفيه أيضًا : إذا اختلف الخيّاط والصبّاغ وصاحب الثوب فقال صاحب الثوب للخياط أمرتک أن تعمله قَباءً ، وقال الخياط قميصًا، أو قال صاحب الثوب للصباغ أمرتک أن تصبغه أحمر فصبغته أصفر ، فالقول قول صاحب الثوب مع يمينه ، فإن حلف فالخياط ضامن .

(ص/۱۰۵، کتاب الإجارة ، ط؛ بلال بکڈپو دهلی)

(۱۵) ما في " الهداية شرح البداية " : (ولو قال : إن خطته اليوم فبدرهم ، وإن خطته غدًا فبنصف درهم ، فإن خاطه اليوم فله درهم، وإن خاطه غدًا فله أجر مثله عند أبي حنيفة لا يجاوز به نصف درهم ......، وقال أبو يوسف ومحمد رحمهما الله : الشرطان جائزان) .... ، فإن خاطه في اليوم الثالث لا يجاوز به نصفَ درهم عند أبي حنيفة رحمه الله ، وهو الصحيح ؛ لأنه إذا لم يرض بالتأخير إلى الغد فبالزيادة عليه إلى ما بعد الغد أولى . (۳/۲۴۱ ، ۲۴۲ ، کتاب الإجارة ، باب الإجارة على أحد الشرطين ، ط؛ دار الأرقم بيروت ، الجوهرة النيرة : ۱/۵۹۰، کتاب الإجارة ، ط ؛ دار الکتب العلمية بيروت ، مالی معاملات پر غرر کے اثرات:ص/٦۵، ٦٦، ٦۷)

شہریت کا مسئلہ

سوال: ۱- اسلام میں شہریت حاصل ہونے، یا حاصل کرنے کے لیے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؛ کسی ملک میں بود وباش اختیار کرلینے کو، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے کو، ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کو، یا کسی اور بات کو؟

جواب: ۱- اسلام میں شہریت حاصل ہونے، یا حاصل کرنے کے لیے، کسی ملک میں مستقل بود وباش اختیار کرلینے کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اس کی تائید فقہ اسلامی کے اس قانون سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی مقام پر مع اہل وعیال مستقل بود وباش اختیار کرتا ہے، تو وہ مقام اس کے حق میں وطنِ اصلی بن جاتا ہے[۱]، رہیں معاشی سرگرمیاں، یا مخصوص مدت تک کسی جگہ پر قیام تو یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کی بنیاد بنایا جائے، کیوں کہ آج کے اِس عالَم گیریت (Globalization) کے زمانے میں آدمی کی سکونت کہیں ہوتی ہے، اوراس کی معاشی سرگرمیاں کہیں اور، نیز دورِ حاضر میں نقل وحمل اور آمد ورفت کی سہولیات بھی اس قدر میسر ہیں جو ماضی میں نہیں تھیں۔

سوال: ۲- اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے، تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا یا نہیں؟

جواب: ۲- اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری، یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے[۲]، تو اس دوسرے

مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً مستحب [۳]، اور اخلاقی طور پر ضروری ہے [۴]، کیوں کہ اسلام ضعیف ومجبور، لاچار و بے بس لوگوں کے ساتھ نصرت، مودت اور اخوت وبھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے، بشرطیکہ اس طالبِ شہریت شخص کا قیام ملک وملت کے حق میں دینی، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے نقصان دہ نہ ہو۔ [۵]

سوال: ۳-(الف): بعض دفعہ کسی خاص خطے میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں، اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں، تو انہیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا یہ بات شرعاً درست ہے؟

(ب): کیا یہ بات جائز مانی جاسکتی ہے کہ مسلمان تارکینِ وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہیں دی جائیں؟

جواب: ۳- (الف): یہ بات شرعاً درست نہیں ہے۔

(ب): یہ بات جائز نہیں مانی جاسکتی۔ (بلکہ قدیم باشندوں کی طرح تارکینِ وطن پناہ گزینوں کو بھی شہری ہونے کی سہولتیں دی جانی چاہیے، کیوں کہ حفاظتِ نفس، نسل، مال، عزت وآبرو مقاصدِ شریعت میں سے ہے [۶]، نیز بنی نوع انسان مکرم ومحترم ہیں [۷]، خصوصاً ایک مسلم کی حرمت تو کعبہ کی حرمت سے بھی بڑھی ہوئی ہے [۸]، اور زمین پوری کی پوری اللہ کی ملک ہے، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں [۹]، اس لیے مظلوم، مجبور اور پناہ گزیں مسلمانوں کو قدیم شہری باشندوں کی طرح مراعات نہ دینا گویا ایک مسلمان کی حرمت کو پامال کرنا ہے)۔

سوال: ۴- اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے کیا حقوق مانے جائیں گے؟ جیسے: ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں اُمیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق، وغیرہ۔

جواب: ۴- ایک مسلمان جب کسی ملک یا شہر کو اپنا وطنِ اصلی اور مستقل مستقر بنالے (۱۰)، تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے اُس کو وہ تمام مراعات وحقوق حاصل ہوں گے، جو عام شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں (۱۱)، جیسے؛ ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں اُمیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق، اسی طرح اُس کی جان وآبرو کی حفاظت (۱۲)، ذاتی ملکیت کی حفاظت (۱۳)، شخصی آزادی (۱۴) آزادیٔ اظہارِ رائے (۱۵)، عقیدہ ومسلک کی آزادی (۱۶)، عدل وانصاف۔ (۱۷)

سوال: ۵- شریعتِ اسلامی میں پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے؟ نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے، اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

جواب: ۵- پناہ گزیں کا حکم مستأمن کی طرح ہے (۱۸)، اور ایک مستامن کو کسی ملک میں پناہ لینے پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں، وہ تمام حقوق پناہ گزینوں کو حاصل

ہوں گے، اور اُن کے نفس، نسل، عقل، مال اور دین ومذہب تمام چیزوں کی حفاظت لازم ہوگی۔[۱۹]

نوٹ:- اگر پناہ گُزین مسلمان ہیں اور اُس ملک یا شہر میں مستقل سکونت اور بود وباش اختیار کر چکے ہیں، تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دیگر باشندوں کو حاصل ہیں، البتہ اگر پناہ گُزین غیر مسلم ہیں، تو پھر انہیں سیاسی (Political) اعتبار سے ملکی انتخابات میں حصہ لینے اور امیدوار بننے کا حق حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی بھی ہے[۲۰]، اور کافر کی شہادت مسلمان کے خلاف نا قابلِ قبول ہے، کیوں کہ شہادت میں بھی ایک قسم کا غلبہ (**تنفيذ القو ل على الغير**) پایا جاتا ہے، اور قاعدۂ مسلمہ ہے: ''اسلام غالب ہوتا ہے، مغلوب نہیں''۔[۲۱]

سوال:۶- **(الف):** کیا کسی مسلمان کے لیے ضرورت ومجبوری کی بنا پر، **(ب):** یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟

جواب: ۶- **(الف):** کسی ضرورت ومجبوری کی بنا پر، مثلاً: مسلمانوں کی آبادی میں جان ومال کو تحفظ حاصل نہ ہو، ہمہ وقت بلا کسی جرم کے گرفتار ہوجانے، یا قتل کردیئے جانے کا شدید خطرہ لاحق ہو، اور غیر مسلموں کی مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کرنے کے علاوہ بچنے کی کوئی صورت نہ ہو[۲۲]، مسلمانوں کی آبادی میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں، اور غیر مسلموں کے علاقہ میں رہنے سے جائز ملازمت کا حصول آسان ہو، یا کوئی مسلمان حلال روزی کے خاطر غیر مسلموں کی آبادی میں رہ جائے[۲۳]، یا غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کی نیت ہو، یا جو مسلمان غیر مسلموں

کے ساتھ مقیم ہیں ان کو دین اسلام پر جمے رہنے کی تلقین کرنا مقصود ہو[۲۴]، تو ان تمام صورتوں میں چند شرطوں کے ساتھ غیر مسلم ملک میں شہریت وجنسیت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی:

(۱) غیر مسلم ممالک میں یا شہروں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص احکام اسلام پر مکمل طور پر کار بندر ہے۔[۲۵]

(۲) وہاں مروجہ منکرات ومحظورات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھے۔[۲۶]

(۳) اس کے پاس دینی وشرعی اتنا علم ہو کہ جس سے وہ احکام اسلام سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دفع کرسکتا ہو۔

(۴) اس کے پاس اتنا تقویٰ ودیانت ہو جو اسے شہوات سے روک سکے۔[۲۷]

(۵) ایسے ملک کی شہریت اختیار کرے جو اسے فوج میں داخلہ، مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غیر اسلامی امور کی انجام دہی پر مجبور نہ کرے۔[۲۸]

(ب): جب اپنے ملک میں بقدرِ کفاف معاشی وسائل حاصل ہوں، اس کے باوجود محض معاشی فوائد، خوشحالی وخوش عیشی، یا سماج ومعاشرہ میں معزز بننے[۲۹]، یا دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کا اظہار، فخر ومباہات[۳۰]، یا اپنی عملی زندگی میں غیر مسلموں کا طرز اختیار کرکے ان جیسا بننے[۳۱] کی غرض سے غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

نوٹ:- خصوصاً آج کے اِس دور میں مسلمانوں کو مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا مناسب نہیں، بلکہ مسلمانوں کی اپنی الگ آبادی ہونی چاہیے، یا مسلم اکثریتی علاقوں

میں رہنا بہتر ہے، تاکہ مسجد کی وجہ سے نماز کا اہتمام، اور مکتب کی وجہ سے اپنی اولاد کی بنیادی تعلیم کا نظم ہو سکے، مخلوط علاقے میں رہنے سے پڑوس کی وجہ سے تہذیب کا اثر پڑتا ہے، جیسا کہ ماضی میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے، ان کے درمیان رہنے سے نفع کم اور مضرت وخطرات زیادہ ہیں (۳۲)، اور مزید یہ کہ غیر مسلموں میں رہنے کی وجہ سے ان کی تہذیب کے اثرات سے نئی نسل کا متاثر ہو جانا بھی یقینی ہے، جس سے عقائد، عادات وعبادات پر زد پڑ سکتی ہے، اور قومی وملکی حالات کے پیش نظر، اور آئے دن ہونے والے فسادات کی وجہ سے جانی ومالی نقصان سے بچنے کی تدبیر بھی یہی ہے کہ ان علاقوں میں سکونت اختیار نہ کی جائے۔ (۳۳)

سوال: ۷- کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

جواب: ۷- جزیرۃ العرب کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا (۳۴)، البتہ سیاسی طور پر پناہ لینے والے غیر مسلموں کی طرف سے کسی فتنے، بغاوت یا ظلم کا اندیشہ ہو، جس سے مسلم حکومت کو خطرہ ہو (۳۵)، یا غیر مسلموں کی اکثریت ہو جاوے اور مسلمان اقلیت میں آکر تعطل کا شکار ہو جاوے، تو پھر ایسے حالات میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دینے سے احتراز ضروری ہے۔ (۳۶)

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " البحر الرائق " : والوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرىٰ اتخذها دارًا وتوطن بها مع أهله وولده ، وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها .

(۲۳۹/۲ ، بدائع الصنائع : ۲۸۰/۱)=

....

=ما في " الدر المختار مع الشامية " : (الوطن الأصلي) هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (أو توطنه) أي عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وإن لم يتأهل . (۲/۶۱۴)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : والحاصل أن شروط الاتمام ستة : النية ، والمدة ، واستقلال الرأي ، وترک السير ، واتحاد الموضع وصلاحيته . قهستاني . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (ستة) زاد في الحلية شرطاآخر ؛ وهو أن لا تكون حالته منافية لعزيمته . قال : كما صرحوا به في مسائل : أي كمسئلة من دخل بلدةً لحاجة ومسئلة العسكر . فافهم . (۲/۶۰۹)

(۲) ما في " الفقه الإسلامي وأدلته " : (أ) لكل إنسان حرية التنقل واختيار محل إقامته داخل بلاده أو خارجها مع مراعاة الضوابط المشروعة لذلک . (ب) للمضطهد حق اللجوء إلى دولة أخرى ، وعلى الدولة التي لجأ إليها أن تجيره حتى يبلغ مأمنه . (۸/۶۳۵۴، ۹– شرعة حقوق الإنسان في الإسلام ، حق التنقل واللجوء ، المادة الثانية والعشرون)

(۳) ما في " رعاية اللاجئين وحقوقهم في الإسلام " : يقول الشيخ حامد العلي أستاذ الثقافة الإسلامية في كلية التربية الأساسية بالكويت : يستحب في الإسلام إغاثة الملهوف ونصر المظلوم وحمل الكلّ (والكل هو الشخص الضعيف) وحمله أي إعانته حتى لو كان كافرًا ، وقد جاء في حديث عائشة قول خديجة رضي اللّٰه تعالى عنها للنبي ﷺ : " أول ما جاء ه الوحي فخشي على نفسه : كلا واللّٰه لا يخزيک اللّٰه أبدًا ، إنک لتصل الرحم وتحمل الكلّ ، وتكسب المعدوم ، وتقري الضيف ، وتعين على نوائب الحق . ويقول أيضًا : ولا ريب أن قبول اللاجيء السياسي إن كان مظلوما يخشى على نفسه أو ضعيفًا يطلب الأمان عند المسلمين ليحملوه ويعينوه.

(اون اسلام نت/on islam.net)

ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : " ترک الإحسان لا يكون إساءةً " .

(ص/۱۴۴ ، قاعدة :۸۷ ، شرح السير الكبير :۳/۱۱۰ ، باب ما يحمل عليه الفيء وما يركبه الرجل من الدواب ، قواعد الفقه :ص/۷۰ ، قاعدة :۸۲)

(۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إن اللّٰه يأمر بالعدل والإحسان وإيتآء ذي القربى وينهى عن الفحشآء والمنكر والبغي﴾ . (سورة النحل :۹۵)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿وأحسنوا ان اللّٰه يحب المحسنين﴾ . (سورة البقرة :۱۹۵)

ما في " محاسن التأويل [تفسير القاسمي] " : ﴿وأحسنوا﴾ أي : الإتيان بكل ما هو حسن ،=

....

= ومن أجلّه الإنفاق ، وقوله : ﴿إن اللّٰه يحب المحسنين﴾ قال الراغب : نبّه بإظهار المحبة للمحسنين على شرف منزلتهم وفضيلة أفعالهم .

(الباب : ۱۹۵ ، محمد جمال الدين القاسمي ، من المكتبة الشاملة)

ما في " اسلام کا نظام سیاست وحکومت " : حقوق مالی ہوں یا جانی، عزت وحیا کے ہوں یا امن کے- مطلب یہ کہ تمام انسان آرام وسکون کی زندگی بسر کرسکیں، مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ میں بڑی تاکید سے اس کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وليبدّلنّهم من بعد خوفهم أمنًا﴾ – '' اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن''۔ [سورۃ النور :۵۵] (۱/۴۲، انسانی حقوق کا تحفظ)

(۵) ما في " صحيح البخاري " : [في الأثر] : وقد أخرج عمر أخت أبي بكر حين ناحت .

(ص/۳۲۴ ، كتاب في الخصومات ، باب إخراج أهل المعاصي والخصوم من البيوت بعد المعرفة ، رقم : ۲۴۲۰ ، ط : احياء التراث)

ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : " دفع المفاسد أولى من جلب المنافع " .

(ص/۱۷۱ ، قاعدة :۱۴۴ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم :ص/۳۲۲ ، درر الحكام : ۱/۱/۴۱ ، المادة: ۳۰ ، قواعد الفقه:ص/۸۱ ، قاعدة :۱۳۳ ، جمهرة القواعد الفقهية :۲/۷۳۳ ، قاعدة : ۱۸۹ ، ترتيب اللآلي في سلك الأمالي :ص/۱۶۹ ، القواعد الفقهية :ص/۱۷۰ ، شرح القواعد : ص/۲۰۵ ، القواعد الكلية والضوابط الفقهية :ص/۱۸۲)

ما في " رعاية اللاجئين وحقوقهم في الإسلام " : كل ذلك مستحب في الإسلام ما لم يتعارض مع مواثيق وعهود أبرمها المسلمون مع أمر من الأمم أو يتعارض مع نصوص أو قواعد شرعية أخرى ، كما أن ذلك يدخل أيضًا في العدل والإحسان الذي أمر اللّٰه به قائلا: ﴿إن اللّٰه يأمر بالعدل والإحسان وإيتآء ذي القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغي﴾ . [سورة النحل :۹۵]

(اون اسلام نت/on islam.net)

ما في " رد المحتار " : لو غلب على ظن الإمام مصحلة في التغريب تعزيرًا فله أن يفعله وهو محمل الواقع للنبي ﷺ وأصحابه كما غرب عمر نصر بن الحجاج لافتتان النساء بجماله والجمال لا يوجب نفيا . اهـ . ... تنبيه : أشاره كلام الفتح إلى أن السياسة لا تختص بالزنا وهو ما عزاه الشارح إلى النهر . وفي القهستاني : السياسة لا تختص بالزنا بل تجوز في جناية والرأي فيها إلى الإمام على ما في الكافي كقتل مبتدع يتوهم منه انتشار بدعته ....

فإن مدار الشريعة بعد قواعد الإيمان على حسم مواد الفساد لبقاء العالم ، ولذا قال في البحر : =

....

=وظاهر كلامهم أن السياسة هي فعل شيء من الحاكم لمصلحة يراها ، وإن لم يره بذلك الفعل دليل جزئي . اهـ . (٦/٢٠ ، كتاب الحدود ، مطلب في الكلام على السياسة)

وفيه أيضًا : قوله : (ويكون بالنفي عن البلد) .... ونفى عمر رضي الله عنه نصر بن حجاج لافتتان النساء بجماله ، وفي النهر عن شرح البخاري للعيني – أن من آذى الناس ينفى عن البلد .

(٦/١١٠ ، كتاب الحدود ، باب التعزير ، مطلب يكون التعزير بالقتل ، ط : بيروت)

(اسلام کا نظام سیاست وحکومت:۱/۳۴۷)

(٦) ما في " المستصفى من علم الأصول للغزالي " : ومقصود الشرع من الخلق خمسة : وهو أن يحفظ عليهم دينهم ، ونفسهم ، وعقلهم ، ونسلهم ، ومالهم ، فكل ما يتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة ، وكل ما يفوّت هذه الأصول فهو مفسدة ودفعها مصلحة.

(١/٢٨٧ ، ط : دار الفكر بيروت)

ما في " الموافقات للشاطبي في أصول الشريعة " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين ، والنفس ، والنسل، والمال، والعقل ، وقد قالوا : إنها مراعاة في كل ملةٍ . (٢/٣٢٦)

(٧) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولقد كرمنا بنيٓ ادم وحملنٰهم في البرّ والبحر ورزقنٰهم من الطيبٰت وفضلنٰهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا﴾ . (سورة الإسراء : ٧٠)

ما في " رد المحتار " : والآدمي مكرم شرعًا وإن كان كافرًا ، فإيراد العفو عليه وابتذاله به وإلحاقه بالجمادات إذلال له .... إلا أن يجاب بأن المراد تكريم صورته وخلقته ، ولذا لم يجز كسر عظام ميت كافر . (٧/٢٤٥ ، كتاب البيوع ، مطلب الآدمي مكرم شرعًا ولو كافرًا ، الفتاوى الهندية: ٥/٣٥٤ ، كتاب الكراهية ، الباب الثامن عشر في التداوي)

(٨) ما في " صحيح البخاري " : عن ابن عمر قال : قال النبي ﷺ بمنى ...... " فإن الله حرم عليكم دماء كم وأموالكم وأعراضكم كحرمة يومكم هذا ، في شهركم هذا ، في بلدكم هذا " .

(٢/٨٦ ، رقم :٢٠٤٣ ، صحيح مسلم :٥/١٠٠ ، ط ؛ احياء التراث العربي، جامع الترمذي : ٢/٣٩ ، أبواب الفتن ، باب ما جاء في تحريم الدماء والأموال)

ما في " جامع الترمذي " : عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : "المسلم أخو المسلم ، لا يخونه ، ولا يكذبه ، ولا يخذله ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ عرضه وماله ودمه ، التقوى ههنا ، بحسب امرئ من الشرّ أن يحتقر أخاه المسلم " . هذا حديث حسن غريب .

(٢/١٤ ، أبواب البر والصلة ، باب ماجاء في شفقة المسلم على المسلم ، رقم : ١٩٢٧ ، =

....

=مشکوة المصابیح:ص/۴۲۲ ، باب الشفقة والرحمة على الخلق، كتاب الآداب ، رقم :۴۹۶۲ ، صحيح مسلم: ۲/۳۱۷ ، كتاب البر والصلة والأدب ، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره . إلخ)

(۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إن الأرض لله يورثها من يشآء من عباده والعاقبة للمتقين﴾ .

(سورة الأعراف :۱۲۸)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها﴾ . (سورة النساء :۹۷)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿ومن يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مراغمًا كثيرًا وسعة﴾ .

(سورة النساء :۱۰۰)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿يٰعبادي الذين اٰمنوآ إن أرضي واسعة فإياي فاعبدون﴾ .

(سورة العنكبوت :۵۲)

(۱۰) ما في " البحر الرائق " : والوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرىٰ اتخذها دارًا وتوطن بها مع أهله وولده و ليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها .

(۲/۲۳۹ ، بدائع الصنائع : ۱/۲۸۰)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : (الوطن الأصلي) هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه . (در المختار) . وفي الشامية : قوله : (أو توطنه) أي عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وإن لم يتأهل .

(۲/۶۱۴)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : والحاصل أن شروط الاتمام ستة : النية ، والمدة ، واستقلال الرأي ، وترک السير ، واتحاد الموضع وصلاحيته . قهستاني . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (ستة) زاد في الحلية شرطا آخر ؛ وهو أن لا تكون حالته منافية لعزيمته . قال : كما صرحوا به في مسائل : أي كمسئلة من دخل بلدةً لحاجة ومسئلة العسكر . فافهم . (۲/۶۰۹)

(۱۱) ما في " اسلام کا نظام سیاست وحکومت " : المساوات بين الرجل والمرأة في أداء الواجبات الشرعية والإثابة عليها .... المساوات بين الأجناس والأعراق في التمتع بالحقوق المشروعة لكل منهم . ... المساوات بين الخصوم في مجالس القضاء وفهم سماع الحجة منهم والقصاص من المعتدي أيا كانت منزلته .... المساوات في حق الكرامة الإنسانية فلا يؤذى أحد بسبب لونه أو جنسه أو مذهبه أو عقيدته .... المساوات في حق إبداء الرأي من المسلم وغير المسلم . قال الله تعالى : ﴿قل يآ أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سوآء بيننا وبينكم﴾ .

[آل عمران :۶۴] .... المساوات في حرمة الدماء والأموال والأعراض .... =

....

=المساوات بين المسلمين في الحضور لأماكن العبادة كالمسجد الحرام وغيره . [نضرة النعيم]. (۱/۸۷ ۸۸ ، ط : القاسم اکیڈمی خالق آباد نوشهره سرحد)

(۱۲) ما في " صحيح البخاري " : عن ابن عمر قال : قال النبي ﷺ بمنى ...... " فإن الله حرم عليكم دماء كم وأموالكم وأعراضكم كحرمة يومكم هذا ، في شهركم هذا ، في بلدكم هذا " .

(۸٦/۲ ، رقم :۲۰۴۳ ، صحيح مسلم :۱۰۰/۵ ، ط ؛ احياء التراث)

ما في " جامع الترمذي " : عن سليمان بن عمرو بن الأحوص ، عن أبيه قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول في حجة الوداع للناس: أي يوم هذا ؟ قالوا : يوم الحج الأكبر ، قال : " فإن دمائكم وأموالكم وأعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا ، في بلدكم هذا " .

(۳۹/۲ ، أبواب الفتن ، باب ما جاء في تحريم الدماء والأموال)

ما في " جامع الترمذي " : عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : "المسلم أخو المسلم ، لا يخونه ، ولا يكذبه ، ولا يخذله ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ عرضه وماله ودمه ، التقوى ههنا ، بحسب امرئ من الشرّ أن يحتقر أخاه المسلم " . هذا حديث حسن غريب .

(۱۴/۲ ، أبواب البر والصلة ، باب ماجاء في شفقة المسلم على المسلم ، رقم : ۱۹۲۷ ، مشكوة المصابيح :ص/۴۲۲ ، باب الشفقة والرحمة على الخلق، كتاب الآداب ، رقم :۲۵٦۴ ، صحيح مسلم: ۳۱۷/۲ ، كتاب البر والصلة والأدب ، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره إلخ)

ما في " المستصفى من علم الأصول للغزالي " : ومقصود الشرع من الخلق خمسة : وهو أن يحفظ عليهم دينهم ، ونفسهم ، وعقلهم ، ونسلهم ، ومالهم ، فكل ما يتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة ، وكل ما يفوّت هذه الأصول فهو مفسدة ودفعها مصلحة .

(۲۸۷/۱ ، ط ؛ دار الفكر بيروت)

ما في " الموافقات في أصول الشريعة للشاطبي " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين ، والنفس ، والنسل، والمال، والعقل ، وقد قالوا : إنها مراعاة في كل ملةٍ . (۳۲٦/۲)

(۱۳) ما في " صحيح البخاري " : عن أنس قال : قدم النبي ﷺ المدينةَ ، فنزل أعلى المدينة في حيّ يقال لهم : بنو عمرو بن عوف ، فأقام النبي ﷺ فيهم أربع عشرة ليلةً ، ثم أرسل إلى بني النّجّار ، فجاؤا متقلّدي السيوفِ ، كأني أنظر إلى النبي ﷺ على راحلته ، وأبو بكر رِدفه ، وملأُ بني النجار حوله ، حتى ألقى بفناء أبي أيوب ، وكان يحبّ أن يصلي حيث أدركته الصلاة ، ويصلي في مرابض الغنم ، وأنه أمر ببناء المسجد ، فأرسل إلى ملأ من بني النجار ، فقال : " يا بني النجار ! ثامنوني =

....

=بحائطكم هذا " . قالوا : لا والله ، لا نطلب ثمنَه إلا إلى الله ، فقال أنس : فكان فيه ما أقول لكم ، قبور المشركين ، وفيه خَرِبٌ ، وفيه نخلٌ ، فأمر النبي ﷺ بقبور المشركين فنُبشت ، ثم بالخرب فسُوّيت ، وبالنخل فقُطع ، فصفُّوا النّخل قبلة المسجد ، وجعلوا عضادتيه الحجارة ، وجعلوا ينلقون الصخر وهم يرتجزون ، والنبي ﷺ معهم ، وهو يقول : " اللهم لا خير إلا خيرُ الآخرة – فاغفر للأنصار والمهاجرة " . (ص/۹۹، كتاب الصلاة ، باب هل تنبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد ؟ رقم :۴۲۸ ، ط ؛ احياء التراث العربي بيروت ، صحيح مسلم : ۱/۳۷۳ ، باب ابتناء مسجد النبي ﷺ ، ط : احياء التراث ، سنن النسائي [المجتبى من السنن]: ۲/۳۹ ، نبش القبور واتخاذ أرضها مسجدا ، رقم : ۷۰۲، ط : مكتب المطبوعات الإسلامية – حلب ، سنن أبي داود : ۱/۱۷۲ ، باب في بناء المسجد ، رقم :۴۵۳ ، إكمال المعلم شرح صحيح مسلم : ۲/۴۴۶ ، علامه قاضي أبو الفضل عياض اليحصبي ، شرح أبي داود للعيني: ۲/۳۵۳ ، شرح كتاب العلم من صحيح البخاري : ۱/۴۴ ، أبو إسحاق الحويني الأثري حجازي محمد شريف ، من مكتبة الشاملة ، اللؤلؤ والمرجان فيما اتفق عليه الشيخان : ۱/۱۰۴ ، ابتناء مسجد النبي ﷺ ، رقم : ۳۰۱ ، محمد فؤاد بن عبد الباقي بن صالح بن محمد ، دار احياء الكتب العربية ، الإصابة في تمييز الصحابة لإبن حجر العسقلاني :۳/۲۰۳ ، ط : دار الجيل بيروت ، عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير: ۱/۲۵۸ ، محمد بن عبد الله بن يحى ابن سيد الناس ، مسند أبي عوانة : ۱/۳۳۱ ، بيان صفة موضع مسجد النبي ﷺ ، إمام أبو عوانه يعقوب بن إسحاق الاسفرائني ، ط : دار المعرفة بيروت)

ما في " عمدة القاري " : قوله : (ثامنوني) بالثاء المثلثة ، وقال الكرماني : أي بيعونيه بالثمن . ... قوله : (بحائطكم) الحائط ههنا البستان يدل عليه قوله : (وفيه نخل) .... وفي لفظ : كان مربدًا ، وهو الموضع الذي يجعل فيه التمر لينشف . (۴/۲۶۱ ، ط؛ مكتبه رشيديه كوئٹه)

(۱۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿لا يحب الله الجهر بالسوٓء من القول إلا من ظلم﴾ .

(سورة النساء :۱۴۸)

ما في " التفسير المنير " : ثم استثنى الله تعالى حالة يجوز فيها إعلان السوء من القول ، وهي حالة الشكوى من ظلم الظالم لحاكم أو قاض أو غيره ممن يرجى منه رفع ظلامته وإغاثته ومساعدة في إزالة الظلم ، والشكوى على الظالم أمر مطلوب شرعًا ، إذ لا يحب الله لعباده أن يسكتوا على الظلم، أو أن يخضعوا للضيم أو أن يقبلوا المهانة ويسكتوا على الذل روى الإمام أحمد " إن لصاحب الحق مقالا " . يباح للمظلوم اللجوء إلى القضاء والشكوى لرفع الظلم ووصف فعل الظالم ، كما أنه=

....

= يـجـوز الـدعـاء عـلـى الظالم ودعوة المظلوم مستجابة، قال عليه الصلوة والسلام : " اتق دعوة الـمـظـلـوم فـإنهـا لـيـس بينها وبين الله حجاب " . يقول الله : " وعزتي وجلالي لأنصرنک ولو بعد حين" . (۳/۳۵۲، ۳۵۳)

مـا في " الفقه الإسلامي وأدلته " : (أ) مسؤولية الإنسان عن أفعاله في أساسها شخصية ، ولا جريمة ولا عـقـوبة إلا بـنص . (ب) لا يجوز بغير موجب شرعي القبض على إنسان أو تقييد حريته أو نفيه أو تعريضه للتعذيب البدني أو النفسي ، أو لأي معاملة منافية للكرامة الإنسانية، وكل تدبير أو نص يجيز ذلک يُعـد هـدرًا لـلـحـق الإنساني ومنافيًا للشرع الإلهي . [المادة العشرون] . وفيه أيضًا: (أ) لكل إنسـان الـحـق في الاعتراف له بشخصيته الشرعية من حيث أهليته للإلزام والتزام . (ب) لكل إنسان حـقه في الاستقلال بحياته الخاصة وأسرته وماله واتصالاته الاجتماعية ، ولا يجوز التجسس عليه أو الإسـاءة إلـى سـمـعتـه ، ويـجـب عـلـى الـدولة حـمـايتـه مـن كل تدخل تعسفي . [المادة الحادية والعشرون]. (۸/۶۴۵۳، ۶۴۵۴)

(۱۵) مـا فـي " الـقرآن الكريم " : ﴿ومنهم من يلمزک في الصدقٰت فإن اعطوا منها رضُوا وإن لم يعطوا منها إذا هم يسخطون﴾ . (سورة التوبة :۵۸)

مـا فـي " تـفسيـر الـكشاف " : كان رسول الله ﷺ يقسم غنائم حنين فقال : اعدل يا رسول الله ! فـقـال صـلـوات الـلّٰـه عـليه وسلامه : "ويلک إن أعدل فمن يعدل؟ " . (۲/۲۸۱ ، ط : دار الكتاب الـعربی بيروت ، علامه جار الله أبو القاسم محمود بن عمر الزمخشري ، مسند أبي يعلى :۲/۲۹۸ ، رقم :۱۰۲۲ ، ط : دار المأمون للتراث دمشق ، أحمد بن علي بن المثنى أبو يعلى الموصلي التميمي، الـملل والنحل : ۱/۲۰، المقدمة الرابعة في بيان أول شبهة وقعت ، ط : دار المعرفة بيروت ، محمد بن عبد الكريم بن أبي بكر أحمد الشهرستاني)

مـا في " موسوعة الرد على المذاهب الفكرية المعاصرة [جمع وإعداد : علي بن نايف الشحود] " : قال حذيفة بن اليمان : دخلت على عمر بن الخطاب يومًا فرأيته مهمومًا حزينًا فقلت له : ما يهمک يـا أميـر الـمـؤمنين ؟ قال : إني أخاف أن أقع في منكر فلا ينهاني أحد منكم تعظيمًا ، فقلت : والله ! لو رأيناک خرجت عن الحق لنهيناک ! ففرح عمر وقال : " الحمد لله الذي جعل لي أصحابًا يقوّمونني إذا اعـوجـجـت . ويومًا صعد على المنبر وقال : يا معشر المسلمين ! ماذا تقولون لو ملْتُ برأسي إلى الـدنيا كذا ؟ فقام إليه رجل فقال : أجل ... كنا نقول بالسيف كذا (وأشار بالقطع) ، فقال عمر : إياي تعني بقولک ؟ أجاب الرجل : نعم إياک أعني بقولي ، فقال عمر : " رحمک الله ! الحمد لله=

....

= الذي جعل في رعيّتي من إذا تعوّجت قوّمني " .

(۱۲/۲۵ ، حول قداسة الحكام في تاريخنا [عماد الدين خليل])

ما في " خلفاء راشدين " : ''ایک روز کا واقعہ ہے کہ مالِ غنیمت میں چادریں آئیں اور سب کو ایک ایک آپ نے تقسیم کردی، اس کے بعد جمعہ کے دن خطبہ پڑھنے کے لیے جو تشریف لے گئے تو انہی چادروں میں سے ایک اوڑھے ہوئے اور ایک کی ازار باندھے ہوئے تھے، (لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ آپ نکتہ چینی کرنے سے خوش ہوتے ہیں)، لہٰذا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے، اور کہنے لگے کہ ہم آپ کا خطبہ نہیں سنیں گے، آپ نے ہم سب کو تو ایک ایک چادر دی، اور خود دو لیں، حضرت فاروق رضی اللہ عنہ یہ سن کر مسکرائے، اور فرمایا کہ میں نے اپنی پرانی ازار دھو کر خشک ہونے ڈال دی ہے، اور ایک چادر میں نے عبد اللہ بن عمر سے مانگ لی ہے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بولے: ہاں! اب ہم آپ کا خطبہ سنیں گے۔'' (ص/۴۳،۴۷، حضرت فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، عام اخلاق وحالات، مؤلفہ: حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی رحمہ اللہ، ط: ادارہ اصلاح وتبلیغ دیوبند)

ما في " خلفاء راشدين " : ''ایک مرتبہ مسجد سے نکلے، جارود بھی آپ کے ساتھ تھے، کہ ایک عورت ملی، آپ نے اس کو سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا اور کہا کہ اے عمر! مجھے تمہارا وہ وقت یاد ہے، جب بازارِ عکاظ میں لوگ تم کو عمیر کہتے تھے، پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد لوگ تم کو عمر کہنے لگے اور اب تو تم امیر المؤمنین ہو، خدا سے ڈر کے کام کرنا، جارود کہتے ہیں: میں نے اس عورت سے کہا کہ تو نے امیر المؤمنین سے بہت گستاخی کی باتیں کیں، تو آپ نے مجھے منع فرمایا کہ تم ان کو نہیں پہچانتے، یہ خولہ بنت حکیم ہیں جن کی بات خدا نے سات آسمانوں کے اوپر سے سنی ہے، لہٰذا عمر تو زیادہ مستحق اس بات کا ہے کہ ان کی بات سنے۔'' (ص/۹۱،۹۲، حضرت فاروق اعظم، گشت کے چند واقعات)

ما في " السياسة والإدارة الشرعية في ضوء إرشادات خير البرية [اسلام كا نظام سياست وحكومت اردو ترجمه] " : حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجلس میں انصار ومہاجرین کے ساتھ شریک تھے، آپ نے فرمایا: " أرأيتم لو ترخصت في بعض الأمور ما كنتم فاعلين ؟ فسكتوا : فقال : ذلک مرتين أو ثلاثا ، فقال بشر بن سعد : لو فعلت ذلک قومناک تقويم القدح ، فقال عمر : أنتم إذًا أنتم إذًا . [كنز العمال] . (۲۵۶/۲)

(۱۶) ما في " الإمامة والسياسة " : فقال سعد : .... فكنتم أشد الناس على من تخلف عنه منكم وأثقله على عدوكم من غيركم حتى استقاموا لأمر الله تعالى طوعًا وكرها وأعطي البعيد المقادة صاغرا داخرا حتى أثخن الله تعالى لنبيه بكم الأرض ودانت بأسيافكم له العرب وتوفاه الله تعالى وهو راض عنكم قرير العين ، فشدوا أيديكم بهذا الأمر فإنكم أحق وأولاهم به ، فأجابوه جميعًا أن قد وقفت في الرأي وأصبت في القول ولن نعدو ما رأيت توليتک هذا الأمر فأنت مقنع =

....

=ولصالح المؤمنين رضا . اهـ . (١/٩، ذكر السقيفة وما جرى فيها من القول ، أبو محمد عبد الله بن مسلم ابن قتيبة الدينوري ، ط : بيروت)

وفيه أيضًا : فلما رأت الأوس ما صنع قيس بن سعد وهو من سادات الخزرج وما دعوا إليه المهاجرين من قريش وما تطلب الخزرج من تأمير سعد بن عبادة قال بعضهم لبعض ، وفيهم أسيد بن حضير رضي الله عنه ؛ لئن وليتموها سعدا عليكم مرة واحدة لا زالت لهم بذلك عليكم الفضيلة ولا جعلوا لكم نصيبا فيها أبدا فقوموا فبايعوا أبا بكر رضي الله عنه ، فقاموا إليه فبايعوه فقام الحباب بن المنذر إلى سيفه فأخذه فبادروا إليه فأخذوا سيفه منه فجعل يضرب بثوبه وجوههم حتى فرغوا من البيعة فقال : فعلتموها يا معشر الأنصار ، أما والله لكأني بأبنائكم على أبواب أبنائهم قد وقفوا يسألونهم بأكفهم ولا يسقمون الماء ، قال أبو بكر أمنا تخاف يا حباب ؟ قال : ليس منك أخاف ولكن ممن يجيء بعدك ، قال أبو بكر : فإذا كان كذلك فالأمر إليك وإلى أصحابك ، ليس لنا عليكم طاعة ، قال الحباب : هيهات يا أبا بكر إذا ذهبت أنا وأنت جاء نا بعدك من يسومنا الضيم .

(١/١٣، بيعة أبي بكر الصديق رضي الله عنه)

(٧١) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إن الله يأمر بالعدل والإحسان وإيتآء ذي القربى وينهى عن الفحشآء والمنكر والبغي يعظكم لعلكم تذكرون﴾ . (سورة النحل :٩٠)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : فإنه قد انتظم سائر القبائح والأفعال والأقوال والضمائر المنهي عنها ، والفحشاء قد تكون بما يفعله الإنسان في نفسه مما لا يظهر أمره ، وهو مما يعظم قبحه ، وقد تكون مما يظهر من الفواحش ، وقد تكون لسوء العقيدة والبخل ، لأن العرب تسمى البخيل فاحشًا ، والمنكر ما يظهر للناس مما يجب إنكاره . (٣/٢٤٧)

ما في " التفسير المنير " : (بالعدل) فعل كل مفروض من عقائد وشرائع وسير مع الناس في أداء الأمانات وترك الظلم والإنصاف وإعطاء الحق . (والمنكر) ما أنكره الشرع واستقبحه العقل السليم كالكفر والمعاصي من الضرب الشديد والقتل وغمط حقوق الناس ونحو ذلك .

(٧/٥٣١ – البحر المحيط :٥/٦٧٣)

ما في " القرآن الكريم " : قال تعالى: ﴿إعدلوا هو أقرب للتقوى﴾ . (سورة المائدة:٨)

ما في " صحيح البخاري " : عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما ، عن النبي ﷺ قال : "الظلم ظلمات يوم القيامة " . (ص/٣٣٠ ، رقم :٢٤٤٧،كتاب المظالم ، جامع الترمذي :٢/٢٣)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين ﴾ .(سورة البقرة :١٩٠)=

....

=مـا فـي " التفسير المنير " : أي المتجاوزين ما حد لهم من الشرائع والأحكام ومحبة الله لعباده إرادة الخير والثواب لهم . (۱/۲/۵۴۲)

ما في " الفقه الإسلامي وأدلته " : المساواة أمام القانون : العدل بمعناه الشامل يشمل هذا المبدأ الشائع الآن ؛ لأن العدل كما تقدم يتطلب التسوية في المعاملة وفي القضاء وفي الحقوق وملكيات الأموال ، عبر أبو بكر رضي الله عنه عن ذلک بقوله : " الضعيف فيكم قوي عندي حتى آخذ الحق له ، والقوي فيكم ضعيف عندي حتى آخذ الحق منه إن شاء الله" . وفي رسالة عمر المشهورة لأبي موسى الأشعري : " آسِ بين الناس في وجهک وعدلک ومجلسک ، حتى لا يطمع شريف في حيفک ، ولا ييأس ضعيف من عدلک " . ولقد حمل الرسول ﷺ على محاولات التمييز بين الناس أمام القضاء والشريعة ، فقال فيما يرويه البخاري ومسلم عن عائشة رضي الله عنها : " إنما أهلک من كان قبلكم أنهم كانوا إذا سرق فيهم الشريف تركوه ، وإذا سرق فيهم الضعيف أقاموا عليه الحدّ ، والذي نفسي محمد بيده ، لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها " .

(۲۲۰۸/۸ ، ط : مكتبه رشيديه كوئٹه ، أبو بكر الصديق رضي الله عنه شخصيته وعصره [عصر الخلفاء الراشدين] :۱۴۴/۳ ، الدكتور علي محمد الصلابي ، السيرة لإبن حبان : ۴۱۹/۱ ، أخبار الخلفاء ، استخلاف أبي بكر ، سلسلة مصابيح الهدى :۹/۶ ، خطبة أبي بكر بعد تولية الخلافة ، محمد بن إبراهيم بن حسان ، من موقع الشبكة الإسلامية ، مجلة البيان :۱۷۶/۴ ، وداعًا أيتها العدالة ! ، تصدر عن المنتدى الإسلامي – محملة من شبكة الإنترنت ، الإسلام وأحداث الحادي عشر من أيلول ۲۰۰۱ :۱۸۶/۱ ، زبير سلطان قدوري ، حياة محمد ﷺ:۱۸۰/۲ ، محمد حسنين هيكل)

ما في " إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء " : وقال أبو يوسف : حدثني من سمع طلحة بن معدان اليعمري قال : خطبنا عمر بن الخطاب رضي الله عنه ، فحمد الله وأثنى عليه ، ثم صلى على النبي ﷺ ، وذكر أبا بكر الصديق فاستغفر له ثم قال : " أيها الناس ! انه لم يبلغ ذو حق في حقه أن يطاع في معصية الله وإني لم أجد في هذا المال مصلحة إلا خلالا ثلاثًا ، أن يوخذ بالحق ويعطى بالحق يمنع من الباطل ، وإنما أنا ومالكم كوالي اليتيم إن استغنيت عن استعففت ، وإن افتقرت أكلت بالمعروف ، ولست أدعَ أحدا يظلم أحدًا ولا يعتدي عليه حتى أضع خدّه على الأرض وأضع قدمي على الخد الآخر حتى يذعن بالحق .. الخ " . (۱۹۴/۱ ، محدث هند شاه ولي الله دهلوي رحمه الله، الرياض النضرة في مناقب العشرة : ۱۵۰/۱ ، محب الدين أحمد بن عبد الله أبو جعفر الطبري ، دروس للشيخ سعود الشريم :۱۲/۳۵ ، رقم الدرس :۵۷ ، سعود بن إبراهيم بن محمد=

....

= آل شريم ، موقع الشبكة الإسلامية) (اسلامی ریاست:ص/۳۰۰-۳۱۲،الطاف احمد اعظمی،ط:مکتبہ الحسنات دہلی)

(۱۸) ما في " الموسوعة الفقهية " : وفي الإصطلاح : المستأمن : من يدخل إقليم غيره بأمان مسلما كان أم حربيا . (۳۷/۱۶۸ ، مستأمن)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : باب المستأمن – أي طالب للأمان (هو من يدخل دار غيره بأمان مسلما كان أو حربيا (دخل مسلم دار الحرب بأمان حرم تعرّضه لشيء) من دم ومال وفرْج (منهم) إذ المسلمون عند شروطهم . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (حرم تعرضه لشيء الخ) شمل الشيء .... قوله : (إذ المسلمون عند شروطهم) لأنه ضمن بالاستئمان أن لا يتعرض لهم ، والغدر حرام إلا إذا غدر به ملكهم فأخذ ماله أو حبسه أو فعل غيره بعلمه ولم يمنعه لأنهم الذين نقضوا العهد . بحر . (۳/۲۴۷ ، باب المستأمن ، ط : احياء التراث)

(۱۹) ما في " الموافقات في أصول الشريعة للشاطبي " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين ، والنفس ، والنسل ، والمال، والعقل ، وقد قالوا : إنها مراعاة في كل ملةٍ . (۲/۳۲۶)

(۲۰) ما في " التنوير وشرحه مع الشامية " : (هي) لغة خبر قاطع – وشرعًا : (إخبار صدق لإثبات حق) . فتح . (تنوير مع الدر) . وفي الشامية : قال في البحر : هي اخبار عن مشاهدة وعيان لا عن تخمين وحسبان . (۱۱/۷۷ ، كتاب الشهادات ، ط : بيروت)

ما في " درر الحكام شرح مجلة الأحكام " : الشهادة : هي الإخبار صدقا عن يقين وعيان بلفظ من الشهادة . (۴/۳۴۶ ، تعريف الشهادة ونصابها ، تحت مادة : ۱۶۸۴)

ما في " العناية شرح الهداية " : وهي في اللغة : عبارة عن الإخبار بصحة الشيء عن مشاهدة وعيان ...... وفي اصطلاح أهل الفقه : عبارة عن إخبار صادق في مجلس الحكم بلفظ الشهادة . الخ .
(۴/۲۳۱ ، كتاب الشهادات ، ط : بيروت)

(۲۱) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : الإسلام يعلو ولا يعلى . (ص/۱۱۵ ، قاعدة :۲۶ ، شرح السير الكبير : ۱/۹۳ ، باب دواء الجراحة ، قواعد الفقه:ص/۵۸ ، قاعدة :۲۷)

ما في " صحيح مسلم " : عن عائشة – رضي الله تعالى عنها – قالت : " أمرنا رسول الله ﷺ أن ننزل الناس منازلهم " . (۱/۲ ، المقدمة ، ط : دار الجيل بيروت ، سنن أبي داود : ۴/۴۱۱ ، رقم : ۴۸۴۴ ، باب في تنزيل الناس منازلهم ، ط : دار الكتاب العربي)

(۲۲) ما في " أحكام القرآن لإبن العربي " : الهجرة تنقسم إلى ستة أقسام : الرابع الفرار من الأذاية في البدن ، وذلک فضل من الله عز وجل أرخص فيه ، فإذا خشي المرء على نفسه في=

....

= موضع فقد أذن اللّٰہ سبحانه له في الخروج عنه والفرار بنفسه ، ليخلها من ذلک المحذور .
(۲۸۵/۱)

ما في " الهجرة إلى بلاد غير المسلمين " : تجوز الهجرة من بلاد الإسلام إلى غيرها من بلاد الإسلام أو بلاد الكفر عند ما تضيق على المسلم الأرض بما رحبت ، بسبب بلاء نزل به، أو ضيق في كسبه أو معاشه أو بظلم ، ولم يبلغ كل ذلک حدًا لا ينفع معه الصبر والاحتمال ، كأن يؤذي إلى إزهاق الروح ، أو إتلاف الأعضاء ، أو الفقر المدقع الذي يوصل الإنسان إلى درجة الكفر ، وهو يختلف بحسب الأشخاص . (ص/۲۱۴)

ما في " المحلى لإبن حزم " : وأما من فرّ إلى أرض الحرب لظلم خافه ، ولم يحارب المسلمين ، ولا أعانهم عليهم ، ولم يجد في المسلمين من يجيره ، فهذا لا شيء عليه ، لأنه مضطر مكره .
(۱۳/۶۷، مسألة : ۲۲۰۲)

(۲۳) ما في " القرآن الكريم " : ﴿هو الذي جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور﴾ . (سورة الملک :۱۵)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿فإذا قضيت الصلوة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل اللّٰه﴾ .
(سورة الجمعة :۱۰)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم﴾ . (سورة البقرة :۱۹۸)

ما في " مجمع الزوائد " : عن عائشة قالت : قال رسول اللّٰه ﷺ : " اطلبوا الرزق في خبايا الأرض " . (۴/۲۷ ، كتاب البيوع ، باب الكسب والتجارة ومحبتها والحث على طلب الرزق ، رقم : ۶۲۳۷)

(۲۴) ما في " الفتاوى البزازية على هامش الهندية " : تعليم صفة الخالق مولانا جل جلاله للناس وبيان خصائص مذهب أهل السنة والجماعة من أهم الأمور وعلى الذين تصدوا للوعظ أن يلقنوا الناس في مجالسهم على منابرهم ذلک قال اللّٰه تعالى : ﴿وذكر فإن الذكرىٰ تنفع المؤمنين﴾ وعلى الذين يؤمّون في المساجد أن يعلموا جماعتهم شرائط الصلاة وشرائع الإسلام وخصائص مذهب الحق وإذا علموا في جماعتهم مبتدعًا أرشدوه . (۶/۳۲۰ ، كتاب ألفاظ تكون إسلامًا أو كفرًا أو خطأً ، الباب الثاني فيما يكون كفرًا من المسلم وما لا يكون)

(۲۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا ادخلوا في السلم كآفّة ولا تتبعوا خطوات الشيطٰن﴾ . (سورة البقرة :۲۰۸)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿ومآ اٰتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا﴾ . (سورة الحشر: ۷)=

....

=(۲۶) مـا فـي " الـقرآن الكريم " : ﴿إن الله يأمر بالعدل والإحسان وإيتآء ذي القربى وينهى عن الفحشآء والمنكر والبغي﴾ . (سورة النحل : ۹۰)

(۲۷) مـا فـي " مـجموع الثمين للعثيمين " : شرط على المسافر إلى تلك البلاد : أن يكون عنده علم يدفع به الشبهات ، ودين يمنعه الشهوات ، وأن يكون محتاجًا إلى ذلك السفر .

(ص/۵۰ ، بحواله : الهجرة إلى بلاد غير المسلمين : ص/۱۷۹)

(فقہی مقالات:۱/۲۴۳،المسائل المہمۃ:۳/۳۰۲،۳۰۳)

(۲۸) ما في " اختلاف الدين وآثاره في أحكام الشريعة الإسلامية " : أما السفر من دار الإسلام إلى دار الكفر لقصد التجارة أو طلب العلم أو غير ذلك من الأغراض الأخرى ، ففيه تفصيل : فإن كان المسلم المسافر إلى بلاد الكفار يقدر على إظهار دينه ولا يخاف من الفتنة فيه ، ولا يوالي المشركين ، فهـذا يـجوز له السفر ، كما فعل بعض الصحابة رضي الله عنه كأبي بكر الصديق رضي الله عنه فقد سـافـر إلـى بـلـدان الـمشـركين للتجارة ، ولم ينكر عليه النبي ﷺ . وكما صرح بذلك العلماء أن الـقـادر عـلى إظهار دينه في ديار الكفار فلا بأس بإقامته فيها ، وهذا يدل على أن من سافر إليها لغرض وقدر على إظهار دينه جاز له ذلك . (ص/۱۷۰، ۱۷۱)

(۲۹) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إن أكرمكم عند الله أتقكم﴾ . (سورة الحجرات : ۱۳)

(۳۰) ما في " رياض الصالحين " : عن أبي هريرة رضي الله عنه : أن رسول الله ﷺ قال: " إياكم والـظـنّ فـإن الـظـن أكـذب الحديث ، ولا تحسّسوا ، ولا تجسّسوا ولا تنافسوا ، ولا تحاسدوا ، ولا تبـاغـضـوا ، ولا تـدابـروا ، وكـونـوا عباد الله إخوانا . المسلم أخو المسلم ، لا يظلمه ولا يخذله ولا يـحـقـره ، التقوى ههنا . ويشيـر إلـى صـدره ثـلاث مـرات : بحسب امرئ من الشر أن يـحـقـر أخاه الـمسـلـم ، كل المسلم على المسلم حرام : دمه ، وماله وعرضه . إن الله لا ينظر إلى أجسادكم ولا إلى صوركم ، ولكن ينظر إلى قلوبكم وأعمالكم . وأشار بأصابعه إلى صدره .

(ص/۵۹۲ ، رقـم : ۱۵۷۰ ، كتـاب الأمور المنهي عنها ، باب النهي عن التجسّس والتسمّع لكلام من يكره استماعه ، ط : دار المؤيد جدّة)

مـا فـي " الـمـوسـوعة الـفقهية " : قال ابن حجر : الكبر الحالة التي يختص بها الإنسان من إعجابه بنفسه وذلك أن يرى نفسه أكبر من غيره . (۵۸/۳۲)

وفيـه أيـضًـا : الـفـخـر من الأمور المنهي عنها شرعا في الجملة .... وقيل : المفتخر إما مـؤمـن تـقـي فإذن لا ينبغي له أن يتكبر على أحد ، أو فاجر شقي فهو ذليل عند الله والذليل لا يستحق

التکبر ، فالتکبر منفي بکل حال . (۵۸/۳۲ ، تحفة الأحوذي : ۳۱۶/۱۰ ، دار الکتب العلمیة بیروت)

(۳۱) ما في " سنن أبي داود " : عن ابن عمر قال : قال رسول اللّٰه ﷺ : " من تشبه بقوم فهو منهم" . (ص/۵۵۹)

ما في " مرقاة المفاتیح " : قوله : (من تشبه بقوم) أي من شبه نفسه بالکفار مثلاً في اللباس وغیره ، أو بالفساق ، أو الفجار ، أو بأهل التصوف والصلحاء الأبرار .

(۲۲۲/۸ ، کتاب اللباس ، رقم :۴۳۴۷)

ما في " سنن أبي داود " : عن سمرة بن جندب أما بعد : قال رسول اللّٰه ﷺ : " من جامع المشرک وسکن معه فإنه مثله " .

(۴۸/۳ ، باب في الإقامة بأرض الشرک ، ط : دار الکتاب العربي بیروت)

(۳۲) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : دفع المفاسد أولی من جلب المنافع .

(ص/۱۷۱ ، قاعدة :۱۴۴ ، الأشباه والنظائر لإبن نجیم :ص/۳۲۲ ، درر الحکام : ۴۱/۱، المادة: ۳۰ ، قواعد الفقه :ص/۸۱ ، قاعدة :۱۳۳ ، جمهرة القواعد الفقهیة : ۷۳۳/۲ ، قاعدة : ۸۹۱ ، ترتیب اللآلي في سلک الأمالي :ص/۱۹۱ ، القواعد الفقهیة :ص/۱۷۰ ، شرح القواعد : ص/۲۰۵ ، القواعد الکلیة والضوابط الفقهیة :ص/۱۸۲)

(۳۳) ما في " بدائع الصنائع " : لا بأس بحمل الثیاب والمتاع والطعام ونحو ذلک إلیهم لانعدام معنی الإمداد والإعانة ، وعلی ذلک جرت العادة من تجار الأنصار أنهم یدخلون دار الحرب للتجارة من غیر ظهور الرد والإنکار علیهم إلا أن الترک أفضل لأنهم یستخفون بالمسلمین ویدعونهم إلی ما هم علیه ، فکان الکف والإمساک عن الدخول من باب صیانة النفس عن الهوان والدین عن الزوال فکان أولی . (۴۰۲/۹ ، کتاب السیر ، فصل في بیان ما یکره حمله إلی دار الحرب) (فقہی مقالات:۲۳۳/۱-۲۳۷،میمن اسلامک پبلیشرز کراچی،محقق ومدلل جدید مسائل:۵۱۵/۱-۵۱۸، اہل کفر کے ساتھ تعلقات وفاداری یا بیزاری اور اسلامی تعلیمات:ص/۱۷۴)

(۳۴) ما في " القرآن الکریم " : ﴿وإن أحد من المشرکین استجارک فأجره حتی یسمع کلام اللّٰه ثم أبلغه مأمنه ذلک بأنهم قوم لا یعلمون﴾ . (سورة التوبة : ٦)

ما في " حقوق اللاجئین في الشریعة الإسلامیة والقانون الدولي " : وجه الدلالة : أن اللّٰه یخطب نبیه قائلا : یا محمد ! إن أحد من المشرکین استجارک ؛ فأجره ولا تقتله ، وأسمعه القرآن ؛ کي یفهم أحکامه وأوامره ونواهیه ، فإن أبی وامتنع عن أن یسلم ؛ فرده إلی مأمنه وأمنه في ذلک حتی یلحق بدار المشرکین . [قرطبي :۷٦/۸] . (ومثله في مجلة الجامعة الإسلامیة [سلسلة الدراسات الإسلامیة] ، المجلد السابع عشر ، العدد الأول :ص/۱٦۳ ، ۱٦۴ – کلیة الشریعة والقانون —=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

= الجامعة الإسلامية غزة – فلسطين ، اون اسلام نت/on islam.net)

(۳۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿والفتنة أشد من القتل﴾ . (سورة البقرة : ۱۹۱)

ما في " رعاية اللاجئين وحقوقهم في الإسلام " : إذا كانت الدولة إسلامية تحرص على تطبيق أحكام الشريعة فلا يجوز لها أن توافق على تسليم اللاجئين السياسين إلى بلادهم إذا كانوا سيتعرضون إلى ظلم أو إلى فتنة – اهـ . (اون اسلام نت/on islam.net)

(۳٦) ما في " الموسوعة الفقهية " : وقيد شمس الأئمة الحلواني جواز السكنى بقوله : هذا إذا قلوا وكانوا بحيث لا تتعطّل جماعات المسلمين ، ولا تتقلل الجماعة بسكناهم بهذه الصفة ، فأما إذا كثروا على وجه يؤدى إلى تعطيل بعض الجماعات أو تقليلها منعوا من السكنى وأمروا أن يسكنوا ناحية ليس فيها للمسلمين جماعة . قال : وهذا محفوظ عن أبي يوسف في الأمالي . قال ابن عابدين : قال الخير الرملي : إن الذي يجب أن يعول عليه التفصيل ، فلا نقول بالمنع مطلقا ولا بعدمه مطلقا ، بل يدور الحكم على القلة والكثرة ، والضرر والمنفعة ، وهذا هو الموافق للقواعد الفقهية .

(۱۲٦/۲۵ ، سكنى أهل الذمة مع المسلمين ، مذهب الحنفية)

کتابیات

کتب تفاسیر

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
۱	التفسیر المنیر	دکتور وہبہ زحیلی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۲	احکام القرآن	ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی	مکتبۃ الریاض الحدیثۃ
۳	احکام القرآن	امام ابوبکر بن علی رازی جصاص	مکتبہ شیخ الہند دیوبند
۴	البحر المحیط	امام ابوحیان غرناطی اندلسی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۵	تفسیر الکشاف	علامہ جاراللہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری	دار الکتاب العربی بیروت
۶	محاسن التأویل (تفسیر القاسمی)	محمد جمال الدین القاسمی	من المکتبۃ الشاملۃ

کتب احادیث وشروحات احادیث

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
۷	صحیح بخاری	امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری	مکتبہ بلال دیوبند/ احیاء التراث بیروت
۸	صحیح مسلم	امام ابوالحسن مسلم بن حجاج قشیری	بلال دیوبند/ احیاء التراث
۹	سنن نسائی (المجتبی من السنن)	امام ابوعبدالرحمٰن بن شعیب بن علی نسائی	مکتب المطبوعات الاسلامیۃ حلب
۱۰	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی	مکتبہ بلال دیوبند
۱۱	جامع ترمذی	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسی ترمذی	مکتبہ بلال/ بیروت
۱۲	مشکوۃ المصابیح	شیخ ولی الدین خطیب تبریزی بغدادی	یاسر ندیم اینڈ کمپنی
۱۳	عمدۃ القاری شرح البخاری	امام بدرالدین عینی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۱۴	اعلاء السنن	علامہ شیخ ظفر احمد عثمانی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۱۵	ریاض الصالحین	ابوزکریا محی الدین یحی بن شرف النووی	دار المؤید جدّہ
۱۶	مرقاۃ المفاتیح	علامہ شیخ ملاعلی قاری حنفی	مکتبہ اشرفیہ دیوبند
۱۷	اکمال المعلم شرح صحیح مسلم	علامہ قاضی ابوالفضل عیاض الیحصبی	من مکتبۃ الشاملۃ
۱۸	شرح کتاب العلم من صحیح البخاری	ابواسحاق الحوینی الاثری الحجازی محمد شریف	من مکتبۃ الشاملۃ
۱۹	شرح أبی داود للعینی	امام بدرالدین عینی	من مکتبۃ الشاملۃ
۲۰	اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان	محمد فؤاد بن عبدالباقی بن صالح بن محمد	دار احیاء الکتب العربیۃ

۲۱	مجمع الزوائد	علامہ شیخ نورالدین ھیثمی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۲۲	مسند أبی یعلی	احمد بن علی بن المثنی ابویعلی الموصلی التمیمی	من موقع الشاملۃ
۲۳	مسند أبی عوانہ	ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی	دارالمعرفۃ بیروت
۲۴	انعام الباری	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبۃ الحراء کراچی

کتب فقہ وفتاویٰ عربی

۲۵	تنویرالابصار مع الدر والرد	امام محمد بن عبداللہ تمرتاشی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۲۶	ردالمحتار (شامی)	علامہ محمد امین ابن عابدین شامی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۲۷	الدرالمختار	علامہ شیخ علاءالدین حصکفی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۲۸	البحرالرائق	علامہ زین الدین (ابن نجیم حنفی)	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۲۹	بدائع الصنائع	ملک العلماء شیخ علاءالدین کاسانی	دارالکتاب العربی بیروت
۳۰	الفتاوی الہندیۃ	شیخ نظام وجماعت علماء ہند	مکتبہ زکریا/ رشیدیہ/ دارالفکر
۳۱	الفتاوی البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ	امام حافظ الدین محمد بن محمد (ابن بزاز)	زکریا/ رشیدیہ/ دارالفکر
۳۲	الفقہ الاسلامی وأدلتہ	دکتور وہبہ زحیلی	دارالفکر سوریہ بدمشق
۳۳	الموسوعۃ الفقہیۃ	وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ	وزارۃ الاوقاف کویت
۳۴	بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد	محمد بن احمد القرطبی	المکتبۃ المدنیہ بدیوبند الہند
۳۵	العنایہ شرح الہدایہ	امام شیخ اکمل الدین بابرتی حنفی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۳۶	المختصرالقدوری	احمد بن محمد بن جعفر بغدادی القدوری	مکتبہ بلال بکڈپو دہلی
۳۷	الجوہرۃ النیرۃ	علامہ ابوبکر بن علی الحداد	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۳۸	الہدایۃ	امام برہان الدین مرغینانی	دارالارقم بیروت
۳۹	المبسوط	شیخ الاسلام ابوبکر محمد بن احمد سرخسی	دارالکتب العلمیۃ/ دارالمعرفۃ
۴۰	الکافی فی فقہ الحنفی	علامہ وہبی سلیمان غاوجی	مؤسسۃ الرسالۃ بیروت
۴۱	عقدالبیع	شیخ مصطفیٰ الزرقاء	دارالقلم دمشق
۴۲	أحادیث البیوع المنہی عنہا	شیخ خالد بن عبدالعزیز الباتلی	کنوز اشبیلیا بیروت
۴۳	الغرر وأثرہ فی العقود	بحوالہ مالی معاملات پرغرر کے اثرات	....
۴۴	مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی	....	....
۴۵	مجمع الانہر	عبدالرحمٰن بن محمد المدعو بشیخی زادہ	دارالکتب العلمیۃ بیروت

کتب فقہ وفتاویٰ وغیرہ اردو

۴۶	فقہی مقالات	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	زمزم بکڈپو دیوبند

۴۷	المسائل المہمہ	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا
۴۸	محقق ومدلل جدید مسائل	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا
۴۹	اسلام اور جدید معاشی مسائل	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ فیصل دیو بند دہلی
۵۰	مالی معاملات پر غرر کے اثرات	ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی	ادارۃ المعارف کراچی
۵۱	اہل کفر کے ساتھ تعلقات وفاداری یا بیزاری	مولانا مقصود الحسن فیضی	نور اسلام اکیڈمی لاہور پاکستان
۵۲	اسلامی ریاست	الطاف احمد اعظمی	مکتبہ الحسنات دہلی
۵۳	اسلام کا نظام سیاست وحکومت	مولانا عبد الباقی حقانی/سید الامین انور حقانی	القاسم اکیڈمی، خالق آباد نوشہرہ

کتب اصول فقہ وقواعد فقہ

۵۴	الاشباہ والنظائر	علامہ زین الدین (ابن نجیم حنفی)	فقیہ الامت دیو بند/ ادارۃ القرآن
۵۵	درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام	شیخ علی حیدر استنبول ترکی	دار الجیل بیروت
۵۶	الاصول والقواعد للفقہ الاسلامی	شیخ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	الہدی پبلیکیشنز نئی دہلی
۵۷	جمہرۃ القواعد الفقہیۃ	دکتور علی احمد الندوی	شرکۃ الراجحی المصرفیۃ
۵۸	قواعد الفقہ	شیخ مفتی عمیم احسان مجددی برکتی	اشرفی بکڈ پو دیو بند
۵۹	القواعد الکلیۃ والضوابط الفقہیۃ	محمد عثمان شبیر	دار النفائس اردن
۶۰	ترتیب اللآلی فی سلک الأمالی	محمد بن سلیمان (ناظر زادہ)	مکتبۃ الرشد ریاض
۶۱	القواعد الفقہیۃ	علی احمد الندوی	دار القلم دمشق، سوریہ
۶۲	شرح القواعد الفقہیۃ	شیخ احمد بن محمد الزرقاء	دار القلم دمشق، سوریہ
۶۳	شرح السیر الکبیر	امام محمد بن الحسن الشیبانی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۶۴	المستصفی من علم الأصول	امام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی	دار الفکر بیروت
۶۵	الموافقات فی اصول الشریعۃ	امام ابو اسحاق شاطبی	دار المعرفۃ/ احیاء التراث

کتب متفرقہ

۶۶	الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ	علامہ ابن حجر عسقلانی	دار الجیل بیروت
۶۷	حجۃ اللہ البالغۃ	محدث ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	دار المعرفۃ بیروت
۶۸	ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	محدث ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	موقع الشبکۃ الاسلامیۃ
۶۹	الملل والنحل	محمد بن عبد الکریم بن ابی بکر احمد الشہر ستانی	دار المعرفۃ بیروت
۷۰	الإمامۃ والسیاسۃ	ابو محمد عبد اللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۷۱	عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر	محمد بن عبد اللہ بن یحیی بن سید الناس	من موقع الشاملۃ

۷۲	موسوعۃ الرد علی المذاہب الفکریۃ المعاصرۃ	علی بن نایف الشحود	من موقع الشاملۃ
۷۳	السیرۃ لابن حبان	امام ابن حبان	من موقع الشاملۃ
۷۴	سلسلۃ مصابیح الہدی	محمد بن ابراہیم بن حسان	من موقع الشاملۃ
۷۵	مجلۃ البیان	....	محملۃ من شبکۃ الانترنت
۷۶	الإسلام وأحداث الحادی عشر من أیلول ۲۰۰۱	زبیر سلطان قدوری	من موقع الشاملۃ
۷۷	حیاۃ محمد	محمد حسنین ھیکل	من موقع الشاملۃ
۷۸	ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ شخصیۃ وعصرہ	الدکتور علی محمد الصلابی	من موقع الشاملۃ
۷۹	اختلاف الدارین وآثارہ	شیخ عبدالعزیز بن مبروک الاحمدی	مؤسسۃ فؤاد بعینو للتجلید بیروت
۸۰	خلفاء راشدین	مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی	ادارہ اصلاح وتبلیغ دیوبند
۸۱	الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ	محبّ الدین احمد بن عبداللہ ابوجعفر الطبری	من موقع الشاملۃ
۸۲	دروس للشیخ سعود الشریم	سعود بن ابراہیم بن محمد آل شریم	موقع الشبکۃ الاسلامیۃ
۸۳	الہجرۃ الی بلاد غیر المسلمین	شیخ عماد بن عامر	دار ابن حزم
۸۴	المحلی لابن حزم	ابن حزم الظاہری	دار احیاء التراث العربی
۸۵	مجموع الثمین للعثیمین	بحوالہ الہجرۃ إلی بلاد غیر المسلمین	....
۸۶	حقوق اللاجئین فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون	اون اسلام نت/on islam.net	....
۸۷	رعایۃ اللاجئین وحقوقھم فی الاسلام	اون اسلام نت/on islam.net	....

مقالہ

(۲۴ رواں فقہی سمینار [کیرالہ] بتاریخ: ۱-۳ مارچ ۲۰۱۵ء ۱۴۳۶ھ)

قرآن مجید کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت سے متعلق بعض مسائل

///

بغیر متن کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت

(۱) **سوال**: **(الف)**: کیا کسی زبان میں (متن قرآن کے بغیر) تنہا ترجمۂ قرآن کی اشاعت درست ہے؟

(ب): اگر یہ اشاعت ناجائز ہے تو اسے خریدنے، تقسیم کرنے اور ہدیہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

(ج): اگر یہ اشاعت درست ہے تو بے وضو اسے چھونے کا کیا حکم ہے؟

(۱) **جواب**: **(الف)**: کسی زبان میں متن قرآن کے بغیر تنہا ترجمۂ قرآن کی اشاعت باجماعِ امت حرام اور باتفاقِ ائمہ اربعہ ممنوع ہے[1]، عامۃ الناس خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لیے وضو کا انتظام نہ کریں گے، تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا، اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے، اور مثلاً

اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابلِ انتفاع ہوجانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے، تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آوے گا، اور محذور کا سبب لامحالہ محذور و محظور ہے۔ (۲)

(ب): جب اشاعت ناجائز ہے تو اس کی خرید وفروخت، تقسیم اور ہدیہ وغیرہ سب بوجہ اعانت علی المعصیت ناجائز ہوگا۔ (۳)

(ج): اشاعت تو درست نہیں، البتہ کسی نے شائع کردیا تو اس ترجمۂ قرآن کو بلا وضو چھونا خلافِ ادب واحترامِ مصحف ہوگا۔ (۴)

غیرعربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت

(۲) **سوال:** **(الف):** جو لوگ قرآن پاک کی عبارت کو عربی رسم الخط میں نہیں پڑھ سکتے، یا اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کے لیے متنِ قرآن کو ان کی زبان (ہندی، انگریزی وغیرہ) اور ان کے رسم الخط میں لکھ دیا جاتا ہے، یعنی عبارتِ قرآن کی ہوتی ہے، اور رسم الخط غیرعربی ہوتا ہے؛ تا کہ غیرعربی داں حضرات کو تلاوتِ قرآن میں سہولت ہو، شرعاً ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(ب): اگر عربی رسم الخط اور رسم عثمانی میں متنِ قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھ دیا جائے اور دونوں کو ساتھ شائع کیا جائے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

(ج): غیرعربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت کا کیا حکم ہے؟

(۲) جواب : **(الف)**: قرآن کریم کو رسمِ عثمانی اِجماعی توقیفی کے علاوہ کسی اور عجمی رسم الخط میں لکھنا بالاجماع ناجائز ہے، غیر عربی داں حضرات کو تلاوتِ قرآن میں سہولت کی خاطر انہیں عربی رسم الخط سکھایا جائے، محض غیر عربی داں حضرات کی سہولت کے خاطر اجماعِ امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا، نیز حفاظتِ قرآن کی مصلحت پر کسی اور مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی (۵)، اور قرآن کریم چوں کہ اُن مقدس الفاظ کا نام ہے جو کلامِ الٰہی کی حیثیت سے آں حضرت ﷺ پر نازل ہوئے۔ گویا قرآن کریم حقیقت میں وہ خاص عربی الفاظ ہیں جن کو قرآن کہا جاتا ہے۔ (۶)

(ب): عربی رسم الخط اور رسمِ عثمانی میں متنِ قرآن کو باقی رکھتے ہوئے کسی اور زبان کے رسم الخط میں قرآن کو لکھنے کی اجازت نہیں ہوگی، کیوں کہ غیر عربی رسم الخط میں لکھنے سے عبارت مصحف مسخ ہوجائے گی، مثلاً - ح، ذ، ز، ض، ظ - میں نمایاں فرق نہیں رہے گا، سب کی صورت یکساں ہوگی، اصل مخارج وصفات سے ان کو ادا نہیں کیا جائے گا، استعلاء، اطباق، استطالت سب کچھ ضائع کردیں گے۔ (۷)

(ج): غیر عربی رسم الخط میں تنہا قرآن کی اشاعت درست نہیں ہے۔ (۸)

بریل کوڈ میں قرآن مجید کی کتابت

(۳) سوال : **(الف)**: بریل کوڈ میں کے عربی رسم الخط اور رسم عثمانی نہ ہونے کے باوجود کیا نابیناؤں کی مجبوری کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست اور مستحسن ہے؟

(ب): بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن کا حکم کیا اصل قرآن کی طرح ہے کہ اس کو

چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے، یا وضو کے بغیر بھی اسے چھوا جا سکتا ہے؟

(ج): اگر بریل کوڈ میں قرآن تیار کرنا درست ہے، تو کیا اس کے کچھ مخصوص آداب واحکام ہیں؟

(۳) **جواب** : **(الف)**: بریل کوڈ کے عربی رسم الخط اور رسمِ عثمانی نہ ہونے کے باوجود نابیناؤں کی مجبوری وسہولت کی بنا پر بریل کوڈ میں قرآن مجید میں تیار کرنا درست اور مستحسن ہے۔(۹)

(ب): بریل کوڈ میں تیار کردہ قرآن پر اصل قرآن کی طرح احکام جاری نہیں ہوں گے(۱۰)، البتہ بحیثیت وجوبِ تعظیم وآداب وحرمتِ امتہان واستخفاف بریل کوڈ قرآن کا حکم بھی اصل قرآن کی طرح ہوگا(۱۱)، لہٰذا اسے بلا وضو چھونا اور پڑھنا اور لکھنا خلافِ ادب ضرور ہوگا۔(۱۲)

(ج): ☆ایسی خود ساختہ من گھڑت علامت جو قرآن اور بریل کے ماہرین کی مسلمہ علامات سے ٹکراتی ہو انہیں اختیار نہ کیا جائے، کہ غیر معروف علامات باعث تشویش، غلط فہمی اور سببِ اختلاف وگناہ ہے۔

☆ بریل نسخے کی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ مطمئن بخش، یقینی اور اغلاط سے پاک ہو۔

☆مسلمہ عربی بریل کے علاوہ کوئی نامانوس بریل طباعت میں اختیار نہ کی جائے۔

☆عربی بریل کے حروف چوں کہ مکمل طور پر رسم عثمانی کے معیار کے موافق نہیں ہیں، لہٰذا ان کی پہچان اور صحت وتجوید پر مکمل توجہ دی جائے، وغیرہ وغیرہ۔

موبائل پر قرآن مجید

(٤) سوال : **(الف)**: اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید ہو، تو کیا موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہوگا؟

(ب): یا موبائل کے ڈھانچے کو ایسا غلاف تصور کیا جائے گا جس کو بے وضو چھونے کی گنجائش ہوتی ہے؟

(٤) جواب : **(الف)**: اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن مجید موجود ہو، یعنی قرآن کریم کے حروف اسکرین (Screen) پر لکھے ہوئے آرہے ہوں، تو موبائل کو ہاتھ میں لینے یا اسکرین پر ہاتھ لگانے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہوگا۔[۱۳]

(ب): موبائل کے ڈھانچے کو غلافِ منفصل تصور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ غلافِ متصل ہے، اور غلافِ متصل مفتیٰ بہ قول کے مطابق جزوِ مصحف میں داخل ہے، جسے بلا وضو چھونا درست نہ ہوگا۔[۱۴]

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " المحيط البرهاني " : ولو كتب القرآن وكتب تفسير كل حرف وترجمته تحته ؛ روي عن الفقيه أبي حفص رحمه الله : لا بأس بهذا في ديارنا ، لأن معاني القرآن وفوائدها لا يضبطها العوام إلا بهذا ، وإنما يكره هذا في ديارهم ، لأن القرآن نزل بلغتنا .

(۱/ ۳۵۱ ، كتاب الصلاة ، الفصل الرابع في كيفيتها ، دار احياء التراث العربي بيروت)

ما في " جواهر الفقه " : ''قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے''۔ (۱/ ۹۷، صیانۃ القرآن عن تغییر الرسم واللسان)=

....

=ما في " جواهر الفقه " : ''خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہوگیا تو مثل تورات وانجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے، اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے، محققان دین ومبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں، حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاعِ قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا، حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا، لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا، پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے۔''

(۱/۱۱۳، نقل فتویٰ حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہٗ)

ما في " فتاوی محمودیه " : ''بغیر عربی کے محض اردو یا کسی بھی زبان میں قرآن شریف کو لکھنا چھاپنا منع ہے، اتقان میں اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع نقل ہے۔''

(فتاویٰ محمودیہ: ۳/۵۱۰، باب ما یتعلق بالقرآن، ترجمۂ قرآن بغیر عربی عبارت کے، کراچی، امداد الفتاویٰ: ۴/۳۹ تا ۴۲، عدم جوازِ کتابت واشاعت ترجمۂ قرآن مجید مجرد از قرآن، امداد الاحکام: ۱/۲۳۲ تا ۲۳۹، قرآن مجید کی کتابت میں خط عثمانی کا واجب ہونا اور ترجمۂ قرآن کو علیحدہ چھاپنے کا حکم، امداد الفتاویٰ: ۴/۴۲، ۴۳، ۴۳، مشورہ در ترجمہ قرآن مجید بزبان ہندی، کفایت المفتی: ۱/۱۲۶، ۱۲۸، کتاب العقائد، خیر الفتاویٰ: ۱/۲۱۷، محض اردو ترجمہ چھاپنا جائز نہیں)

ما في " فتح القدير لإبن الهمام " : وفي الكافي : إن اعتاد القرآن بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع ، فإن فعل آية أو آيتين لا ، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز . الخ .

(۱/۲۸٦ ، باب صفة الصلاة ، مصطفى البابي الحلبي مصر ، رد المحتار : ۱/۴۸٦ ، مطلب في بيان المتواتر والشاذ ، مكتبه سعيد كراچي ، مناهل العرفان : ۲/۳۸، دار احياء التراث العربي بيروت)

ما في " فتاوی محمودیه " : ''محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں، اصل عربی کے ساتھ ترجمہ بھی ہو تو درست ہے۔'' (۳/۵۰۹، اردو میں قرآن پاک لکھنا)

(۲) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . (سورة المائدة : ۲)

ما في " رد المحتار " : " ما كان سببًا لمحظور فهو محظور " . (۵/۲۲۳، ط : نعمانيه)=

....

=ما في " الدر المختار مع الشامية " : " وكل ما أدى إلى ما لا يجوز لا يجوز " . (۹/۴۳۲)

ما في" بدائع الصنائع " : "كل ما أدى إلى الحرام حرام " . (۶/۴۸۸)

ما في " جمهرة القــواعد الفقهية " : " الإعانة على المحظور محظور ". (۲/۶۴۴)

مـا فـي " الـمـقـاصـد الشرعية للخادمي " : " إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرماً " . (ص/۴۶)

(۳) مـا في " جواهر الفقه " : ''اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید وفروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لیے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا، اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا، اور جتنے مسلمان اس کی خرید وفروخت کی وجہ سے گناہگار ہوں گے وہ اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔لقولہ تعالیٰ:﴿وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاْعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾۔'' (۱/۹۷،صیانۃ القرآن عن تغییر الرسم واللسان)

مـا في " جواهر الفقه " : ''حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾۔اور فقہاء نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے، اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے، کیوں کہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے، اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہوجاوے اور لینے کی صورت میں یہ سلسلہ جاری رہے گا، پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی ،اس لیے یہ بھی ناجائز ہے۔'' (۱/۱۱۵،نقل فتویٰ حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہٗ)

مـا في " فتاوى محمود يه " : ''محض اردو میں قرآن پاک لکھنا اور چھاپنا اور فروخت کرنا اور خریدنا درست نہیں۔'' (۳/۵۰۹،اردو میں قرآن پاک پڑھنا،کراچی،خیر الفتاویٰ:۱/۲۱۸،جزئیہ نمبر۵، ۶)

(۴) مـا فـي " جـواهـر الفقه " : ''حسب تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا۔ كـمـا في الـعـالـمـكـيـرية : ولـو كـان الـقـرآن مـكتوبًا بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة ، وكذا عـنـدهـمـا عـلـى الـصـحيح . هكذا في الخلاصة . (۱/۳۴) وفيه أيضًا : إذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أم لا إذا أخبر السامع أنه قرأ=

....

= آية السجدة . (۱/۸۵) وهذه الجزئية الثانية تؤيد الأولى حيث وجب سجدة التلاوة بقراءة القرآن بالفارسية فعلم منه أن الترجمة بالفارسية لا تخرج القرآن عن كونه قرآنا حكما فلا يجوز مسه للمحدث۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ عامہ ناس اس ترجمہ کوایک کتاب خالی ازقرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لیے وضوکا انتظام نہ کریں گے۔" (۱/۱۱۳،۱۱۴)

ما في " ارشاداتِ گنگوهي " : "قرآن شریف مترجم کو بے وضو ہاتھ لگانا منع ہے۔"

(ص/۲۰۲، بحوالہ ماہنامہ راہِ عافیت: ص/۴۰، محرم الحرام ۱۴۳۶ھ، شمارہ نمبر: ۹، جلد نمبر: ۹)

ما في " خير الفتاوى " : "بہت سے لوگ اسے بلا وضو چھوئیں گے، حالانکہ احتراماً اس کا بلا وضو چھونا درست نہیں۔ (خیر الفتاویٰ: ۱/ ۲۱۸، محض اردو ترجمہ چھاپنا الخ)

ما في " كتاب الفتاوى " : "قرآن مجید کا ترجمہ بعینہٖ قرآن کے حکم میں نہیں ہے، اس لیے ترجمۂ قرآن کو پڑھنے اور چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری نہیں، بشرطیکہ اس کے ساتھ قرآن مجید کا متن نہ ہو، اور ہو تو اس پر ہاتھ نہ لگے، البتہ دشواری نہ ہو تو ترجمہ کے لیے بھی وضو کر لینا بہتر ہے، اس سے ان شاء اللہ قرآن کے کمالِ احترام کا ثواب ملے گا۔" (۱/ ۴۷۸، ترجمۂ قرآن پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے؟، نیز دیکھیے؛ جواب نمبر: ۴ کا حاشیہ نمبر: ۱)

(۵) ما في " فقه النوازل " : الخلاصة : لا يجوز استعمال الرسم التعليمي إلا إذا كان لبعض الآيات ضمن كتب تعليمية . (۲/۱۸، وثيقة رقم : ۱ ، الموضوع ؛ حكم كتابة القرآن الكريم بالرسم التعليمي ، المصدر : مجمع البحوث الإسلامية بالقاهرة ، التاريخ ؛ شعبان ۱۳۸۸ھ)

وفيه أيضًا : الخلاصة : يبقى رسم المصحف على الرسم العثماني ولا ينبغي تغييره ليوافق قواعد الإملاء الحديثة ، وذلک محافظة على كتاب الله من التحريف واتباعًا لما كان عليه أئمة السلف .

(۲/۱۹، وثيقة رقم : ۲، الموضوع ؛ حكم كتابة القرآن الكريم بطريقة الإملاء العادية ، المصدر ؛ هيئة كبار العلماء بالسعودية ، التاريخ ؛ شوال ۱۳۹۹ھ ، دار ابن الجوزي ، الدمام ، السعودية)

ما في " الإتقان في علوم القرآن للسيوطي " : وقال أشهب : سئل مالک : هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء ؟ فقال : لا إلا على الكتبة الأولى . رواه الداني في المقنع . ثم قال : ولا مخالف له من علماء الأمة ، وقال في موضع آخر : سئل مالک عن الحروف في القرآن مثل الواو والألف : أترى أن يغير من المصحف إذ وجد فيه كذلک ؟ قال : لا ، قال أبو عمرو : يعني =

....

=الواو والألف المزيديتين في الرسم المعدومتين في اللفظ نحو: (أولوا) . وقال الإمام أحمد : يحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك . وقال البيهقي في شعب الإيمان : من يكتب مصحفًا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف ، ولا يخالفهم فيه ، ولا يغير مما كتبوه شيئًا فإنهم كانوا أكثر علمًا ، وأدق قلبًا ولسانًا ، وأعظم أمانةً ، فلا ينبغي أن نظنّ بأنفسنا استدراكًا عليهم . (۲/۳۲۹ ، النوع السادس والسبعون في مرسوم الخط وآداب كتابته ، فصل ، قديمي كتب خانه كراچي ، كذا في مناهل العرفان : ۱/۳۷۹ ، أقوال العلماء في التزام الرسم العثماني ، مطبعة دار احياء الكتب العربية قاهرة مصر ، المقدمات الأساسية في علوم القرآن: ص/۱۵۲ ، ۱۵۳ ، المبحث الثالث : حكم المحافظة عينه في خطوط المصاحف ، ط : مؤسسة الريان بيروت ، عبد الله يوسف الجديع)

وما في " خلاصة النصوص الجلية " : أجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته .... اهـ . قال العلامة ابن عاشر : ووجه وجوبه ما تقدم من إجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثني عشر ألفًا والأجماع حجة حسب ما تقرر في أصول الفقه ثم ذكر معزيا للمحكم بسنده إلى عبد اللّٰه بن عبد الحكم قال : قال أشهب : سئل مالک فقيل له : أرأيت من استكتب مصحفا اليوم أترى أن يكتب على ما أحدث الناس من الهجاء اليوم فقال : لا أرى ذلک ، ولكن يكتب على الكتبة الأولى . قال العلامة السخاوي : والذي ذهب إليه مالک هو الحق ، وقال الجعبري : وهذا مذهب الأئمة الأربعة وخص مالكا لأنه صاحب فتياه ومستندهم ومستند الخلفاء الأربعة رضوان اللّٰه تعالى عليهم . اهـ . (ص/۲۵، بحواله جواهر الفقه : ۱/۱۰۶ ، وكذا في الفرائد الحسان في بيان رسم القرآن: ص/۵۸ ، مناهل العرفان للزرقاني :ص/۳۷۰ ، دليل الحيران:ص/۴۰، المقنع في معرفة مرسوم مصاحف الأمصار للداني :ص/۳۴ ، نثر المرجان في رسم نظم القرآن : ۱/۴۶۹ ، لطائف البيان في رسم القرآن : ۲/۲۷ ، الجامع لما يحتاج إليه من رسم المصحف : ص/۵۲ ، بحوالہ فتاویٰ عثمانی :۱/۲۸۱،۲۱۹، کتاب التفسیر وما یتعلق بالقرآن، بعنوان؛ قرآن کریم کورسم عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنا)

ما في " الموسوعة الفقهية الكويتية " : ذهب جمهور فقهاء الأمة إلى وجوب الإقتداء في رسم المصاحف برسم مصحف عثمان رضي اللّٰه عنه لكونه قد أجمع الصحابة عليه . سئل الإمام=

....

= مالک : أرأيت مَن استُكتِب مصحفا اليومَ ، أترى أن يكتب على ما أحدث الناس من الهجاء اليوم ؟ فقال : لا أرى ذلك ، ولكن يُكتب على الكِتبة الأولى ، وروي أنه سئل عن الحروف التي تكون في القرآن مثل الواو والألف أترى أن تُغيّر من المصحف إذا وُجدت فيه كذلك ؟ فقال : لا ، قال الداني : يعني الواو والألف الزائدتين في الرسم المعدومتين في اللفظ قال : ولا مخالف لمالك في ذلك من علماء الأمة ، وقال أحمد : تحرم مخالفة مصحف الإمام في واو أو ياء أو ألف أو غير ذلك . وقال البيهقي في شعب الإيمان : من كتب مصحفا فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به هذه المصاحف ولا يخالفهم فيه ، ولا يغير مما كتبوا شيئًا ، فإنهم كانوا أكثرَ علما وأصدق لسانا وأعظم أمانة منا ، فلا ينبغي أن نظنّ بأنفسنا استدراكاً عليهم . (۳۸/۱۲، ۱۳، اتباع رسم المصحف الإمام ، مصحف ، المقنع في معرفة مرسوم مصاحف أهل الأمصار للداني : ص/۹، ۱۰، البرهان في علوم القرآن للزركشي : ۱/۳۷۹، ط : دار المعرفة بيروت ، الإتقان في علوم القرآن للسيوطي : ۲/۴۳۰، ۴۳۱، ط : دار الحديث ، النوع السادس والسبعون في مرسوم الخط وآداب كتابته ، شرح منتهى الإرادات : ۱/۷۴، ط : دار الفكر)

ما في " فتح الباري لإبن حجر " : وقال البغوي في شرح السنة : المصحف الذي استقر عليه الأمر هو آخر العرضات على رسول الله ﷺ فأمر عثمان بنسخه في المصاحف وجمع الناس عليه وأذهب ما سوى ذلك قطعًا لمادة الخلاف فصار ما يخالف خط المصحف في حكم المنسوخ والمرفوع كسائر ما نسخ ورفع فليس لأحد أن يعدو في اللفظ إلى ما هو خارج عن الرسم .

(۹/۳۰، باب أنزل القرآن على سبعة أحرف ، ط: دار المعرفة بيروت) (مقدمه شرح الدرة : ص/۱۱٦، بحوالہ فضائل حفاظ القرآن :ص/۱۲۱۰، حصہ دوم ، أبوعبد القادر محمد طاہر رحیمی مدنی ، ط: ادارۂ اسلامیات کراچی لاہور، پاکستان، قرآنی املاء اور رسم الخط :ص/۱۴، ۱۵، مکتبہ صوت القرآن دیوبند، مؤلفہ المقری أبوالحسن أعظمی)

ما في " إمداد الأحكام " : قلت : ولا يمكن رعاية ذلك في خط الهنود ولا في الخط الإنجليزي فغاية ما يمكن فيها أن يكتب الحروف المتلفظ بها فقط ولا يمكن رعاية الزوائد أصلا وأيضًا فبعض ما يتلفظ به من الحروف في العربي لا توجد في هذين اللسانين أصلا مثل الضاد والقاف ونحوهما فيعبر عنها بحروف مشترك بينها وبين غيرها ولا يخفى ما فيه من لزوم التحريف في القرآن . وقال في الإتقان أيضًا : وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي ؟ قال الزركشي : لم أر فيه كلاما لأحد=

....

= من العلماء قال : ويحتمل الجواز لأنه قد يحسنه من يقرأه بالعربية والأقرب المنع كما تحرم قرأته بغير لسان العرب ، ولقولهم : القلم أحد اللسانين ، والعرب لا تعرف قلما غير العربي ، وقد قال الله تعالى : ﴿بلسان عربي مبين﴾ . (امداد الاحکام:۱/۲۴۰، ۲۴۱، خط ناگری میں قرآن مجید لکھنے کا حکم)

(وكذا في البحوث العلمية :۷/۳۸۸ ، كتابة المصحف حسب قواعد الإملاء ، هيئة كبار العلماء بالمملكة السعودية ، الناشر : رئاسة إدارة البحوث العلمية والإفتاء ، مجلة البحوث الإسلامية :۶/۲۱، القاعدة السادسة من قواعد رسم المصحف الخ ، المؤلف : الرئاسة العامة لإدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، أبحاث هيئة كبار العلماء :۷/۲۹۳ ، ثانيا نقول عن العلماء الخ ، المؤلف : هيئة كبار العلماء بالمملكة العربية السعودية ، فتاوى الأزهر :۷/۴۷۶ ، رسم المصحف ، إعداد : موقع وزارة الأوقاف المصرية ، فتاوى دار الإفتاء المصرية :۷/۴۷۶، رسم المصحف ، المؤلف : دار الإفتاء المصرية ، أرشيف المجلس العلمي من موقع الألوكة : حكم كتابة القرآن الكريم بغير العربية . www.majles.alukah.net، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير: ۱/۳۳۲، فصل في نواقض الوضوء، الفتاوى الكبرى الفقهية : ۱/۳۸ ، باب النجاسة ، المكتبة الإسلامية تركى ، آكام النفائس: ص/۵۳ ، في ضمن رسائل اللكنوي : ۴/۳۸۵ ، إدارة القرآن كراچی)

ما في '' مناهل العرفان في علوم القرآن '' : رسم المصحف يراد به الوضع الذي ارتضاه عثمان رضي الله عنه في كتابته كلمات القرآن وحروفه . (۱/۳۶۹ ، رسم المصحف)

ما في '' المحيط البرهاني '' : ولو اعتاد القراء ة بالفارسية أو أراد أن يكتب المصحف بالفارسية منع من ذلك أشدّ المنع ، وإن فعل ذلك في آية أو آيتين لا يمنع من ذلك ، ذكره شمس الأئمة السرخسي في شرح الجامع الصغير .

(۱/۱۳۵۱ ، كتاب الصلوة ، الفصل الرابع في كيفيتها ، ط : احياء التراث العربي بيروت)

ما في '' تاريخ القرآن الكريم '' : فكما اتفقت الأئمة على عدم جواز كتابته بغير الرسم العثماني محافظة على هيئة كتابته الأولى اتفقت أيضًا على عدم جواز كتابته وترجمته حرفيًا بغير اللغة العربية خوفًا من التغيير والتبديل الذي لا بد من حصوله بالترجمة .

(۱/۱۱۹ ، المكتبة الشاملة ، مؤلف : الشيخ محمد طاهر الكردي)

ما في '' التفسير الحديث '' : إن أكثر العلماء وأئمة القراء ة قرروا وجوب الاحتفاظ في كتابة=

....

= القرآن بالرسم العثماني . اهـ . (۱/ ۱۳۰، رسم المصحف العثماني ، دار احياء الكتب العربية القاهرة ، دار الغرب الإسلامي دمشق)

ما في ” جواهر الفقه “ : ”رسالہ نصوص جلیہ اور فضائل القرآن ابن کثیر اور امام زرکشی سے جو عبارات ونصوص نقل کی گئی ہیں ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت ومخالفت بھی ثابت ہوگئی کہ زبان تو عربی ہی رہے، لیکن رسمِ خط انگریزی یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی، ناگری وغیرہ کردیا جائے، جیسا کہ اس فتنہ زاز زمانہ میں اس کا بھی شیوع ہے، کہیں انگریزی رسم خط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے، کہیں ہندی اور گجراتی میں، جو باجماع امت ناجائز ہے، خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم خط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہوگی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمتِ اسلام سمجھ کر کیا جارہا ہے، اور اس کے لیے بہت سی مصالحِ دینیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے، نہ ضرورت، کیوں کہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے بھی حاصل ہوسکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اسی طرح حاصل ہوتی آئی ہیں کہ ہر ملک وقوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انہوں نے بدون رسم خط تبدیل کرنے کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں، اور ایسا پڑھا کہ انہیں اہلِ عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کی قرأت وتجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے، اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کیے جائیں تو ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماعِ امت کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا، اور حفاظتِ قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمان اور دوسرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے ان مصالح کی طرف نظر نہیں فرمائی، حالانکہ یہ مصالح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں، کیوں کہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا، اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے، اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن نہ تھا، کیوں کہ خود کاتب قرآن زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) مختلف زبانیں جانتے تھے، مگر اس کے باوجود کتابت قرآن میں خاص خاص ملکی مصالح کو نظر انداز کرکے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں بھیجے۔“ والی اللہ المشتکی مما عمت فیہ البلوی من أیدی أصحاب الھوی وایاہ نسئل الھدی والتقی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (۱/ ۱۱۰، ۱۱۱، تنبیہ، فتاویٰ محمودیہ: ۳/ ۵۰۸، ۵۰۹، کراچی، و۳/ ۵۱۲، اڑیہ زبان میں قرآن وحدیث لکھنا، کفایت المفتی: ۱/ ۱۲۸، کتاب العقائد، فتاویٰ مولانا عبدالحی ابوالحسنات اردو: ص/ ۱۱۵، ۱۱۶، قرآن کا رسم الخط اور علم نحو، مکتبہ تھانوی دیوبند، فتاویٰ محمودیہ: ۳/ ۵۰۷، ۵۰۸، غیر عربی میں قرآن لکھنا، مکتبہ فاروقیہ کراچی، و۳/ ۵۰۹، اردو میں قرآن پاک پڑھنا، کفایت المفتی: ۱/ ۱۲۸، امداد الاحکام: ۱/ ۲۴۳، امداد الفتاویٰ: ۴/ ۴۴، حکم نوشتن قرآن درخط ناگری، خیر الفتاویٰ: ۱/ ۲۲۵، قرآن کے رسم الخط میں مصاحفِ عثمانیہ کا اتباع واجب ہے، فتاویٰ رحیمیہ: ۳/ ۱۶، ۱۷، گجراتی میں قرآن شریف لکھنا)=

....

=(٦) مـا في " كشف الأسرار لفخر الإسلام البزدوي " : أما الكتاب فالقرآن المنزل على الرسول المكتوب في المصاحف ، المنقول عن النبي ﷺ نقلاً متواترًا بلا شبهة وهو النظم والمعنى جميعًا في قول عامة العلماء ، وهو الصحيح من قول أبي حنيفة عندنا .

(١/٦٧، و ١/١٩ ، دار الكتاب الإسلامي بيروت ، نور الأنوار :ص/٧-٩ ، طبع مكتبه حقانيه پشاور ، پاكستان ، الموسوعة الفقهية :٣٣/٣٠ ، قرآن)

ما في " أصول الفقه الإسلامي للزحيلي " : فإن تغيير سورة أو آية بألفاظ عربية مرادفة لألفاظ القرآن لا يعد قرآنا مهما كان مطابقًا للمفسر في دلالته لأن القرآن عربي خاص نزل من عند الله سبحانه وترجمة القرآن لا تعد قرآنا مهما كانت الترجمة دقيقة فلا يصح الاعتماد عليها في استنباط الأحكام الشرعية . (١/٤٢٣ ، ط: مكتبه رشيديه كوئٹه)

ما في " رد المحتار " : وهو اسم للمنزل باللفظ العربي المنظوم الخاص ، المكتوب في المصاحف، المنقول إلينا نقلا متواترا ، والأعجمي إنما يسمى قرآنا مجازا ، ولذا يصح نفي اسم القرآن عنه . (٢/١٨٤ ، باب صفة الصلاة ، مطلب الفارسية ، دار الكتب العلمية بيروت ، البحر الرائق :٣/٢٢٠ ، فصل ما يفعله من أراد الدخول في الصلاة)

ما في " آپ کے مسائل اور ان کا حل " : ﴿انا نحن نزّلنا الذكر وانا له لحٰفظون﴾ . [الحجر : ٩]
''یعنی ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' قرآن کریم کی حفاظت کے وعدے میں اس کے الفاظ کی حفاظت، اس کے معنی کی حفاظت، اور زبان ولغت کی حفاظت سب ہی کچھ شامل ہے۔

(۴/۴۶۷، جدید ایڈیشن)

(۷) (فتاویٰ محمودیہ:۳/۵۱۱، باب ما یتعلق بالقرآن، ط: کراچی)

(۸) دلائلِ مذکورہ......(الف، حاشیہ نمبر:۱)

(٩) ما في " القرآن الكريم " : ﴿عبس وتولّى ان جآءه الاعمى O وما يدريك لعلّه يزّكّى﴾ .

(سورة عبس : ١، ٢)

ما في " الدر المنثور في التفسير المأثور " : وأخرج ابن جرير وابن مردويه عن ابن عباس قال : بينا رسول الله ﷺ يناجي عتبة بن ربيعة والعباس بن عبد المطلب وأبا جهل بن هشام، وكان يتصدى لهم كثيرا ، ويحرص أن يؤمنوا فأقبل إليه رجل أعمى يقال له عبد الله بن أم مكتوم يمشي وهو يناجيهم ، فجعل عبد الله يستقرئ النبي ﷺ آية من القرآن ، قال : يا رسول الله ! علّمني=

....

= مما علّمک اللّٰہ ، فأعرض عنه رسول اللّٰہ ﷺ وعبس في وجهه وتولی وکرہ کلامه ، وأقبل علی الآخرین ، فلما قضی رسول اللّٰہ ﷺ نجواہ ، وأخذ ینقلب إلی أهله أمسک اللّٰہ ببعض بصرہ ثم خفق برأسه ثم أنزل اللّٰہ ﴿عبس وتولّیٓ أن جآءہ الأعمی﴾ فلما نزل فیه ما نزل أکرمه نبي اللّٰہ وکلمه یقول له : ما حاجتک ؟ هل ترید من شيء ؟ .

(۵۱۸/۶، سورۃ عبس ، دار الکتب العلمیة بیروت ، معالم التنزیل المعروف بتفسیر البغوي : ۳۳۲/۸ ، دار طیبة للنشر والتوزیع ، روح المعاني :۲۴۱/۱۵ ، ط : بیروت)

وما في '' القرآن الکریم '' : ﴿ولقد یسّرنا القراٰن للذّکر فهل من مدّکر﴾ . (سورۃ القمر : ۱۷)

ما في '' تفسیر القرآن العظیم '' : قوله تعالی : ﴿ولقد یسّرنا القراٰن للذّکر﴾ ؛ أي سهلناہ للحفظ والقراءۃ والکتابة ...... ﴿فهل من مدکر﴾ ؛ أي فهل ذاکرٌ یذکرہ ، وقارئٌ یقرأہ ، ومعناہ : الحث علی قراءۃ القرآن ودرسه وتعلّمه ، ولو لا تسهیل اللّٰہ علینا ذلک لم یستطع أحد أن یلفِظَ به .

(الباب :۱۷ ، أبو القاسم سلیمان بن أحمد بن أیوب بن مطیر اللخمي والشامي الطبراني ، الجامع لأحکام القرآن للقرطبي :۱۳۴/۱۷ ، سورۃ القمر ، دار عالم الکتب ، الریاض ، التحریر والتنویر المعروف بتفسیر ابن عاشور:۸۹/۱۶، سورۃ مریم ، الآیة/۹۶ ، محمد الطاهر بن محمد بن محمد الطاهر ابن عاشور التونسي ، مؤسسة التاریخ العربي بیروت)

ما في '' تفسیر التستري '' : قوله تعالی : أي ؛ هونا القرآن للذکر ، ولو لا ذلک لما أطاقت الألسنة أن تتکلم به فهل من مدکر لهذہ النعمة . (۱۵۸/۱ ، أبو محمد سهل بن عبد اللّٰہ التستري ، دار الکتب العلمیة بیروت ، تفسیر روح البیان المعروف بتفسیر حقي : ۲۲۴/۹، سورۃ القمر ، إسماعیل حقي بن مصطفی الإستانبولي الحنفي الخلوتي ، دار احیاء التراث العربي بیروت ، غریب القرآن لإبن قتیبه : ۴۳۲/۱ ، أبو محمد عبد اللّٰہ بن مسلم بن قتیبه الدینوري ، دار الکتب العلمیة ، مصریه ، شرح السنة : ۱۸۲/۱ ، الحسین بن مسعود البغوي ، المکتب الإسلامي دمشق ، و بیروت ، الورع لإبن حنبل : ۸۸/۱ ، أبو عبد اللّٰہ أحمد بن محمد بن حنبل الشیباني ، دار الکتب العلمیة بیروت ، مرعاۃ المفاتیح :۲۶۱/۷، الفصل الأول ، تحت رقم : ۲۲۰۹ ، أبو الحسن عبید اللّٰہ بن محمد عبد السلام المبارکفوري ، إدارۃ البحوث العلمیة .. ، بنارس ، الهند)

ما في '' التفسیر المنیر للزحیلي '' : ولقد سهلناہ للحفظ وأعنا علیه من أراد حفظه فهل من =

....

=طالب لحفظه ليعان عليه . (۲۷/۱۶۳ ، فقه الحياة والأحكام)

ما في " التفسير الواضح " : فإنما يسرنا القرآن بلسانک العربي حتى صار مفهوما يفهمه الخاص والعام فهو كالبحر يغترف منه كل على قدر طاقته ولقد يسرنا القرآن للذكر ــ الخ .

(۲/۴۷۴ ، سورة مريم ، الدكتور محمد محمود حجازي ، دار الجيل الجديد)

ما في " التحرير والتنوير " : ﴿ولقد يسّرنا القرآن للذكر﴾ [القمر: ۲۲] ، ولذلک كان شأن الرسول ﷺ حفظ القرآن عن ظهر قلب ، وكان شأن المسلمين اقتداء به في ذلک على حسب الهمم والمكنات . (۲۵/۸، سورة فصلت)

ما في " لطائف الإشارات " : يسّرنا قرأته على ألسنة الناس ، ويسّرنا علمه على قلوب قوم، ويسرنا فهمه على قلوب قوم ، ويسرنا حفظه على قلوب قوم ، وكلهم أهل القرآن ، وكلهم أهل اللّٰه وخاصته. (۳/۴۹۷ ، سورة القمر ، عبد الكريم بن هوازن القشيري ، الناشر ؛ الهيئة المصرية العامة للكتاب ، مصر)

ما في " كيف نفهم القرآن الكريم ؟ " : فهذا القرآن العظيم قد سهل اللّٰه ألفاظه للحفظ والأداء ومعانيه للفهم والعلم ، لأنه أحسن الكلام لفظا وأصدقه معنى ، وأبينه تفسيرا ، فكل من أقبل عليه يسر اللّٰه عليه مطلوبه غاية التيسير وسهله عليه .... ولهذا كان علم القرآن حفظا وتفسيرا أسهل العلوم وأجلها ...... فهذه نعمة عظيمة فهل من مدكر ؟ هل من متعظ ؟ هل من مقبل على كلام اللّٰه يفهمه ويتعلمه ؟ والله يعينه ويوفقه ويسدده .... فهم القرآن وتدبره ليس مقصودا على العلماء ، بل كل واحد لا بد أن يأخذ حظّه من بحسب ما يسره اللّٰه له ، وبحسب ما معه من الفهم والعلم والإدراک ، فاللّٰه تبارک وتعالى دعا عباده كلهم إلى تدبر القرآن وفهمه لم يخص طائفة بذلک دون طائفة ، ولو كان فهم القرآن وتدبره مقتصرا على فئة من الناس لكان نفع القرآن محصورا عليهم ولكان الخطاب في الآية موجهًا إليهم . (۱/۲، عبد السلام بن إبراهيم بن محمد الحصين)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحفظون﴾ . (سورة الحجر: ۹)

ما في " جمع القرآن الكريم حفظا وكتابة " : سهولة حفظ القرآن الكريم وتيسيره ؛ فكان من رحمة اللّٰه على خلقه أن يسر لهم حفظ القرآن ليجعل من ذلک سببًا مانعًا من ضياع شيء منه ، فكما قال عزّ وجلّ : ﴿انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحفظون﴾ ... فقد قال أيضًا : ﴿ولقد يسرنا=

....

= القرآن للذكر﴾ . (۱/ ۲۶ ، د . علي بن سليمان العبيد)

ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : " مَا رَآهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ " .

" جس چیز کو مسلمان اچھا خیال کریں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہے۔"

(ص/ ۲۶۳ ، قاعدة : ۳۱۲ ، شرح السير الكبير : ۴/ ۱۴۹ ، باب ما يكره في دار الحرب وما لا يكره ، قواعد الفقه : ص/ ۱۱۵ ، قاعدة : ۲۹۴ ، جمهرة القواعد ، المادة : ۱۱۷۱)

ما في " موقع الإسلام سؤال وجواب " : وقال الشيخ صلاح الصاوي حفظه الله : أما إن كان سؤالک حول جواز هذا العمل في ذاته – أي : المصحف المترجم بطريقة برايل ، فلا شک في مشروعيته ، وأنه يمثل إنجازا حضاريا كبيرا ، ونعمة من أجل نعم الله على المكفوفين . والله تعالى أعلى وأعلم . انتهى . (أحكام المصاحف " القرآن وعلومه " www.islamQA.com) (كتابة القرآن الكريم بنظام برايل للمكفوفين ، د. عبد الله الخميس ، المسلم نت almoslim.net ، نیز اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے ارسال کردہ، مدرسۃ النور فار دی بلائنڈ ترکی کانفرنس کا مقالہ)

(۱۰) (ما هو حكم ترجمة معاني القرآن إلى طريقة برايل للمكفوفين ؟ وهل تأخذ حكم المصحف؟ موقع الإسلام سؤال وجواب www.islamQA.com، وكذا : اللجنة الدائمة للإفتاء في السعودية ، المجموعة الثانية : ۳/ ۴۱)

(۱۱) (المصحف المطبوع بطريقة برايل للمكفوفين هل له حكم المصحف المعروف ؟ ، الدكتور حسام الدين عفانه/ جامعة القدس فلسطين ، المصدر : جمعية أصدقاء الكفيف فلسطين)

(۱۲) (جواب نمبر: ۴ کا حاشیہ نمبر: ۱)

(۱۳) ما في " القرآن الكريم " : ﴿لا يمسة إلا المطهرون﴾ . (سورة الواقعة : ۷۹)

ما في " أحكام القرآن شفيعي " : وجه الاستدلال بالآية أن المراد بالمطهرين هم المطهرون من الأحداث ، ويؤيد هذا أن الكلام مسوق لتعظيم القرآن .... وهذا شرط لمس نقوشه وأوراقه .

(۵/ ۱۰)

ما في " أحكام القرآن لظفر أحمد التهانوي " : إن المراد به المطهرون من الأحداث ، وهم المكلفون من الآدميين لما روى أنس بن مالک في حديث إسلام عمر قال لأخته : أعطوني الكتاب الذي كنتم تقرؤون ، فقالت : إنک رجس إنه لا يمسه إلا المطهرون ، فقم واغتسل أو توضأ .... ولذا ذهب الجمهور إلى أنه لا يجوز للمحدث مس المصحف إلا بواسطة شيء منفصل=

....

=عنه . (۵/۱۰)

ما في " جامع الترمذي " : عن علي قال : " كان رسول الله ﷺ يقرئنا القرآن على كل حال ما لم يكن جنبًا " . قال أبو عيسى : هذا حديث حسن صحيح . (۱/۳۸ ، أبواب الطهارة)

ما في " الفتاوى الهندية " : لا يجوز مسّ شيء مكتوب فيه شيء من القرآن من لوح أو دراهم أو غير ذلك إذا كان آية تامة . هكذا في الجوهرة النيرة . والصحيح منع مس حواشي المصحف والبياض الذي لا كتابة عليه . هكذا في التبيين . (۱/۳۹ ، بدائع الصنائع: ۱/۱۴۱ ، كتاب الطهارة ، مطلب في مس القرآن ، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي :ص/۳۴ ، كتاب الطهارة ، الدر المختار مع الشامية : ۱/۲۸۲ ، كتاب الطهارة)

ما في " التنوير وشرحه مع الشامية " : ويحرم به أي بالأكبر والأصغر مس مصحف : أي ما فيه آية كدرهم وجدار إلا بغلاف متجاف غير مشرز أو بصُرة . به يفتى . وحل قلبه بعود . (تنوير مع الدر) . وفي الشامية : قوله : (أي ما فيه آية الخ) أي المراد مطلق ما كتب فيه قرآن مجازًا ، لكن لا يحرم في غير المصحف إلا بالمكتوب . (۱/۳۱۵ ، كتاب الطهارة ، مطلب يطلق الدعاء على ما يشمل الثناء)

ما في " بدائع الصنائع " : قال ﷺ : " لا صلاة إلا بوضوء " . ولا مسّ المصحف من غير غلاف عندنا ..... ولا مس الدراهم التي عليها القرآن ، لأنه حرمة المصحف كحرمة ما كتب منه فيستوى فيه الكتابة في المصحف وعلى الدراهم . (۱/۱۴۰ ، ۱۴۱ ، كتاب الطهارة ، مطلب مسّ المصحف، الفتاوى الهندية : ۱/۳۹ ، مراقي الفلاح :ص/۳۴ ، كتاب الطهارة)

ما في " الفتاوى الهندية " : المحدث إذا كان يقرأ القرآن بتقليب الأوراق بقلم أو سكين لا بأس به . كذا في الغرائب . (۵/۳۱۷ ، كتاب الكراهية ، الباب الرابع في الصلاة والتسبيح وقراءة القرآن الخ) (فتاویٰ بنوریہ،رقم الفتویٰ:۱۴۸۴۹)

ما في " حلبي كبير " : (لا تكره قراءة القرآن للمحدث ظاهرًا) أي على ظهر لسانه حفظًا بالإجماع . (ص/۶۰)

ما في " مراقي الفلاح مع الطحطاوي " : ويحرم مسها أي الآية لقوله تعالى : ﴿لا يمسه إلا المطهرون﴾ سواء كتب على قرطاس أو درهم أو حائط . (ص/۳۴ ، كتاب الطهارة)

(۱۴) ما في " الدر المختار مع الشامية " : وقراءة قرآن بقصده ومسّه ولو مكتوباً بالفارسية في الأصح إلا بغلافه المنفصل. (در مختار) . وفي الشامية : قوله : إلا بغلافه المنفصل أي كالجراب والخريطة دون المتصل كالجلد المشرز هو الصحيح وعليه الفتوى ؛ لأن الجلد تبع له . =

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=(۱/۴۲۳ ،كتاب الطهارة، باب الحيض ، مطلب لو أفتى مفت بشيء من هذه الأقوال... الخ ، الفتاوى الهندية : ۱/۳۸ ، ۳۹ ، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة)

ما في " الفقه الإسلامي وأدلته " : ويجوز للمحدث أن يمس غلاف المصحف إذا كان متجافياً عنه بأن يكون شيء ثالث بين الماس والممسوس كمنديل ونحوه .... وأما مس الغلا ف المتصل بالمصحف غير المتجافي عنه فلا يحل شيء لأنه تبع للمصحف . (۱/۹۸)

(امدادالاحکام:۱/۲۵۰، دستانے پہن کر بلاوضوقرآن پاک چھونا، مکتبہ دارالعلوم کراچی، المسائل المہمۃ فیما ابتلت بہ العامۃ: ۲/۲۵۲، ۲۵۳، مسائل متفرقہ، و۳/۵۴، ۵۵، مسئلہ:۲۱، ۲۲، کتاب الطہارۃ، و۷/ ۲۲۵، درسی وتعلیمی اہم مسائل کا انسائیکلو پیڈیا:ص/۶۶، مسئلہ:۷۴، ۷۵، ۷۶، پاکی وناپاکی کا بیان)

❖❖❖

کتابیات

کتب تفاسیر

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
	القرآن الکریم		
۱	التفسیر المنیر	دکتور وہبہ زحیلی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۲	احکام القرآن	مفتی شفیع مفتی اعظم پاکستان (بحکم تھانوی)	ادارۃ القرآن لاہور
۳	احکام القرآن	مولانا ظفر احمد تھانوی (بحکم تھانوی)	ادارۃ القرآن لاہور
۴	الجامع لأحکام القرآن	امام ابوعبداللہ احمد انصاری قرطبی	دار عالم الکتب الریاض
۵	محاسن التأویل (تفسیر القاسمی)	محمد جمال الدین القاسمی	المکتبۃ الشاملۃ
۶	الدر المنثور فی التفسیر المأثور	امام جلال الدین سیوطی	دار الکتب العلمیۃ
۷	معالم التنزیل (تفسیر البغوی)	عبداللہ بن احمد بن علی الزید	دار طیبۃ للنشر والتوزیع، الریاض
۸	روح المعانی	شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی	دار الکتب العلمیۃ
۹	التفسیر الحدیث	محمد عزت دروزہ	دار احیاء الکتب قاہرہ/ دار الغرب دمشق
۱۰	تفسیر القرآن العظیم	ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن مطیر اللخمی والشامی الطبرانی	المکتبۃ الشاملۃ
۱۱	التحریر والتنویر (تفسیر ابن عاشور)	محمد الطاہر بن محمد بن محمد الطاہر ابن عاشور التونسی	مؤسسۃ التاریخ العربی بیروت
۱۲	تفسیر التستری	ابومحمد سہل بن عبداللہ التستری	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۱۳	روح البیان المعروف بتفسیر حقی	اسماعیل حقی بن مصطفیٰ استانبولی	دار احیاء التراث العربی
۱۴	غریب القرآن لابن قتیبہ	ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری	دار الکتب العلمیۃ مصریہ
۱۵	التفسیر الواضح	دکتور محمد محمود حجازی	دار الجیل الجدید
۱۶	لطائف الإشارات	عبدالکریم بن ہوازن القشیری	الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب

کتب احادیث وشروحات احادیث

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
۱۷	جامع الترمذی	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسی ترمذی	بلال دیوبند/ بیروت
۱۸	فتح الباری	علامہ ابن حجر عسقلانی	السلفیۃ/ الریاض

۱۹	شرح السنة	الحسین بن مسعود البغوی	المکتب الإسلامی دمشق وبیروت
۲۰	مرعاة المفاتیح	ابوالحسن عبیداللہ بن محمد عبدالسلام مبارکپوری	إدارة البحوث العلمیة بنارس
۲۱	الورع لإبن حنبل	ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی	دارالکتب العلمیة

کتب فقه وفتاویٰ عربی

۲۲	تنویرالابصارمع الدروالرد	امام محمد بن عبداللہ تمرتاشی	دارالکتب العلمیة
۲۳	ردالمحتار (شامی)	علامہ محمدامین ابن عابدین شامی	سعید کراچی/نعمانیہ/ بیروت
۲۴	الدرالمختار	علامہ شیخ علاءالدین حصکفی	دارالکتب العلمیة
۲۵	البحرالرائق	علامہ زین الدین (ابن نجیم حنفی)	دارالکتب العلمیة
۲۶	بدائع الصنائع	ملک العلماء شیخ علاءالدین کاسانی	دارالکتاب العربی بیروت
۲۷	الفتاوی الہندیة	شیخ نظام وجماعت علماء ہند	زکریا/ رشیدیہ/ دارالفکر
۲۸	المحیط البرہانی فی فقہ النعمانی	علامہ محمود بن احمد بن مازہ بخاری	احیاء التراث العربی
۲۹	الفقہ الاسلامی وأدلتہ	دکتوروہبہ زحیلی	دارالفکر سوریہ بدمشق
۳۰	الموسوعة الفقہیة	وزارة الاوقاف والشؤون الاسلامیة	وزارة الاوقاف کویت
۳۱	فتح القدیر	محقق ابن ہمام حنفی	مصطفیٰ البابی الحلبی
۳۲	مراقی الفلاح مع حاشیة الطحاوی	حسن بن عمار بن علی شرنبلالی	مکتبہ شیخ الہند/ بیروت
۳۳	حلبی کبیر (غنیة المتملی)	علامہ شیخ ابراہیم حلبی	سہیل اکیڈمی لاہور
۳۴	حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر	بحوالة الموسوعة الفقہیة الکویتیة	دارالفکر بیروت
۳۵	شرح منتہی الإرادات	منصور بن یونس بن ادریس البھوتی	دارالفکر
۳۶	فقہ النوازل	محمد بن حسین الجیزانی	دارابن الجوزی
۳۷	الفتاوی الکبری الفقہیة	....	المکتبة الإسلامیة ترکی
۳۸	البحوث العلمیة	ھیئة کبارالعلماء بالمملکة السعودیة	رئاسة إدارة البحوث العلمیة
۳۹	مجلة البحوث الإسلامیة	الرئاسة العامة لإدارات البحوث العلمیة والإفتاء	الرئاسة العامة
۴۰	أبحاث ھیئة کبارالعلماء	ھیئة کبارالعلماء بالمملکة العربیة السعودیة	ھیئة کبارالعلماء
۴۱	فتاوی الأزہر	موقع وزارة الأوقاف المصریة	موقع وزارة الأوقاف المصریة
۴۲	فتاوی دارالإفتاءالمصریة	دارالافتاءالمصریة	دارالافتاءالمصریة
۴۳	أرشیف المجلس العلمی	المجلس العلمی	من موقع الألوکة
۴۴	آکام النفائس فی ضمن رسائل اللکنوی	علامہ عبدالحی اللکنوی	إدارة القرآن کراچی

کتب فقہ وفتاویٰ وغیرہ اردو

۴۵	امدادالفتاویٰ	علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	دارالعلوم کراچی
۴۶	امدادالاحکام	شیخ ظفر احمد عثانی/عبدالکریم گمتھلوی	مکتبہ زکریا دیوبند
۴۷	فتاویٰ محمودیہ	علامہ مفتی محمود حسن گنگوہی	فاروقیہ کراچی
۴۸	خیرالفتاویٰ	علامہ مفتی خیر محمد جالندھری	مکتبہ امدادیہ ملتان
۴۹	کفایت المفتی	علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی	دارالاشاعت پاکستان
۵۰	فتاویٰ عثمانی	علامہ مفتی محمد تقی عثمانی	معارف القرآن کراچی
۵۱	کتاب الفتاویٰ	علامہ شیخ خالد سیف اللہ رحمانی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۵۲	فتاویٰ مولانا عبدالحی اردو	علامہ شیخ عبدالحی لکھنوی	مکتبہ تھانوی دیوبند
۵۳	فتاویٰ رحیمیہ	علامہ مفتی عبدالرحیم لاجپوری	دارالاشاعت کراچی
۵۴	فتاویٰ بنوریہ	جامعہ بنوریہ ٹاؤن کراچی	جامعہ بنوریہ ٹاؤن کراچی
۵۵	جواہرالفقہ	علامہ مفتی شفیع احمد عثانی	تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند
۵۶	فقہی مقالات	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	زمزم بکڈپو دیوبند
۵۷	آپ کے مسائل اوران کاحل	علامہ یوسف لدھیانوی شہید	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۵۸	درسی وتعلیمی اہم مسائل کاانسائیکلوپیڈیا	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا
۵۹	المسائل المہمۃ فیما ابتلت بہ العامۃ	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا

کتب اصول فقہ وقواعد فقہ

۶۰	الاصول والقواعد للفقہ الاسلامی	شیخ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	الہدیٰ پبلیکیشنز نئی دہلی/ یاسین بکڈپو دہلی
۶۱	جمہرۃ القواعد الفقہیۃ	دکتور علی احمد الندوی	شرکۃ الراجحی المصرفیۃ
۶۲	قواعدالفقہ	شیخ مفتی عمیم احسان مجددی برکتی	اشرفی بکڈپو دیوبند
۶۳	شرح السیر الکبیر	امام محمد بن الحسن الشیبانی	دارالکتب العلمیۃ بیروت
۶۴	أصول الفقہ الإسلامی	دکتور وھبہ الزحیلی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۶۵	نورالأنوار	ملاجیون	مکتبہ حقانیہ پشاور، پاکستان
۶۶	أصول البزدوی مع کشف الأسرار	ابوالحسن علی بن محمد فخرالاسلام البزدوی	دارالکتاب الاسلامی بیروت

کتب متفرقہ

۶۷	الاتقان فی علوم القرآن	جلال الدین سیوطی	قدیمی کتب خانہ کراچی/ دار الحدیث

۶۸	مناہل العرفان فی علوم القرآن	محمد عبدالعظیم الزرقانی	داراحیاء الکتب العربیۃ قاھرۃ
۶۹	المقدمات الأساسیۃ فی علوم القرآن	عبداللہ یوسف الجدیع	مؤسسۃ الریان بیروت
۷۰	خلاصۃ النصوص الجلیۃ	بحوالہ جواہر الفقہ	بحوالہ جواہر الفقہ
۷۱	الفرائد الحسان فی بیان رسم القرآن	بحوالہ فتاویٰ عثمانی	بحوالہ فتاویٰ عثمانی
۷۲	دلیل الحیران	بحوالہ فتاویٰ عثمانی	بحوالہ فتاویٰ عثمانی
۷۳	المقنع فی معرفۃ مرسوم مصاحف الأمصار	أبوعمرو الدانی	بحوالہ فتاویٰ عثمانی
۷۴	نثر المرجان فی رسم نظم القرآن	بحوالہ فتاویٰ عثمانی	بحوالہ فتاویٰ عثمانی
۷۵	لطائف البیان فی رسم القرآن	بحوالہ فتاویٰ عثمانی	بحوالہ فتاویٰ عثمانی
۷۶	الجامع لما یحتاج إلیہ من رسم المصحف	بحوالہ فتاویٰ عثمانی	بحوالہ فتاویٰ عثمانی
۷۷	البرہان فی علوم القرآن	بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی	دارالمعرفۃ بیروت
۷۸	مقدمۃ شرح الدرۃ	بحوالہ فضائل حفاظ القرآن	بحوالہ فضائل حفاظ القرآن
۷۹	تاریخ القرآن الکریم	شیخ محمد طاہر الکردی	المکتبۃ الشاملۃ
۸۰	کیف نفھم القرآن الکریم؟	عبدالسلام بن ابراہیم بن محمد الحصین	المکتبۃ الشاملۃ
۸۱	جمع القرآن الکریم حفظاً وکتابۃً	دکتور علی بن سلیمان العبید	المکتبۃ الشاملۃ
۸۲	فضائل حفاظ القرآن	ابوعبدالقادر محمد طاہر رحیمی مدنی	ادارۂ اسلامیات کراچی
۸۳	قرآنی املاء اور رسم الخط	المقری ابوالحسن اعظمی	مکتبہ صوت القرآن دیوبند
۸۴	المصحف المطبوع بطریقۃ برایل للمکفوفین	الدکتور حسام الدین عفانہ/ جامعۃ القدس فلسطین	المصدر: جمعیۃ أصدقاء الکفیف فلسطین
۸۵	ماھو حکم ترجمۃ معانی القرآن إلی طریقۃ برایل؟ الخ	موقع الإسلام سؤال وجواب	www.islamQA.com
۸۶	اللجنۃ الدائمۃ للإفتاء فی السعودیۃ	اللجنۃ الدائمۃ	اللجنۃ الدائمۃ
۸۷	موقع الإسلام سؤال وجواب	www.islamQA.com	www.islamQA.com
۸۸	کتابۃ القرآن الکریم بنظام برایل للمکفوفین	دکتور عبداللہ الخمیس	المسلم نت almoslim.net
۸۹	مقالہ مدرسۃ النور فاردی بلائنڈ ترکی کانفرنس	مدرسۃ النور فاردی بلائنڈ	ترکی/ ارسال کردہ از اکیڈمی
۹۰	ارشاداتِ گنگوہی	بحوالہ ماہنامہ راہِ عافیت	بحوالہ ماہنامہ راہِ عافیت

مقالہ

(۲۵؍رواں فقہی سمینار [بدر پور کریم گنج، آسام] ۲۵-۲۷؍ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ/ مطابق: ۵-۷؍فروری ۲۰۱۶ء)

اہلِ کتاب اور اُن سے متعلق احکام

سوال : ۱- اہلِ کتاب کی تعریف کیا ہے؟

جواب : ۱- جمہور فقہاء (امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کے نزدیک اہلِ کتاب سے مراد؛ یہود ونصاریٰ ہیں، اپنے تمام فرقوں کے ساتھ۔ اور عندالاحناف- اہلِ کتاب سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی نبی پر ایمان رکھے، اور کسی کتابِ الٰہی کو مانے۔ (اس تعریف میں یہودی ونصاریٰ اور حضرت داؤد پر نازل ہونے والی کتاب ''زبور''، اور حضرت ابراہیم وحضرت شیث علیہما السلام کے صحیفوں پر ایمان لانے والے لوگ داخل ہیں، اس لیے کہ یہ لوگ آسمانی دین کو جس کے ساتھ کتاب نازل ہوئی مانتے ہیں)۔ [۱]

سوال : ۲- قرآن مجید میں اہلِ کتاب کی حیثیت سے یہود ونصاریٰ اور صائبین کا ذکر آیا ہے، اُن میں سے یہود ونصاریٰ تو معروف ہیں:

[الف]: لیکن صائبین سے کون لوگ مراد ہیں؟

[ب]: اور کیا اب یہ گروہ پایا جاتا ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں!

جواب : ۲-[الف]: صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے

بارے میں چوں کہ کسی کو پورا پتہ نہ چلا، اس لیے ان کے متعلق مختلف اقوال ہیں [۲]۔

الموسوعۃ الفقہیۃ میں صائبین کی تعریف میں دس اقوال مذکور ہیں۔ [۳]

''صابئین'' کی تعریف میں مختلف اقوال ہیں، اس لیے اُن کے دین ومذہب کی حقیقت میں بھی فقہاء کرام کے مابین اختلاف ہے:

امام ابوحنیفہ وامام احمد بن حنبل رحمہما اللہ اُن کو اہلِ کتاب مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ ستاروں کی تعظیم کرتے ہیں عبادت نہیں، جیسے مسلمان کعبۃ اللہ کی تعظیم کرتے ہیں پرستش نہیں۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف وامام محمد) اور علامہ قرطبی مالکی رحمہم اللہ اُن کو اہلِ کتاب نہیں مانتے، اس لیے کہ وہ ستارہ پرست ہیں جو بت پرستوں ہی کی طرح ایک قوم ہے۔ [۴]

[ب]: آیتِ کریمہ: ﴿ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والصّٰبئون والنصٰرٰی من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر﴾ . [المائدۃ: ٦٩] کی تفسیر میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آیت میں حق تعالیٰ شانہٗ نے چار قوموں کو مخاطب کر کے ایمان اور عملِ صالح کی ترغیب اور اس پر فلاحِ آخرت کا وعدہ فرمایا، ان میں سے پہلے - الذین اٰمنوا - یعنی مسلمان ہیں، دوسرے - الذین ہادوا - یعنی یہود، تیسرے صابئون، اور چوتھے نصاریٰ، ان میں تین قومیں؛ مسلمان، یہود، نصاریٰ معروف ومشہور، اور دنیا کے اکثر خطوں میں موجود ہیں، صابئون، صابئہ کے نام سے آج کل کوئی قوم معروف نہیں، اسی لیے اس کی تعیین میں علماء وائمہ کے اقوال مختلف ہیں۔ امام تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ نے بحوالہ قتادہ ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ صابئون وہ لوگ ہیں جو فرشتوں کی عبادت

کرتے ہیں اور قبلہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں، اور آسمانی کتاب ''زبور'' کی تلاوت کرتے ہیں (جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی)۔

(معارف القرآن: ۳/۱۹۹، سورۂ مائدہ، آیت: ۶۹، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

سوال : ۳- رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو یہود ونصاریٰ تھے، وہ بھی بہت سی گمراہیوں کے باوجود ایک خدا کے قائل تھے، اگرچہ عیسائی تین کے مجموعہ کو ایک مانتے تھے، اسی طرح وہ وحی، نبوت، ملائکہ اور آخرت میں جزا وسزا کو بھی تسلیم کرتے تھے، البتہ رسول اللہ ﷺ کو نبی نہیں مانتے تھے، لیکن موجودہ دور میں یہ صورتِ حال نہیں ہے، خاص کر مغربی ملکوں میں جو لوگ اپنے آپ کو یہودی یا عیسائی کہتے ہیں اُن میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خدا کے وجود کے قائل نہیں ہے، اگر خدا کو مانتے ہیں تو وحی ورسالت اور آخرت کو نہیں مانتے، کیا ایسے لوگوں کا شمار بھی یہود ونصاریٰ میں ہوگا؟ اور نکاح وذبیحہ کے معاملے میں اُن کے ساتھ اہلِ کتاب کا معاملہ کیا جائے گا؟

جواب: ۳- ایسے لوگوں کا شمار اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) میں نہیں ہوگا، اور نکاح وذبیحہ کے معاملے میں اُن کے ساتھ اہلِ کتاب کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔(۵)

سوال : ۴- بعض ایسے باطل ادیان بھی ہیں جو شریعتِ محمدی [ﷺ] کے نازل ہونے کے بعد ایجاد کیے گئے ہیں، جیسے بہائی، بابی، سکھ اور قادیانی، ان میں سے بعض گروہ قرآن کو بھی اللہ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں، یا محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے بعد کسی اور الہامی کتاب کے اور خاتم النبیین ﷺ کے بعد کسی اور شخص کے نبی ہونے کے دعوے دار ہیں، کیا اُن کا شمار بھی اہلِ کتاب میں ہوگا؟

جواب : ۴- اُن کا شمار اہلِ کتاب میں نہیں ہوگا، اس لیے کہ نصوص میں اہلِ کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔ (۶)

سوال : ۵- قادیانی دو طرح کے ہیں؛ ایک وہ جو خود مرتد ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے آبا واَجداد مرتد ہوئے، اور وہ نسلی طور پر قادیانی ہیں۔ اگر قادیانی اہل کتاب میں سے نہیں ہیں، تو کیا قادیانیوں میں سے دوسرا گروہ یعنی نسلی قادیانیوں کو اہل کتاب میں شمار کیا جاسکتا ہے؟

جواب : ۵- مطلقًا قادیانی اہلِ کتاب میں شامل نہیں ہوں گے، خواہ مرتد ہوئے ہوں، یا نسلی قادیانی ہوں۔ (۷)

سوال : ۶- بعض فقہاء نے اہلِ کتاب سے نکاح کے مسئلے میں دارالاسلام اور دارالکفر کے درمیان فرق کیا ہے، دارالاسلام میں مباح قرار دیا ہے، اور دارالکفر میں مکروہ، لیکن:

[الف]: آج کل مسلم ممالک میں اگر کوئی مسلمان لڑکا یہودی یا عیسائی لڑکی سے نکاح کرلے، تو مغرب کے فکری تسلط کی وجہ سے بیوی کے شوہر پر اثر انداز ہونے کا پورا خطرہ رہتا ہے، خاص کر عرب ملکوں میں مسلمان حکمرانوں، فوجی کمانڈروں اور اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کرنے نے عالمِ اسلام کو غیر معمولی فوجی سیاسی اور معاشی نقصان پہنچایا ہے، اِن حالات میں دارالاسلام میں اہلِ کتاب خواتین سے نکاح کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

[ب]: مغربی ممالک میں مسلمان مختلف محرکات جیسے مزاجی ہم آہنگی، ویزہ کی سہولت وغیرہ کے تحت یہودی وعیسائی عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، بعض لوگ کہتے

ہیں کہ ہم نے یہ نکاح دعوتی نقطۂ نظر سے کیا ہے، اور یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اکثر وبیشتر مسلمان مردوں کے نکاح میں آنے والی عورتیں دامنِ اسلام میں آجاتی ہیں، اور پھر وہ ایمان کی روشنی اپنے خاندان اور سماج تک بھی پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں، تو کیا اس صورتِ حال میں بھی ان لوگوں کے قول پر اہل کتاب سے نکاح کرنے کی کراہت باقی رہے گی، جو دارالکفر میں اہل کتاب سے نکاح کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

جواب : ٦- [الف]: نکاح جائز اور درست تو ہے، لیکن احتیاط ازیں ہر ہمہ اولیٰ است۔ (٨)

[ب]: مذکورہ صورت میں عدمِ نکاح اولیٰ وافضل ہے، اگرچہ نفسِ جوازِ نکاح (مع الکراهة) کا انکار نہیں، اگر اس کتابیہ کا اسلام قبول کرنا متیقن یا مظنون ہو، تو یہ نکاح مصلحتاً افضل ہے، ذاتاً افضل نہیں ہے، لیکن واقعات ومشاہدات یہ ہیں کہ ان کا اسلام قبول کرنا موہوم ہوتا ہے، اور شوہر، شوہر کی اولاد کا خلافِ اسلام اُمور سے مالوف ومانوس ہونا متیقن ومظنون ہوتا ہے، پس یہ حیلہ اور بہانہ کہ دعوتی نقطۂ نظر سے نکاح کر رہے ہیں، یا کتابیہ دامنِ اسلام میں آجانے کی امید ہے- سودمند نہیں۔ (٩)

سوال : ٧- [الف]: قرآن مجید میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں، اور ہر زبان میں اپنی کتاب نازل فرمائی ہے، لیکن جن انبیاء اور آسمانی کتابوں کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، اُن کے علاوہ دوسری شخصیتوں اور کتابوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کیا وہ اپنے عہد کے پیغمبر تھے؟ اور کیا اُن کے ماننے والوں کے پاس جو مذہبی کتاب موجود ہے اور وہ ان کو خدائی تعلیمات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، کیا وہ آسمانی کتابیں ہیں، جن میں تورات وانجیل کی

طرح اُن کے ماننے والوں نے آمیزش کردی ہیں؟

[ب]: اسی سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہندو مذہب کی کتابوں؛ خاص کر ویدوں میں توحید کی واضح تعلیمات موجود ہیں، آخرت کا تصور بھی ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی خوش خبری بھی ہے، اور اس میں قریب قریب صراحت کے ساتھ آپ کے اسماء مبارکہ ''احمد'' اور ''محمد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، تو کیا برادرانِ وطن جن شخصیتوں کو خدا کا اوتار مانتے ہیں، کیا یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے اپنے عہد میں اللہ کے پیغمبر رہے ہوں گے؟ اور جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں مبالغہ سے کام لیا، اُن کے ماننے والوں نے ان کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہوگا؟ اور کیا ان کی کتابوں کو قرآن مجید کی بیشتر اعتقادی اور اخلاقی تعلیمات میں موافقت کی بنیاد پر الہامی کتاب تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

جواب : ۷- [الف]: ایک مسلمان کے لیے جس طرح ثابت النبوۃ نبی کی نبوت کا انکار جائز نہیں ہے، اسی طرح نبی غیر ثابت النبوۃ پر ایمان لانا اور اس کا اقرار کرنا بھی جائز نہیں ہے، بعض انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے اسماء مبارکہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں موجود ہیں، لیکن کرشن، رام چندر، گرونانک یا اُن کے علاوہ کسی بھی معین شخص کی نبوت پر ایمان واقرار شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ اِجمالاً جس قدر انبیاء مبعوث ہوئے اُن تمام پر ہم اہلِ سنت والجماعت کا ایمان ہے۔[۹]

[ب]: ان کتابوں کو الہامی کتاب تسلیم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ جن کتابوں کا سماوی وملہم من اللہ ہونا کتاب وسنت سے ثابت ہے، یعنی توراۃ، انجیل اور زبور، جب اُن کی صحت بھی مخدوش ہے، بوجہ اس کے کہ ان کتابوں کے ماننے والوں نے ان میں

تحریف وتغییر کردی ہیں، تو پھر دیگر غیر ثابت کتابوں کا کیا حال ہوگا! اس لیے جن انبیاء وکتب کے احوال کو رب سبحانہٗ نے پردۂ خفاء میں رکھا اُن پر اِجمالی ایمان کافی ہے، نہ تو ان کی بحث وتفتیش کرنی ہے، اور نہ اس کا علم انقطاعِ وحی (سلسلۂ وحی بند ہونے) کے بعد ہوسکتا ہے۔ (۱۰)

سوال: ۸- اہلِ کتاب سے سماجی تعلقات کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں:

[الف]: عیسائی مشنریز تعلیم پر خصوصی توجہ دیتی رہی ہیں، اور پورے ملک میں ان کے اسکولوں کا جال بچھا ہوا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اسکولوں سے پڑھ کر نکلنے والے طلبہ وطالبات کی ایک اچھی خاصی تعداد الحاد ودہریت کا شکار ہوجاتی ہے، اور ان کے ذہن میں شکوک وشبہات کے کانٹے جڑ پکڑ لیتے ہیں، ان حالات میں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایسے اداروں میں داخلہ لینے کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کو اپنے علاقوں میں ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، تاکہ ان کے بچے عصری تعلیم سے آراستہ ہوسکیں، اور ان کے روزگار کے مواقع حاصل ہوسکیں، یا اس سے اجتناب کرنا چاہیے، اور متبادل معیاری تعلیمی درس گاہوں کے قیام پر توجہ دینی چاہیے؟

جواب: ۸- [الف]: عیسائی مشنریز کی ایسی اسکولوں میں مسلمانوں کا اپنے بچوں کو بغرض تعلیم بھیجنا، داخلہ لینا، بالکل جائز نہیں ہے، کیوں کہ ایسے اسکولوں میں مسلمانوں کا اپنے بچوں کو بغرضِ تعلیم بھیجنا درحقیقت اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت کو تقویت وترجیح دینا لازم آتا ہے (۱۱)، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے علاقوں میں ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی سے بالکلیہ اجتناب برتیں، تاکہ آیت: ﴿ولا ترکنوآ

إلى الذين ظلموا فتمسّكم النار﴾ (۱۲)– اورآیت:﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ (۱۳)– کی خلاف ورزی کا بار مسلمان بچوں کے والدین یا سرپرست پر عائد نہ ہو۔ اور اہلِ خیر حضرات وہمدردانِ قوم وملت (علماء وعوام) کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے علاقوں میں متبادل معیاری تعلیمی درس گاہوں کے قیام پر مکمل توجہ دیں! (۱۴)

سوال : [ب]: اگر اہلِ کتاب خاتون سے نکاح کیا جائے، تو اس کے کیا حقوق ہوں گے؟ کیا اس کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمان بیویوں کے ہیں؟ کیا نکاح کرنے کے بعد اُن کے حقوق سے راہِ فرار اختیار کرنے اور اُن کو چھوڑ کر بھاگ آنے کی، یا محض غیر مسلم ہونے کی بنا پر طلاق دینے کی اجازت ہوگی؟ جو اہلِ کتاب خواتین مسلمان مردوں کے نکاح میں ہوں، وہ اپنے شوہر کے گھر میں مذہبی مراسم انجام دے سکتی ہیں یا نہیں؟

جواب : [ب]: اگر اہلِ کتاب خاتون سے نکاح کیا جائے، تو اس کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمان بیوی کے ہوتے ہیں (۱۵)۔ اور نکاح کرنے کے بعد اُن کے حقوق سے راہِ فرار اختیار کرنے اور اُن کو چھوڑ کر بھاگ آنے کی، یا محض غیر مسلم ہونے کی بنا پر، بلا ضرورتِ شدیدہ طلاق دینے کی اجازت نہیں ہوگی (۱۶)۔ نیز جو اہلِ کتاب خاتون مسلمان مرد کے نکاح میں ہو، وہ اپنے شوہر کے گھر میں، اپنی مذہبی عبادتیں انجام دے سکتی ہے، البتہ شوہر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں اس کو اعلانِ منکر، نصبِ تماثیل، ضربِ ناقوس اور اظہارِ شعائر سے منع کرے (۱۷)، اور اُس پر یہ بھی لازم ہوگا کہ اپنی اولاد کو بیوی کی عبادت میں شرکت اور اس کے عقائد سے متأثر ہونے سے بچائے۔ (۱۸)

سوال : [ج]: عیسائی مشنریز کثرت سے ہاسپٹل اورقرض مہیا کرنے والے ادارے بھی قائم کرتی ہیں، یہ ادارے خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کم سے کم اور دوسروں کو ان کے مذہب سے دور کردینے میں اہم کردار ادا کررہے ہیں، ایسے اداروں میں خدمت کرنے اور اُن کی خدمات سے استفادہ کرنے میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟

جواب : [ج]: مسلمانوں کو ایسے اداروں میں خدمت کرنے اور اُن کی خدمات سے استفادہ کرنے سے حتی الامکان اجتناب کرنا لازم وضروری ہے۔ (۱۹)

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿لم يكن الذين كفروا من أهل الكتٰب والمشركين﴾ .

(سورة البينة : ۱)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : قوله تعالى : ﴿من أهل الكتٰب﴾ – يعني اليهود والنصارى ... . قال ابن عباس : (أهل الكتاب) : اليهود الذين كانوا بيثرب وهم قريظة والنظير وبنو قينقاع . (۲۰/۱۴۰، ط : دار الكتاب العربي بيروت ، المهذب للشيرازي : ۲/۲۵۰، باب الجزية ، ط: عيسى الحلبي)

ما في " المغني والشرح الكبير " : فصل : وأهل الكتاب الذين هذا حكمهم ، هم أهل التوراة والإنجيل ، قال اللّٰه تعالى : ﴿أن تقولوا انما أُنزل الكتاب على طآئفتين من قبلنا﴾ – فأهل التوراة اليهود والسّامرة ، وأهل الإنجيل النصارى ، ومن وافقهم في أصل دينهم من الإفرنج والأرمن وغيرهم. (۷/۵۰۱، ط: دار الكتاب العربي بيروت)

ما في " الموسوعة الفقهية " : ذهب جمهور الفقهاء إلى أن (أهل الكتاب) هم : اليهود والنصارى بفرقهم المختلفة . وتوسّع الحنفية فقالوا: إن أهل الكتاب هم : كل مَن يؤمن بنبيّ ويُقرّ بكتاب ، ويشمَل اليهود والنصارى ، ومن آمن بزبورِ داود وصُحف إبراهيم وشيث ، وذلک لأنهم يعتقدون دينًا سماويًا مُنزّلا بكتاب . (۷/۱۴۰، أهل الكتاب ، التعريف ، و:۷/۱۲۱، أهل الذمة ، أهل الكتاب، موسوعه فقهيه اردو :۷/۲۰۲، اهل كتاب)

ما في " حاشية ابن عابدين " : والكتابي : من يعتقد دينًا سماويًا أي منزّلا بكتاب كاليهود=

....

= والنصارى . (۲٦۸/۳، ط: احياء التراث العربي)

ما في " فتح القدير لإبن الهمام " : والكتابي : من يؤمن بنبيّ ويقرّ بكتاب ، والسّامرية من اليهود ، أما من آمن بزبور داود وصحف إبراهيم وشيث فهم أهل كتاب .

(۲۲۸/۳ ، ط: دار الفكر بيروت ، و: ۳۷۳/۳ ، ط: بولاق مصر)

ما في " تفسيرات احمديه " : "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿والمحصنٰت من المؤمنٰت والمحصنٰت من الذين اوتوا الكتٰب من قبلكم﴾ — یعنی اہلِ کتاب کی آزاداور پاک دامن عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لیے حلال ہے،اوراہلِ کتاب یہودی ونصاریٰ ہیں ۔" (ص/۳۷۷،حصہ اول،کتابیہ عورتوں سے نکاح کاحکم،سورۂ مائدہ:آیت:۵)

ما في " دعوة التقريب بين الأديان " : قال ابن جرير رحمه الله : (يعني تعالى ذكره بقوله : ﴿يا اهل الكتٰب﴾ : يا أهل التوارة والإنجيل) . وقال أيضًا : (عني بقوله : يا أهل الكتٰب﴾ ؛ أهل الكتابين ؛ لأنهما جميعا من أهل الكتاب .... فأهل الكتاب إذًا هم اليهود والنصارى ، وهذا أمر واضح متقرر لدى جميع المفسرين ويزيد الأمر وضوحًا إضافة " الكتاب " إلى هاتين الطائفتين خاصة . اهـ.

(۱/ ۴۳ ، ۴۴ ، التمهيد ، المبحث الثاني ؛ أهل الكتاب ، تأليف : الدكتور أحمد بن عبد الرحمن بن عثمان القاضي ، ط: دار ابن الجوزي – السعودية)

(امدادالفتاوی:۴۵۰/۵،رسالہ إرسال الجنود إلى ارسال الهنود،الأحكام المستفادة من الروايات،نمبر:۱)

(۲) (معارف القرآن شفیعی:۲۳۹/۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ/۶۲،بیان القرآن:۴۳/۱،ط:ادارہ تالیفات اشرفیہ پاکستان)

(۳) ما في " الموسوعة الفقهية " : وقد اختلف العلماء في تعريف الصائبة على أقوال هي : أ – أنهم قوم كانوا على دين نوح عليه السلام ، نقله الراغب في مفرداته .ونقل ابن منظور عن الليث : هم قوم يشبه دينهم دين النصارى ، إلا أن قبلتهم نحو مهب الجنوب ، يزعمون أنهم على دين نوح وهم كاذبون . ونقل قريبا منه القرطبي عن الخليل . ب – أنهم صنف من النصارى ألين منهم قولا . وهو مروي عن ابن عباس وبه قال أحمد في رواية . ج – وقال السّدي وإسحاق بن راهويه : هم طائفة من أهل الكتاب لأنهم يقرأون الزبور ، وبه قال أبو حنيفة . د – قال مجاهد والحسن وابن أبي نجيح : هم قوم تركّب دينهم بين اليهودية والمجوسية . هـ – وقيل : هم بين اليهود والنصارى . و– وقال سعيد بن جبير هم قوم بين النصارى والمجوس . ز – وقال الحسن أيضًا وقتادة : هم قوم يعبدون الملائكة ، ويصلّون إلى القبلة ويقرأون الزبور ، ويصلون الخمس . رآهم زياد بن أبي سفيان فأراد وضع الجزية عنهم حين عرف أنهم يعبدون الملائكة ، ونقل القرطبي : أنهم موحدون يعتقدون تأثير النجوم . ح – وقيل : إنهم قوم كانوا يقولون : لا إله إلا الله ، وليس لهم عمل ولا كتاب ولا نبي . ط – =

....

=وقال الصاحبان من الحنفية : إنهم ليسوا من أهل الكتاب ، لأنهم يعبدون الكواكب ، وعابد الكوكب كعابد الوثن . ی – وقال أحمد في رواية ثانية : إنهم قوم من اليهود ؛ لأنهم يسبتون .
(۲۶/۲۹۳ ، ۲۹۴، صابئة)

(۴) ما في " الموسوعة الفقهية " : اختلف الفقهاء في حقيقة دين الصابئة أ هم من أهل الكتاب أم لا؟ على أقوال : القوال الأول : أنهم من أهل الكتاب ، وهذا قول أبي حنيفة وأحمد ، وقد جعلهم أبو حنيفة من أهل الكتاب ؛ لأنهم يقرأون الزبور ولا يعبدون الكواكب ولكن يعظمونها كتعظيم المسلمين للكعبة في الاستقبال إليها ، وأما أحمد فقال في رواية : هم من النصارى ؛ لأنهم يدينون بالإنجيل . اهـ . ... القول الثاني : أنهم ليسوا من أهل الكتاب ..... قال : ولهذا أفتى أبو سعيد الاصطخري – القاهر بالله – بكفرهم حين سأله عنهم ، وهو قول أبي يوسف ومحمد بن الحسن فيهم ؛ لأنهم يعبدون الكواكب ، وعابد الكواكب كعابد الوثن . (۲۶/۲۹۴، صابئة ، مذاهب الفقهاء في حقيقة الصابئة ، توضيح القرآن : ۱/۶۷، سورة البقرة ، الآية/۶۲)

(۵) ما في " تفسير عثماني " : شیخ الاسلام علامہ شبیراحمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''ہمارے زمانے کے نصاریٰ عموماً برائے نام نصاریٰ ہیں، ان میں بکثرت وہ ہیں جو نہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہیں، نہ مذہب کے نہ خدا کے، اُن پر اہلِ کتاب کا اِطلاق نہیں ہوسکتا، لہٰذا ان کے ذبیحہ اور نساء کا حکم اہلِ کتاب کا سا نہ ہوگا،......موجودہ زمانے میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا، بےضرورت اختلاط کرنا، اُن کی عورتوں کے جال میں پھنسنا یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں، وہ مخفی نہیں، لہٰذا بدی اور بددینی کے اسباب وذرائع سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔''(ص/۱۴۲، سورۂ مائدہ، آیت:۵، حاشیہ نمبر:۱۲)

ما في " المصنف لإبن أبي شيبة " : عن شقيق قال : تزوج حذيفة رضي الله تعالى عنه يهودية فكتب إليه عمر رضي الله تعالى عنه : أن خلّ سبيلها فكتب إليه : إن كانت حرامًا فخلّيتُ سبيلها ، فكتب إليه : إني لا أزعم أنها حرام ، ولكني أخاف أن تعاطوا المومسات منهنّ " .
(۹/۸۵/ ۱۶۴۱۷ ، باب من كان يكره النكاح في أهل الكتاب ، المجلس العلمي أفريقيا)

ما في " المعجم الكبير للطبراني " : وأخرج الطبراني برواية ابن عباس رضي الله تعالى عنه قال : وقد نكح طلحة بن عبد الله رضي الله تعالى عنه يهودية ونكح حذيفة بن اليمان رضي الله تعالى عنه نصرانية ، فغضب عمر رضي الله تعالى عنه غضبا شديدا حتى همّ أن يسطو عليها ، فقالوا : نحن نطلق ولا تغضب ، فقال عمر رضي الله عنه : لئن حل طلاقهنّ لقد حل نكاحهن ، ولكن لننزعهنّ صغرة قمأة" . (۱۲/۱۳/ ۱۳۰۱۳، مكتبة العلوم والحكم)

ما في " المصنف لإبن أبي شيبة " : عن عبد الملک قال : سألت عطاء عن نكاح=

....

= اليهوديات والنصرانيات ؟ فكرهه ، وقال : كان ذلک والمسلمات قليل .

وعن نافع عن ابن عمر رضي الله تعالى عنه : " أنه كان يكره نكاح نساء أهل الكتاب ولا يرى بطعامهنّ بأساً " .

وعن ميمون بن مهران عن ابن عمر رضي الله تعالى عنه : " أنه كره أهل الكتاب وقرأ : ﴿ولا تنكحوا المشركٰت حتى يؤمنّ﴾ .

(۸۵/۹، باب من كان يكره النكاح في أهل الكتاب ، المجلس العلمي أفريقيا)

ما في " الفتاوى الهندية " : ويجوز للمسلم نكاح الكتابية الحربية والذمية حرة كانت أو أمة . كذا في محيط السرخسي . والأولى أن يفعل .... وكل من يعتقد دينا سماويا وله كتاب منزل كصحف إبراهيم عليه السلام وشيث عليه السلام وزبور داود عليه السلام فهو من أهل الكتاب فتجوز مناكحتهم . (۲۸۱/۱ ، القسم السابع المحرمات بالشرک)

ما في " الشامية " : ففي الفتح : ويجوز تزويج الكتابيات ، والأولى أن لا يفعل ، ولا يأكل ذبيحها إلا لضرورة ، وتكره الكتابية الحربية إجماعا لافتتاح باب الفتنة . (۱۳۴/۴ ، كتاب النكاح ، فصل في المحرمات ، مطلب مهم في وطء السراري الخ ، البحر الرائق :۱۰۳/۳ ، فصل في المحرمات ، ط : رشيديه كوئٹه ، فتح القدير :۲۲۸/۳ ، فصل في بيان المحرمات ، دار الفكر بيروت)

ما في " دعوة التقريب بين الأديان " : وجماع القول : أن القوم ما داموا ينتسبون إلى أديانهم ويظهرون تعظيم أنبيائهم وبيعهم وكنائسهم ويحتفلون بأعيادهم الدينية وغير ذلک من شعائرهم الظاهرة وتقاليدهم الدينية الخاصة ، فهم أهل الكتاب ، الذي عنى الله بكتابه ورسوله ﷺ في سنته ، فتتعلق بهم أحكام أهل الكتاب العلمية والعملية ، ولا يزول هذا الوصف عن جملتهم وآحادهم إلا إذا فارقوا ذلک بإيمان بالله ورسوله ﷺ فيكونون من جملة المسلمين ، أو تحولٍ إلى ملة من الملل الإلحادية أو الوثنية سوى اليهودية والنصرانية فحينئذ تجري عليهم أحكام سائر المشركين والملحدين وتزول عنهم خاصية أهل الكتاب . (ص/۵۳، البحث الثاني ؛ أهل الكتاب)

ما في " إمداد الفتاوى " : حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:"اس زمانے میں جونصاریٰ کہلاتے ہیں وہ اکثر قومی حیثیت سے نصاریٰ ہیں، مذہبی حیثیت سے محض دہری وسائنس پرست ہیں، ایسوں کے لیے یہ حکم جوازِ نکاح کا نہیں ہے۔" (۲۱۳/۲، کتاب النکاح، بیان القرآن:۹/۳)

ما في " فتاویٰ دار العلوم ديوبند " : "آج کل لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں، ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو دہری ہیں کسی مذہب ہی کو نہیں مانتے، بلکہ خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں، یہ لوگ اگر چہ باعتبار مردم شماری نصاریٰ=

....

= کہلاتے ہیں، مگر حکمِ شرع میں ایسے لوگ اہلِ کتاب نہیں ہوسکتے۔'' (بحوالہ فتاویٰ فریدیہ:۴/۴۷۰، حاشیہ، معارف القرآن کاندھلوی:۲/۴۴۶، سورۂ مائدہ، آیت:۵، پارہ:۶، ط: فرید بکڈپو دہلی، فتاویٰ فریدیہ:۴/۴۷۲، عیسائی عورت سے نکاح الخ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۱۷/۳۹۳، سوال نمبر:۱۸۵۶، موجودہ دور کے عیسائی اہلِ کتاب ہیں یا نہیں؟)

ما في " فتاویٰ دار العلوم زکریا " : ''موجودہ زمانے کے اہلِ کتاب کے ساتھ نکاح مکروہ ہے، اگرچہ نفسِ جواز کا انکار نہیں، لیکن ان کے اندر زنا، فحاشی اور ناجائز تعلقات کی اتنی کثرت ہے کہ جس کو سن کر انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے، اور جس نے گویا حیوانوں کو بھی پسِ پُشت ڈال دیا ہے، اس لیے عدمِ نکاح اولیٰ اور افضل ہے، نیز کتابیات سے وہ مراد ہیں جو دینِ سماوی کا انکار نہیں کرتے، ہاں! جو انکار کرتے ہیں اُن کے ساتھ نکاح بالکل حرام ہے۔''

(۳/۶۰۵، کتابیات سے نکاح کا حکم، امداد الفتاویٰ:۲/۲۱۲، فتاویٰ دار العلوم زکریا:۳/۶۰۵، ۶۰۶، کتاب النکاح، فتاویٰ محمودیہ:۱۱/۴۵۰-۴۵۴، کراچی، جدید فقہی مسائل:۱/۲۸۳)

ما في " فتاوی محمودیه " : ''عالمگیری میں ہے: **" وکل من یعتقد دینا سماویا وله کتاب منزل کصحف إبراهیم علیه السلام وشیث علیه السلام وزبور داود علیه السلام فهو من أهل الکتاب فتجوز مناکحتهم "** . نیز درمختار (مع شامیہ): میں ہے: **"وصح نکاح کتابیة"**.

نیز قرآن مجید سے بھی ثابت ہے: ﴿**والمحصنٰت من المؤمنٰت والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب**﴾ **الخ.**

مذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوا کہ مسلمان مرد کتابیہ (عیسائی ہو یا یہودی) سے نکاح کرسکتا ہے۔ *الحیلۃ الناجزۃ* : ص/۱۶۵ر میں لکھا ہے کہ- اگر عورت کتابیہ یعنی یہودیہ نصرانیہ وغیرہ ہو، تو اس سے مسلمان مرد کا نکاح دو شرطوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، اول یہ کہ وہ تمام اقوام یورپ کی طرح صرف نام کی عیسائی اور درحقیقت لا مذہب (دہریہ) نہ ہو، بلکہ اپنے مذہبی اصول کو کم از کم مانتی ہو، اگرچہ عمل میں خلاف بھی کرتی ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اصل سے یہودیہ ونصرانیہ ہو، اسلام سے مرتد ہوکر یہودیت یا نصرانیت اختیار نہ کی ہو۔ جب یہ دونوں شرطیں کسی کتابیہ عورت میں پائی جائیں، تو اس سے نکاح صحیح ومنعقد ہوجاتا ہے، لیکن بلاضرورتِ شدیدہ اس سے بھی نکاح مکروہ ہے، اور بہت سے مفاسد پر مشتمل ہے، اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مسلمانوں کو کتابیہ عورتوں سے نکاح کرنے کو منع فرمادیا تھا، اور جب عہدِ فاروقی میں کہ زمانہ خیر تھا ایسے مفاسد موجود تھے، تو آج کل جس قدر مفاسد ہوں کم ہے۔ بالخصوص موجودہ اقوام یورپ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقاتِ ازدِواج تو بالکل ہی اُن کے دین ودنیا کو تباہ وبرباد کردینے والے ہیں، جن کا روزمرہ مشاہدہ ہوتا ہے، اور پھر یہ کہ اولاد عموماً کم سنی میں ماں سے زیادہ مانوس ہوتی ہے، اور اس کے اثرات سے متأثر ہونے کا مظنہ غالب ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت حذیفہ وطلحہ وکعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کتابیہ سے نکاح کیا، تو آپ خفا ہوگئے، خفگی کی وجہ ابن ہمام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:'' **وإنما کان غضبه لخلطة الکافرة بالمؤمن وخوف الفتنة علی الولد ؛ لأنه في صغره ألزم الأمة "** . [فتح القدیر:۳/۲۳۹ ، کتاب النکاح ، =

....

=فصل في بيان المحرمات ، بيروت]...... نیز تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کے نکاح میں آ کر اکثر غدر اور نقصان کیا ہے، لہٰذا سلامتی اسی میں ہے کہ اُن سے مناکحت کا سلسلہ کسی مجبوری کے بغیر نہ کیا جائے، اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ مسلمان عورت کا نکاح کسی کافر مرد سے کسی حال میں جائز نہیں ہے، خواہ کفر کی کوئی قسم ہو کتابی ہو یا غیر کتابی'' - فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ (۸۲/۱۷، ۸۳، کتابیہ سے نکاح، حرمتِ نکاح بسببِ اختلافِ مذہب، مکتبہ محمودیہ میرٹھ، الحیلۃ الناجزۃ: ص/۱۷۰، خلاصۃ حکم الأزواج مع اختلاف دین الأزواج، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند)

ما في " فتاوى محموديه " : ''یہودی ونصرانی عورتوں سے نکاح کی گنجائش ہے، مگر اس میں مفاسد زیادہ ہیں، اس لیے پرہیز کرنا چاہیے۔'' (۸۴/۱۷، یہود ونصاریٰ عورتوں سے نکاح، سوال نمبر: ۶۲۲۵، میرٹھ، فتاویٰ دینیہ: ۳/ ۳۴۸، ۳۴۹، کیتھولک عیسائی لڑکی سے نکاح الخ، درسی وتعلیمی اہم مسائل کا انسائیکلوپیڈیا: ص/ ۴۷، مسئلہ نمبر: ۱۸۴)

(۶) ما في " أشرف الأحكام تتمه إمداد الفتاوى " : ''فرمایا کہ: میرے نزدیک قادیانی عورت سے نکاح باطل ہے، جب ان کا کفر مسلّم ہے، اور مرتد بحکم کتابی نہیں ہوتا، اس لیے اہلِ کتاب میں اُن کو داخل نہیں کر سکتے، اور لاہوری گو مرزا کو نبی نہ کہیں، لیکن اس کے عقائدِ کفر کو کفر نہ سمجھنا بھی کفر ہے۔'' (ص/۱۵۳، نکاح کے احکام، افادات تھانوی، جمع وترتیب: محمد اقبال قریشی، ط: ادارہ اسلامیات لاہور وکراچی، بحوالہ کمالاتِ اشرفیہ: ص/۱۲۳)

ما في " المجمع الفقه الإسلامي مكه مكرمه كے فقهي فيصلے " : ''قادیانیت (جسے احمدیت بھی کہتے ہیں) کا عقیدہ اسلام سے مکمل طور پر خارج ہے، اور اس کے ماننے والے کافر اور اسلام سے مرتد ہیں، اور ان کا اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا سراسر دھوکا ہے۔ المجمع الفقہی کا اجلاس اعلان کرتا ہے کہ مسلم حکومتوں، علماء، اہلِ قلم، مفکرین اور دعاۃ وغیرہ سبھوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر گوشہ میں اس گمراہ فرقہ کا مقابلہ کریں۔''

(ص/۳۴، ۳۵، تیسرا فیصلہ؛ قادیانیت اور اس سے وابستگی کا حکم)

ما في " المجمع الفقه الإسلامي مكه مكرمه كے فقهي فيصلے " : ''بہایت کے اسلام کی اساس کو منہدم کر دینے والے عقائد خصوصاً بہائیت کے بشری وثنیت پر مبنی دعوی الوہیت اور احکام شریعت میں تبدیلی کے اختیار سے متعلق واضح ومستند ثبوت اکیڈمی کے سامنے آئے، ان کی بنیاد پر اکیڈمی بالاتفاق طے کرتی ہے کہ بہائیت اور بابیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اسلام کے خلاف جنگ ہیں، ان کے متبعین کھلم کھلا کافر ہیں، جس میں ذرا بھی کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اکیڈمی دنیا کے تمام خطوں کے مسلمانوں کو اس کافر اور مجرم فرقہ سے چوکنا کرتی ہے، اور انہیں آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کریں، ان سے پوری طرح چوکنا رہیں، خصوصاً جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ استعماری ممالک اسلام اور مسلمانوں کی تباہی وانتشار کے لیے اس کا تعاون کرتے ہیں۔'' (ص/ ۳۷، چوتھا فیصلہ، بہائیت اور اس سے وابستگی کا حکم، ط: ایفا پبلی کیشنز)

(مزید دلائل کے لیے رجوع کریں جواب نمبر ۳ ر کے حواشی)

(۷) ما في " فتاوى ختم نبوت " : ''احمدیوں (قادیانیوں) کو مسلمان اس لیے نہیں مانتے کہ ان کے پیشوا=

....

= نے قرآن، انبیائے کرام اور دینِ اسلام کی توہین کی۔عقیدہ ختم نبوت کا انکار کیا، چوں کہ پہلے مسلمان تھے، ارتداد کے بعد مرتد ہوگئے، (اور اُن کی اولاد تمام قادیانیوں کی طرح زندیق وملحد [ہے]) لہٰذا وہ مرتد ہیں، اہل کتاب نہیں، وہ خود بھی اہل کتاب نہیں کہتے، مسلمان کہلاتے ہیں، جو ارتداد کی وجہ سے ختم ہوگیا۔اسلام سے نکلے مرتد ہونے کی وجہ سے، اہل کتاب اس لیے نہیں کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں، نہ کہلاتے ہیں۔''

(۱/۶۰، کتاب العقائد، باب چہارم، قادیانی اہل کتاب نہیں ہیں، مرتب: مفتی سعید احمد جلال پوری، ط: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، وایضاً: ۳/ ۲۳۵، لاہوری اور قادیانی مرزائی دونوں کافر ہیں، مفتی ولی حسن ٹونکی)

ما في '' فتاوی رحیمیه '' : ''قادیانیوں کی اولاد (نسلی مرزائی قادیانی) غلام احمد قادیانی کو نبی یا کم از کم مسلمان مانتے ہو، تو بھی وہ کافر ہیں، ان کا ذبیحہ حرام اور مردار ہونا چاہیے، ان کو اہل کتاب کے حکم میں قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا ہے، علامہ شامی غالی روافض کو کافر مانتے ہیں اور ان کو اہل کتاب نہیں سمجھتے، تو قادیانیوں کی اولاد کا شمار اہل کتاب میں کیسے ہوگا؟ **والظاهر أن الغلاة من الروافض المحكوم بكفرهم لا ينفكون عن اعتقادهم الباطل في حال إتيانهم بالشهادتين وغيرهما من أحكام الشرع كالصوم والصلاة فهم كفار لا مرتدون ولا أهل كتاب.** (رسائل ابن عابدین: ص/ ۳۷۰، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان) حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی دامت برکاتہم جو اس موضوع پر کافی بصیرت رکھتے ہیں ردّ قادیانیت پر کئی رسائل تصنیف فرمائے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں، ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے:

O جو شخص خود قادیانیت کی طرف مرتد ہوا، وہ مرتد بھی ہے اور زِندیق بھی۔

O اس کی صلبی اولاد بھی اپنے والدین کے تابع ہونے کی وجہ سے حکماً مرتد ہے اور زندیق بھی۔

O اس کی اولاد کی اولاد مرتد نہیں بلکہ خالص زندیق ہے۔

O مرتد اور زندیق دونوں واجب القتل ہیں، دونوں سے مناکحت باطل اور دونوں کا ذبیحہ حرام اور مردار ہے، اس لیے کسی قادیانی کا ذبیحہ کسی حال میں حلال نہیں۔(رسالہ قادیانی ذبیحہ: ص/۲۴، ۲۵، شائع کردہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، حضوری باغ روڈ پاکستان) فقط واللہ اعلم بالصواب۔'' (۱/ ۱۹۶، قادیانیوں کا کیا حکم ہے؟)

ما في '' إمداد الفتاوی '' : ''آج کل فرقۂ مرزائیہ جن میں وہ مرزائی بھی داخل ہیں، جو مرزا کے صریح دعویٰ نبوت تاویل کرتے ہیں، کیوں کہ وہ منکر ضروریات کو کافر نہیں سمجھتے، جیسے کوئی شخص مسیلمہ کے دعویٰ نبوت میں تاویل کرکے اس کو مومن سمجھنے لگے کیا اس کو مومن کہا جاوے گا۔''

(۵/ ۴۵۰، رسالہ إرسال الجنود إلی ارسال الهنود، الأحکام المستفادة من الروایات، نمبر: ۴)

ما في '' أشرف الأحكام تتمه إمداد الفتاوی '' : ''فرمایا کہ: میرے نزدیک قادیانی عورت سے نکاح باطل ہے، جب ان کا کفر مسلّم ہے، اور مرتد بحکم کتابی نہیں ہوتا، اس لیے اہل کتاب میں اُن کو داخل نہیں کرسکتے، اور لاہوری گو مرزا=

= کو نبی نہ کہیں، لیکن اس کے عقائد کفر کو کفر نہ سمجھنا بھی کفر ہے۔'' (ص/۱۵۳، نکاح کے احکام، افادات تھانوی، جمع وترتیب: محمد اقبال قریشی، ط: ادارہ اسلامیات لاہور وکراچی، بحوالہ کمالاتِ اشرفیہ: ص/۱۲۳)

(مزید دلائل کے لیے رجوع کریں جواب نمبر ا/اور ۴/کے حواشی)

(۸) ما في " القواعد الكلية والضوابط الفقهية " : درء المفاسد أولى من جلب المصالح .

(ص/۱۸۲، قواعد الفقه :ص/۸۱، قاعدة :۱۳۳، الأشباه والنظائر لإبن نجيم :ص/۷۸)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : كل ما أدى إلى ما لا يجوز لا يجوز .

(۵۱۹/۹، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس)

ما في " الفتاوى الحديثية " : القاعدة المشهورة المقررة أن درء المفاسد مقدم على جلب المصالح . (ص/۲۰۳، مطلب ؛ الاجتماع للموالد والأذكار، وأيضًا :ص/۱۱۹، مطلب يكره تعليم النساء للكتابة)

ما في " بدائع الصنائع " : الوسيلة إلى الحرام حرام . (۲۶۸/۱)

ما في " المقاصد الشرعية للخادمي " : إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما . (ص/۴۶) (فتاویٰ دار العلوم دیوبند[عزیز الفتاویٰ]: ۷/۱۹۶، کتاب النکاح، عیسائی عورت سے نکاح درست ہے یا نہیں؟، ط: دار الاشاعت کراچی، وأیضاً: ۷/۲۰۷، یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟، و: ۷/۲۱۴، کتابیہ سے نکاح درست ہے، فتاویٰ محمودیہ: ۱۱/۴۵۰ تا ۴۵۴، باب المحرمات، ط: کراچی)

(۹) ما في " الفقه على المذاهب الأربعة " : قال العلامة عبد الرحمن الجزيري : الحنفية قالوا : يحرم تزوج الكتابية إذا كانت في دار الحرب غير خاضعة لأحكام المسلمين ؛ لأن ذلک فتح لباب الفتنة فقد ترغمه على التخلق بأخلاقها التي يأباها الإسلام ويعرض ابنه للتدين بدين غير دينه ويزج بنفسه فيما لا قبل له به من ضياع سلطته التي يحفظ بها عرضها وغير ذلک من المفاسد فالعقد وإن كان يصح إلا أن الإقدام عليه مكروه تحريمًا لما يترتب عليه من المفاسد، أما إذا كانت ذمية ويمكن اخضاعها للقوانين الإسلامية فإنه يكره نكاحها تنزيها . (۷۴/۴، مبحث المحرمات لاختلاف الدين)

(فتاویٰ فریدیہ: ۴/۴۷۱، مایجوز تزوجہا ومالا یجوز)......(مزید دلائل کے لیے رجوع کریں جواب نمبر ۳/کے حواشی)

(۹-۱۰) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ورسلا قد قصصناهم عليک من قبل ورسلا لم نقصصهم عليک﴾ . (سورة النساء : ۱۶۴)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿اٰمن الرسول بمآ اُنزل إليه من ربه والمؤمنون ، كل اٰمن بالله وملٰئكته وكتبه ورسله ، لا نفرّق بين أحد من رسله ، وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا واليک المصير﴾.=

....

=(سورة البقرة : ۲۸۵)

ما في " شرح الفقه الأكبر " : يجب أن يقول : آمنت بالله وملائكته وكتبه ورسله . (ص/۲۶)

ما في " شرح العقائد النسفية " : والأولى أن لا يقتصر على عدد في التسمية ...... ولا يؤمن في ذكر العدد أن يدخل فيهم من ليس منهم أو يخرج منهم من هو فيهم ..... ويحتمل مخالفة الواقع وهو عد النبي ﷺ من غير الأنبياء أو غير النبي من الأنبياء.(ص/۱۳۹، ۱۴۰)

ما في " شرح عقيدة الطحاوية " : وأما الأنبياء والمرسلون فعلينا الإيمان بمن سمى الله تعالى في كتابه من رسله ، والإيمان بأن الله أرسل رسلا سواهم وأنبياء لا يعلم أسمائهم وعددهم إلا الله تعالى الذي أرسلهم ، فعلينا الإيمان بهم جملة لأنه لم يأت في عددهم نص . وقد قال الله تعالى : ﴿ورسلاً قد قصصناهم عليك من قبل ورسلاً لم نقصصهم عليك﴾ [النساء : ۱۶۴] وقال تعالى : ﴿ولقد أرسلنا رسلاً من قبلك منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك﴾ [الغافر : ۷۸] .

(ص/۲۸۹)

ما في " شرح المقاصد " : ذكر بعض العلماء أن الأولى أن لا يقتصر عددهم ، لأن خبر الواحد على تقدير اشتماله على جميع الاعتقادات ، وههنا حصر عددهم يخالف ظاهر قوله تعالى : ﴿منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص﴾ ...... ويحتمل أيضًا مخالفة الواقع ، وإثبات نبوة من ليس بنبي إن كان عددهم في الواقع أقل مما ذكر ، ونفي النبوة عمن هو نبي إن كان أكثر ، فالأولى عدم التنصيص على عدد . (۲/ ۳۱۷،فصل فی النبوۃ ، بحوالہ فتاوی محمودیہ:۱/ ۴۵۲،کراچی،کفایت المفتی:۱/ ۱۰۸)

ما في " المسامرة شرح المسايرة " : وأما المبعوثون فالإيمان بهم واجب ومن ثبت شرعًا تعيينه منهم وجب الإيمان بعينه ومن لم يثبت تعيينه كفى الإيمان به إجمالا . (ص/۲۲۵، الإيمان بالمبعوثين واجب ، مكتبه تجاريه مصر ، بحوالہ حاشیہ فتاوی محمودیہ میرٹھ:۳/ ۲۱۵،وایضاً:۱/ ۴۵۲،کراچی)

(امداد الفتاوی:۵/ ۴۵۰،رسالہ إرسال الجنود إلی ارسال الہنود،الأحکام المستفادۃ من الروایات،نمبر۳،وأیضًا:۶/ ۱۱۷، کتاب العقائد والکلام،کیا بدھ نبی تھا اور کیا قرآن میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل آیا ہے اس سے مراد بدھ ہے؟)

ما في " إمداد الفتاوى " : ''ہنود میں اہل کتاب ہونے کا ضعیف سے ضعیف احتمال بھی نہیں ہوسکتا، کیوں کہ کسی شخص کا نبی ومرسل ہونا اور کسی کتاب کا منزل من اللہ ہونا اور کسی دین کا سماوی ہونا جو مدار ہے کتابیت کا،......امورِ قطعیہ سے ہے، اس لیے دلیل قطعی کا محتاج ہوگا، اور ظاہر ہے کہ اس قوم کے کسی پیشوا کے نبی ہونے پر یا ان کے کسی مذہبی کتاب کے آسمانی ہونے پر دلیل قطعی تو کیا ظنی بلکہ شکی بھی تک بھی قائم نہیں، جیسا کہ بلاشک وشبہ ظاہر ہے، پس یہ ایک ہی حکم مسئلہ زیر بحث کے فیصلے کے لیے کافی ہے، بقیہ احکام پر تفریع محض تبرّع ہے۔'' =

....

=(۵/ ۴۵۱، کتاب العقائد والکلام، رسالہ در بیان صاحب کتاب نبودن ہنود، تفریع علی احکام المذکورۃ)

ما في " كفايت المفتي " : ''پس کسانے کہ شری کرشن رانبی می دانند خاطی ہستند چہ برنبوت شری کرشن دلیلے درادلۂ شرعیہ موجود نیست، وہم چنیں حال دیگر پیشوایان واوتار ہنود است۔''

(۱/ ۹۹، کتاب العقائد، انبیاء علیہم السلام۔تعلیم الاسلام: ۴/ ۱۲، مطبوعہ دہلی)

(فتاویٰ محمودیہ: ۱/ ۴۵۳، ۴۵۵، کراچی، فتاویٰ محمودیہ: ۳/ ۲۱۲، سوال نمبر: ۳۶۹، رام کچھمن وغیرہ، وایضاً: ۳/ ۲۱۳، سوال نمبر: ۳۷۰، و: ۳/ ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، رام کرشن کے متعلق کیا عقیدہ رکھے؟ مہاتمابدھ اوررام چندر جی کیا نبی تھے؟ لكل قوم هاد سے استدلال، میرٹھ، محقق ومدلل جدید مسائل: ۲/ ۵۵، مسئلہ نمبر: ۱۴، درسی وتعلیمی اہم مسائل: ص/ ۱۸، مسئلہ نمبر: ۴۸، محقق ومدلل مسائلِ ارکانِ اسلام غیر مطبوعہ: مسئلہ نمبر: ۲۶)

(۱۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿إن الدين عند الله الإسلام﴾ . [آل عمران : ۱۹] . وقوله تعالى : ﴿ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخٰسرين﴾ . (سورة آل عمران :۸۵)

ما في " روح المعاني " : ﴿ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه﴾ نزلت في جماعة ارتدوا وكانوا إثني عشر رجلا وخرجوا من المدينة وأتوا مكة كفارًا ، منهم الحارث بن سويد الأنصاري ، والإسلام قيل : التوحيد والانقياد ، وقيل : شريعة نبينا عليه الصلاة والسلام بَيَّنَ الله تعالى أن من تحرى بعد مبعثه غير شريعته فهو غير مقبول منه ، وقبول الشيء هو الرضا به وإثابة فاعله عليه .

(۳/ ۳۴۵)

ما في " مشكوة المصابيح " : عن جابر أن عمر بن الخطاب أتى رسول الله ﷺ بنسخة من التوراة فقال : يا رسول الله ! هذه نسخة من التوراة فسكت فجعل يقرأ ، ووجه رسول الله ﷺ يتغير ، فقال أبو بكر : ثكلتك الثواكل ما ترى ما بوجه رسول الله ؟ فنظر عمر إلى وجه رسول الله ﷺ فقال : أعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله ، رضينا بالله رباً وبالإسلام ديناً ، وبمحمد نبياً ، فقال رسول الله ﷺ : "والذي نفس محمد بيده لو بدا لكم موسى فاتبعتموه وتركتموني لضللتم عن سواء السبيل ، ولو كان حياً وأدرك نبوتي لا تبعني" .

(ص/ ۳۲ ، كتاب الإيمان ، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

(۱۲) ما في " القرآن الكريم " : قوله تعالىٰ : ﴿ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار﴾ .

(سورة هود :۱۱۳)

ما في " حاشية القونوي على تفسير البيضاوي " : قال ابن عباس : أي لا تميلوا ، والركون المحبة والميل بالقلب ، وقال أبو العالية : لا ترضوا بأعمالهم ، وقال عكرمة : لا تطيعوهم ؛ =

....

=قال البيضاوي : لا تميلوا إليهم أدنى ميل ، فإن الركون هو الميل اليسير كالتزيى بزيهم وتعظيم ذكرهم . (۲۲٦/۱۰ ، تفسير المظهري : ۴۳۰/۴)

ما في " البحر المحيط لأبي حيان الغرناطي " : والنهي متناول لانحطاط في هواهم والانقطاع إليهم ومصاحبتهم ومجالستهم وزيادتهم ومداهنتهم ، والرضا بأعمالهم والتشبه بهم والتزي بزيهم ، ومد العين إلى زهرتهم وذكرهم بما فيه تعظيم لهم . (۳۵۰/۵)

ما في " الجامع لأحكام القرآن للقرطبي " : قال قتادة : معناه لا تؤدوهم ولا تطيعوهم وقال ابن جريج : لا تميلوا إليهم ، وقال أبو العالية : لا ترضوا بأعمالهم . (۱۰۸/۹)

ما في " التفسير المنير " : ولا تميلو إلى الظالمين بمودة أو مداهنة ، أو رضىً بأعمالهم ، أو استعانة بهم، أو اعتماد عليهم ، فتصيبكم النار بركونكم إليهم . (۴۹۲/٦)

ما في " معارف القرآن شفيعي " : حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''مراد ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو''، ابنِ جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو''، ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ '' ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو'' [قرطبی]، سدّی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظالموں سے مداہنت نہ کرو، یعنی ان کے برے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو''، عکرمہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو''، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے''۔ (۶۷۳/۴)

(۱۳) ما في " القرآن الكريم ": ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . (سورة المائدة: ۲)

ما في "روح المعاني " : فيعم النهي ما هو من مقولة الظلم والمعاصي ويندرج فيه النهي عن التعاون على الاعتداء والانتقام .... وعن ابن عباس رضي اللّٰه تعالى عنهما وأبي العالية أنهما فسرا الإثم بترك ما أمرهم به وارتكاب ما نهاهم عنه . (۸۵/۴)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قوله تعالى : ﴿وتعاونوا على البر والتقوى﴾ يقتضي ظاهره إيجاب التعاون على كل ما كان طاعة للّٰه تعالى لأن البر هو طاعات اللّٰه ، وقوله تعالى : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ نهي عن معاونة غيرنا على معاصي اللّٰه تعالى . (۳۸۱/۲)

ما في " مختصر تفسير ابن كثير " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ قال الحافظ عماد الدين الدمشقي: نهاهم عن التناصر على الباطل والتعاون على المأثم والمحارم . (۴۷۸/۱)

ما في " جامع الترمذي " : عن صفية قالت : قال رسول اللّٰه ﷺ :" لا ينتهى الناس عن غزو هذا البيت حتى يغزو جيش ، حتى إذا كانوا بالبيداء أو ببيداء من الأرض خسف بأولهم وآخرهم =

....

=ولم ينج أوسطهم قلت : يا رسول الله ! فمن كره منهم ؟ قال : يبعثهم الله على ما في أنفسهم ".
(۴۲/۲ ، كتاب الفتن)

ما في " تحفة الأحوذي " : قال النووي : وفي هذا الحديث من الفقه التباعد من أهل الظلم، والتحذير من مجالستهم ومجالسة البغاة ونحوهم من المبطلين ، لئلا يناله ما يعاقبون به . (۴۱۷/۶)

ما في " مشكوة المصابيح " : قوله عليه السلام : " أبغض الناس إلى الله ثلاثة ؛ ملحد في الحرم ، ومبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ، ومطلب دم امرئٍ مسلم بغير حق ليهريق دمه " .
(ص/۲۷ ، صحيح البخاري : ۱۰۱۶/۲)

ما في "فتح الباري شرح صحيح البخارى لإبن حجر العسقلاني " : قوله : ومبتغ في الإسلام سنة الجاهلية. قيل المراد من يريد بقاء سيرة الجاهلية أو إشاعتها أو تنفيذها .(۲۶۲/۱۲، رقم : ۶۸۸۲)

ما في " مرقاة المفاتيح " :قوله ﷺ : (من تشبه بقوم فهو منهم) . أي من شبه نفسه بالكفار، مثلا في اللباس وغيره أو بالفساق والفجار أو بأهل التصوف والصلحاء والأبرار . (۲۲۲/۸ ، كتاب اللباس ، الفصل الثاني ، رقم : ۴۳۴۷ ، موسوعة تكملة فتح الملهم : ۱۰ / ۷۷ ، كتاب اللباس والزينة)

ما في " المقاصد الشرعية للخادمي " : إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما . (ص/۴۶)

ما في " القواعد الكلية والضوابط الفقهية " : درء المفاسد أولى من جلب المصالح .
(ص/۱۸۲، قواعد الفقه :ص/ ۸۱ ، قاعدة :۱۳۳ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم :ص/۷۸)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : كل ما أدى إلى ما لا يجوز لا يجوز .
(۵۱۹/۹، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في اللبس)

ما في " جمهرة القـواعد الفقهية " : " الإعانة على المحظور محظور " . (۶۴۴/۲)

(فتاویٰ بسم اللہ:۱/۲۷۱،۲۷۲،مسئلہ نمبر:۱۷۰،۱۷۱،کتاب العقائد، پردیس میں غیر مذہبی اسکولوں میں بچوں کی تعلیم، نیز؛ عیسائی اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعلیم،مفتی اسماعیل بن محمد بسم اللہ، ناشر: جامعۃ القرأت کفلیتہ سورت)

(۱۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ أيها الذين امنوا قوآ أنفسكم وأهليكم نارًا وقودها الناس والحجارة﴾ . (سورة التحريم : ۶)

ما في " روح المعاني " : وأخرج ابن المنذر والحاكم وصححه ، وجماعة عن علي كرم الله تعالى وجهه أنه قال في الآية : علّموا أنفسكم وأهليكم الخير وأدبوهم ، والمراد بالأهل على ما قيل : ما يشمل الزوجة والولد والعبد والأمة ، واستدل بها على أنه يجب على الرجل تعلم ما يجب=

....

= من الفرائض وتعليمه لهولاء ، وأدخل بعضهم الأولاد في الأنفس لأن الولد بعض من أبيه ، وفي الحديث : " رحم الله رجلا قال : يا أهلاه صلاتكم صيامكم زكاتكم مسكينكم يتيمكم جيرانكم لعل الله يجمعكم معه في الجنة " . وقيل : إن أشد الناس عذابًا يوم القيامة من جهل أهله . (۲۳۲/۱۵ ، الجزء الثاني ، سورة التحريم : الآية/٦ ، معارف القرآن :۵۰۳/۸ ، سورة التحريم)

ما في " صحيح البخاري " : وقال مجاهد : ﴿قوآ أنفسكم وأهليكم﴾ أوصوا أنفسكم وأهليكم بتقوى الله وأدّبوهم . (ص/۹۰۰ ، باب قوله : أن تتوبا إلى الله فقد صغت قلوبكما، ط : بيروت ، و:۷۳۰/۲ ، كتاب التفسير ، التحريم ، قديمي ، معارف القرآن : ۵۰۳/۸)

ما في " صحيح البخاري " : عن عبد الله بن عمر – رضي الله عنهما – يقول : سمعت رسول الله ﷺ يقول : " كلكم راع ، وكلكم مسؤول عن رعيته ، الإمام راع ومسؤول عن رعيته ، والرجل راع في أهله وهو مسؤول عن رعيته ، والمرأة راعية في بيت زوجها ومسؤولة عن رعيتها ، والخادم راع في مال سيده ومسؤول عن رعيته " . (ص/۱۶۹ ، رقم : ۸۹۳ ، كتاب الجمعة ، باب الجمعة في القرى والمدن ، ط : بيروت ، صحيح مسلم : ۴۶۰/۲ ، رقم :۱۸۲۹ ، كتاب الإمارة ، باب فضيلة الإمام العادل وعقوبة الجائر والحث على الرفق بالرعية الخ ، ط : بيروت)

ما في " اعلاء السنن " : تزكية الأخلاق من أهم الأمور عند القوم .... فكما أن العلم بالتعلّم من العلماء كذلک الخلق بالتخلق على يد العرفاء فالخلق الحسن صفة سيد المرسلين .

(۴۷۷/۱۸ ، كتاب الأدب)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : وفي القنية : له إكراه طفله على تعلم قرآن وأدب وعلم لفريضته على الوالدين . (۱۳۰/٦ ، كتاب الحدود ، باب التعزير ، مطلب في تعزير المتهم)

ما في " الموسوعة الفقهية " : على الآباء والأمهات وسائر الأولياء تعليم الصغار ما يلزمهم بعد البلوغ ، فيعلّم الصغير ما تصح به عقيدته من إيمان بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر ، وما تصح به عبادته ، ويعرفه ما يتعلق بصلاته وصيامه وطهارته ونحوها ، وذلک لقول النبي ﷺ : " مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين ، واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين ، وفرقوا بينهم في المضاجع " . ويعرفه تحريم الزنا واللواط والسرقة وشرب المسكر والكذب والغيبة وشَبَهِهَا ، كما يعلم أنه بالبلوغ يدخل في التكليف ، ويعرف ما يبلغ به . وقيل : هذا التعليم مستحب ، ونقل الرافعي عن الأئمة وجوبه على الآباء والأمهات ، وهذا ما صححه النووي . ودليل وجوب تعليم الصغار قول الله عز وجل : ﴿يآ أيها الذين اٰمنوا قوآ أنفسكم وأهليكم نارًا﴾ قال علي بن أبي=

....

= طـالـب رضـي الـلّٰه عنه ومجاهد وقتادة : معناه علّموهم ما ينجون به من النار وهذا ظاهر ، وثبت في الصحيحين عن ابن عمر رضي اللّٰه عنهما عن رسول اللّٰه ﷺ أنه قال : " كلكم راع ومسئول عن رعيتـه " . قـال الـقـاضي أبو بكر بن العربي : إن الصبي أمانة عند والديه ، وقلبه الطاهر جوهرةٌ نفيسةٌ سـاذجة خـالية عن كل نقش وصورة ، وهو قابل لكل نقش ، وقابل لكل ما يُمال به إليه فإن عُوّد الخير وعُـلّـمـه نشـأ عليه وسعد في الدنيا والآخرة ، يشاركه في ثوابه أبواه وكل معلم له ومؤدب ، وإن عود الشر وأهمل شقي وهلك ، وكان الوزر في رقبة القيم به والولي عليه ، ومهما كان الأب يصون ولده مـن نـار الدنيا فينبغي أن يصونه من نار الآخرة ، وهو أولى ، وصيانته بأن يؤدبه ويهديه ويعلّمه محاسن الأخلاق ، ويحفظه من قرناء السوء ، ولا يعود التنعّم ، ولا يحبب إليه الزينة وأسباب الرفاهية ، فيضيع عمره في طلبها إذا كبر ويهلك هلاك الأبد . وينبغي أن يعلّمه أيضًا من أمور الدنيا ما يحتاج إليه من : السبـاحة والـرمـي وغيـر ذلک مـمـا ينفعه في كل زمان بحسبه ، قال عمر رضي اللّٰه عنه : " علموا أولادكم السباحة والرماية ، ومروهم فليثبوا على الخيل وثبًا " . (۱۲/۱۳ ، تعليم الصغار)

مـا فـي " الـمـوافـقـات في أصول الشريعة للشاطبي " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل . (۱۱/۲ ، كتاب المقاصد ، النوع الأول ، المسئلة الأولى)

(۱۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وعاشروهنّ بالمعروف﴾ . (سورة النساء : ۱۹)

مـا في " الموسوعة الفقهية " : ويسوّي في القسم بين المسلمة والكتابية لما ذكرنا من الدلائل من غير فصل ، ولأنهما يستويان في سبب وجوب القسم وهو النكاح ، فيستويان في القسم .

(۳۵۷/۱۱ ، تسوية ، التسوية بين الزوجات في القسم)

مـا فـي " بـدائـع الـصـنـائـع " : ويستـوي فـي الـقسم البكر والثيب ، والشابة والعجوز ، والقديمة والحديثة ، والمسلمة والكتابية . اهـ .

(۳۳۲/۲ ، ط: الـمـكتبة العلمية بيروت ، جواهر الإكليل شرح مختصر خليل : ۳۲۷/۱ ، فصل ، ط: دار الفكر بيروت ، المغني لإبن قدامة : ۳۰۹/۷ ، مسألة ، ط: مكتبة القاهرة)

مـا فـي " الـمـوسـوعة الـفـقـهية " : ونـصّ الحنفية والشافعية والحنابلة على أنه يستحب للزوج أن يسوّي بين زوجاته في جميع الاستمتاعات من الوطء والقبلة . اهـ . (۱۸۵/۳۳)

مـا فـي " الموسوعة الفقهية " : العدل بين الزوجات – ولو مختلفات في الدين – واجب . قال ابن الـمنذر : أجمع كل من نحفظ عنه من أهل العلم على أن القسم بين المسلمة والذمية سواء ، وذلک لأن القسم من حقوق الزوجية فاستوت فيه المسلمة والكتابية كالنفقة والسكنى ، وهذا عند =

....

=جميع الفقهاء . (۷/۱۴۶، أهل الكتاب ، العدل بين الزوجات المسلمات والكتابيات)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : (والبكر والثيب ، والجديدة والقديمة ، والمسلمة والكتابية سواء) لإطلاق الآية . (در مختار) . وفي الشامية : قوله : (لإطلاق الآية) أي قوله تعالى : ﴿ولن تستطيعوا أن تعدلوا﴾ . [النساء : ۱۲۹] أي في المحبة ، فلا تميلوا في القسم، قاله ابن عباس . وقوله تعالى : ﴿وعاشروهنّ بالمعروف﴾ . [النساء : ۱۹] وغايته القسم ، وقوله تعالى : ﴿فإن خفتم ألا تعدلوا﴾ . [النساء :۳] ولإطلاق أحاديث النهي ، ولأن القسم من حقوق النكاح ، ولا تفاوت بينهما في ذلك . اهـ . (۳۸۴/۴ ، كتاب النكاح ، باب القسم ، ط : دار الكتب العلمية بيروت)

(۱۶) ما في " سنن أبي داود " : عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال : " أبغض الحلال إلى الله عزّ وجلّ الطلاق " . (ص/۲۹۶ ، كتاب الطلاق ، باب في كراهية الطلاق)

ما في " الدرالمختار الشامية " : ومن محاسنه التخلص به من المكاره . (در مختار) . وفي الشامية: قوله : (ومن محاسنه التخلص به من المكاره) أي الدينية والدنيوية . بحر . أي كأن عجز عن إقامة حقوق الزوج ، أو كان لا يشتهيها . (۴۲۹/۴ ، كتاب الطلاق)

ما في " الشامية " : وأما الطلاق فإن الأصل فيه الحظر ، بمعنى أنه محظور إلا لعارض يبيحه ، وهو معنى قولهم : " الأصل فيه الحظر" . والإباحة للحاجة إلى الخلاص .... ولهذا قالوا : إن سببه الحاجة إلى الخلاص عند تباين الأخلاق وعروض البغضاء الموجبة عدم إقامة حدود الله تعالى .... وعليه حديث : " أبغض الحلال إلى الله الطلاق " . قال في الفتح : ويحمل لفظ المباح على ما أبيح في بعض الأوقات : أعني أوقات تحقق الحاجة المبيحة اهـ. وإذا وجدت الحاجة المذكورة أبيح .... إن إباحته للحاجة إلى الخلاص ، فلم يبيحوه إلا عند الحاجة إليه لا عند مجرد إرادة الخلاص ، وإن أراد الخلاص عند الحاجة إليه فهو المطلوب .

(۴۲۸/۴ ، كتاب الطلاق ، دار الكتب العلمية بيروت)

(۱۷) ما في " موقع الإسلام سوال وجواب " : فليس للزوج أن يكرهها على الإسلام ولا أن يمنعها من عبادتها الخاصة بها ، لكن له الحق في منعها الخروج من المنزل ولو كان خروجها للكنيسة لأنها مأمورة بطاعته ، وله الحق في منعها من إعلان المنكر في المنزل كنصب التماثيل وضرب الناقوس . ... والزوج ليس له أن يجبر زوجته النصرانية على ترك اعتقادها هذا ، ولكنه ينكر إشاعتها للمنكر وإظهارها له . (رقم الفتوى :۷۰۱۷۷ ، www.islamQA.com)

(۱۸) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ أيها الذين امنوا قوآ انفسكم واهليكم نارًا وقودها الناس=

....

= والحجارة﴾ . (سورة التحريم : ٦)

ما في " تفسير القرطبي " : وقال بعض العلماء لما قال : ﴿قوٓا انفسكم﴾ دخل فيه الأولاد؛ لأن الولد بعض منه كما دخل في قوله تعالى : ﴿ولا علىٓ أنفسكم أن تأكلوا من بيوتكم﴾ فلم يفردوا بالذكر إفراد سائر القربات ، فيعلمه الحلال والحرام ، ويجنبه المعاصي والآثام إلى غير ذلك من الأحكام ، وقال عليه السلام : " حق الولد على الوالد أن يحسن اسمه ويعلمه الكتاب ويزوجه إذا بلغ" . وقال عليه السلام : " ما نحل والدٌ ولدًا أفضل من أدب حسن " . وقد روى عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عن النبي ﷺ : " مروا ابنائكم بالصلاة لسبع واضربوهم عليها لعشر وفرّقوا بينهم في المضاجع " . خرّجه جماعة من أهل الحديث ، وهذا لفظ أبي داود ...... قال الكِيا : فعلينا تعليم أولادنا وأهلينا الدين والخير وما لا يستغنى عنه من الأدب .

(١٨/١٩٥، ١٩٦، سورة التحريم ، الآية/٦)

ما في " صحيح البخاري " : عن عبد الله بن عمر – رضي الله عنهما – يقول : سمعت رسول الله ﷺ يقول : " كلكم راع ، وكلكم مسؤول عن رعيته ، الإمام راع ومسؤول عن رعيته ، والرجل راع في أهله وهو مسؤول عن رعيته ، والمرأة راعية في بيت زوجها ومسؤولة عن رعيتها ، والخادم راع في مال سيده ومسؤول عن رعيته " . (ص/١٢٩ ، رقم : ٨٩٣ ، كتاب الجمعة ، باب الجمعة في القرى والمدن ، ط : بيروت ، صحيح مسلم : ٢/٢٦٠ ، رقم : ١٨٢٩ ، كتاب الإمارة ، باب فضيلة الإمام العادل وعقوبة الجائر والحث على الرفق بالرعية الخ ، ط : بيروت)

(١٩) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . (سورة المائدة : ٢)

ما في " روح المعاني " : فيعم النهي ما هو من مقولة الظلم والمعاصي ويندرج فيه النهي عن التعاون على الاعتداء والانتقام .... وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما وأبي العالية أنهما فسّرا الإثم بترك ما أمرهم به وارتكاب ما نهاهم عنه . (٤/٨٥)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : وقوله تعالى : ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ نهي عن معاونة غيرنا على معاصي الله تعالى . (٢/٣٨١)

ما في " رد المحتار " : " ما كان سبباً لمحظور فهو محظور " . (٥/٢٣٣ ، مكتبه نعمانيه)

ما في " جمهرة القواعد الفقهية " : " الإعانة على المحظور محظور ". (٢/٦٤٤)

تلخیص جوابات

۱- اہلِ کتاب سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی نبی پر ایمان رکھے، اور کسی کتابِ الٰہی کو مانے۔

۲- صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چوں کہ کسی کو پورا پتہ نہ چل سکا، اس لیے ان کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ صابئون یا صابئہ کے نام سے آج کل کوئی قوم معروف نہیں۔

۳- ایسے لوگوں کا شمار اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) میں نہیں ہوگا، اور نکاح وذبیحہ کے معاملے میں اُن کے ساتھ اہلِ کتاب کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

۴- اُن کا شمار اہلِ کتاب میں نہیں ہوگا، اس لیے کہ نصوص میں اہلِ کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔

۵- مطلقاً قادیانی اہلِ کتاب میں شامل نہیں ہوں گے، خواہ مرتد ہوئے ہوں، یا نسلی قادیانی ہوں۔

۶- [الف]: نکاح جائز اور درست تو ہے، لیکن احتیاط از یں ہر ہمہ اولیٰ است۔

[ب]: کراہت باقی رہے گی۔

۷- [الف، ب]: جن انبیاء وکتب کے احوال کو رب سبحانہٗ نے پردۂ خفاء میں رکھا اُن پر اِجمالی ایمان کافی ہے، نہ تو ان کی بحث وتفتیش کرنی ہے، اور نہ اس کا علم انقطاعِ وحی (سلسلۂ وحی بند ہونے) کے بعد ہوسکتا ہے، لہٰذا ہندو مذہب کی وہ کتابیں جن کو وہ خدائی تعلیمات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، یا جن میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی

خوش خبری وغیرہ ہے، کوالہامی کتابیں تسلیم کرنا۔ یا جن شخصیتوں کو وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں اُنہیں یقینی طور پر اللہ کا پیغمبر کہنا جائز ودرست نہیں ہے۔

۸- [الف]: عیسائی مشنریز کی اسکولوں میں مسلمانوں کا اپنے بچوں کو بغرض تعلیم بھیجنا، داخلہ لینا، بالکل جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اپنے علاقوں میں ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی سے بالکلیہ اجتناب برتنا چاہیے۔ اور اہلِ خیر حضرات وہمدردانِ قوم وملت (علماء وعوام) کو چاہیے کہ وہ اپنے علاقوں میں متبادل معیاری تعلیمی درس گاہوں کے قیام پر مکمل توجہ دیں!

[ب]: اہلِ کتاب خاتون سے نکاح کرنے کی صورت میں اس کے وہی حقوق ہوں گے، جو مسلمان بیوی کے ہوتے ہیں۔ نکاح کے بعد اہل کتاب خاتون کے حقوق سے راہِ فرار اختیار کرنا، اور بلا ضرورتِ شدیدہ اُسے طلاق دینا جائز ودرست نہیں ہے۔ اسی طرح شوہر اپنے گھر میں اہل کتاب خاتون کو اس کی مذہبی عبادت سے نہیں روک سکتا، البتہ اظہارِ شعائر، اعلانِ منکر، نصبِ تماثیل اور ضربِ ناقوس سے منع کرسکتا ہے۔

[ج]: مسلمانوں کو ایسے اداروں میں خدمت کرنے اور اُن کی خدمات سے استفادہ کرنے سے حتی الامکان اجتناب کرنا لازم وضروری ہے۔

کتابیات

کتب تفاسیر

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
	القرآن الکریم	....	....
۱	التفسیر المنیر	دکتور وہبہ زحیلی	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۲	الجامع لأحکام القرآن	امام ابوعبداللہ احمد انصاری قرطبی	دار عالم الکتب ریاض/ دار الکتاب العربی بیروت
۳	روح المعانی	امام شہاب الدین سید محمد محمود آلوسی بغدادی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۴	حاشیۃ القونوی علی تفسیر البیضاوی	عصام الدین اسماعیل بن محمد حنفی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۵	تفسیر المظہری	قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی	مکتبہ زکریا دیوبند
۶	أحکام القرآن	امام ابوبکر بن علی رازی جصاص	مکتبہ شیخ الہند دیوبند
۷	مختصر تفسیر ابن کثیر	علامہ ابن کثیر دمشقی	دار القرآن الکریم دمشق
۸	البحر المحیط	امام ابوحیان غرناطی اندلسی	دار الکتب العلمیۃ بیروت
۹	تفسیرات احمدیہ	شیخ احمد ملا جیون	المیزان لاہور
۱۰	معارف القرآن	مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع	فرید بکڈپو دیوبند
۱۱	معارف القرآن	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی	فرید بک ڈپو دہلی
۱۲	بیان القرآن	حکیم الامت علامہ تھانوی	ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان پاکستان
۱۳	تفسیر عثمانی	شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی	ناشر؛ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا
۱۴	توضیح القرآن (آسان ترجمۂ قرآن)	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

کتب احادیث وشروح احادیث

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مؤلف	مکتبہ/مطبع
۱۵	صحیح بخاری	امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری	قدیمی/ احیاء التراث العربی بیروت
۱۶	صحیح مسلم	امام ابوالحسن مسلم بن حجاج قشیری	احیاء التراث العربی

۱۷	سنن ابی داود	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی	مکتبہ بلال دیوبند
۱۸	سنن الترمذی	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسی ترمذی	مکتبہ بلال/ بیروت
۱۹	مشکوۃ المصابیح	شیخ ولی الدین خطیب تبریزی بغدادی	یاسر ندیم اینڈ کمپنی
۲۰	مصنف ابن ابی شیبہ	امام عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ	المجلس العلمی افریقیا
۲۱	معجم کبیر طبرانی	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی	دارالکتب العلمیۃ
۲۲	اعلاء السنن	علامہ شیخ ظفر احمد عثمانی	دارالکتب العلمیۃ
۲۳	فتح الباری	علامہ ابن حجر عسقلانی	السلفیۃ/ الریاض
۲۴	موسوعۃ تکملۃ فتح الملہم	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی	داراحیاء التراث العربی بیروت
۲۵	تحفۃ الاحوذی	شیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری	احیاء التراث العربی
۲۶	مرقاۃ المفاتیح	علامہ شیخ ملاعلی قاری حنفی	ملتان/ اشرفیہ

کتب فقہ وفتاویٰ عربی

۲۷	ردالمحتار (شامی)	علامہ محمد امین ابن عابدین شامی	کراچی/نعمانیہ/ بیروت
۲۸	الدرالمختار	علامہ شیخ علاءالدین حصکفی	دارالکتب العلمیۃ
۲۹	البحرالرائق	علامہ زین الدین (ابن نجیم حنفی)	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۳۰	بدائع الصنائع	ملک العلماء شیخ علاءالدین کاسانی	دارالکتاب العربی بیروت/ بیروت
۳۱	الفتاوی الہندیۃ	شیخ نظام وجماعت علماء ہند	زکریا/ رشیدیہ/ دارالفکر
۳۲	فتح القدیر	محقق ابن ہمام حنفی	دارالفکر بیروت/ بولاق مصر
۳۳	الفقہ الاسلامی وأدلتہ	دکتور وہبہ زحیلی	دارالفکر سوریہ بدمشق
۳۴	الموسوعۃ الفقہیۃ	وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ	وزارۃ الاوقاف کویت
۳۵	الفقہ علی المذاہب الاربعۃ	امام عبدالرحمٰن بن معوض الجزیری	احیاء التراث/ بیروت
۳۶	جواہرالاکلیل شرح مختصر خلیل	بحوالہ: الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	دارالفکر بیروت
۳۷	المغنی لابن قدامۃ	ابن قدامہ حنبلی	مکتبۃ القاہرۃ
۳۸	المغنی والشرح الکبیر	موفق الدین وشمس الدین ابنی قدامۃ	دارالفکر بیروت

۳۹	المہذب للشیرازی	امام ابواسحٰق شیرازی	مطبع عیسی الحلبی
۴۰	الفتاوی الحدیثیۃ	احمد بن محمد بن علی بن حجر ہیثمی مکی	احیاء التراث العربی

کتب فقہ وفتاویٰ اُردو

۴۱	امداد الفتاویٰ	علامہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	دار العلوم کراچی
۴۲	فتاویٰ محمودیہ	علامہ مفتی محمود حسن گنگوہی/ ترتیب؛ مولانا سلیم اللہ خان صاحب	فاروقیہ کراچی
۴۳	فتاویٰ محمودیہ	علامہ مفتی محمود حسن گنگوہی/ ترتیب؛ مفتی فاروق صاحب	مکتبہ محمودیہ میرٹھ
۴۴	کفایت المفتی	علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی	دار الاشاعت پاکستان
۴۵	فتاویٰ رحیمیہ	علامہ مفتی عبد الرحیم لاجپوری	دار الاشاعت کراچی
۴۶	فتاویٰ دار العلوم دیوبند	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن	در العلوم دیوبند/ زکریا
۴۷	عزیز الفتاویٰ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند)	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن	دار الاشاعت کراچی
۴۸	فتاویٰ فریدیہ	مفتی محمد فرید صاحب	دار العلوم صدیقیہ زروبی ضلع صوابی پاکستان
۴۹	فتاویٰ دار العلوم زکریا	مفتی رضاء الحق صاحب	زمزم پبلشرز کراچی
۵۰	فتاویٰ ختم نبوت	مرتب؛ مفتی سعید جلال پوری شہید	عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان پاکستان
۵۱	فتاویٰ دینیہ	مفتی اسماعیل کچھولوی	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس
۵۲	فتاویٰ بسم اللہ	مفتی اسماعیل صاحب	جامعۃ القرأت کفلیتہ سورت
۵۳	اشرف الاحکام تتمہ امداد الفتاوی	حکیم الامت علامہ تھانوی/ ترتیب مولانا اقبال قریشی	ادارہ اسلامیات لاہور وکراچی
۵۴	موسوعہ فقہیہ اردو	وزارۃ الاوقاف والشون الاسلامیہ	وزارۃ الاوقاف کویت
۵۵	جدید فقہی مسائل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	مکتبہ نعیمیہ دیوبند
۵۶	مکہ فقہ اکیڈمی کے فیصلے	المجمع الفقہ الاسلامی/ فہیم اختر ندوی مترجم	ایفا پبلی کیشنز
۵۷	الحیلۃ الناجزۃ	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی	کتب خانہ اعزازیہ دیوبند
۵۸	محقق ومدلل جدید مسائل	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا

۵۹	محقق ومدلل مسائل ارکانِ خمسہ	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	غیر مطبوعہ
۶۰	درسی وتعلیمی اہم مسائل کا انسائیکلوپیڈیا	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	جامعہ اکل کوا

کتب اصول فقہ وقواعد فقہ

۶۱	الاشباہ والنظائر	علامہ ابن نجیم مصری	مکتبہ فقیہ الامت دیوبند
۶۲	جمہرۃ القواعد الفقہیۃ	دکتور علی احمد الندوی	شرکۃ الراجحی المصرفیۃ
۶۳	قواعد الفقہ	شیخ مفتی عمیم احسان مجددی برکتی	اشرفی بکڈپو دیوبند
۶۴	القواعد الکلیۃ والضوابط الفقہیۃ	دکتور محمد عثمان شبیر	دار النفائس الاردن
۶۵	المقاصد الشرعیۃ	شیخ نور الدین الخادمی	دار اشبیلیا
۶۶	الموافقات فی اصول الاحکام ـ ـ	امام ابواسحاق شاطبی	دار المعرفۃ/ احیاء التراث

کتب عقائد ومتفرقہ

۶۷	شرح الفقہ الاکبر	شیخ ملا علی قاری	دار الکتب العلمیۃ
۶۸	شرح عقیدۃ الطحاویۃ	جماعۃ من العلماء	دعوۃ الاِسلامیۃ شباب الأزہر
۶۹	شرح العقائد النسفیۃ	علامہ سعد الدین التفتازانی	مکتبۃ یاسر ندیم اینڈ کمپنی
۷۰	شرح المقاصد	بحوالہ فتاویٰ محمودیہ کراچی	بحوالہ فتاویٰ محمودیہ کراچی
۷۱	المسامرۃ شرح المسایرۃ	بحوالہ فتاویٰ محمودیہ کراچی	بحوالہ حاشیہ فتاویٰ محمودیہ کراچی ومیرٹھ
۷۲	دعوۃ التقریب بین الأدیان	دکتور احمد بن عبد الرحمٰن	دار ابن الجوزی السعودیۃ
۷۳	موقع الاِسلام سؤال وجواب	www.islamQA.com	www.islamQA.com

مقالہ

(۲۶/رواں فقہی سمینار [اُجین، ایم پی] ۵-۷/رجمادی الاخریٰ ۱۴۳۸ھ/ مطابق: ۴-۶/مارچ ۲۰۱۷ء)

فضائی آلودگی

ہمارے استعمال میں مختلف ایسی چیزیں آتی ہیں، جو فضائی آلودگی کا باعث بنتی ہیں، جیسے: آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن، صنعتی فضلات، کھلی جگہوں پر قضائے حاجت، سڑکوں پر تھوکنا، ایسی اشیاء کا استعمال کرنا جو سستی ہوں؛ لیکن تحلیل نہ ہو پاتی ہوں، ذبیحہ کے فاضل اجزا کو کھلی جگہ پر ڈال دینا، دوسری طرف قدرت نے جن چیزوں میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، ان کو ختم کر دینا، جیسے درختوں کی کٹائی وغیرہ، اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ:

سوال:۱- عام طور پر پکوان میں ایندھن کے طور پر لکڑی، کوئلہ، گوبر، گیس اور بجلی کا استعمال ہوتا ہے، ان میں بعض چیزیں دھواں چھوڑنے والی ہیں، جن سے ماحول آلودہ ہوتا ہے، اور بعض دھواں پیدا نہیں کرتیں، لیکن ممکن ہے کہ وہ نسبتاً مہنگی ہوں، تو جو شخص ایسے وسائل استعمال کرنے پر قادر ہو، کیا اس کے لیے ارزاں ہونے کی وجہ سے آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کا استعمال درست ہوگا، جب کہ اس سے اجتماعی ضرر پیدا ہوتا ہو؟

جواب:۱- جو شخص مہنگے ایندھن کے استعمال پر قادر ہے، پھر محض اپنے مفاد کے لیے سستا ایندھن استعمال کرتا ہے، جو عام لوگوں کے لیے ضرر کا باعث ہو، شرعاً درست نہیں ہے۔ (۱)

سوال : ۲- گاڑیاں ایک اہم ضرورت ہیں، لیکن اِن کے لیے بھی ایندھن مطلوب ہے، یہ ایندھن ڈیزل، پٹرول اور کئی قسم کی گیسوں کی شکل میں قابلِ استعمال ہوتا ہے، اور اب اس میدان میں بھی شمسی توانائی کو قابلِ استعمال بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، ڈیزل میں بہت زیادہ، اس سے کم پٹرول میں اور اس سے بھی کم گیس میں دھواں خارج ہوتا ہے، ایسی صورت میں حکومت کی طرف سے ڈیزل کے استعمال کی ممانعت کردی جائے، یا کسی خاص گاڑی کے لیے گیس ہی کے استعمال کو لازم کردیا جائے، تو عوام کے لیے اس قانون پر عمل کرنا شرعاً واجب ہوگا یا نہیں؟ اور اگر حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ہو، تب بھی لوگوں کو ضرر سے بچانے اور ماحول کو پاک وصاف رکھنے کے لیے کم آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کو ترجیح دینے کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟

جواب : ۲- جی ہاں! عوام کے لیے اس قانون پر عمل کرنا لازم ہوگا، اور اگر حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ہو، تب بھی لوگوں کو ضرر سے بچانے اور ماحول کو پاک وصاف رکھنے کے لیے کم آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کو ترجیح دینا صاحبِ وسعت پر لازم ہوگا۔ (۲)

سوال : ۳- روشنی کے حصول کے لیے اس وقت جو ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ بنیادی طور پر الیکٹرک اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں جنریٹر ہے، جنریٹر مٹی کے تیل سے بھی چلتا ہے اور ڈیزل پٹرول اور گیس سے بھی، مٹی کے تیل اور ڈیزل سے چلنے والے جنریٹر بہت زیادہ دھواں چھوڑتے ہیں، اور بہت سی جگہوں پر حکومت کی طرف سے اس کے استعمال کی ممانعت بھی ہوتی ہے، کیا ایسی صورت میں شرعاً کم دھواں پیدا کرنے والے ایندھن کا استعمال واجب ہوگا؛ تاکہ ماحول کو اس کے نقصان سے بچایا جاسکے؟

جواب :۳- ایسی صورت میں شرعاً کم دھواں پیدا کرنے والے ایندھن کا استعمال واجب ہوگا؛ تاکہ ماحول کو اس نقصان سے بچایا جاسکے۔ (۳)

سوال :۴- ایندھن کے مذکورہ وسائل کے ساتھ ساتھ اس وقت شمسی توانائی کا استعمال کافی بڑھ رہا ہے، حکومت بھی اس کے لیے بعض سہولتیں فراہم کررہی ہیں، اس میں ایک بار ضرور خطیر رقم خرچ ہوتی ہے، لیکن آئندہ وہ برقی بل سے بچ جاتا ہے، کیا شرعی نقطۂ نظر سے صاحبِ استطاعت افراد واشخاص، مساجد ومدارس اور اِداروں کے لیے آلودگی سے محفوظ اس توانائی کا استعمال مستحب اور مستحسن عمل نہیں ہوگا؟

جواب :۴- شرعی نقطۂ نظر سے صاحبِ استطاعت افراد واشخاص، مساجد ومدارس اور اِداروں کے لیے آلودگی سے محفوظ اس توانائی کا استعمال مستحب اور مستحسن عمل ہوگا۔ (۴)

سوال :۵- صنعتی ترقی کے اِس دور میں چھوٹے بڑے کارخانوں کی بہتات ہے، اور یہ یقیناً موجودہ دور کی ایک ضرورت ہیں، لیکن کارخانوں میں جو ایندھن استعمال کیا جاتا ہے وہ بہت دھواں پیدا کرنے والا ہوتا ہے، اور جو صنعتی فضلات باہر پھینکے یا بہائے جاتے ہیں وہ فضائی آلودگی پیدا کرتے ہیں، اس لیے حکومت نے اس کے لیے کئی قوانین بھی بنائے ہیں، کہ کارخانے آبادیوں سے باہر ہوں، ان کی چمنیوں کو ایک خاص سطح تک اونچا رکھا جائے، کم سے کم ایندھن استعمال کیا جائے، جو آلودگی پیدا کرنے کا باعث نہ ہو، اور فضلات کو تحلیل کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے، یہ قوانین انسانی بھلائی کے ہی نقطۂ نظر سے بنائے گئے ہیں، تو شرعاً ایسے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب :۵- یہ قوانین چوں کہ انسانی بھلائی کے ہی نقطۂ نظر سے بنائے گئے ہیں، لہٰذا شرعاً ایسے قوانین پر عمل کرنا لازم ہوگا، بصورتِ دیگر خلاف ورزی پر گناہ لازم آئے گا، اور ایسے افراد کے خلاف قانونی کارروائی اور تعزیر جائز ہوگی۔ (۵)

سوال :٦-انسانی خوراک کا ایک اہم حصہ جانور ہیں، جن سے لحمی غذا حاصل کی جاتی ہے، جانور کے قابل استعمال اجزا کے حاصل کرنے کے بعد بعض اجزا جیسے خون، اوجھڑی وغیرہ ضائع کردی جاتی ہیں، بمقابلہ نباتات کے جانوروں میں جلد تعفُّن پیدا ہوجاتا ہے، اور یہ بہت تیزی سے فضا کو آلودہ کرتے ہیں، گزشتہ زمانے میں اس کی وجہ سے کثرت سے ہیضے کی بیماری پھیل جایا کرتی تھی، خاص کر جب بیک وقت بہت سارے جانور ذبح کیے جائیں، جیسا کہ قربانی کے ایام میں ہوتا ہے، تو ایسے مواقع پر اس کا کافی اندیشہ ہوتا ہے، تو ذبیحہ کے ایسے اجزا کے سلسلے میں شریعت کے کیا احکام ہیں؟ اس کے امکانی نقصان سے بچانے کے لیے حکومت کی کیا ذمہ داریاں ہیں، اور خود ذبح وقربانی کرنے والے کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب :٦- حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس طرح کے اجزا کو ٹھکانے لگوائے، اور اگر وہ یہ کام نہیں کرتی ہے، تو خود ذبح وقربانی کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ ان اجزا کو ایسے مقامات پر ڈالے، یا دفن کرائے جہاں ڈالنے یا دفن کرنے سے سوال میں مذکور اُمور پیدا نہ ہوتے ہوں۔ (٦)

سوال : ۷- سامان کی پیکنگ بھی ایک اہم ضرورت ہے، قدیم زمانے میں اس کے لیے ردّی کاغذ یا اس سے تیار ہونے والی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں، اب اس کی جگہ پلاسٹک کی تھیلیوں نے لے لی ہیں، لیکن پلاسٹک زمین میں تحلیل نہیں ہوتا،

اور اگر اسے جلایا جائے، تو اس سے بہت کثیف دھواں پیدا ہوتا ہے، ہمارے ماحول کو نقصان پہنچانے والی چیزوں میں ماہرین اس کو بہت خطرناک قرار دیتے ہیں، لیکن آسانی وخوش نمائی کی غرض سے اور خاص کر سستا ہونے کی وجہ سے تجّار اور عوام اس کا خوب استعمال کرتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب : ۷- دفعِ مفسدہ جلبِ منفعت سے اَولیٰ ہوتا ہے [۷]، لہٰذا سرکاری طور پر اس پر پابندی ہونی چاہیے، اور خود بھی اس کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ [۸]

سوال :۸- سماج میں تمباکو کی اشیاء مختلف صورتوں میں استعمال کی جاتی ہیں، جیسے: سگریٹ، بیڑی، حقہ وغیرہ، اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ زیادہ کثیف اور مسموم ہوتا ہے، اس کا نقصان صرف پینے والے کو ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے متعلقین اور ہم نشینوں کو بھی ہوتا ہے، اور بحیثیت مجموعی اس سے ماحول کو کافی نقصان پہنچتا ہے، اس لیے آج کل ایئر پورٹ اور دوسرے عوامی مقامات پر ایسے لوگوں کے لیے اسموکنگ زون بنا دیا گیا ہے، سوال یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے استعمال کا کیا حکم ہوگا؟ اور قانوناً جن مقامات پر سگریٹ نوشی وغیرہ کی ممانعت ہو، وہاں سگریٹ وغیرہ پینے کا شرعاً کیا حکم ہوگا؟

جواب : ۸-حقہ، بیڑی اور سگریٹ نوشی مکروہ ہے [۹]، اور قانوناً جن مقامات پر سگریٹ نوشی وغیرہ کی ممانعت ہو، وہاں سگریٹ نوشی وغیرہ حکومتی قانون کی خلاف ورزی ہوگی، اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے افراد پر تعزیر جائز ہوگی۔ [۱۰]

سوال :۹- بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اب بھی بہت سے گھروں میں بیت الخلا نہیں ہیں، لوگ سڑکوں کے کنارے یا کھیت وغیرہ میں رفعِ حاجت کرتے ہیں، اور

پیشاب تو عوامی مقامات جیسے: ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ وغیرہ پر بلا تکلف کیا جاتا ہے، اس بُری عادت کا شریعت کی نظر میں کیا درجہ ہے؟ اسی طرح بہت سی جگہ گندے پانی اور فضلات کھلی نالیوں میں یہاں تک کہ گلیوں میں بہا دیئے جاتے ہیں، یہ بھی فضا میں آلودگی پیدا کرنے کا ایک اہم سبب ہے، اس سلسلے میں شریعت کیا ہدایت دیتی ہے؟

جواب :۹- اسلام ایک پاکیزہ مذہب ہے، اس نے اپنے ماننے والوں کو جہاں ظاہری اور باطنی پاکی وطہارت کا حکم دیا، وہیں اس بات کا بھی امر فرمایا کہ جن جگہوں پر ان کی سکونت ورہائش ہے، جن راستوں سے اُن کا مرور وگزر ہوتا رہتا ہے، اسی طرح عوامی مقامات جیسے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور فٹ پاتھ وغیرہ، یہ سب جگہیں اور مقامات صاف ستھرے رہیں، کیوں کہ گھروں اور کمروں پر کوڑا کرکٹ جمع کرنا، صفائی کا خیال نہ رکھنا، اسی طرح راستوں کے کنارے، کھلے صحرا و بیابان میں رفعِ حاجت کرنا، یا عوامی جگہوں اور پبلک مقامات پر بلا تکلف پیشاب کرنا؛ بری عادات میں سے ہے[11]، نیز کیڑے مکوڑوں، کھٹملوں اور مچھروں وغیرہ کی آمد، اور بیماریوں کے پھیلنے کا ذریعہ وسبب بنتا ہے، نیز یہ عدمِ نظافت وطہارت میں یہودیوں سے مشابہت اختیار کرنا ہے، جو ناجائز وممنوع ہے، اس لیے خود بھی صاف ستھرا رہیں، اور اپنے ماحول کو بھی صاف ستھرا رکھیں۔[12]

سوال :۱۰- تھوک اور اگر بالخصوص تھوکنے والے نے کوئی نقصان دہ چیز وغیرہ کھا رکھی ہو، تو یہ بھی مضرِ صحت جراثیم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ماحول کو نقصان پہنچاتے ہیں، اسی لیے بعض ملکوں میں سڑک اور عوامی مقامات پر تھوکنے سے قانوناً منع کیا جاتا ہے، اور بہت سے عوامی مقامات پر تھوک دان بنا دیئے گئے ہیں، اس پس منظر

میں اس بات کی وضاحت مطلوب ہے کہ ایسے اُمور کے سلسلے میں حکومت یا متعلق ادارے کی ہدایت پر عمل کرنا کس درجے میں مطلوب ہے؟

جواب :۱۰- ایسے اُمور کے سلسلے میں حکومت یا متعلق ادارے کی ہدایت پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے۔[۱۳]

سوال :۱۱- مختلف مشینی اشیاء شعاعوں کو جنم دیتی ہیں، جو انسانوں اور جانداروں، نیز ماحول کے لیے سخت نقصان کا باعث ہوتی ہیں، جیسے: فریج، واشنگ مشین، ایئر کنڈیشن، ٹی وی، خاص کر موبائل وغیرہ، چنانچہ یہ بات مشاہدے میں ہے کہ جب سے موبائل کے استعمال کی کثرت ہوئی ہے، پرندے ناپید ہوتے جارہے ہیں، حالانکہ ماحول کے تحفظ میں پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کا بھی حصہ ہے، ایسی چیزوں کا استعمال- بالخصوص ضرورت سے زیادہ استعمال کس حد تک درست ہے؟

جواب : ۱۱- کسی بھی چیز کا استعمال زائد از ضرورت بنگاہِ شرع محمود و پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ یہ اِسرافِ مال[۱۴] وضیاعِ وقت میں داخل ہونے کی وجہ سے شرعاً ممنوع ہوگا۔[۱۵]

سوال :۱۲- جو چیزیں ماحول کا تحفظ کرتی ہیں، ان میں پیڑ پودوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ نقصان دہ گیس کو ہضم کرکے ہمارے لیے قابلِ استعمال بناتے ہیں، تو قابلِ استفسار امر یہ ہے کہ:

الف: بلاضرورت جنگلات کو کاٹنے اور کھیتوں کو زیادہ سے زیادہ پیسوں کے حصول کے لیے پلاٹس بنا کر آبادیوں کو بسانا کیسا ہے؟

ب: اسلام کی نظر میں درخت لگانے اور کاشت کاری کرنے کی کیا اہمیت ہے؟ جس

کے ذریعے نہ صرف یہ کہ پیداوار فراہم ہوتی ہے، بلکہ ماحول کو بھی متوازن رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

جواب: ۱۲- **الف**: مقاصدِ شریعت کی دفعہ ''حفاظتِ نفس'' کے پیشِ نظر، بلاضرورت جنگلات کو کاٹنے اور کھیتوں کو زیادہ سے زیادہ پیسوں کے حصول کے لیے پلاٹس بنا کر آبادیوں کو بسانا شرعاً منع ہے۔ (۱۶)

ب: اسلام کی نظر میں درخت لگانے اور کاشت کاری کرنے کی بڑی اہمیت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اگر کوئی مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، یا کوئی کاشت کرتا ہے، پھر اس میں سے پرندہ یا انسان یا جانور کھاتے ہیں، تو اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔'' (۱۷)

اس حدیث شریف کا مقتضٰی یہ ہے کہ درخت یا پودہ لگانے والے شخص کو صدقے کا اجر اس وقت تک ملتا رہتا ہے، جب تک اس کے پھل کو استعمال کیا جاتا رہے، اگرچہ کاشت کار یا پودہ لگانے والا انتقال کر جائے، نیز ظاہرِ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زارع یا غارس (کاشت کار یا پودہ لگانے والے) کو ضرور اجر ملے گا، اگرچہ وہ پودہ یا درخت کسی دوسرے کی ملکیت میں چلا جاوے۔ (۱۸)

ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس شخص کے پاس زمین ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں خود کاشت کرے، یا (خود کاشت نہ کر سکے تو) اپنے کسی بھائی کو عاریۃً دیدے، اور یہ دونوں ہی باتیں پسند نہ ہوں، تو پھر چاہیے کہ اپنی زمین اپنے پاس رکھے۔'' (۱۹)

…………

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " مجمع الزوائد " : قوله ﷺ : " لا ضرر ولا ضرار في الإسلام " . (۱۳۸/۴ ، البيوع ، باب لا ضرر ولا ضرار ، ابن ماجه : ص/۱۶۹ ، أبواب الأحكام ، التمهيد : ۲۸۴/۴)

ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : يُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصُّ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِّ . (ضررِعام کو دور کرنے کی خاطر، ضررِخاص کو برداشت کیا جائے گا)۔ (ص/۲۹۰ ، قاعده : ۳۷۱ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم: ص/۳۱۲ ، قواعد الفقه : ص/۱۳۹ ، قاعده : ۳۹۸ ، ترتيب اللآلي في سلک الأمالي : ص/۱۱۶۷ ، شرح القواعد : ص/۱۹۷ ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۴۰/۱ ، المادة : ۲۶)

(۲) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : يُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصُّ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِّ . (ضررِ عام کو دور کرنے کی خاطر، ضررِخاص کو برداشت کیا جائے گا)۔ (ص/۲۹۰ ، قاعده : ۳۷۱ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم: ص/۳۱۲ ، قواعد الفقه : ص/۱۳۹ ، قاعده : ۳۹۸ ، ترتيب اللآلي في سلک الأمالي : ص/۱۱۶۷ ، شرح القواعد : ص/۱۹۷ ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۴۰/۱ ، المادة : ۲۶)

(۳) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : يُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصُّ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِّ . (ضررِ عام کو دور کرنے کی خاطر، ضررِخاص کو برداشت کیا جائے گا)۔ (ص/۲۹۰ ، قاعده : ۳۷۱ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم: ص/۳۱۲ ، قواعد الفقه : ص/۱۳۹ ، قاعده : ۳۹۸ ، ترتيب اللآلي في سلک الأمالي : ص/۱۱۶۷ ، شرح القواعد : ص/۱۹۷ ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۴۰/۱ ، المادة : ۲۶)

(۴) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : يُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصُّ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِّ . (ضررِ عام کو دور کرنے کی خاطر، ضررِخاص کو برداشت کیا جائے گا)۔ (ص/۲۹۰ ، قاعده : ۳۷۱ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم: ص/۳۱۲ ، قواعد الفقه : ص/۱۳۹ ، قاعده : ۳۹۸ ، ترتيب اللآلي في سلک الأمالي : ص/۱۱۶۷ ، شرح القواعد : ص/۱۹۷ ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۴۰/۱ ، المادة : ۲۶)

(۵) ما في " الدر المختار مع الشامية " : لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض .

(۴۱۶/۶ ، كتاب الجهاد ، باب البغاة ، مطلب في وجوب طاعة الإمام)

ما في " الموسوعة الفقهية " : أجمع العلماء على وجوب طاعة أولي الأمر من الأمراء والحكام ، وقد نقل النووي عن القاضي عياض وغيره هذا الإجماع . (۳۲۳/۲۸ ، طاعة ، طاعة أولي الأمر)

(۶) ما في " المسائل المهمة فيما ابتلت به العامة " : (قربانی ایک عبادت ہے، کوئی ہڑبونگ نہیں) مسئلہ (۱۲۷): اسلام نے جہاں عیدالاضحیٰ کے تین دنوں میں قربانی کی عبادت کو باعثِ فضیلت قرار دیا ہے، وہاں دوسرے بہت سے احکام بھی دیئے ہیں، ایک عبادت کی انجام دہی میں دوسرے احکام کو نظرانداز کرنا، بندگی کا شیوہ (طورطریق)=

....

= نہیں، مثلاً: یہ حکم بھی اسلام ہی نے دیا ہے اور انتہائی تاکید کے ساتھ دیا ہے کہ- اپنے کسی عمل سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچاؤ[۱]، اپنے گھروں کے ماحول کو صاف ستھرا رکھو[۲]، لوگوں کی گذرگاہوں اور راستوں کو گندا نہ کرو، بلکہ راستے میں پڑی ہوئی گندگی یا کسی تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینا - ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے[۳]، لہٰذا جہاں قربانی ایک صاحبِ استطاعت مسلمان کے لیے ضروری ہے، وہاں اس کے ذمہ یہ بھی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ذبح شدہ جانور کی آلائشوں کو اس طرح ٹھکانے لگانے کا انتظام کرے کہ اس سے ماحول میں گندگی نہ پھیلے، اُن آلائشوں کو شارعِ عام (عام راستے) پر ڈال دینا، یا اُنہیں اِس طرح چھوڑ کر چلے جانا کہ وہ پڑی سڑتی رہیں، اور لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوں، ایک مستقل گناہ ہے[۴]، اور اس قسم کے گناہ کر کر کے عبادت انجام دینا بھی عبادت کے بنیادی مقصد سے جہالت کی دلیل ہے۔ خلاصہ یہ کہ قربانی ایک عبادت ہے، کوئی ہڑ بونگ (ہنگامہ، بدنظمی) نہیں ہے، جو قواعد وضوابط سے آزاد ہو، اور اس کے دوران نظم وضبط اور صفائی ستھرائی کے احکام وآداب کو نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ اس عبادت کا تو اول وآخر پیغام ہی یہ ہے کہ: ﴿اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ . ''بے شک میری نماز، میری عبادت، اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''[۵]

[۱] ما في '' مشكوة المصابيح '' : عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : '' المسلم أخو المسلم ؛ لا يظلمه ولا يخذله ولا يحقره ، التقوىٰ ههنا ، - ويشير إلى صدره - ثلاث مرار - بحسب من الشر أن يحقر أخاه المسلم ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ دمه وماله وعرضه'' . رواه مسلم . (ص/۴۲۲)

[۲] ما في '' جامع الترمذي '' : عن صالح بن أبي حسان قال : سمعت سعيد بن المسيب يقول : ''إن اللّٰه طيب يحب الطيب ، نظيف يحب النظافة ، كريم يحب الكرم ، جواد يحب الجود ، فنظفوا '' . أراه قال : '' أفنيتكم ، ولا تشبهوا باليهود'' . (۳/۵۳۷ ، كتاب الأدب ، حديث : ۲۷۹۹ ، بيروت)

[۳] ما في '' مشكوة المصابيح '' : عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : '' الإيمان بضع وسبعون شعبة ، فأفضلها قول : لا إله إلا اللّٰه ، وأدناها إماطة الأذى عن الطريق ، والحياء شعبة من الإيمان '' . متفق عليه . (ص/۱۲ ، كتاب الإيمان)

[۴] ما في '' سنن أبي داود '' : (عن) عبد اللّٰه بن بريدة قال : سمعت أبي ؛ بريدة - يقول : سمعت رسول اللّٰه ﷺ .... قال : '' النخاعة في المسجد تدفنها ، والشيء تنحيه عن الطريق '' .
(ص/۱۱۷ ، مكتبه دار السلام سهارنپور)

[۵] (سورة الأنعام :۱۶۳) =

....

=(مقتبس از ذکر وفکر:ص/۱۱۶، ۱۱۷، محقق مدلل مسائل قربانی:ص/۱۲۶، المسائل المہمۃ:۹/ ۱۸۷، ۱۸۸)

(۷) ما في " القواعد الكلية والضوابط الفقهية " : درء المفاسد أولى من جلب المصالح .

(ص/۱۸۲ ، الفتاوى الحديثية : ص/۲۰۳ ، مطلب الاجتماع للموالد والأذكار ، الأصول والقواعد للفقه الإسلامي : ص/۱۷۱ ، قاعده : ۱۴۴ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم : ص ۳۲۲ ، درر الحكام: ۱/ ۴۱ ، المادة: ۳۰ ، قواعد الفقه: ص ۸۱، القاعدة:۱۳۳ ، جمهرة القواعد الفقهية : ۲/۳۳۷، القاعدة : ۱۸۹، ترتيب اللآلي :ص/۱۲۹۱، القواعد الفقهية : ص/۱۷۰ ، شرح القواعد: ص ۲۰۵)

ما في " الدر المختار مع الشامية " : كل ما أدى إلى ما لا يجوز لا يجوز .

(۹/ ۵۱۹ ، كتاب الحظر والإباحة ، فصل في اللبس)

(۸) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : يُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصُّ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِّ . (ضررِ عام کودور کرنے کی خاطر، ضررِ خاص کو برداشت کیا جائے گا)۔ (ص/۲۹۰ ، قاعده : ۱۷۳ ، الأشباه والنظائر لإبن نجيم: ص/۳۱۲ ، قواعد الفقه : ص/۱۳۹ ، قاعده : ۳۹۸ ، ترتيب اللآلي في سلك الأمالي : ص/۱۱۶۷ ، شرح القواعد : ص/۱۹۷ ، درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ۱/۴۰ ، المادة : ۲۶)

(۹) ما في " المسائل المهمة فيما ابتلت به العامة " : مسئلہ(۱۱):مطلقاً سگریٹ نوشی؛(اگراس میں کسی قسم کی نشہ آور چیز کی آمیزش نہ بھی ہو، تب بھی مال کو ضائع کرنے، فضول خرچی کو شامل ہونے، اور منہ میں ایسی بدبو کے پیدا ہونے کی وجہ سے کہ اس سے دوسرے لوگ نفرت کرتے ہیں) مکروہ ہے، اس لیے عام حالات میں اس کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے۔[۱]

[۱] ما في " الأحكام الفقهية المتعلقة بالتدخين " : فأفتى الجمهور الأعظم بالتحريم ، وأفتى بعضهم بالكراهة ، وذهب آحاد منهم إلى حله ، وذهب القليل إلى أنه تجري عليه الأحكام الخمسة : فهو حرام إذا تحقق ضرره ، ومكروه لرائحته ، أو كان ضرره قليلا محتملا ، أو لكونه مما اختلف فيه، ومندوب إذا كان له فائدة مرجوة كالمداواة مثلا ، ومباح إذا استوى حال متعاطيه شرب أو لم يشرب ، وواجب إذا تعين دواء وأخبره بذلك طبيب عادل . (ص/۴۸ ، المطب الثامن حكم شرب الدخان ، المرحلة الثانية)

ما في " رد المحتار " : وفي شرح الوهبانية للشرنبلالي [الطويل] : ويمنع من بيع الدخان وشربه – وشاربه في الصوم لا شك يفطر . (۱۰/ ۴۲ ، كتاب الأشربة) (المسائل المہمۃ:۷/۳۲، و:۱/۱۵۳، ۱۵۴)

(۱۰) ما في " الدر المختار مع الشامية " : لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض . =

....

=(٢١٦/٦ ، كتاب الجهاد ، باب البغاة ، مطلب في وجوب طاعة الإمام)

ما في " الموسوعة الفقهية " : أجمع العلماء على وجوب طاعة أولي الأمر من الأمراء والحكام ، وقد نقل النووي عن القاضي عياض وغيره هذا الإجماع . (٣٢٣/٢٨ ، طاعة ، طاعة أولي الأمر)

(١١) ما في " سنن أبي داود " : عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال : " اتقوا اللاعنَين ، قالوا : وما اللاعنان يا رسول الله ؟ قال ﷺ : " الذي يتخلى في طريق الناس أو ظلهم " . ... (وفيه أيضًا:) عن معاذ بن جبل قال : قال رسول الله ﷺ : " اتقوا الملاعن الثلاثة : البراز في الموارد ، وقارعة الطريق ، والظل " . (ص/٥ ، كتاب الطهارة ، باب المواضع التي نهي عن البو فيها ، ط : قديمي ، و: ٢٩/١ ، ط : حمص ، مستدرک الحاکم : ١٦٧/١ ، ط : دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد الهند)

ما في " الفتاوى الهندية " : ويكره البول والغائط في الماء جاريا كان أو راكدا ، ويكره على طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين أو تحت شجرة مثمرة أو في زرع أو في ظل ينتفع بالجلوس فيه ، ويكره بجنب المساجد ومصلى العيد وفي المقابر وبين الدواب وفي طرق المسلمين .

(٥٠/١ ، ط : دار الفكر بيروت)

ما في " الموسوعة الفقهية " : يكره عند جمهور الفقهاء (الحنفية والمالكية والشافعية) التخلي تحت شجرة مثمرة . ... وزاد الحنفية والمالكية : أو في ظل ينتفع بالجلوس فيه أو ما من شأنه الاستظلال به . وقال الحنابلة : يحرم التبول أو التغوط في ظل نافع وتحت شجرة عليها ثمرة مقصودة مأكولة ؛ لأنه يفسدها وتعافها الأنفس ، فأما في غير حال الثمرة فلا بأس .

(٣٥٤/٢٥ ، شجر ، التخلي تحت الشجر ، و: ١٠٠/٤٠ ، نجاسة ، توقي النجاسات ، جواهر الإكليل شرح مختصر خليل : ١٧/١ ، ١٨ ، ط : دار الفكر بيروت ، الدر المختار مع حاشية ابن عابدين : ٢٢٩/١ ، ط : إحياء التراث)

ما في " مواهب الجليل شرح مختصر خليل " : قال في النوادر : ويكره أن يتغوط في ظل الجدار والشجر وقارعة الطريق وضفة الماء وقربه . انتهى . وضفة الماء جانبه كما تقدم . (فائدة) روى أبو داود عن معاذ بن جبل قال : قال رسول الله ﷺ : " اتقوا الملاعن الثلاثة : البراز في الموارد ، وقارعة الطريق ، والظل " . قال في النهاية : هي جمع ملعنة ؛ وهي الفعلة التي يلعن بها فاعلها كأنها مظنة للعن ومحل له ؛ لأن الناس إذا مروا به لعنوا فاعله . انتهى . (٢٧٧/١ ، ط : دار الفكر بيروت ، أسنى المطالب شرح روض الطالب : ٤٧/١ ، ط : دار الكتاب الإسلامي بيروت ، كشاف القناع : ٦٤/١ ، ط : دار الفكر بيروت ، مطالب أولي النهى شرح غاية المنتهى : ٧٢/١ ، ط : بيروت ،=

....

=المغني مع الشرح الكبير : ۱/۱۵۶ ، ط : دار الكتاب العربي)

(۱۲) ما في " المسائل المهمة فيما ابتلت به العامة " : عدمِ نظافت وطہارت میں تشبہ مع الکفار لازم آتا ہے۔مسئلہ(۱۷۷): اسلام ایک پاکیزہ مذہب ہے، اس نے اپنے ماننے والوں کو جہاں ظاہری اور باطنی پاکی وطہارت کا حکم دیا، وہیں اس بات کا بھی امر فرمایا کہ جن جگہوں پر ان کی سکونت ورہائش ہے، وہ بھی صاف ستھری رہیں، کیوں کہ گھروں اور کمروں میں کوڑا کرکٹ جمع کرنا، صفائی کا خیال نہ رکھنا، کیڑے مکوڑوں، کھٹملوں اور مچھروں وغیرہ کی آمد، اور بیماریوں کے پھیلنے کا ذریعہ وسبب بنتا ہے، نیز یہ عدمِ نظافت وطہارت میں یہودیوں سے مشابہت اختیار کرنا ہے، جو ناجائز وممنوع ہے، اس لیے خود بھی صاف ستھرا رہیں، اور اپنے ماحول کو بھی صاف ستھرا رکھیں۔[۱]

[۱] ما في " القرآن الكريم " : ﴿وثيابک فطهِّر﴾ . [سورة المدثر:۴] وقال : ﴿إن الله يحب التوّابين ويحب المتطهّرين﴾ . (سورة البقرة : ۲۲۲)

ما في " تفسير المظهري " : قال القاضي ثناء الله رحمه الله تعالى : قلت : والظاهر عندي أنه أمر بتطهير الثياب فالواجب بالمنطوق وعبارة النص إنما هو تطهير الثوب ؛ وبدلالة النص يجب تطهير البدن بالطريق الأولى ، فإن الله سبحانه القدوس المطهر الطاهر لما لم يرض بنجاسة الثوب فكيف يرضى بنجاسة البدن اهـ . ... احتج الفقهاء بهذه الأية لاشتراط طهارة الثوب والمكان والبدن عن النجاسة الحقيقية للصلاة ، والصحيح عندي أنه لا دلالة على اشتراطها للصلاة بل على وجوب الطهارة الثلاث في جميع الأحوال . (۱۰/ ۸۹ ، ۹۰)

ما في " جامع الترمذي " : قوله ﷺ : " إن الله طيب يحب الطيب ، نظيف يحب النظافة ، كريم يحب الكرم ، جواد يحب الجود ، فنظفوا أفنيتكم ، ولا تشبهوا باليهود " . (۲/۱۰۷ ، قديمي ، وأيضًا :۳/۵۳۷ ، كتاب الأدب ، باب ما جاء في النظافة ، رقم : ۲۷۹۹)

ما في " صحيح مسلم " : عن مالک الأشعري قال : قال رسول الله ﷺ : " الطهور شطر الإيمان" . (۱/۱۱۸ ، كتاب الطهارة ، باب فضل الوضوء ، جمع الجوامع :۵/۱۳۲، رقم : ۱۴۰۰۴ ، حرف الطاء)

ما في " المعجم الأوسط للطبراني " : قوله ﷺ : " إن الله جميل يحب الجمال " .

(۳/۳۰۶، رقم : ۴۶۶۸)

ما في " سنن أبي داود " : قوله ﷺ : " من تشبه بقوم فهو منهم " .

(ص/۵۵۹ ، كتا ب اللباس ، باب لباس الشهرة)

ما في " المقاصد الشرعية " : إن الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما ،=

…………………………………………………………

=وتکون واجبة إذا کان المقصد واجبا . (ص/۴۶ ، اعلام الموقعین :۳/ ۱۷۵)

(المسائل المہمۃ :۱/ ۱۶۹،۱۷۰)

ما في ’’ المسائل المھمة فیما ابتلت به العامة ‘‘ : ’’گندگی اورعدمِ صفائی جہاں ایک سماجی لعنت ہے، وہیں انسانی وماحولیاتی صحت پربھی اس کے بڑے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مذہبِ اسلام نے آج سے چودہ سوپینتیس (۱۴۳۵) سال پہلے ہی سے صفائی اورطہارت کوانتہائی اہمیت دی ہے،قرآن کریم میں ہے:﴿انّ اللّٰه یُحبُّ التّوّابین ویُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْن﴾ بے شک اللہ تعالیٰ خوب توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں،اورخود پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے صفائی وپاکی کی اہمیت پرزور دیتے ہوئے فرمایا:’’پاکیزگی آدھا ایمان ہے‘‘ ۔اورآپ نے یہ بھی فرمایا کہ-’’اپنے صحنوں اورآنگنوں کوصاف ستھرا رکھو‘‘اسلام نے جس طرح باطن کی صفائی وپاکیزگی کو انسانیت کا اعلیٰ مقصد قرار دیا،اسی طرح ظاہر کی صفائی وستھرائی کوبھی ایمان کا حصہ قرار دیا ہے،لہٰذا تمام مسلمانوں ؛ بالخصوص طبقۂ اہلِ علم وطلبۂ علم کی ذمہ داری ہے کہ ہرطرح کی صفائی وطہارت کاممکن حدتک خیال رکھیں ۔‘‘

(المسائل المہمۃ فیما ابتلت بہ العامۃ :۸/۲۶۳،۲۶۴،مسئلہ نمبر:۱۷۱،گندگی ایک سماجی لعنت اور پاکیزگی آدھا ایمان ہے)

(۱۳) ما في ’’ الدر المختار مع الشامیة ‘‘ : طاعة الإمام فیما لیس بمعصیة فرض .

(۶/ ۴۱۶ ، کتاب الجهاد ، باب البغاة ، مطلب في وجوب طاعة الإمام)

ما في ’’ الموسوعة الفقهیة ‘‘ : أجمع العلماء علی وجوب طاعة أولي الأمر من الأمراء والحکام ، وقد نقل النووي عن القاضي عیاض وغیره هذا الإجماع . (۳۲۳/۲۸ ، طاعة ، طاعة أولي الأمر)

(۱۴) ما في ’’ القرآن الکریم ‘‘ : ﴿ولا تُسرفوا إن اللّٰه لا یحبّ المُسرفین﴾ . (سورة الأنعام: ۱۴۱) وقوله تعالی : ﴿کلوا واشربوا ولا تُسرفوا ، إنه لا یحب المُسرفین﴾ .

(سورة الأعراف : ۳۱)

ما في ’’ أحکام القرآن لإبن العربي ‘‘ : الإسراف تعدي الحد ، فنهاهم عن تعدي الحلال إلی الحرام، وقیل ألا یزیدوا علی قدر الحاجة . (۲/ ۲۸۱)

ما في ’’ القرآن الکریم ‘‘ : ﴿ولا تُبذِّر تبذیرًا ، إن المُبذِّرین کانوٓا إخوانَ الشیطِین﴾ .

(سورة الإسراء : ۲۶ ، ۲۷)

ما في ’’ التفسیر الکبیر للرازي ‘‘ : والتبذیر في اللغة : إفساد المال وانفاقه في السرف . (۳۲۸/۷)

ما في ’’ تفسیر السمرقندي ‘‘ : قال تعالی : ﴿إن المبذّرین﴾ أي ؛ المنفقین أموالهم في غیر طاعة اللّٰه تعالی ، کانوا اخوان الشیاطین یعني أعوان الشیاطین . (۲۶۶/۲) وفیه : ﴿ولا تبذر تبذیرً﴾ .... أي ؛ لا تنفق مالک في غیر طاعة اللّٰه تعالی . (۲۶۵/۲)=

....

=ما في " صحيح البخاري " : عن المغيرة بن شعبة قال : قال النبي ﷺ : " إن الله حرّم عليكم عُقوق الأمهات ، ووأد البنات ، ومنع وهات ، وكره لكم قيل وقال ، وكثرة السوال ، وإضاعة المال". (۱/۳۲۴ ، رقم : ۲۴۰۸ ، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر الخ ، باب ما ينهى عن إضاعة المال ، صحيح مسلم : ۲/۷۶ ،كتاب الأقضية)

ما في " فتح الباري لإبن حجر " : قوله : (وإضاعة المال) وقد قال الجمهور : إن المراد به السرف في إنفاقه . (۵/۸۶)

ما في " الموافقات في أصول الأحكام للشاطبي " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين ، والنفس ، والنسل، والمال ، والعقل . (۲/۴ ، كتاب المقاصد ، المسئلة الأولى)

(۱۵) ما في " الألعاب الرياضية " : يقول يوسف القرضاوي حفظه الله : والحق أن السفه في إنفاق الأوقات أشد خطرًا من السفه في إنفاق الأموال .... لأن المال إذا ضاع قد يعود ، والوقت إذا ضاع لا عوض له . (ص/۳۲۰ ، ط : مكتبة دار النفائس ، أردن)

(۱۶) ما في " الموافقات في أصول الأحكام للشاطبي " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين ، والنفس ، والنسل، والمال ، والعقل . (۲/۴ ، كتاب المقاصد ، المسئلة الأولى)

(۱۷) ما في " صحيح البخاري " : عن أنس بن مالك – رضي الله عنه – قال : قال رسول الله ﷺ : " ما مِن مُسلمٍ يَغرِسُ غَرسًا أو يَزرَعُ زرعًا فيأكل منه طيرٌ أو إنسانٌ أو بهيمةٌ إلا كان له به صدقةٌ " . (۱/۳۱۲ ، كتاب المزارعة ، باب فضل الزرع والغرس إذا أكل منه ، رقم : ۲۳۲۰ ، صحيح مسلم : ۲/۲۱ ، كتاب المساقاة والمزارعة ، باب باب فضل الغرس والزرع ، رقم : 1553/۳۹۵۰ ، ط : احياء التراث ، جامع الترمذي : ۲/۳۶۶ ، كتاب الأحكام ، باب ما جاء في فضل الغرس ، رقم : ۱۳۸۲ ، ط : بيروت ، مسند أحمد بن حنبل : ۳/۲۲۸ ، رقم : ۱۳۴۱۳ ، مسند أنس بن مالك رضي الله عنه ، ط: مؤسسة قرطبة القاهرة ، فتح الباري :۵/۳ ، ط: دار المعرفة بيروت)

(۱۸) ما في " الموسوعة الفقهية " : ورد في فضل الغرس والزرع أحاديث منها : ما رواه أنس رضي الله عنه ، عن النبي ﷺ قال : " ما مِن مُسلمٍ يَغرِسُ غَرسًا أو يَزرَعُ زرعًا فيأكل منه طيرٌ أو إنسانٌ أو بهيمةٌ إلا كان له به صدقةٌ " . ومقتضى هذا الحديث أن أجر ذلك يستمرُّ ما دام الزرع والغرس مأكولا منه ولو مات زارعه وغارسه ، ولو انتقل ملكه إلى غيره ، وظاهر الحديث أن الأجر يحصل للغارس ولو كان ملكه لغيره . (۳۱/۱۷۳ ، غرس ، الأحكام المتعلقة بالغرس ، أولا : فضل الغرس ، فتح الباري :۵/۴ ، ط: دار المعرفة بيروت ، الموسوعة الفقهية: ۸/۴۹ ، بذر ، =

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=و: ۲۰۳/۳۲ ، فلاحة ، التعريف ، و: ۲۳۹/۳۴ ، كسب ، المفاضلة بين أنواع المكاسب المختلفة)

ما في " كتاب الكسب للإمام محمد بن حسن الشيباني " : ثم المكاسيب أربعة : الإجارة ، والتجارة ، والزراعة ، والصناعة ، وكل ذلک في الإباحة سواء عند جمهور الفقهاء . (ص/۲۸۱)

ما في " فتح الباري لإبن حجر" : قال الماوردي : أصول المكاسب – الزراعة ، والتجارة ، والصنعة . والأشبه بمذهب الشافعي أن أطيبها التجارة . قال : والأرجح عندي أن أطيبها الزراعة ؛ لأنها أقرب إلى التوكل .

(۳۸۴/۴ ، كتاب البيوع ، باب كسب الرجل وعمله بيده ، ط : دار السلام الرياض)

ما في " حاشية كتاب الكسب " : قال السرخسي : المكاسب أربعة : الإجارة والتجارة والزراعة والصناعة ، وكل ذلک في الإباحة سواء .... قال النووي : قال النبي ﷺ : " ما أكل أحد طعاماً قط خيرًا من أن يأكل من عمل يده ، وإن نبي اللّٰه داود عليه السلام كان يأكل من عمل يده " . فهذا صريح في ترجيح الزراعة والصنعة لكونهما من عمل يده . (ص/۲۸۱ ، ۲۸۲) (کفایت المفتی: ۳۷۰/۶،مسائلِ زراعت:ص/۱۶، ۱۷، زراعت کی فضیلت واہمیت،مؤلف:مفتی توقیر عالم قاسمی، ط:فرید بکڈ پو دہلی)

(۱۹) ما في " مشكوة المصابيح " : عن جابر رضي اللّٰه عنه قال : قال رسول اللّٰه ﷺ : " من كانت له أرض فليزرعها ، أو ليمنحها أخاه ، فإن أبى فليمسک أرضه " . متفق عليه . (ص/۲۵۷)

صوتی آلودگی

صوتی آلودگی بھی انسان کے لیے کچھ کم مضرت رساں نہیں، اور یہ شوراور غیر معتدل آواز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس پس منظر میں درج ذیل اُمور پر روشنی ڈالنے کی درخواست ہے:

سوال :۱- کارخانے کی بعض مشینیں بہت پُر شور ہوتی ہیں، حکومت کی طرف سے ان کو آبادی سے باہر لگانے کی ہدایت ہوتی ہے، یہ ہدایت شرعاً کس حد تک قابلِ تعمیل ہے؟

جواب :۱- حکومت کی اس ہدایت پر عمل کرنا واجب ہے۔[۱]

سوال :۲- گاڑیوں کے ہارنوں کی آواز بھی بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، بعض لوگ غیر ضروری طور پر ہارن بجاتے ہیں، اور بعض حضرات اپنی گاڑی میں ضرورت سے زیادہ تیز آواز کا ہارن یہاں تک کہ ایمبولنس میں لگائے جانے والے سائرن کی طرح کے ہارن لگاتے ہیں، اس سے صوتی آلودگی بھی پیدا ہوتی ہے، اور دوسرے راہ گیروں کو دہشت بھی ہوتی ہے، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب :۲- غیر ضروری طور پر ہارن بجانا، یا تیز آواز کا ہارن لگانا جس سے صوتی آلودگی ہوتی ہے، شرعاً منع ہے، اس لیے کہ اس میں ایذائے غیر لازم آتی ہے[۲]، اور ایذائے غیر ظلم ہے، جو شرعاً ممنوع وحرام ہے۔[۳]

سوال : ۳- ہمارے معاشرے میں بدقسمتی سے مختلف تقریبات میں ڈی جے (D.J) کا رواج بڑھتا جارہا ہے، اس کا شور انسان کی سماعت اور ماحول کے لیے

سخت نقصان دہ ہے، مزامیر میں داخل ہونے سے قطعِ نظر اس عمل کو شریعت کس نظر سے دیکھتی ہے؟

جواب :۳- مذکورہ بالا وجہ کی بنا پر، یہ بھی شرعاً ممنوع وحرام ہے۔[۴]

سوال :۴- ہمارے معاشرے میں مذہبی، سیاسی جلسوں اور مشاعروں کا رواج بھی عام ہے، قانونی اعتبار سے اس کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، مثلاً رات کے دس یا ساڑھے دس بجے تک، کہ اس کے بعد پروگرام جاری نہیں رکھا جاسکتا، اسی طرح آواز کے بارے میں بھی تحدید ہوتی ہے کہ کس درجے کا ساؤنڈ سسٹم ہونا چاہیے؟ اور کتنے ساؤنڈ بکس رکھے جاسکتے ہیں؟ اس کا مقصد لوگوں کی صحت اور ماحولیات کا تحفظ دونوں ہوتا ہے؛ لیکن بہت سے لوگ ان ہدایات پر عمل نہیں کرتے، آواز کا شور پوری آبادی تک پہنچاتے ہیں، اور رات رات بھر پروگرام چلائے جاتے ہیں، شرعاً ان قوانین کی پابندی کس درجے میں ضروری ہے؟ اوران کی خلاف ورزی کا کیا حکم ہے؟

جواب :۴- حکومت کے اس طرح کے قوانین کا پاس ولحاظ واجب ہے، اوران کی خلاف ورزی حرام ہے[۵]، اس لیے کہ اس میں ایذائے غیر ہے، جو شرعاً ممنوع وحرام ہے۔[۶]

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " الدر المختار مع الشامية " : طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض .

(۲۱۶/۶، كتاب الجهاد ، باب البغاة ، مطلب في وجوب طاعة الإمام)

ما في " الموسوعة الفقهية " : أجمع العلماء على وجوب طاعة أولي الأمر من الأمراء والحكام ، وقد نقل النووي عن القاضي عياض وغيره هذا الإجماع . (۳۲۳/۲۸، طاعة ، طاعة أولي الأمر)

(۲) ما في " صحيح البخاري " : عن عبد الله بن عمر عن النبي ﷺ قال : " المسلم من سلم =

....

=المسلمون من لسانه ويده " . (۱/٦، كتاب الإيمان ، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده ، صحيح مسلم : ۱/۴۸ ، كتاب الإيمان ، باب بيان تفاضل الإسلام وأي أموره أفضل)

ما في " صحيح مسلم " : قوله ﷺ : " الإيمان بضع وسبعون أو بضع وستون شعبة ، فأفضلها قول لا إله إلا الله ، وأدناها إماطة الأذى عن الطريق ، والحياء شعبة من الإيمان " .

(۱/۴۷ ، كتاب الإيمان ، باب بيان عدد شعب الإيمان وأفضلها وأدناها . الخ)

ما في " حاشية أبي داود " : قوله ﷺ : " إياكم والجلوس بالطرقات " . " ويدخل في الأذى أن يضيق الطريق على المارّين " . [رقم الحاشية : ۲] .

(سنن أبي داود: ص/٦٦٣ ، كتاب الأدب ، باب في الجلوس بالطرقات)

ما في " مرقاة المفاتيح " : فيه إشارة إلى أن علامة الإسلام هي السلامة من إيذاء الخلائق كما أن الكذب والخيانة وخلف الوعد وعلامة المنافق . (۱/۱۳۸)

ما في " جمع الجوامع " : عن أبي حذيفة بن أُسيد أن النبي ﷺ قال : " من آذى المسلمين في طرقهم وجبت عليه لعنتهم " . (٦/۳۹٦ ، حرف الميم مع النون ، رقم :۲۰۰۳٦)

(۳) ما في " الموسوعة الفقهية " : أصل الظلم في اللغة : وضع الشيء في غير موضعه ، والجور ومجاوزة الحد ، والميل عن القصد .(۲۹/۱٦۹ ، ظلم)

وفيه أيضًا : الظلم محرم ، دل على حرمته الكتاب والسنة والإجماع ، أما الكتاب فمنه قوله تعالى : ﴿إن الذين كفروا وظلموا لم يكن الله ليغفر لهم ولا ليهديهم طريقا﴾ . الآية .... وأما السنة فمنها : حديث أبي ذر رضي الله عنه ، عن النبي ﷺ فيما روي عن الله تعالى أنه قال : يا عبادي ! إني حرّمت الظلم على نفسي وجعلت بينكم محرما فلا تظالموا " . الحديث .... وأجمع الفقهاء على تحريم الظلم . (۲۹/۱۷۰ ، ظلم ، الحكم التكليفي)

(۴) (دیکھیے : حاشیہ مذکورہ بالا: ۲-۳)

(۵) ما في " الدر المختار مع الشامية " : طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض .

(٦/۴۱٦ ، كتاب الجهاد ، باب البغاة ، مطلب في وجوب طاعة الإمام)

ما في " الموسوعة الفقهية " : أجمع العلماء على وجوب طاعة أولي الأمر من الأمراء والحكام ، وقد نقل النووي عن القاضي عياض وغيره هذا الإجماع . (۲۸/۳۲۳ ، طاعة ، طاعة أولي الأمر)

(٦) (دیکھیے : حاشیہ مذکورہ بالا : ۲ – ۳)

سرکاری اسکیموں سے استفادہ

سوال: ۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۱- شرعاً قرض کا حکم یہ ہے کہ جتنا قرض لیا جائے، اتنا ہی ادا بھی کیا جائے(۱)، لیکن اگر صاحبِ قرض اس میں سے کچھ حصہ مقروض سے ساقط ومعاف کردے، تو یہ جائز ہے(۲)، چنانچہ اگر حکومت کی طرف سے دیئے گئے قرضوں میں سے بطورِ امداد واعانت کے کچھ حصہ معاف کردیا جائے(۳)، تو اس طرح کے قرضوں کا لینا جائز ہے۔

سوال: ۲- معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے؟ جب کہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

جواب: ۲- یہ صورت بھی جائز ہے۔(۴)

سوال: ۳- اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۳- قرض جتنا لیا اُتنا ہی واپس کرنا چاہیے(۵)، یہاں چوں کہ کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑ رہی ہے، جو ربوا کی صورت ہے، اس لیے جائز نہیں ہے۔(۶)

سوال :۴- غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو، تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرے میں آئے گا؟ یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی؟

جواب :۴- انتظامی خرچ (سروس چارج) شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی۔ یہ سود کے دائرے میں نہیں آئے گا۔ (۷)

سوال :۵- [الف]: اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو، کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

[ب]: واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لیے بھی ہوتے ہیں، تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

جواب :۵- [الف]: یہ سود کے دائرے میں آتا ہے، لہٰذا جائز نہیں ہے۔ (۸)

[ب]: اس میں کوئی فرق نہیں ہے، یعنی چاہے وہ قرض کسی بھی ضرورت سے لیا گیا ہو، اگر اس پر سود ادا کرنا پڑے، تو وہ ربوا میں شامل ہے جو کہ حرام ہے۔ (۹)

سوال :٦- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل اِمداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلا کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لیے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم

ہے؟ جب کہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی، اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اِعانت ہوتی ہے۔

جواب :۶- گورنمنٹ کی طرف سے اس طرح کی رقوم (جن کو مع سود کے واپس کرنا نہیں پڑتا) لینا جائز ہے۔ (۱۰)

سوال :۷- گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم- جس قوم کی بھی ہوں- ان کے حصول کے لیے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے، اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لیے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب :۷- شرعاً یہ دلالی اور سمسرہ ہے، اور حاجاتِ ناس کی بنا پر دلالی وسمسرہ کی اُجرت جائز ہے۔ (۱۱)

سوال : ۸- بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب :۸- یہ درست نہیں ہے۔ (۱۲)

سوال : ۹- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لیے اگر رشوت دینی پڑے، تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب :۹- مجبوری میں رشوت دی جاسکتی ہے۔ (۱۳)

سوال :۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے پر امداد یا

قرض سے فائدہ اُٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب : ١٠- کذب وخیانت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ (١٤)

سوال : ١١- بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے، اوراس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے، اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب : ١١- اگر پورا سود حکومت ادا کرتی ہے، تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔ (١٥)

سوال : ١٢- بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اوراس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے، اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب : ١٢- اگر استفادہ کرنے والے حضرات واقعی مستحق ومحتاج ہیں، تو ان کے لیے اس طرح کی رقم لینا جائز ہونا چاہیے۔ (١٦)

الحجة على ما قلنا :

(١) ما في " رد المحتار " : إن الديون تقضى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض؛ لأن قبضه بنفسه على وجه التملك ، ولرب الدين على المديون مثله . (٦٧٥/٥)

ما في " بحوث في قضايا فقهية معاصرة " : القرض يجب في الشريعة الإسلامية أن تقضى بأمثالها .... والذي يتحقق من النظر في دلائل القرآن والسنة ، ومشاهدة معاملات الناس أن المثلية المطلوبة في القرض هي المثلية في المقدار والكمية ، دون المثلية في القيمة والمالية . (ص/١٧٤)=

....

=مـا فـي ” الفتاوى الهندية “ : والقرض هو أن يقرض الدراهم والدنانير أو شيئًا مثليًا يأخذ مثله في ثاني الحال . (۳٦٦/۵)

(۲) مـا في ” درر الحكام شرح مجلة الأحكام “ : يسقط حق المبرأ منه [ا] إذا كان قابلا للإسقاط . [۲] إذا وقـع الإبـراء مشـروعًا . [۳] إذا لم يكن لفظ الإبراء مقيدًا بقيد يفيد الشک . [۴] إذا كان الإبراء غير معلق بشرط . (۸۰/۴ ، أحكام الإبراء)

(۳) مـا فـي ” تـنـويـر الأبـصـار وشـرحـه “ : الهبة : هي شرعًا تمليک العين مجانًا أي بلا عوض، وسببهـا إرادة الـخيـر لـلواهب ، وينوى كعوض ومحبة وحسن ثناء . (رد المحتار :۴۲۳/۸ ، كتاب الهبة ، الدر المنتقى شرح الملتقى : ۴۸۹/۳ ، كتاب الهبة ، البحر الرائق :۴۸۳/۷)

مـا فـي ” الاختيـار لتـعـليل المختار “ : الهبة : وهي العطية الخالية عن تقدم الاستحقاق ، وهي أمر مندوب وضيع محمود محبوب وقبولها سنة فإنه قبل هدية العبد . (۵۳۳/۲، كتاب الهبة)

ما في ” فتح باب العناية “ : هي تمليک عين بلا عوض ومعناها إيصال ما ينفع مالا كان أو غيره . (۴۰۹/۲ ، كتاب الهبة)

(۴) مـا فـي ” درر الـحكام شرح مجلة الأحكام “ : لو قال الدائن لمدينه : أعطني غدًا نصف الألف درهـم الـمـطلوبة منک على أن تكون بريئًا من النصف الآخر فأعطى المدين في الغد النصف للدائن يبرأ من النصف الآخر . (۶۹/۴ ، ۷۰ ، المسائل المتعلقة بأحكام الإبراء)

وفيـه أيـضًـا : إذا قـال أحـد : .... أبـرأت فـلانا من حقي ، أو جعلت حقي من فلان حلالا له ، أو وهبـت حقي من فلان له ، أو تركت دعواي مع فلان ..... أو تركت مطلوبي من فلان فيكون قد أبرأه .... ويدخل في هذا الإبراء الأمانات والمضمونات التي هي من الحقوق المالية .

(۶۷/۴، الفصل الثاني – في المسائل المتعلقة بأحكام الإبراء)

وفيه أيضًا : أما إذا لم يؤد المدين النصف غدًا فلا يبرأ المدين من النصف وللدائن مطالبته بالكل . (۷۰/۴)

(۵) مـا فـي ” رد الـمـحتـار “ : إن الـديـون تـقـضـى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض؛ لأن قبضه بنفسه على وجه التملک ، ولرب الدين على المديون مثله .(۲۷۵/۵)

ما في ” بحوث فقهية قضايا معاصرة “ : القرض يجب في الشريعة الإسلامية أن تقضى بأمثالها .... والـذي يتحقق من النظر في دلائل القرآن والسنة ، ومشاهدة معاملات الناس أن المثلية المطلوبة في القرض هي المثلية في المقدار والكمية دون المثلية في القيمة والمالية . (ص/۱۷۴)=

....

=(۲) ما في " القرآن الكريم " : ﴿أحل الله البيع وحرم الربوا﴾ . (سورة البقرة :۲۷۵)

مـا فـي " صـحيـح مسـلـم " : عـن جـابـر قـال : " لـعـن رسول الله ﷺ اكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال : هم سواء " . (۲/ ۲۷ ، كتاب المساقات والمزارعة ، باب لعن آكل الربا وموكله)

مـا فـي " صـحيـح البـخـاري " : عـن عون بن أبي جحيفة قال : رأيتُ أبي اشترى عبدًا حجامًا فأمر بـمـحـاجمه فكُسرتْ فسألته ، فقال : " نهي النبي ﷺ عن ثمن الكلب وثمن الدم ونهى عن الواشمة والـمـوشـومة ، وآكل الربا وموكله ، ولعن المصور " . (۱/ ۲۸۰ ، كتاب البيوع ، باب موكل الربا ، رقم : ۲۰۸٦ ، سنن ابن ماجه :ص/ ١٦٥ ، باب التغليظ في الربوا ، ط : قديمي)

مـا فـي " سنن ابن ماجة " : عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال : قال رسول الله ﷺ : " الربوا سبعون حوباً ، أيسرها أن ينكح الرجل أمه". (ص/ ١٦٤ ، باب التغليظ في الربوا)

مـا فـي " التـنـوير وشرحه مع الشامية " : قال صاحب التنوير التمرتاشي : الربا شرعًا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة . (تنوير الأبصار) . (۷/ ۳۹۸ – ۴۰۱)

(فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۳۰۲،۳۰۴، ۳۰۷، بینک سے سودی قرض لینا، ط: کراچی)

(۷) ما في " المبسوط للسرخسي " : اعلم أن الإجارة عقد على المنفعة بعوض هو مال . اهـ .

(۱۵/ ۸٦ ، كتاب الإجارات ، ط : بيروت)

(۸) مـا في " التنوير وشرحه مع الشامية " : قال صاحب التنوير التمرتاشي : الربا شرعًا فضل خال عـن عـوض بـمـعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة . (تنوير الأبصار) . (۷/ ۳۹۸ – ۴۰۱) (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۳۰۲،۳۰۴، ۳۰۷، ۳۰۸، بینک سے سودی قرض لینا، ط: کراچی)

(۹) (التنوير وشرحه مع الشامية :۷/ ۳۹۸ – ۴۰۱)

(فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۳۰۲،۳۰۴، ۳۰۷، بینک سے سودی قرض لینا، ط: کراچی)

(۱۰) مـا فـي " الاختيار لتعليل المختار " : الهبة : وهي العطية الخالية عن تقدم الاستحقاق ، وهي أمر مندوب وضيع محمود محبوب وقبولها سنة فإنه قبل هدية العبد . (۲/ ۵۳۳، كتاب الهبة)

ما في " فتح باب العناية " : هي تمليک عين بلا عوض ومعناها إيصال ما ينفع مالا كان أو غيره .

(۲/ ۴۰۹ ، كتاب الهبة)

(۱۱) مـا فـي " صـحيـح البـخـاري " : بـاب أجرة السمسرة – ولم ير ابن سيرين وعطاء وابراهيم والـحسـن بـأجر السمسار بأساً ، وقال ابن عباس : لا بأس أن يقول : بع هذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهو لک ، وقال ابن سيرين : إذا قال : بعه بكذا وكذا فما كان من ربح فهو لک=

....

= أو بيني وبينک فلا بأس به . (۱/۳۰۳ ، کتاب الإجارة ، باب أجر السمسار)

ما في" عمدة القاری شرح صحيح البخاری" : قال ابن عباس : لا بأس أن يقول : بع هذا الثوب فما زاد علی کذا وکذا فهو لک ، علقه البخاري ، ووصله ابن أبي شيبة عن هشيم عن عمرو بن دينار عن ابن عباس نحوه وهذا سند صحيح . (۱۱/۳۰۴)

ما فی " اعلاء السنن" : وشرط جوازها عند الجمهور أن تکون الأجرة معلومة ، قلت: والحاصل أن أجرة السمسار ضربان: إجارة وجعالة، فالأول يکون مدة معلومة يجتهد فيها للبيع ، وهذا جائز بلا خلاف، فإن باع قبل ذلک أخذ بحسابه، وإن انقضی الأجل أخذ کامل الأجرة .

(۱۶/ ۲۴۴، ۲۴۵)

ما في " خلاصة الفتاوی " : وفي الأصل : أجرة السمسار والمغاري والحمامي والصکاک ، وما لا تقدير فيه للوقت ، ولا مقدار لما يستحق بالعقد ، لکن للناس فيه حاجة جاز ، وإن کان في الأصل فاسدًا .(۳/۱۱۶ ، کتاب الإجارات ، جنس آخر في المتفرقات)

ما في " رد المحتار " : قال في " التاتر خانية " : وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن في کل عشرة دنانير کذا فذاک حرام عليهم . وفي " الحاوی " : سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار ، فقال : أرجو أنه لا بأس به وإن کان في الأصل فاسداً لکثرة التعامل ، وکثير من هذا غير جائز فيجوزوه لحاجة الناس إليه کدخول الحمام . (۹/۷۵ ، کتاب الإجارة ، مطلب فی أجرة الدلال ، المبسوط للسرخسي : ۵/۱۲۸ ، باب السمسار)

ما في " الفتاوی البزازية علی هامش الهندية " : إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصکاک وما لا يقدر فيه الوقت ولا مقدار العمل لما کان للناس به حاجة جاز ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل . (۵/۴۰ ، نوع فی المتفرقات)

ما في " رد المحتار " : قال في البزازية : إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصکاک وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما کان للناس به حاجة ، ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل .

(۹/۶۴ ، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة ، کذا في خلاصة الفتاوی : ۳/۱۱۶ ، کذا في الفتاوی الهندية : ۴/۴۵۰) (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۶۱۷،۶۱۸،باب أجرة الدلال والسمسار،ط: کراچی)

(۱۲) ما في " سنن الدار قطني " : عن أبي سعيدٍ الخدري قال : " نهی عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان " . (۳/۴۲ ، رقم : ۲۹۶۶ ، السنن الکبری للبيهقي : ۵/۵۵۶ ، رقم : ۱۰۸۵۴ ، نصب الراية للزيلعي : ۴/۳۳۴)=

....

=ما في " الدر المختار مع الشامية " : ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه ، أي بنصف الغزل أو استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه ، أو ثورًا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل ، لأنه استأجره بجزء من عمله ، والحاصل في ذلک نهيه ﷺ عن قفيز الطحان . (در مختار) .

(۴۸/۹ ، ۴۹ ، كتاب الإجارة ، باب الإجارة الفاسدة ، مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر : ۳/۵۳۹ ، كتاب الإجارة ، تبيين الحقائق: ۱۲۷/۶ ، ۱۲۸ ، كتاب الإجارة ، باب الإجارة الفاسدة ، الفتاویٰ الهندية : ۴۴۴/۴ ، كتاب الإجارة ، الفصل الثالث في قفيز الطحان)

(۱۳) ما في " بذل المجهود " : فأما إذا أعطى ليتوصل به إلى الحق أو يدفع عن نفسه ظلمًا ، فإنه غير داخل في هذا الوعيد . (۳۰۶/۱۱ ، كتاب القضاء ، باب في كراهية الرشوة ، رقم : ۳۵۸۰)

ما في " رد المحتار " : ثم الرشوة أربعة أقسام : .... الثالث : أخذ المال ليسوي أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع ، وهو حرام على الآخذ فقط .... الرابع : ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله ، حلال للدافع حرام على الآ خذ .

(۳۴/۸ ، ۳۵ ، كتاب القضاء ، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية ، ط : بيروت)

(۱۴) ما في " صحيح مسلم " : عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالى عنه ، أن رسول اللّٰه ﷺ قال : "من حمل علينا السلاح فليس منا ، ومن غشنا فليس منا " .

(۱۷۷/۲ ، كتاب الإيمان ، باب قول النبي ﷺ : من غشنا فليس منا)

ما في " جامع الترمذي " : عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالى عنه ، أن رسول اللّٰه ﷺ ...... قال : "من غشّ فليس منا " . قال أبو عيسى: والعمل على هذا عند أهل العلم كرهوا الغشّ وقالوا : الغش حرام . (۲۴۵/۱)

ما في " الموسوعة الفقهية " : اتفق العلماء على أن الغشّ حرام ، سواء أكان بكتمان العيب فى المعقود عليه أو الثمن ، أم بالكذب والخديعة ، وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة و النصيحة . (۲۱۹/۳۱)

ما في " رياض الصالحين " : عن ابن مسعود رضي اللّٰه عنه ، عن النبي ﷺ قال : " إن الصدق يهدي إلى البرّ ، وإن البرّ يهدي إلى الجنة ، وإن الرجل ليصدُق حتى يُكتب عند اللّٰه صدّيقًا ، وإن الكذب يهدي إلى الفجور ، وإن الفجور يهدي إلى النار ، وإن الرجل ليكذِب حتى يُكتب عند اللّٰه كذّابًا " . متفق عليه . (ص/۴۶ ، رقم :۵۴ ، باب الصدق ، ط : مكتبة الإحسان ديوبند)

(۱۵) (التنوير وشرحه مع الشامية :۳۹۸/۷ – ۴۰۱)=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=(١٦) ما في " رد المحتار " : والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم ، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحلّ له ، ويتصدق به بنية صاحبه . (٣٠١/٧ ، كتاب البيوع ، مطلب فيمن ورث مالا حراما ، الموسوعة الفقهية : ٤٠٧/٣٩ ، الكسب الناشي عن الميسر ، الفتاوى الهندية : ٣٤٩/٥ ، كتاب الكراهية ، الباب الخامس عشر في الكسب)

ما في " بذل المجهود " : صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالاً بغير حق ، فأما إذا كان عند رجل مال خبيث ، فأما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه ، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء . (٣٥٩/١ ، كتاب الطهارة)
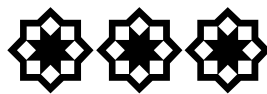
مقالہ

(۹ر واں فقہی اجتماع ''اِدارۃ المباحث الفقہیۃ، تحت اِشراف جمعیۃ علماء الہند'' [دیوبند، یوپی]
۲۱، ۲۲ر رجب المرجب ۱۴۳۴ھ/ مطابق: ۱، ۲ر جون ۲۰۱۳ء)

زمین کے کاروبار سے متعلق بندہ کی تحقیق

بندہ نے زمینوں کی پلاٹنگ کے کاروبار سے متعلق وابستہ افراد سے، اس معاملہ کی پوری تحقیق کی ہے، وہ تحقیق یہ ہے کہ مالکِ زمین خریدار کے ہاتھ پوری زمین بیچنے کا معاملہ کرلیتا ہے، قیمت کا کچھ حصہ نقد بطورِ اسار یعنی بیعانہ لیتا ہے، اور بقیہ قیمت کی ادائیگی کے لیے دونوں کی رضامندی سے ایک مدت طے ہوتی ہے، جسے اسٹامپ پیپر کے ذریعہ مؤکد کیا جاتا ہے، بقیہ قیمت کی ادائیگی میں خریدار کو سہولت ہو، اس لیے مالکِ زمین خریدار کو زمین پر قبضہ دے کر آگے تیسرے فریق کو فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے، خریدار اپنے پاس آنے والے گاہکوں کو مالکِ زمین کی طرف سے رجسٹری کر کے نہیں دیتا، بلکہ محض مالکِ زمین کی طرف سے اسٹامپ پیپر بنا دیتا ہے، ......ان اسٹامپ پیپروں کی حیثیت بھی محض معاہدۂ بیع کی ہوتی ہے، جو خریدار اول مالکِ زمین کی طرف سے گاہک کے ساتھ کرتا ہے، اب اگر خریدار اول مقررہ مدت کے اندر اندر پوری رقم مالکِ زمین کو ادا نہ کرسکے، تو خود اس کا اپنا معاہدہ - جو اس نے مالکِ زمین سے کیا تھا، وہ فسخ ہوجاتا ہے، اور اس نے اسار یعنی بیعانہ کی جو رقم دی تھی وہ بھی ڈوب جاتی ہے، نیز اس نے اپنے پاس آنے والے گاہکوں کو جو اسٹامپ پیپر

مالکِ زمین کی اجازت سے بنادیئے تھے، وہ بھی فسخ ہوجاتے ہیں، ......اس لیے زمینوں کے لین دین کی یہ صورت -حقیقۃً بیع نہیں، بلکہ معاہدۂ بیع ہے۔ [1]

ہاں! اگر مالکِ زمین خریداراول سے قطعی بیع کرلے، اوراس سے قیمت کا ایک حصہ نقد وصول کرلے، اور بقیہ قیمت کی ادائیگی کے لیے متعاقدین باہم رضامندی سے ایک مدت طے کرلیں، اور مدت کے پوری ہونے پرخریدار پوری قیمت ادانہ کرسکنے کی صورت میں بائع یعنی فروخت کنندہ اپنے لیے فسخِ بیع کا اختیار رکھے، تو اسے بیع بخیار النقد کہا جاتا ہے [2]، مگر اس صورت میں بھی جب تک خریدار مقررہ مدت پر پوری قیمت ادانہیں کرے گا، مبیع یعنی زمین اصل مالک ہی کی ملک میں رہے گی، خریداراس کا مالک نہیں ہوگا، ...... معلوم ہوا - معاہدۂ بیع - کی صورت ہو یا - بیع بخیار النقد - دونوں صورتوں میں جب تک معاملہ غیر یقینی صورتِ حال سے نہیں نکلے گا، اس وقت تک خریدار زمین کا مالک نہیں بنے گا [3]، اور نہ ہی اس کے لیے اس زمین کا آگے فروخت کرنا جائز ہوگا، کیوں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: " **لا تبع ما ليس عندك**". جو چیز اپنی ملک میں نہیں اُسے فروخت نہ کر۔ [4]

اب رہی یہ بات کہ خود مالکِ زمین خریدار کو اپنی اس زمین کے پلاٹ بنابنا کر آگے فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے، تاکہ خریدار کو پیمنٹ کی ادائیگی میں سہولت ہو، تو خریداراول اس زمین کو آگے کس حیثیت سے فروخت کررہا ہے؟ ...... مالک بن کر؟ ...... دلال بن کر؟ ...... یا وکیل بن کر؟ ...... ظاہر ہے ...... جب وہ خود، فی الحال اس زمین کا مالک نہیں، اور مالکِ زمین کے ساتھ اس کا اپنا معاہدہ غیر یقینی صورتِ حال

سے دوچار ہے-(کہ ہوسکتا ہے وہ پورا ہوجائے، اور یہ بھی امکان ہے کہ وقت پر قیمت ادانہیں کرسکا، تو فسخ ہوجائے)......تو اس کا اس زمین کو پلاٹ بنابنا کرآگے فروخت کرنا مالکانہ حقوق کے ساتھ کسی بھی طرح نہیں ہے، ......اس کی حیثیت یا تو دلال کی ہوگی[۵] یا وکیل کی[۶]، ......اور دلال یا وکیل-اپنی اجرتِ متعینہ کے حق دار ہوتے ہیں، نہ کہ پورے منافع کے۔[۷]

❁......❁......❁

زمینوں کی بیع کی بعض مروجہ صورتیں

سوال: ۱- آج کل زمینوں کی پلاٹنگ کے کاروبار میں یہ طریقہ متعارف ہے کہ مالکِ زمین خریدار کے ہاتھ پوری زمین بیچنے کا معاملہ کرلیتا ہے، لیکن اس معاملہ میں پوری رقم کی ادائیگی نقدنہیں ہوتی، بلکہ ایک مدت ۳/ماہ، یا ۶/ماہ کی طے کی جاتی ہے، اور بیع نامہ کے طور پر کچھ رقم مالک لے لیتا ہے، اور خریدار کو اس پوری زمین پر قبضہ دے کر اپنی مرضی سے کسی کے بھی ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت بھی دے دیتا ہے، اب خریدار بلڈر اس زمین کے پلاٹ بنا کرآگے بیچنا شروع کرتا ہے، اور جو گاہک آتا ہے اس رجسٹری مالک کی طرف سے اسی گاہک کے نام کراتا رہتا ہے، لیکن اگر مقررہ مدت کے اندر اندر پوری رقم نہ ملے، تو مالک پہلا معاملہ فسخ کردیتا ہے، اور دوسرے کے ساتھ نیا معاملہ کرنے کا مجاز ہوجاتا ہے، اور پہلے خریدار نے جن لوگوں کے ہاتھ پلاٹ فروخت کرنے کے لیے بیعانے لیے تھے، ان کو بھی یہ فسخ کردیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مقررہ مدت تک اس اصل معاملہ کی صورتِ حال غیر یقینی بھی رہتی ہے، اور وقت پر

ادائیگی نہ ہونے کی شکل میں بڑی مشکلات اور تنازعات کی نوبت پیش آتی ہے، اس صورتِ حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوال ہے کہ:

اس غیر یقینی عقد کے بعد خریدار کا دوسروں کے ہاتھ اس زمین کا بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ۱- اس غیر یقینی عقد کے بعد خریدار کا دوسروں کے ہاتھ اس زمین کا مالکانہ طور پر بیچنا جائز نہیں، لیکن دلال یا وکیل بن کر بیچ سکتا ہے۔

سوال: ۲- اگر بیچ دیا ہے، اور بائع کی مرضی سے باقاعدہ رجسٹری بھی کرادی ہے، تو اس سے حاصل شدہ قیمت اور نفع کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۲- جب خریدار اس غیر یقینی عقد کے بعد اس زمین کا مالک نہیں، اور بائع کی مرضی سے آگے گاہکوں کے ہاتھ اس نے اس کی بیع کی، تو اس کی حیثیت محض دلال یا وکیل بالاجرۃ کی ہے، لہٰذا وہ محض اپنی متعینہ اجرت اور عدم تعیّن کی صورت میں اجرتِ مثل کا حق دار ہوگا، پورے نفع کا نہیں۔ (۸)

سوال: ۳- بعض مرتبہ بیع نامہ دینے والوں کو معاملہ فسخ ہونے کی شکل میں ڈبل رقم دے کر انہیں درمیان سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو یہ عمل کرنا کیسا ہے؟

جواب: ۳- بیع نامہ دینے والوں کو معاملہ کے فسخ ہونے کی شکل میں محض اُن کے اسار کی رقم واپس کی جائے گی، ڈبل نہیں، ورنہ یہ معاملہ سودی ہو جائے گا، لہٰذا انہیں درمیان سے نکالنے کے لیے ڈبل رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہوگا۔ (۹)

سوال: ۴- اگر وقت پر مالک کو قیمت ادا کردی جائے، تو اس صورت میں بعد میں ہونے والے عقود کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۴- اگر وقت پر مالک کو قیمت ادا کردی جائے، اور معاملہ حتمی اور

قطعی شکل اختیار کرلے، تو اس معاملہ کے حتمی وقطعی شکل اختیار کرنے سے پہلے جو عقود کیے (یعنی خریدار نے بائع کی مرضی سے آگے گاہکوں کو اصل مالکِ زمین کی طرف سے جو اسٹامپ پیپر بنا کر دیئے)، وہ عقود اصل مالک کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے اور ان کی پوری قیمت کا حق دار اصل مالکِ زمین ہوگا، نہ کہ خریدار اول (بلڈر)۔

اب رہی یہ بات کہ خریدار اول (بلڈر) نے چوں کہ مالکِ زمین سے پوری زمین کا معاملہ کیا تھا، اور درمیان میں اس نے، اسی کی اجازت سے، آگے بہت سے گاہکوں کو اسٹامپ پیپر بنا کر دیئے تھے، اور وقت پر مالک کو پوری قیمت ادا کردینے کی صورت میں، جہاں وہ تمام معاہدے اصل مالک کے ساتھ قطعیت اختیار کرلیں گے، وہیں خود اس کا اپنا معاہدہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیگا، یعنی اس کا یہ معاملہ اصل مالکِ زمین کے ساتھ قطعی شکل اختیار کرلے گا، مگر چوں کہ اصل مالک کے پاس اتنی زمین باقی نہیں رہے گی، جتنی زمین کا معاملہ اس بلڈر کے ساتھ ہوا تھا، کیوں کہ بلڈر نے بائع کی مرضی سے آگے گاہکوں کو جو اسٹامپ پیپر بنا کر دیئے تھے، وہ اصل مالک کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے، لہٰذا اب بلڈر جس کے ساتھ پوری زمین کا معاملہ ہوا تھا، صرف ما بقیہ زمین کو اس کے حصۂ قیمت کے عوض لے گا۔

سوال: ۵- بار بار رجسٹری میں سرکاری طور پر خرچ ہونے والی رقم کو بچانے کے لیے مشتری بلڈر کا اپنے نام رجسٹری کرائے بغیر محض مالک کی اجازت سے قبضہ کے بعد پلاٹ بیچنا شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟ اور رجسٹری کے بغیر اس اجازت کو قبضہ کے درجہ میں مانا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ۵-اصل مالک کے ساتھ بلڈر کے معاملہ کے یقینی ہوجانے (یعنی مقررہ

مدت پر پوری قیمت ادا کردینے) کے بعد، چوں کہ بلڈر معاہدہ کے مطابق اس زمین کا مالک ہوجائے گا، اور مالک کی طرف سے آگے اس زمین کو بیچنے کی اجازت بھی ہے، کوئی مانع موجود نہیں، تو رفعِ موانع قبضے کے لیے کافی ہوگا، اور بار بار رجسٹری میں آنے والے خرچ سے بچنے کے لیے بلڈر اپنے نام رجسٹری نہ کراتے ہوئے، اصل مالک کے نام سے ڈائریکٹ گاہکوں کے نام رجسٹری کرادیتا ہے، تو اس کا یہ عمل جائز ودرست ہوگا(١٠)، ورنہ نہیں۔

حقوق کی بیع کی بعض صورتیں

حقوق کی بیع سے متعلق سوالوں کے جوابات دینے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حقوق کی قسموں کا استحضار کرلیں، پھر یہ غور کریں کہ جن حقوق کی بیع سے متعلق سوالات کیے گئے، وہ حقوق کی کس قسم میں داخل ہیں، تاکہ ان پر حکم شرعی کا ترتُّب آسان ہوجائے۔

حقوقِ مجردہ کی قسمیں:

جن حقوق کا عوض لینے پر فقہاء نے بحث کی ہے ان کا استقراء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حقوق کی دو قسمیں ہیں:

١- شرعی حقوق: حقوقِ شرعیہ سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا ثبوت شارع کی طرف سے ہوا ہے، قیاس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، یعنی اُن کا ثبوت اصحابِ حقوق کے لیے شارع کی طرف سے نص جلی یا نص خفی کی بنا پر ہوا ہے، اگر نص نہ ہوتی تو وہ حق ثابت نہ

ہوتا، مثلاً حق شفعہ، حق ولاء، حق وراثت، حق نسب، حق قصاص، بیوی سے متمتع ہونے کا حق، طلاق، حضانت اور ولایت کا حق، شوہر کی باری میں بیوی کا حق یعنی حق قسم۔

پھر حقوق شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقوق ضروریہ (۲) حقوق اصلیہ

حقوقِ ضروریہ - یعنی وہ حقوق جو اصالۃً ثابت نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اصحابِ حقوق سے ضرر دور کرنے کے لیے ان کی مشروعیت ہوئی ہے، مثلاً حق شفعہ۔

حقوقِ ضروریہ کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی طریقے سے ان کا عوض لینا جائز نہیں، نہ تو فروختگی کے ذریعہ، نہ صلح اور دست برداری کے ذریعہ۔

حقوقِ اصلیہ - یعنی وہ حقوق جو اصحابِ حقوق کے لیے اصالۃً ثابت ہوئے ہیں، ضرر دور کرنے کے لیے مشروع نہیں ہوئے۔

حقوقِ اصلیہ کا حکم یہ ہے کہ بیع کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے، یعنی اس کی گنجائش نہیں کہ خریدار کی طرف وہ منتقل ہوجائے، اور بائع کو جو استحقاق تھا وہی خریدار کی طرف منتقل ہوجائے، مثلاً حق قصاص - کہ مقتول کے ولی کے لیے جائز نہیں کہ قصاص لینے کا حق کسی کے ہاتھ بیچ دے اور ولی کے بدلے اس دوسرے شخص کو قصاص لینے کا حق حاصل ہوجائے، اسی طرح حق تمتع، یعنی شوہر کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنا حق تمتع کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دے، اور دوسرا شخص اس کی بیوی سے متمتع ہو، اسی طرح حق میراث۔ (۱۱)

الحاصل! یہ حقوق شرعاً قابل انتفاع نہیں ہوتے، یعنی نہ تو ان کی بیع ہوسکتی ہے، نہ ہبہ ہوسکتا ہے، نہ ان میں میراث جاری ہوتی ہے، البتہ صلح اور دست برداری کے ذریعہ ان حقوق کا معاوضہ لینا جائز ہے۔ (۱۲)

۲- عرفی حقوق: حقوقِ عرفیہ سے مراد وہ شرعی حقوق ہیں جن کا ثبوت اصحابِ حقوق کے لیے عرف وعادت کی بنا پر ثابت ہوا ہے، یہ حقوق اس اعتبار سے شرعی ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ نے عرف وتعامل کی بنا پر انہیں تسلیم کیا ہے، لیکن ان حقوق کا ماخذ عرف ہے، نہ کہ شریعت، مثلاً حق مُرور، حق شرب، حق تسییل وغیرہ۔

پھر حقوقِ عرفیہ کی کئی قسمیں ہیں:

اشیاء سے انتفاع کا حق،......یعنی مادی اشیاء کے منافع سے استفادہ کا حق، اگر یہ انتفاع متعین مدت کے لیے ہو تو اجارہ کے طور پر اس کا عوض لینا جائز ہے، اور اس پر اجارہ کے احکام جاری ہوں گے، مثلاً معین مدت کے لیے مکان میں سکونت سے استفادہ کرنا، لہٰذا مالک مکان کے لیے اس انتفاع کا عوض اس طرح لینا جائز ہے کہ وہ اپنا مکان معین مدت کے لیے طے شدہ کرایہ پر کسی کو دیدے، لیکن اگر مالک یہ منفعت دوسرے شخص کی طرف ہمیشہ کے لیے منتقل کرے، تو یہ اِس منفعت کی فروختگی ہے، جسے فقہاء احناف ''بیعِ حقوقِ مجردہ'' کا نام دیتے ہیں، جس کے جواز وعدم جواز میں حضرات فقہاء کرام کے مختلف نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں۔

حقوقِ مجردہ کے ذیل میں فقہاء کرام نے بہت سارے حقوق ذکر فرمائے ہیں:

(۱) حق مُرور (۲) حق تعلّی، (۳) حق تسییل، (۴) حق شُرب، (۵) دیوار پر لکڑی رکھنے کا حق، (۶) دروازہ کھولنے کا حق۔

فقہائے احناف کا مشہور قول یہ ہے کہ اِن حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت درست نہیں [۱۳]، لیکن متاخرین فقہاء نے ان میں سے بعض حقوق مثلاً حق تعلي، حق شرب اور حق تسییل وغیرہ میں صلح اور دست برداری کے ذریعہ ان کا معاوضہ لینے کو جائز قرار

دیا ہے۔[۱۴] ......البتہ فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی کتابوں میں معروف یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حقوق کا عوض لینا جائز ہے۔ (جدید معاشی نظام میں اسلامی قانونِ اجارہ:ص/۴۵۰، حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے:ص/۴۱۸تا۴۲۹)

حضراتِ فقہاء کے مابین حقوقِ مجردہ کی بیع کے جواز وعدم جواز کے اس اختلاف کی بنیاد اصلاً بیع کی تعریف ہے۔

فقہائے احناف کے مشہور قول کے مطابق بیع کی تعریف'' مبادلۃ المال بالمال بالتراضی''(مال کا تبادلہ مال سے کرنا عاقدین کی رضامندی کے ساتھ) ہے۔ '' **هو مبادلة المال بالمال بالتراضي** ''. (البحرالرائق:۵/ ۴۲۹)-اور مال کو عین یعنی مادی محسوس چیز کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، جب کہ دیگر بعض فقہاء نے'' ایک مرغوب چیز کا دوسری مرغوب چیز سے تبادلہ کرنا'' سے بیع کی تعریف کی۔'' **مبادلة شيء مرغوب بشيء مرغوب** ''. (بدائع:۶/ ۵۲۸)-لیکن مرغوب چیز سے مراداُن کے یہاں بھی ''مبادلۃ المال بالمال'' ہی ہے۔اور حقوقِ مجردہ اعیان یعنی مادی اور محسوس چیزیں نہیں ہیں، اس لیے ان حضرات نے حقوقِ مجردہ کی بیع کو ناجائز قرار دیا۔

فقہائے شافعیہ نے بیع کی تعریف ان الفاظ میں کی:'' **عقدٌ يتضمن مقابلة مال بمال بشرطه الآتي لاستفادة ملك عين أو منفعة مؤبدة** ''۔''بیع وہ عقد ہے جس میں مال کا تبادلہ مال سے ہوگا آنے والی شرطوں کے ساتھ تاکہ متعین مادی چیز کی ملکیت یا اس سے ابدی منفعت حاصل ہوجائے''۔

(حواشی الشروانی علی تحفۃ المحتاج:۴/ ۲۱۵، الموسوعۃ الفقہیۃ:۹/ ۵)

فقہائے حنابلہ نے بیع کی تعریف یوں کی:'' **مبادلة عين مالية أو منفعة مباحة مطلقًا بأن لا تختص إباحتها بحال دون آخر كممرّ دار أو بقعة تحفر**

بئرًا بأحدهما أي عين مالية أو منفعة مباحة مطلقًا فيشمل نحو بيع كتاب بكتاب أو بممرّ في دارٍ أو بيع نحو ممرّ في دار بكتاب أو بممر في دار أخرى "۔ ''بیع ایک مالیت رکھنے والی چیز کا تبادلہ ہے یا مطلق مباح منفعت کا تبادلہ ہے جس کی اباحت کسی ایک حال کے ساتھ مخصوص نہ ہو، (دوسری مالیت رکھنے والی چیز یا مطلق مباح منفعت) سے جیسے گھر کی گزرگاہ یا زمین کا وہ حصہ جس میں کنواں کھودا جائے، ان میں سے ایک کا دوسرے سے تبادلہ، یعنی ایک طرف عین مالیت اور دوسری طرف منفعت مباحہ،......لہٰذا یہ تعریف ان تمام صورتوں کو شامل ہوگی، کتاب کا کتاب سے تبادلہ، کتاب کا حق مرور سے تبادلہ، حق مرور کا کتاب سے تبادلہ، ایک گھر کے حق مرور کا دوسرے گھر کے حق مرور سے تبادلہ''۔

(شرح منتہی الارادات:۲/۱۴۰، الموسوعۃ الفقہیۃ:۹/۶)

فقہائے مالکیہ نے بیع کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:'' **عقد معاوضة على غير منافع ولا متعة لذة "**۔ ''بیع ایسا عقد معاوضہ ہے جو منافع پر نہ کیا جائے اور نہ ہی لذت حاصل کرنے کے لیے کیا جائے''۔

(مواہب الجلیل للحطاب:۴/ ۲۲۵، الموسوعۃ الفقہیۃ:۹/۵)

ان تعریفات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ نے بیع کی تعریف کو عام کر کے منافع کو بھی اس میں شامل کیا ہے، اس لیے اُن کے نزدیک اکثر حقوقِ مجردہ کی بیع جائز ہے۔

جوابات بابت حقوق

سوال: ا- آج کل بڑے شہروں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ:

[الف]: کوئی شخص میڈیکل اسٹوروں پر دوائی سپلائی کرتا ہے، اور مثلاً اس کے ۱۰۰/دکانوں سے روابط ہیں، اور اس نے لمبی محنت کر کے ان دکانوں سے ربط پیدا کیا ہے، اب اگر وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ کرتا ہے، تو ان متعینہ ۱۰۰/ دکانوں کی سپلائی کو کسی دوسرے کے ہاتھ متعین قیمت پر فروخت کر کے چلا جاتا ہے، گویا کہ وہ سپلائی کے حق کی قیمت دوسرے سے وصول کرتا ہے۔

[ب]: کوئی بڑی بلڈنگ جس میں دسیوں فلیٹ ہوتے ہیں، جب تیار ہوتی ہے، تو اخبار کا ہاکر اس کے منتظم سے بات کر کے یہ طے کرا لیتا ہے کہ ان سب فلیٹوں میں اخبار ڈالنے کا حق میرا ہوگا، چنانچہ جب وہ فلیٹ آباد ہوتے ہیں، تو یہی ہاکر ان کی طلب پر اخبار ڈالتا ہے، اور دوسرے ہاکر کو وہاں آنے کی اجازت نہیں ہوتی، پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہاکر اس جگہ کام کرنے سے ہٹنا چاہتا ہے، تو مذکورہ بلڈنگ میں اپنے اخبار ڈالنے کے حق کو کسی دوسرے شخص کی طرف معقول معاوضہ لے کر منتقل کر دیتا ہے۔

[ج]: اسی طرح بیکری کے پھیری لگانے والے لوگ اپنی ایک لائن بناتے ہیں، اور بعد میں اس لائن کو دوسرے کے ہاتھ عوض لے کر فروخت کر دیتے ہیں، وغیرہ، تو ان رائج صورتوں کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ: مذکورہ مروجہ معروف حقوق کے بدلہ میں عوض لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

جواب: ا- مذکورہ مروجہ معروف حقوق کے بدلہ میں عوض لینا شرعاً درست نہیں ہے۔

سوال: ۲- اور اگر کسی نے اس طرح عوض لے لیا ہو، تو وہ اب اس رقم کا کیا کرے؟

جواب: ۲- اگر کسی نے اس طرح عوض لے لیا، تو دوبارہ اس کے مالک کو واپس لوٹا دے۔

سوال: ۳- کیا عرفِ عام کی وجہ سے اس طرح کے حقوق کو مالِ متقوم کی حیثیت دی جاسکتی ہے؟

جواب: ۳- بیع میں مال کی شرط جوہری ہے، مال کی حقیقت نصوصِ شرعیہ نے متعین نہیں کی، پس اُس کا اصل مدار ہر عہد کے اُس عرف ورواج پر ہے جو شریعت سے متصادم نہ ہو، وہ تمام حقوق جن کی مشروعیت اصالۃً نہیں بلکہ صاحبِ حق سے کسی ضرر کو دور کرنے کے لیے ہوتی ہے، ایسے حقوق پر عوض لینا جائز نہیں، جیسے شفعہ۔

جو حقوق نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہوں، البتہ اُن سے مالی منفعت متعلق ہوگئی اور عرف میں اُن کا عوض لینا مروج اور معروف ہو چکا ہو، نیز ان کی حیثیت دفعِ ضرر کی نہ ہو، اور نہ وہ شریعت کے عمومی مقاصد ومصالح سے متصادم ہوں، ایسے حقوق پر عوض حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص/۱۴۲)

حقوق کی بیع سے متعلق اسلامک فقہ اکیڈمی کی اِس تجویز پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال نامہ میں مذکور حقوق کو مالِ متقوم کی حیثیت دے کر اُن کی بیع کو جائز نہیں کہا جاسکتا۔

جوابات بابت طویل مدتی کرایہ

سوال: ۱- ہندوستان کے طول وعرض میں یہ بات بکثرت سامنے آتی ہے کہ ایک شخص کسی دکان یا مکان کا کرایہ دار ہوتا ہے، اور وہ مکان سالوں سے معمولی کرایہ پر اس کے تصرف میں رہتا ہے، اور ملکی قانون کے اعتبار سے لمبی مدت سے قابض کرایہ

دار سے دکان یا مکان خالی کرانا سخت مشکل ہے، اب ہوتا یہ ہے کہ اگر اس کرایہ دار کا انتقال ہو جائے، اور اس کی کئی اولادیں ہوں، تو ان اولادوں میں جو چالاک ہوتا ہے، وہ مورِث کے مرنے کے بعد جوڑ توڑ کر کے مالک سے اپنے نام کرایہ داری کرالیتا ہے، اور اس جگہ پر قبضہ کر کے دیگر وارثین کو محروم کر دیتا ہے، اور کرایہ داری کا معاملہ ہونے کی وجہ سے دیگر وارثین کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کر پاتے، اس سے بظاہر ان کی سخت حق تلفی ہوتی ہے، تو اس صورتِ حال میں سوال یہ ہے کہ:

(۱) ایسے طویل مدتی کرایہ داروں کو شرعاً کرایہ دار ہی کے درجہ میں مانا جائے گا، یا مالک کے درجہ میں؟

جواب: ۱- طویل مدتی کرایہ داروں کو شرعاً کرایہ دار ہی کے درجہ میں مانا جائے گا، مالک کے درجہ میں نہیں۔ [۱۵]

سوال: ۲- اس طرح کی دکانوں اور مکانوں میں کرایہ دار کے انتقال کے بعد سب وارثین کا حق ہوگا یا نہیں؟

جواب: ۲- اس طرح کی دکانوں اور مکانوں میں کرایہ دار کے انتقال کے بعد وارثین کا حق نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ دکان یا مکان اُس کرایہ دار کی ملکیت نہیں ہے، جب کہ اِرث کے جاری ہونے کے لیے مالِ موروث میں مورِث کی ملک کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ [۱۶]

سوال: ۳- اگر ایک وارث قابض ہو کر دیگر وارثوں کو محروم کر دے، اور اپنے نام کرایہ داری کرالے، تو اس کا یہ عمل شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

جواب: ۳- اصل کرایہ دار کے انتقال کے بعد چوں کہ اُس کے ساتھ کرایہ داری

کا معاملہ ختم ہوجاتا ہے[۱۷]، اِس لیے اُس کے انتقال کے بعد اگر اُس کا کوئی وارث مالکِ مکان یا دکان سے ڈیل کرکے، کرایہ داری کا معاملہ اپنے نام کرالے، تو اس کا یہ عمل شرعاً درست ہے، اور اگر قانون کا سہارا لے کر اس مکان یا دکان پر قبضہ کیا، جب کہ مالک مکان یا دکان یا اس کے ورثاء موجود ہیں، جن کے ساتھ نیا کرایہ داری کا معاملہ کیا جاسکتا ہے، تو اُس کا یہ عمل شرعاً درست نہیں، بلکہ وہ حق غیر پر جبری قبضہ اور اسے استعمال کرنے کی وجہ سے سخت گنہگار ہوگا۔[۱۸]

سوال: ۴- اگر کرایہ دار کو مکان خالی کرنے کا کوئی معاوضہ ملتا ہے، تو اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس میں وراثت جاری ہوگی یا نہیں؟

جواب: ۴- کرایہ دار کا مکان یا دکان خالی کرنے کا عوض لینا سراسر ظلم اور گناہ ہے، اور وہ مال، مالِ حرام ہے، اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی، بلکہ اس کے اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے[۱۹]، ہاں! اگر کرایہ دار نے کرایہ کا معاملہ کرتے وقت مالک مکان یا دکان کو زرِ ضمانت دیا تھا، اور اس کے انتقال کے بعد اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں مالک مکان یا دکان وہ رقم ورثاء کو واپس کرتا ہے، تو اس میں وراثت جاری ہوگی۔

کرایہ داری میں ڈپازٹ کی شرعی حیثیت

سوال: ۱- آج کل بڑے شہروں میں مکانات کی کرایہ داری میں بھاری مقدار میں پیشگی رقم ڈپازٹ کے عنوان سے لینے کا معمول بن چکا ہے، اب اس میں کئی شکلیں ہوتی ہیں: [**الف**]: اگر ڈپازٹ کی رقم معمولی ہوتی ہے، تو ماہانہ کرایہ کی رقم زیادہ ہوتی ہے، اور جب کرایہ دار جائداد خالی کرتا ہے، تو مالک اسے ڈپازٹ کی رقم لوٹا دیتا ہے۔

[ب]: اگر ڈپازٹ کی رقم بھاری مقدار میں ہو، تو ماہانہ کرایہ کی رقم بہت معمولی ہوتی ہے، اور بہر صورت جب بھی جائداد خالی ہوتی ہے، تو مالک ڈپازٹ کی پوری رقم واپس کرنے کا ضامن ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ:

(ا)اس طرح کا عقد شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ا- اگر ڈپازٹ کی رقم معمولی ہوتو ماہانہ کرایہ کی رقم زیادہ، اوراگر ڈپازٹ کی رقم بھاری مقدار میں ہوتو ماہانہ کرایہ کی رقم بہت معمولی۔ معاملہ کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ ’’ **كلّ قرض جرّ نفعاً فهو ربا** ‘‘کے تحت داخل ہے۔

سوال: ۲- ڈپازٹ کی رقم کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ قیمت ہے یا رہن ہے یا امانت ہے؟

جواب: ۲- ڈپازٹ کی رقم رہن اور زرِ ضمانت ہے۔

سوال: ۳-اس ڈپازٹ کی رقم کو مالک جائداد کے لیے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ۳-ڈپازٹ کی اس رقم کو مالکِ جائداد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔

سوال: ۴- اگر یہ معاملہ جائز نہ ہو، تو کیا اس کو شرعی جواز کے دائرے میں لانے کی کوئی اور شکل ہے؟

جواب: ۴- اس معاملہ کو شرعی جواز کے دائرہ میں لانے کے لیے یہ شکل اپنائی جاسکتی ہے کہ زرِ ضمانت کے طور پر دی جانے والی رقم کو پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، اور مالک مکان یا دکان اس سے اپنے کرایہ کی متعینہ رقم بتدریج منہا کرتا جائے، اس طرح کرنے سے مالک مکان ودکان اس رقم کا مالک بن جائے گا، اس کا استعمال اس کے لیے درست ہوگا، اور اس کی زکوۃ بھی اس پر واجب ہوگی، نیز کرایہ کی رقم پیشگی وصول

ہونے کی وجہ سے مکان یا دکان کے مروجہ کرایہ میں کمی کرنا یہ بھی شرعاً جائز ہوگا، جیسے نقد اور ادھار بیع میں قیمتوں کا تفاوت جائز ودرست ہے، برخلاف اس کے کہ ڈپازٹ اور زرِ ضمانت کو قرض کے حکم میں قرار دے کر مالک اور کرایہ دار کو یہ تلقین کرنا کہ وہ اس قرض کی بنا پر مروجہ کرایہ میں کمی بیشی نہ کریں، محلِ غور ہے، کیوں کہ مشاہدہ یہ ہے کہ عام طور پر کرایہ داری کے معاملات میں یہی ہوتا ہے کہ جس قدر زرِ ضمانت زیادہ دیا جاتا ہے، کرایہ کم رکھا جاتا ہے، اور زرِ ضمانت کے کم ہونے کی صورت میں کرایہ زیادہ متعین کیا جاتا ہے، اور ظاہر ہے معاملہ کی یہ صورت شبہ ربا سے خالی نہیں۔

سوال: ۵- اس ڈپازٹ کی رقم کی زکوۃ کس پر واجب ہے، کرایہ دار پر، یا مالک پر؟ یا کسی پر واجب نہیں؟

جواب: ۵- ڈپازٹ کی اس رقم کو اگر قرض قرار دیا جاتا ہے، تو مالک مکان ودکان پر اس کی زکوۃ واجب نہیں، البتہ واپس ملنے کی صورت میں کرایہ دار پر اس کی زکوۃ واجب ہوگی، اور سنینِ ماضیہ کی زکوۃ بھی ادا کرنی ہوگی۔ (۲۰)

اور اگر اسے رہن قرار دیا جاتا ہے، تو اس کی زکوۃ نہ مالک مکان ودکان پر واجب اور نہ کرایہ دار پر، کیوں کہ شئ مرہون کی زکوۃ نہ تو راہن پر لازم ہوتی ہے اور نہ مرتہن پر، اس لیے کہ راہن کی ملک ہے مگر قبضہ نہیں، اور مرتہن کا قبضہ ہے مگر ملک نہیں، حالانکہ وجوبِ زکوۃ کے لیے ملکِ تام کا ہونا ضروری ہے۔ (۲۱)

اور اگر اسے پیشگی کرایہ قرار دیا جاتا ہے، تو اس کی زکوۃ مالک مکان ودکان پر واجب ہوگی، کیوں کہ وہ اس رقم کا مالک بھی ہے اور قابض بھی۔ (۲۲)

نوٹ-: بندہ کی حقیر سی رائے یہ تھی کہ جب جمعیت کے پلیٹ فارم سے اتنے اہم وابتلاء عام مسئلہ پر سیمینار ہونے جارہا ہے، تو بہتر ہوتا کہ تمام علاقوں اور ریاستوں سے اس کاروبار سے جڑے اہم بڑے کاروباری حضرات کو مدعو کیا جائے، یا اُن سے پوری معلومات حاصل کی جائے، تاکہ صورتِ مسئلہ پوری طرح واضح ہوجائے، اور اس پر حکم شرعی کے انطباق میں کوئی تردّد باقی نہ رہے۔

خلاصۂ جوابات

زمینوں کا کاروبار

۱- غیر یقینی عقد کے بعد خریدار کا دوسرے کے ہاتھ زمین کا مالکانہ طور پر بیچنا جائز نہیں، البتہ دلال یا وکیل بن کر بیچ سکتا ہے۔

۲- اگر خریدار نے بیچ دیا تو وہ بہ حیثیت دلال یا وکیل محض اپنی متعینہ اجرت یا اس کے عدم تعین کی صورت میں اجرتِ مثل کا حق دار ہوگا، پورے نفع کا نہیں۔

۳- بیعانہ دینے والوں کو معاملہ کے فسخ ہونے کی شکل میں محض اُن کے اِسار کی رقم واپس کی جائے گی، ڈبل نہیں، ورنہ یہ معاملہ سودی ہوگا۔

۴- اگر وقت پر مالک کو قیمت ادا کردی جائے، اور معاملہ حتمی وقطعی شکل اختیار کرلے، تو اس معاملہ کے حتمی وقطعی شکل اختیار کرنے سے پہلے جو عقود کیے گئے، وہ اصل مالک کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے، اور ان کی پوری قیمت کا حق دار اصل مالکِ زمین ہوگا، نہ کہ خریدار اول (بلڈر)۔

۵- اصل مالک کے ساتھ بلڈر کے معاملہ کے یقینی ہوجانے کے بعد، چوں کہ بلڈر

معاہدہ کے مطابق اس زمین کا مالک ہوجائے گا، اور مالک کی طرف سے آگے اس زمین کو بیچنے کی اجازت بھی ہے، کوئی مانع موجود نہیں، تو رفعِ موانع قبضے کے لیے کافی ہوگا، اور بار بار رجسٹری میں آنے والے خرچ سے بچنے کے لیے بلڈر کا اپنے نام رجسٹری نہ کراتے ہوئے، اصل مالک کے نام سے ڈائریکٹ گاہکوں کے نام رجسٹری کرادینا جائز ودرست ہوگا۔

حقوق

۱- مذکورہ مروجہ معروف حقوق کے بدلہ میں عوض لینا شرعاً درست نہیں ہے۔

۲- اگر کسی نے اس طرح عوض لے لیا، تو دوبارہ اس کے مالک کو واپس لوٹا دے۔

۳- حقوقِ مذکورہ کو محض عرف کی بنا پر مالِ متقوم کی حیثیت دے کر اُن کی خرید وفروخت کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

طویل مدتی کرایہ

۱- طویل مدتی کرایہ داروں کو شرعاً کرایہ دار ہی کے درجہ میں مانا جائے گا، مالک کے درجہ میں نہیں۔

۲- اس طرح کی دکانوں اور مکانوں میں کرایہ دار کی وفات کے بعد وارثین کا حق نہیں ہوگا۔

۳- اگر کوئی وارث اصل مالک مکان یا دکان سے ڈیل کر کے کرایہ داری کا معاملہ اپنے نام کرالے، تو اس کا یہ عمل شرعاً درست ہوگا۔

۴- کرایہ دار کے لیے مکان خالی کرانے کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہیں، اور نہ اس

میں وراثت جاری ہوگی، بلکہ اس کا اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے، لیکن اگر اس نے کرایہ داری کا معاملہ کرتے وقت مالک مکان یا دکان کو زرِ ضمانت کے طور پر کچھ رقم دی ہو، تو اتنی ہی رقم کا لینا درست ہے، اور اس میں وراثت بھی جاری ہوگی۔

کرایہ داری میں ڈپازٹ

۱- معاملہ کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہونی چاہیے۔

۲- ڈپازٹ کی رقم رہن اور زرِ ضمانت ہے۔

۳- ڈپازٹ کی اس رقم کو مالکِ جائداد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔

۴- اس معاملہ کو شرعی جواز کے دائرہ میں لانے کے لیے زرِ ضمانت کے طور پر دی جانے والی رقم کو پیشگی کرایہ قرار دیا جائے۔

۵- اگر زرِ ضمانت بحکم قرض ہے، تو اس کی زکوۃ مالک مکان ودکان پر واجب نہیں، بلکہ واپس مل جانے کے بعد کرایہ دار پر واجب ہوگی، اور وہ سنینِ ماضیہ کی زکوۃ بھی ادا کرے گا۔ اور اگر بحکم رہن ہے، تو مالک مکان ودکان اور کرایہ دار، دونوں میں سے کسی پر بھی اس کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور اگر اسے پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، تو اس کی زکوۃ مالک مکان ودکان پر واجب ہوگی۔

(بندہ کے نزدیک اسے پیشگی کرایہ قرار دینا ہی اولیٰ وبہتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!)

....

الحجة على ما قلنا :

(ا) ما في " الموسوعة الفقهية " : وفي الإصطلاحي الفقهي : أن يشتري السلعة ، ويدفع إلى البائع درهمًا أو أكثر ، على أنه إن أخذ السلعة ، احتسب به من الثمن ، وإن لم يأخذها فهو للبائع .

(۹۳/۹ ، بيع العربون)

ما في " إعلاء السنن " : عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ نهى عن بيع العربان ، قال مالك : وذلک فيما نرى ، والله تعالى أعلم ، يشتري الرجل العبد أو الوليدة أو يتكارى الدابة ، ثم يقول للذي اشترى منه أو تكارى منه : أعطيتک ديناراً أو درهماً أو أكثر من ذلک أو أقل على أني أخذت السلعة أو ركبت ما تكاريت منک ، فالذي أعطيتک من ثمن السلعة أو من كراء الدابة ، وإن تركت ابتياع السلعة أو كراء الدابة فما أعطيتک لک باطل بغير شيء . (۱۹۷/۱۴ ، كتاب البيوع ، باب النهي عن بيع العربان ، رقم الحديث : ۴۶۷۲، الفقه الإسلامي وأدلته :۳۴۳۴/۵ ، بيع العربون ، الموسوعة الفقهية : ۹۳/۹، ۹۴)

ما في " حجة الله البالغة " : ونهى عن بيع العربان أن يقدم إليه شيء من الثمن ، فإن اشترى حسب من الثمن وإلا فهو له مجاناً وفيه معنى الميسر .

(۱۹۱/۲ ، البيوع المنهي عنها ، بيوع فيها معن الميسر ، ط ؛ دار المعرفة بيروت ، بداية المجتهد ونهاية المقتصد : ۲۱۸/۳ ، كتاب البيوع ، الباب الرابع في بيوع الشروط والثنيا)

(۲) ما في " الموسوعة الفقهية " : وخيار النقد اصطلاحًا هو : حق يشترطه العاقد للتمكّن من الفسخ لعدم النقد . وله صورتان :

۱ – التعاقد واشتراط أن المشتري إذا لم ينقد الثمن إلى مدة معلومة فلا عقد بينهما . ومستعمِل الخيار في هذه الصورة هو المشتري ، وإن كانت فائدته الكبرى للبائع ، وقد وصفوا هذه الصورة أنها بمنزلة اشتراط (خيار الشرط) للمشتري .

۲ – التعاقد ثم قيام المشتري بالنقد مع الاتفاق على أن البائع إذا ردّ العوض في مدة معلومة فلا عقد بينهما ، ومستعمِل الخيار هنا هو البائع ، وهو وحده المنتفع بالخيار ، وهذه الحالة الثانية ذات شبه تام ببيع الوفاء مما جعل بعضم يدخل بيع الوفاء في خيار النقد، وهو قول البائع للمشتري : بعتُک هذه الدار بكذا بشرط أني متى رددتُ إليک الثمن في موعد كذا ترد إليّ المبيع ، وهذه الصورة بمنزلة اشتراط (خيار الشرط) للبائع .... أثبت هذا الخيار المالكية والحنابلة والحنفية . اهـ . (۱۸۱/۲۰، ۱۸۲ ، خيار النقد ومشروعيته)=

....

=ما في " الهداية مع الفتح " : (ولو اشترى على أنه إن لم ينقد الثمن إلى ثلاثة أيام فلا بيع بينهما جاز ، وإلى أربعة أيام لا يجوز عند أبي حنيفة وأبي يوسف ، وقال محمد : يجوز إلى أربعة أيام أو أكثر ، فإن نقد في الثلاث جاز في قولهم جميعًا) والأصل فيه أن هذا في معنى اشتراط الخيار ، إذ الحاجة مسّت إلى الانفساخ عند عدم النقد تحرّزًا عن المماطلة في الفسخ فيكون ملحقًا به ، وقد مرّ أبوحنيفة على أصله في الملحق به ، ونفى الزيادة على الثلاث ، وكذا محمد في تجويز الزيادة ، وأبو يوسف أخذ في الأصل بالأثر ، وفي هذا بالقياس ، وفي هذه المسئلة قياس آخر ، وإليه مال زفر ، وهو أنه بيع شرط فيه إقالة فاسدة لتعلّقها بالشرط ، واشتراط الصحيح منها فيه مفسد للعقد، فاشتراط الفاسد أولى ، ووجه الاستحسان ما بيّنّا . [الهداية] . (فتح القدير :۵/۵۰۲ ، ط؛ احياء التراث)

ما في " الفتاوى الهندية " : إذا باع على أنه إن لم ينقد الثمن إلى ثلاثة أيام فلا بيع بينهما فالبيع جائز ، وكذا الشرط ، هكذا ذكر محمد رحمه الله تعالى في الأصل ، وهذه المسئلة على وجوه – إما أن لم يبيّن الوقت أصلا – بأن قال على أنک إن لم تنقد الثمن فلا بيع بيننا أو بيّن وقتًا مجهولا بأن قال على أنک إن لم تنقد الثمن أيامًا ، وفي هذين الوجهين العقد فاسدٌ ، وإن بيّن وقتا معلوما إن كان ذلک الوقت مقدّرا بثلاثة أيام أو دون ذلک ، فالعقد جائزٌ عند علمائنا الثلاثة رحمهم الله تعالى ، وإن بيّن المدة أكثر من ثلاثة أيام قال أبو حنيفة رحمه الله تعالى : البيع فاسدٌ وقال محمد رحمه الله تعالى : البيع جائز ، كذا في المحيط ، فإن نقد في الثلاث جاز في قولهم جميعًا ، كذا في الهداية .

(۳۹/۳ ، ط : دار الفكر ، بدائع الصنائع :۱۷۵/۵ ، ط: المكتبة العلمية بيروت)

ما في " التنوير وشرحه مع الشامية " : (فإن اشترى) شخص (على أنه) أي المشتري (إن لم ينقُد ثمنه إلى ثلاثة أيام فلا بيعَ صحّ) استحساناً . التنوير وشرحه . وفي الشامية : قوله : (على أنه أي المشتري الخ) وكذا لو نقد المشتري الثمن على أن البائع إن ردّ الثمن إلى ثلاثة فلا بيعَ بينهما صحّ أيضًا . (۴۹/۴ ، مطلب خيار النقد ، ط : احياء التراث ، بدائع الصنائع :۱۷۵/۵ ، ط : المكتبة العلمية بيروت)

(۳) ما في " الموسوعة الفقهية " : حكم الخيار انه يمنع ثبوت حكم العقد فلا يترتب عليه الحكم المعتاد للحال في حق من له الخيار ، وذلک موضع اتفاق بين أبي حنيفة وصاحبيه، وهو عند أبي حنيفة في حق العاقد الآخر أيضًا ، وقال صاحباه : الحكم نافذ في حق من لا خيار له ، لأنه لا مانع بالنسبة له . وسيترتب على ذلک انتقال الملک عنه ، ولذا قال الكاساني : (هو للحال موقوف على معنى أنه لا يعرف حكمه للحال، وإنما يعرف عند سقوط الخيار) والعلة في القول بأنه موقوف=

....

= الحكم أنه لا يدرى أيتصل به الفسخ أو الإجازة، ثم قال بعدئذ : فيتوقف في الجواب للحال ، وهذا تفسير التوقف عندنا ، وقال في موطن آخر : شرط الخيار يمنع انعقاد العقد في حق الحكم للحال . وتبين من منع ثبوت الحكم في حق من له الخيار أنه لو كان الخيار لكل من المتعاقدين لم يترتب على العقد حكمه في الحال ، فلا يخرج المبيع من ملك البائع ، ولا الثمن من ملك المشتري اتفاقًا بين أئمة الحنفية ، فلا يفترق هذا العقد عن العقد البات إلا من حيث تعرضه للفسخ بموجب خيار الشرط الذي زلزل حكم العقد وجعله عرضة للفسخ ، ففي حال اشتراط الخيار للطرفين لا يثبت حكم العقد أصلا . (۲۰/۹۴)

(۴) ما في " جامع الترمذي " : عن عمرو بن شعيب قال : حدثني أبي عن أبيه حتى ذكر عبد الله بن عمرو أن رسول الله ﷺ قال: .... " ولا بيع ما ليس عندک " .

(۲۳۳/۲ ، أبواب البيوع ، باب ما جاء فی كراهية بيع ما ليس عنده ، سنن أبي داود :ص/۴۹۰)

(۵) ما في " معجم لغة الفقهاء " : السِّمسار : الوسيط بين البائع والمشتري . الدلال (Broker). (ص/۲۵۰)

(۶) ما في " معجم لغة الفقهاء " : الوكيل : من فُوّض إليه التصرف ، أو من أقيم مقام النفس في التصرّف . (Agent) (ص/۵۰۹)

(۷) ما في " رد المحتار " : وقال في التاتارخانية : وفی الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليهما أن فی كل عشرة دنانير كذا فذاک حرام ، وفی الحاوی : سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال : أرجو أنه لا بأس به ، وإن كان فی الأصل فاسداً لكثرة التعامل ، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه . (۹/۸۷ ، فتاوی محموديه : ۱۶/۲۱۷)

ما فی" الفتاوی الهندية " :وفی الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن من كل عشرة دنانير كذا فذاک حرام عليهم ، كذا فی الذخيرة ، دفع ثوباً إليه وقال : بعه بعشرة فما زاد فهو بيني وبينک ، ولو باعه بإثني عشر أو أكثر فله أجر مثل عمله ، وعليه الفتوى . هكذا في الغياثية .

(۴/۴۵۰، ۴۵۱ ، فتاوی محموديه :۱۶/۲۱۸)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وإذا اتفق المؤكّل والوكيل على الأجر وجب الأجر اتفاقًا . أما إذا لم يتفق الطرفان على الأجر فقد نص الحنفية على أن الوكيل : إما أن يكون ممن لا يعمل بالأجر ، وإما أن يكون من أصحاب المِهن الذين يعملون بالأجر .... أما في الحالة الثانية وهي أن يكون الوكيل من أصحاب المِهن الذين يعملون بالأجر ، لأن طبيعة مهمّتهم=

....

= تقتضي ذلک کالسّمسار والدلال فیستحقّ الوکیل الأجرة حتی ولو لم یتّفق علیها وقتَ التّعاقُد، وحینئذٍ یجب له أجر المِثل . (۹۱/۳۵ ، أخذ الأجرة علی الوکالة ، درر الحکام :۵۷۳/۳ ، تحت مادة : ۱۴۶۷ ، ط : دار الجیل)

ما في " درر الحکام شرح مجلة الأحکام " : لو خدم أحد بناء علی طلبه من دون مقاولة علی أجرة فله أجر المثل إن کان ممن یخدم بالأجرة وإلا فلا . (۶۴۸/۱ ، المادة : ۵۶۳)

(۸) ما في " الفتاوی الهندیة " :وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل وما تواضعوا علیه أن من کل عشرة دنانیر کذا فذاک حرام علیهم ، کذا فی الذخیرة ، دفع ثوباً إلیه وقال : بعه بعشرة فما زاد فهو بیني وبینک ، ولو باعه بإثني عشر أو أکثر فله أجر مثل عمله ، وعلیه الفتوی . هکذا في الغیاثیة. (۴۵۰/۴ ، ۴۵۱ ، فتاوی محمودیه :۲۱۸/۱۶)

ما في " درر الحکام شرح مجلة الأحکام " : لو خدم أحد بناء علی طلبه من دون مقاولة علی أجرة فله أجر المثل إن کان ممن یخدم بالأجرة وإلا فلا . (۶۴۸/۱ ، المادة : ۵۶۳)

(۹) ما في " القرآن الکریم " : ﴿أحل الله البیع وحرم الربوا﴾ . [البقرة :۲۷۵] وقوله تعالی : ﴿یآیها الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافاً مضاعفةً واتقوا الله لعلکم تفلحون﴾ .

(سورة آل عمران : ۱۳۰)

ما في " صحیح مسلم " : عن جابر قال : " لعن رسول الله ﷺ آکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه ، وقال : هم سواء ". (۲۷/۲ ، صحیح البخاري : ۲۸۰/۱ ، کتاب البیوع)

ما في " التنویر وشرحه مع الشامیة " : قال : الربا شرعًا فضل خال عن عوض بمعیارٍ شرعي مشروط لأحد المتعاقدین في المعاوضة . تنویر . (۳۹۸/۷-۴۰۱)

(۱۰) ما في " قواعد الفقه " : " التخلیة تسلیم " . (ص/۶۹)

ما في " بدائع الصنائع " : ولا یشترط القبض بالبراجم ، لأن معنی القبض هو التمکّن والتخلّي وارتفاع الموانع عرفاً وعادةً حقیقةً . اهـ . (۵۷۱/۲ ، کتاب البیوع ، فصل فیما یرجع إلی المعقود علیه)

(۱۱) ما في " صحیح البخاري " : " إن النبي ﷺ نهی عن بیع الولاء وهبته " .

(۸۹۶/۲ ، کتاب العتق ، باب بیع الولاء وهبته ، رقم الحدیث :۲۳۹۸)

(۱۲) ما في " التنویر وشرحه مع الشامیة " : لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة کحق الشفعة ، وعلی هذا لا یجوز عدم اعتبار العرف الخاص ، لکن أفتی کثیر باعتباره ، وعلیه فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال . =

....

=(۲۵/۷ ، کتاب الوقف ، مطلب في الاعتیاض عن الوظائف والنزول عنها)

ما في " رد المحتار " : وحاصله أن ثبوت حق الشفعة للشفیع ، وحق القسم للزوجة ، وکذا حق الخیار في النکاح للمخیرة إنما هو لدفع الضرر عن الشفیع والمرأة ، وما ثبت لذلک لا یصح الصلح عنه ، لأن صاحب الحق لما رضی علم أنه لا یتضرر بذلک ، فلا یستحق شیئًا ، أما حق الموصی له بالخدمة فلیس کذلک ، بل ثبت له حق علی وجه البر والصلة ، فیکون ثابتا له إصالة ، فیصح الصلح عنه ، إذا نزل عنه لغیره ، ومثله ما مر عن الأشباه من حق القصاص ، والنکاح والرق ، حیث صح الاعتیاض عنه ، لأنه ثابت لصاحبه إصالة ، لا علی وجه دفع الضرر عن صاحبه . (۱۶/۴)

(جدید معاشی نظام میں اسلامی قانونِ اجارہ:ص/ ۴۴۷،۴۴۸)

(۱۳) ما في " بدائع الصنائع " : سفل وعلو بین رجلین انهدما ، فباع صاحب العلو علوه لم یجز ، لأن الهواء لیس بمال . (۱۴۵/۵)

وفي " الهدایة " : لأن حق التعلي لیس بمال ، لأن المال ما یمکن احرازه .

(هدایه مع فتح القدیر :۲۰۴/۵)

وفي " الهدایة " : (وبیع الطریق وهبته جائز ، وبیع مسیل الماء وهبته باطل) والمسئلة تحتمل وجهین ؛ بیع رقبة الطریق والمسیل، وبیع حق المرور أو التسییل ، فإن کان الأول فوجه الفرق بین المسئلتین أن الطریق معلوم ، لأن له طولا وعرضا معلوما ، وأما المسیل فمجهول لأنه لا یدری قدر ما یشغله من الماء ، وإن کان الثاني ففي بیع حق المرور روایتان، ووجه الفرق علی إحداهما بینه وبین حق التسییل ان حق المرور معلوم لتعلقه بمحل معلوم وهو الطریق ، أما المسیل علی السطح فهو نظیر حق التعلي ، وعلی الأرض مجهولة لجهالة محله ، ووجه الفرق بین حق المرور وحق التعلي علی أحد الروایتین ان حق التعلي یتعلق بعین لا تبقی ، وهو البناء ، فأشبه المنافع ، أما حق المرور یتعلق بعین تبقی وهو الأرض فأشبه الأعیان . (هدایه مع الفتح :۲۰۵/۵)

وفي " فتح القدیر " : ان حق المرور یتعلق برقبة الأرض وهي مال هو عین فما یتعلق به یکون له حکم العین ، أما حق التعلي فحق یتعلق بالهواء ، وهو لیس بعین مال . (۲۰۶/۵)

وفي " المبسوط للسرخسي " : بیع الشرب فاسد ، فإنه من حقوق المبیع بمنزلة الأوصاف فلا یفرد بالبیع ثم هو مجهول في نفسه غیر مقدور التسلیم ، لأن البائع لا یدری أیجري الماء أم لا ؟ ولیس في وسعه اجراء ه قال : وکان شیخنا الإمام یحکی عن استاذه أنه کان یفتی بجواز بیع الشرب بدون الأرض ، ویقول : فیه عرف ظاهر في دیارنا بنسف ، فإنهم یبیعون الماء ، فللعرف الظاهر=

....

= كان يفتى بجوازه ولكن العرف إنما يعتبر فيما لا نص بخلافه والنهي عن بيع الغرر نص بخلاف هذا العرف فلا يعتبر . (۱۳۴/۱۴)

وفي " فتح القدير " : ثم بتقدير انه حظ من الماء فهو مجهول المقدار فلا يجوز بيعه وهذا وجه منع مشايخ بخارى بيعه مفردًا . (۲۰۵/۵)

وفي " العناية بهامش الفتح للبابرتي " : وإنما لم يجز بيع الشرب وحده في ظاهر الرواية للجهالة لا باعتبار أنه ليس بمال . (۲۰۴/۵)

(۱۴) ما في " المبسوط للسرخسي " : وبعض المتأخرين من مشايخنا أفتى أن يبيع الشرب وإن لم يكن له أرض للعادة الظاهرة فيه في بعض البلدان ، وهذه عادة معروفة بنسف ، قالوا : إنما جوز الاستصناع للتعامل ، وإن كان القياس يأباه ، فكذلک بيع الشرب بدون الأرض .

(۱۷۱/۲۳ ، كتاب المزارعة)

قال العلامة خالد الأتاسي : أقول : وعلى ما ذكروه من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي أن يجوز الاعتياض عن حق التعلي وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال ، لأن هذه الحقوق لم تثبت لأصحابها لأجل دفع الضرر عنهم بل ثبتت لهم ابتداء بحق شرعي فصاحب حق العلو إذا انهدم علوه ، قالوا : إن له حق إعادته كما كان جبرا عن صاحب السفل ، فإذا نزل عنه لغيره بمال معلوم ينبغي أن يجوز ذلک على وجه الفراغ والصلح ، لا على وجه البيع كما جاز النزول عن الوظائف ونحوها ، لا سيما إذا كان صاحب حق العلو فقيرا قد عجز عن إعادة علوه ، فلو لم يجز ذلک له على الوجه الذي ذكرناه يتضرر فليتأمل وليحرر . والله سبحانه اعلم .

(فقهي مقالات : ۱۹۱/۱)

(۱۵) ما في " الفقه الإسلامي وأدلته " : والإجارة بيع المنفعة لا بيع العين . (۳۸۰۴/۵)

ما في " الهدايه " : لأن العين المستأجرة أمانة في يد المستأجر . (۳۰۸/۳ ، كتاب الإجارات)

(۱۶) ما في " البحر الرائق " : التركة ما تركه الميت خالياً عن تعلق حق الغير بعينه .

(۳۶۵/۹ ، كتاب الفرائض ، ط : ديوبند ، رد المحتار : ۴۹۳/۱۰ ، كتاب الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۱۴۵/۲۹ ، كتاب الفرائض ، ط : بيروت ، الشريفية شرح السراجية :ص/۱)

(۱۷) ما في " النتف في الفتاوى " : ومتى مات المؤاجر أو المستأجر انقضت الإجارة فى جميع ما ذكرنا فى قول أبى حنيفة وأصحابه وأبى عبد الله ، ولا تنفسخ فى قول الشافعى .

(ص/۳۴۹ ، كتاب الإجارة ، فسخ الإجارة)=

....

=(۱۸) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يا أيها الذين اٰمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل﴾ .
(سورة النساء : ۲۹)

ما في " البحر المحيط لأبي حيان " : قال أبوحيان رحمه الله تعالى : الباطل هوكل طريق لم تبحه الشريعة ، فيدخل فيه السرقة والخيانة والغصب والقمار وعقود الربا وأثمان البياعات الفاسدة .
(۳۲۲/۳)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قال العلامة الجصاص في هذه الأية : قد انتظم هذا العموم النهي عن أكل مال الغير بالباطل وأكل مال نفسه بالباطل .... وقد قيل فيه وجهان : أحدهما ما قال السدي : وهو أن يأكل بالربا والقمار والبخس والظلم ؛ وقال ابن عباس والحسن : أن يأكله بغيرعوض . (۲۱۶/۲ ، ۲۱۷)

ما في " جمع الجوامع " : قوله عليه السلام : " ألا لا يحل مال امرئٍ مسلم إلا بطيب نفس منه " .
(۹/۷ ، تتمه ، حرف اللام ألف ، رقم : ۲۶۷۵۹ ، سنن الدار قطني : ۲۲/۳ ، كتاب البيوع ، رقم : ۲۸۶۲، مشكوة المصابيح :ص/۲۵۵ ، كتاب الغصب والعارية)

(۱۹) ما في " رد المحتار " : الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم ، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ، ويتصدق به بنية صاحبه ، وإن كان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام ، ولايعلم أربابه ولا شيئاً منه بعينه حل له حكماً، والأحسن ديانة التنزه عنه.
(۳۰۱/۷ ،كتاب البيوع ، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالاً حراماً ، دارالكتب العلمية بيروت ، كذا في الفتاوى الهندية :۳۴۹/۵، كتاب الكراهية)

ما في " بذل المجهود " : وأما إذا كان عند رجل مال خبيثٌ ، فأما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء ، لأنه لو أنفق على نفسه فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام ..... أو أضاعه واستهلكه ، فدخل تحت قوله صلى الله عليه وسلم : " نهى عن إضاعة المال " . فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء ، ولكن لا يريد بذلك الأجر والثواب ، ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه . اهـ .
(۳۵۹/۱،۳۶۰ ،كتاب الطهارة ، باب فرض الوضوء ، ط : دارالبشائر الإسلامية بيروت ، بذل المجهود : ۳۷/۱، مكتبه خليليه سهارنفور، بذل المجهود: ۳۷/۱، مكتبه قاسميه ملتان ، رقم : ۵۹)

(۲۰) ما في " حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح " : وزكاة الدين على أقسام : فإنه قوي ووسط وضعيف ، فالقوي وهو بدل القرض ومال التجارة إذا قبضه ، وكان على مقر ولو مفلسًا أو على=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

= جاحد عليه بينة زكاه لما مضى . (ص/۳۹۰ ، كتاب الزكاة ، الدر المختار مع الشامية : ۱۸۴/۳،۱۸۵ ، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاءً)

(۲۱) ما في " التنوير وشرحه مع الشامية " : (ولا في مرهون) . التنوير وشرحه . وفي الشامية : قوله : (ولا في مرهون) أي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد .

(۱۸۰/۳ ، كتاب الزكاة)

ما في " الهندية " : ولا على الراهن إذا كان الرهن في يد المرتهن . هكذا في البحر الرائق .

(۱۷۲/۱)

(۲۲) ما في " الهداية " : الزكاة واجبة على العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصاباً ملكاً تاماً وحال عليه الحول . (۱۶۵/۱)

ما في " البحر الرائق " : وشرط وجوبها العقل والبلوغ والإسلام والحرية وملك نصاب حولي فارغ عن الدين وحاجته الأصلية . (۳۵۳/۲ ، ۳۵۵ ، بدائع الصنائع : ۳۷۷/۲ ، تبيين الحقائق : ۱۹/۲ ، الفتاوى الهندية : ۱۷۲/۱ ، الفتاوى التاتارخانية : ۳/۲ ، فتح القدير : ۱۶۳/۲ ، كتاب الزكاة)

مقالہ

(۱۲/رواں فقہی اجتماع ''اِدارۃ المباحث الفقہیۃ، تحت اِشراف جمعیۃ علماء الہند'' [دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر]
۲۹، ۳۰/رجب المرجب ۱۴۳۷ھ)

باپ اور بیٹوں کے مشترکہ کاروبار کی چند اہم صورتیں

سوال: ۱- اس وقت مشترکہ کاروبار کا ایک اہم حصہ باپ اور بیٹوں کے مابین ہونے والا کاروبار ہے، جس کی موجودہ وقت میں بہت سی صورتیں رائج ہیں، مثلاً: باپ اپنے سرمایہ سے کوئی کاروبار شروع کرتا ہے، پھر مثلاً: بڑا بیٹا اس کے کام میں شریک ہوجاتا ہے، بیٹے کا اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگتا، اُس کا کھانا پینا، رہنا سہنا باپ ہی کے ساتھ ہوتا ہے، بڑے بیٹے اور گھر کے دیگر افراد کے سارے اخراجات اسی کاروبار سے پورے کیے جاتے ہیں، بعد میں بڑا بیٹا پورا کاروبار سنبھالتا ہے، باپ کمزوری اور بیماری کی وجہ سے عملی طور پر کاروبار میں وقت نہیں دے پاتا، اسی حالت میں باپ کا انتقال ہوجاتا ہے، اس کے انتقال کے بعد بڑا بیٹا کہتا ہے کہ باپ کی زندگی میں چوں کہ میں نے ہی پورا کاروبار سنبھالا ہے، اس لیے کاروبار اور اُس سے حاصل شدہ آمدنی کا میں ہی تنہا مالک ہوں، دیگر بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، ایسی صورتِ حال میں شریعت کیا کہتی ہے؟ کیا بڑا بیٹا ہی کاروبار کا مالک ہوگا؟ یا بڑے

بیٹے کے کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانے اور باپ کے عیال میں رہنے کی وجہ سے اُس کو باپ کا معاون قرار دیا جائے گا؟ اور باپ کے انتقال کے بعد سارا کاروبار اُس سے حاصل شدہ آمدنی ورثاء کے مابین حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم کی جائے گی؟ واضح رہے کہ اس سلسلے میں علامہ شامی رحمہ اللہ کی یہ عبارت بہت اہمیت کی حامل ہے: " الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ، ولم يكن لهما شيء ، فالكسب كله للأب إن كان الإبن في عياله لكونه معينًا له "-لیکن اِس عبارت میں اِس بات کی تنقیح کی ضرورت ہے کہ بیٹے کا باپ کے عیال میں رہنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا عیال کا مفہوم ہر علاقے کے طرزِ معیشت کو سامنے رکھ کر متعین کیا جائے گا؟ یا اس کا کوئی ایک ہی خاص مفہوم ہے، جس کی روشنی میں سارے علاقے والوں کے لے ایک ہی حکم ہوگا؟

جواب:۱- بیٹا باپ کا معاون شمار ہوگا[1]، مالک نہیں، پورا کاروبار باپ ہی کی ملک ہوگا[2]، اوراس کے انتقال کے بعد یہ پورا کاروبار اور اس سے حاصل شدہ آمدنی اُس کے تمام ورثاء کے مابین حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم کی جائے گی۔[3]-علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی عبات- **إن كان الإبن في عياله الخ**[4]-میں ''ابن'' کا باپ کے عیال میں ہونے کا مطلب یہی ہے کہ باپ اس کے تمام اخراجات کا متحمل ہو، اور عیال کا یہی مفہوم ہر علاقے میں معتبر ہے۔[5]

سوال: ۲- بسا اوقات باپ اور بیٹوں کے درمیان کاروبار کی یہ نوعیت ہوتی ہے کہ بیٹا محنت کرنے کے ساتھ ساتھ بلا کسی معاہدے کے کاروبار میں اپنا کچھ سرمایہ بھی لگاتا ہے، اور باہم نفع کا کوئی فی صد متعین نہیں ہوتا، باپ اپنی زندگی میں بیٹے کو جو بھی

دے دیتا ہے، بیٹا اس کو لے لیتا ہے، لیکن باپ کے انتقال کے بعد سرمایہ لگانے والا بیٹا کاروبار میں اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، دیگر ورثاء اس کی مخالفت کرتے ہیں، ایسی صورت میں کیا بیٹے کو سرمایہ لگانے کی وجہ سے کاروبار کی ملکیت میں شریک سمجھا جائے گا؟ یا یہ اُس کی طرف سے تبرّع ہوگا؟ اگر بیٹے کو شریک قرار دیا جائے گا، تو اُس کا تناسب کیا ہوگا؟ فقہی کتابوں میں مذکور ''شرکت'' کی تفصیلات کی روشنی میں اس کا حکم واضح فرمائیں۔ واضح رہے کہ اِس صورت میں بیٹا باپ ہی کے عیال میں رہتا ہے۔

جواب: ۲- یہ صورت تین حال سے خالی نہیں، یا تو بیٹے نے اپنے والدین کو سرمایہ بطورِ تعاون دیا ہو، اور والد ہی کے ساتھ رہائش پذیر ہو، یا پھر سرمایہ لگاتے وقت شرکت کا معاہدہ کیا ہو، یا پھر سرمایہ بطورِ قرض باپ کو دیا ہو۔

حالتِ اُولیٰ میں تمام سرمایہ والد کی ملکیت شمار ہوگا، اور لڑکا محض والد کا معاون سمجھا جائے گا۔ (۶)

حالتِ ثانیہ میں لڑکا باپ کا کاروباری شریک سمجھا جائے گا، اور سرمایہ کی مقدار کے تناسُب سے نفع کا حق دار ہوگا۔ (۷)

حالتِ ثالثہ میں بطورِ قرض جو رقم لڑکے نے باپ کو کاروبار کے لیے دی تھی، وہ اتنی رقم کا حق دار ہوگا۔ (۸)

مذکورہ سوال میں بیٹے نے بلا کسی معاہدے وتعیین کے کاروبار میں اپنا سرمایہ لگایا، تو بظاہر وہ والد کے کاروبار میں اس کا معاون ہی سمجھا جائے گا (۹)، البتہ اگر وہ بینہ کے ذریعے والد کے ساتھ اپنی اصل شرکت اور حصۂ منافع میں فی صد کو ثابت کردے (۱۰)،

تو پھر وہ بینہ سے ثابت کردہ حصۂ منافع میں متعینہ فی صد کا حق دار ہوگا[11]، اور والد نے اپنی حیاتی میں جو کچھ اسے دیا اُس کا حساب کر کے، اُسے اس کے حصۂ منافع میں سے منہا کیا جائے گا، اور بقیہ مال مرحوم کے تمام پس ماندگان میں حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم کیا جائے گا، جس میں مذکورہ بیٹا بھی شریک ہوگا۔[12]

سوال: ۳- کبھی کاروبار کی یہ نوعیت سامنے آتی ہے کہ باپ کے عیال میں رہتے ہوئے باپ کی پونجی اور سرمایے سے بیٹے کوئی کام شروع کرتے ہیں، باپ کاروبار کی ملکیت اور اُس کے منافع میں اپنے کو اور سب بیٹوں کو برابر کا شریک قرار دیتا ہے، لیکن باپ عملی طور پر کاروبار میں شریک نہیں ہوتا، اور بیٹوں میں بعض زیادہ محنت کرتے ہیں، بعض کم اور بعض بالکل نہیں، ایسی صورت میں اِس کاروبار میں بیٹوں کی باہم کیا حیثیت ہوگی؟ کیا سارے بیٹے کاروبار کی ملکیت اور اُس کے منافع میں برابر کے شریک ہوں گے؟ یا بعض بیٹوں کے زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے اُن کا زیادہ حصہ ہوگا؟

جواب: ۳- اگر باپ نے اپنے بیٹوں کو کاروبار کے لیے سرمایہ دیتے وقت یہ وضاحت کی ہو کہ اس کا اتنا حصہ میں آپ لوگوں کو ہبہ کر رہا ہوں، یا دے رہا ہوں، اور اس کا مالک بنا رہا ہوں، اور اتنا سرمایہ میری ملک ہے، اور میں ہی اُس کا مالک ہوں، تو ایسی صورت میں باپ اور تمام بیٹے اس کاروبار میں شریک سمجھے جائیں گے، اور اپنے اپنے رأس المال (سرمایہ) کے تناسب سے اس کاروبار کے منافع میں حصہ دار بھی ہوں گے[13]، خواہ باپ عملی طور پر کاروبار میں شریک نہ ہوا ہو، اور بیٹوں میں سے بعض نے زیادہ محنت کی ہو، اور بعض نے کم، اور بعض نے بالکل ہی محنت نہ کی ہو۔ اور اس صورت میں باپ کے انتقال کے بعد کاروبار میں باپ کا حصہ، میراث

ہوگا، جو اس کے تمام ورثاء کے مابین حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم ہوگا۔ (۱۴)

سوال: ۴- باپ اور بیٹوں کے درمیان کاروبار کی یہ شکل بھی سامنے آتی ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کو اُن کے سرمایہ لگائے بغیر، مثلاً: اپنی کمپنی میں پرسنٹ کے حساب سے شریک بنالیتا ہے، اور عموماً اس طرح کے معاملے کے وقت ملکیت اور منافع میں شرکت کی کوئی صراحت نہیں ہوتی، ایسی صورت میں کیا شریعت کی رُو سے بیٹوں کو باپ کے ساتھ اصل کمپنی کی ملکیت میں شریک قرار دیا جائے گا؟ یا صرف منافع میں شریک مانا جائے گا؟ پھر ملکیت میں شریک قرار دیا جائے، یا محض منافع میں شریک سمجھا جائے، دونوں صورتوں میں فقہ کی رُو سے اِس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا یہ سمجھا جائے گا کہ باپ نے گویا بیٹوں کے درمیان کمپنی کی ملکیت پرسنٹ کے حساب سے تقسیم کرکے، ہر ایک کو اُس کے حصے کا مالک بنادیا، اور اگر معاملے کے وقت ملکیت یا منافع میں شرکت کی صراحت ہوجائے، تو اُس وقت کیا حکم ہوگا؟ اِس جز کے جواب میں اس بات کی ضرور وضاحت فرمائیں کہ غیر منقسم اشیاء کے ہبہ میں قبضے کا تحقق ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے، تو اس میں قبضہ کے تحقق کی صورت کیا ہے؟

جواب: ۴- باپ کا اپنے بیٹوں کو اُن کے سرمایہ لگائے بغیر اپنی کمپنی میں شریک بنالینا دو حال سے خالی نہیں:

(۱) کمپنی کے اثاثے قابلِ تقسیم ہوں گے؛ (۲) یا قابلِ تقسیم نہیں ہوں گے؛

(۱) اگر کمپنی کے اثاثے قابلِ تقسیم ہوں، اور باپ اِن اثاثوں کو تقسیم کرکے اپنے بیٹوں کو ہبہ مع القبض کرادے، تو اس صورت میں ہبہ تام ہوگا (۱۵)، اور بیٹے اپنے اپنے حصہ کے مالک بن کر کمپنی میں شریک قرار پائیں گے، اور منافع کا فیصد متعین نہ ہونے

کی وجہ سے ہر شریک اپنے رأس المال (سرمایہ) کے تناسب سے منافع کا حق دار ہوگا[۱۶]، لیکن اثاثوں کے قابلِ تقسیم ہونے کے باوجود اگر باپ نے اُنہیں تقسیم کرکے اپنے بیٹوں کو ہبہ مع القبض نہیں کیا، تو اس صورت میں ہبہ تام نہیں ہوگا، اور نہ ہی شرکت کی صورت متحقق ہوگی، اور کمپنی کے جمیع اثاثے ومنافع باپ ہی کی ملک قرار پائیں گے، اوراس کے انتقال پر اس کے تمام ورثاء کے مابین حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم ہوں گے۔[۱۷]

(۲) اوراگر کمپنی کے اثاثے ناقابلِ تقسیم ہوں، اور باپ یہ غیر مقسوم اثاثے اپنے تمام بیٹوں کو بحصۂ متعینہ ہبہ کردے، تو ہبہ تام ہوگا[۱۸]، اوراس صورت میں بھی منافع کا فیصد متعین نہ ہونے کی وجہ سے ہر شریک اپنے رأس المال (سرمایہ) کے تناسب سے منافع کا حق دار ہوگا۔[۱۹]

سوال: ۵- کبھی مشترکہ کاروبار کی یہ شکل ہوتی ہے کہ بیٹے اپنے سرمایے سے ایک کمپنی قائم کرتے ہیں، اُس میں والد کا کوئی سرمایہ نہیں لگا ہوتا، لیکن بیٹے احترام میں کمپنی والد ہی کے نام سے قائم کرتے ہیں، کاغذات میں کمپنی کا مالک والد ہی کو قرار دیا جاتا ہے، اس طرح کی قائم کردہ کمپنی میں شرعاً باپ کی کیا حیثیت ہوگی؟ باپ کے انتقال کے بعد اِس طرح کے معاملے میں بھائیوں اور بہنوں میں اختلافات کثرت سے پیش آتے ہیں، بہنوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ والد محترم یا تو کاروبار کے اصل مالک تھے، یا کاروبار میں شریک تھے، لہٰذا کاروبار میں اُن کے حصے میں سے ہم کو حق ملے گا۔ بھائیوں کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ کاروبار کے اصل مالک ہم ہی تھے، ہم نے احتراماً کمپنی میں والد صاحب کا نام

ڈلوادیا تھا،اس طرح کے نزاع کو شریعت کی روشنی میں کیسے حل کیا جائے گا؟

جواب: ۵- مشترکہ کاروبار کی اس شکل میں جب کہ پورا سرمایہ بیٹوں ہی کا ہو، اور والد کے نام سے کمپنی کا قیام محض اس کے احترام میں ہو، اور کاغذات میں کمپنی کا مالک بھی والد کو ظاہر کیا جائے ،تو محض والد کے نام سے کمپنی کو قائم کرنے اور اس کے کاغذات میں والد کو مالک ظاہر کرنے کی وجہ سے والد اس کمپنی کا مالک نہیں ہوگا، بلکہ اس کمپنی کے مالک وہی تمام بیٹے ہوں گے، جنہوں نے اس میں اپنا سرمایہ لگایا ہے، اس لیے کہ کمپنی پر باپ کی ملک ثابت ہونے کے لیے اسبابِ ملک میں سے کوئی سببِ شرعی موجود نہیں ہے۔ [۲۰]

سوال: ٦- یہ شکل بھی بہت معروف ہے کہ بیٹوں کا اگرچہ باپ کے ساتھ رہنا نہیں ہوتا ہے،لیکن باپ اپنے ہی سرمایہ سے سب کا الگ الگ کاروبار کروادیتا ہے،اور سب کی کمائی باپ کے پاس آتی ہے، کاروبار میں باپ اور بیٹوں کی کوئی حیثیت متعین نہیں ہوتی ، باپ بیٹوں کی ضروریات کے تناسب سے اُن کو رقم دیتا رہتا ہے،اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آمدنی باپ کے پاس نہیں آتی ، بیٹے باپ کی راہنمائی میں کاروبار کرتے ہیں، اس طرح کے کاروبار میں باپ اور بیٹوں کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: ٦-باپ نے اپنے ہی سرمایہ سے تمام بیٹوں کا کاروبار الگ الگ کروادیا،اور بیٹوں کو اپنے اپنے کاروبار کا مالک ومتصرف قرار نہیں دیا،تو یہ تمام کاروبار باپ ہی کی ملک قرار پائیں گے، اور بیٹوں کی حیثیت اجیر کی ہوکر وہ اجرتِ مثل (اجرتِ عرفی) کے حق دار ہوں گے۔ [۲۱]

باپ کی طرف سے انہیں ملنے والی رقم اُن کے واجب حق کے بقدر ہے،تو وہ مزید

کے حق دار نہیں، ورنہ وہ اپنے واجب حق کے حق دار ہوں گے، اور باپ کے انتقال پر یہ تمام کاروبار باپ ہی کی ملک شمار ہوں گے، اور وہ اس کے تمام ورثاء کے مابین حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم ہوں گے۔ (۲۲)

سوال: ۷- والد کے انتقال کے بعد کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والد کا ترکہ تقسیم نہیں کیا جاتا، مرحوم باپ کے بیٹوں کا رہن سہن ایک ساتھ رہتا ہے، والد کے پرانے کاروبار کو بعض بیٹے سنبھال لیتے ہیں، اور اُس سے حاصل شدہ آمدنی سے پورے گھر کا خرچ چلتا ہے، ایسی صورت میں انتقال کے بعد کاروبار میں جو اضافہ ہوتا ہے، کیا وہ سب ورثاء کے مابین اُن کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا؟ یا اضافہ شدہ کاروبار کے صرف وہی بیٹے مالک ہوں گے، جنہوں نے والد کے انتقال کے بعد کاروبار سنبھالا ہے، اگر اضافہ شدہ کاروبار اور اُس سے حاصل شدہ جائداد وغیرہ کا صرف کاروبار کرنے والے بیٹوں کو مالک قرار دیا جائے، تو اس پر بہنوں کو اعتراض ہوتا ہے، اور اگر سب کو برابر کا مالک قرار دیا جائے، تو کاروبار کرنے والے بیٹوں کی محنت ضائع ہوتی ہے؟

جواب: ۷- والد کے انتقال کے بعد بیٹے باپ کے کاروبار کو بڑھاتے رہیں، اور ترکہ تقسیم نہیں کیا گیا، اور کاروبار میں نفع بھی ہوتا رہا، تو اصل کاروبار کے ساتھ نفع بھی ترکہ میں شامل ہوگا، اور باپ کے انتقال کے بعد تمام ورثاء کے مابین حسبِ حصصِ شرعیہ تقسیم ہوگا۔ (۲۳)

سوال: ۸- کبھی ترکے کی تقسیم سے پہلے بعض بیٹے والد کی متروکہ رقم لے کر اپنا کوئی کاروبار شروع کر دیتے ہیں، اس رقم سے ہونے والے کاروبار کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟ کیا رقم کی حیثیت کی تعیین میں ورثاء کی رضامندی وعدمِ رضامندی کا کوئی فرق ہوگا؟

جواب: ۸- قبل از تقسیمِ میراث اس کے ہر جز میں ہر وارث کا حصہ ہوتا ہے، لہٰذا دیگر ورثاء کی اجازت کے بغیر کسی وارث کے لیے ترکہ کے کسی حصہ کو لے کر اس سے کاروبار کرنا شرعاً جائز ودرست نہیں ہے(۲۴)، البتہ اگر دیگر ورثاء اس کی اجازت دیتے ہیں، تو گویا وہ اس وارث کو اپنے اپنے حصۂ اِرث سے انتفاع کی اجازت دے رہے ہیں(۲۵)، اس صورت میں وراثِ مذکور کا یہ کاروبار درست ہوگا، مگر دیگر ورثاء کے حصوں کے بقدر رقم اُس کے ذمہ قرض ہوگی۔(۲۶)

سوال: ۹- جس کاروبار میں ابتداءً معاملے کی نوعیت متعین نہیں ہوتی، اُس میں نوعیت کی تعیین کن بنیادوں پر کی جائے گی؟ کیا اس سلسلے میں قرائن اور عرف کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: ۹- جس کاروبار میں ابتداءً معاملے کی نوعیت (تعاون، شرکت، قرض) متعین نہ ہو، وہاں بر بنائے عدمِ صراحت، دلالت یعنی قرائن وعرف کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے: "**العرف في الشرع له اعتبار . لذا عليه الحكم قد يُدار**" .(۲۷) اور "**الأصل أن للحالة من الدلالة كما للمقالة**" .(۲۸)

سوال: ۱۰- باپ اور بیٹوں کے مابین مشترکہ کاروبار کے حوالے سے ایک ایسا واضح لائحۂ عمل تجویز فرمائیں جو شریعت کے اصول وضابطے کے مطابق ہو، نیز اس زمانے کے حالات میں اُس کا نفاذ آسان ہو، تاکہ اُن اصول اور ہدایات کی روشنی میں لوگوں کے لیے اپنے معاملات طے کرنا آسان ہو۔

جواب: ۱۰- **''مشترکہ خاندان میں معاملاتی تنازعات اور اُن کا حل''**، مسلم معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب اُمڈا ہوا ہے، ان کی تہہ میں اگر دیکھا جائے، تو وہی؛ زر، اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں، روپیہ

پیسہ اورزمین جائداد کا جھگڑا بڑے بڑے پرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کرڈالتا ہے، اوراس کی وجہ سے بڑی بڑی مثالی دوستیاں آن کی آن میں دشمنیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اس صورتِ حال کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ایک بہت بڑا سبب، معاملات کوصاف نہ رکھنا ہے، جب کہ ہمارے مذہب کی ایک انتہائی زریں تعلیم یہ ہے کہ "آپس میں رہو بھائیوں کی طرح، لیکن لین دین کے معاملات کرو اجنبیوں کی طرح"[۲۹]۔ اگر ہم شرعِ اسلامی کی اس اہم وزرّیں تعلیم پر عمل کرلیتے، تو بہت سے جھگڑوں اورتنازعات سے بچ جاتے، لیکن ہم نے اسے نظرانداز کردیا، مثلاً: بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی، یاباپ بیٹے مشترک طور پرایک ساتھ کام کرتے ہیں، اورکسی حساب وکتاب کے بغیر سب لوگ مشترک کاروبار سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے ہیں، نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پرکام کررہے ہیں؟ یا کاروبار میں حصہ دار ہیں؟ اگر تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے توکس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضروریات کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کررہاہے، اورآخر میں جب تقسیم کی بات آتی ہے، تواس میں بہت زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوچکی ہوتی ہیں، اور بڑے مسائل کھڑے ہوتے ہیں، کہ منصفانہ تقسیم کے لیے اُس کاسِرا پکڑنا مشکل ہوجاتا ہے، لہٰذا کوئی بھی کاروبارشروع کرنے سے پہلے تحریری طور پر یہ بات طے ہونی چاہیے کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے؟ اورکس کے کیا حقوق وفرائض ہیں؟[۳۰]، اس لیے معاملہ کرتے وقت آپس میں ہرایک کی حیثیت متعین کرلینی چاہیے، کہ یہی اسلامی تعلیم ہے۔[۳۱]

…………………………………………………

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " درر الحكام شرح المجلة " : المادة (۱۳۹۸) : (إذا عمل أحد في صنعته مع ابنه الذي في عياله فكافة الكسب لذلك الشخص ويعد ولده معينًا كما أنه إذا غرس أحد شجرًا فأعانه ولده الذي في عياله فيكون الشجر لذلك الشخص ولا يشاركه ولده فيه) . [مجلة الأحكام العدلية] . وفي درر الحكام : إذا عمل أحد في صنعته هو وابنه الذي في عياله واكتسبا أموالا ولم يكن معلوما أن للابن مالا سابقا فكافة الكسب لذلك الشخص ولا يكون لولده حصة في الكسب بل يعد ولده معينا وليس له طلب أجر المثل . (۳/۴۲۰ ، كتاب الشركة ، شركة العنان ، شرح المجلة : ص/۸۴۱ ، المادة :۱۳۹۸ ، رد المحتار :۶/۳۹۲ ، الفتاوى الهندية :۲/۳۲۹)

(فتاویٰ محمودیہ:۲۳/۴۴۵،سوال:۸۶۵۵،شرکت اورمضاربت کے احکام،ط:میرٹھ)

(۲) ما في " السنن الكبرى للبيهقي " : " كل أحد أحق بماله من ولده وولده والناس أجمعين " .

(۷/۴۹۰ ، ط: دار الكتب العلمية بيروت)

ما في " الموسوعة الفقهية " : قال إمام الحرمين : القاعدة المعتبرة أن المُلاک مُختصّون بأملاكهم لا يُزاحم أحد مالكًا في ملكه من غير حق مستحق ، ثم الضرورة تُحوِجُ مُلاک الأموال إلى التبادل فيها ...... فالأمر الذي لا شک فيه تحريم التّسالُب والتغالُب ومدّ الأيدي إلى أموال الناس من غير استحقاق ، وقال ابن تيمية : والرجل أحق بماله من ولده ووالده والناس أجمعين .

(۳۹/۳۲ ، ۳۳ ، ملک ، حرمة الملک في الإسلام ، غياث الأمم في التياث الظلم :ص/۴۹۴ ، ۴۹۵ ، ط : نهضة مصر وط: قطر ، مجموعة الفتاوى لإبن تيمية : ۲۹/۱۸۹ ، ط: الرياض)

(۳) ما في " الموسوعة الفقهية " : اتفق الفقهاء على أن انتقال التركة من المورِّث إلى الوارث يكون بعد وفاة المورِّث حقيقة أو حكما أو تقديرا .

(۱۱/۲۱۰، تركة ، الشرط الأول ، موت المورّث)

ما في " حاشية السراجي في الميراث " : (التركة) واصطلاحه : ما بقي بعد الميت من ماله صافيًا عن تعلّق حق الغير بعينه . (ص/۳ ، مقدمه ، رد المحتار : ۱۰/۴۹۳ ، كتاب الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۲۹/۱۴۵ ، كتاب الفرائض ، بيروت ، البحر الرائق : ۹/۳۶۵ ، كتاب الفرائض ، ط : ديوبند) (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۱۳/۶۶، ۶۷،سوال:۳۱، ۳۲،شرکت اوربٹوارہ کا بیان)

(۴) ما في " رد المحتار " : الأب وابنه يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إذا كان الإبن في عيال الأب لكونه معيناً له . (۶/۳۹۲ ، مطلب اجتمعا في دار واحدة الخ)=

....

=(۵) ما في " كتاب التعريفات للجرجاني " : ۱۲۹۴ – عِيال الرجل : هو الذي يسكن معه وتجب نفقته عليه كغلامه وامرأته وولده الصغير . (ص/۱۶۲، ط : دار الكتب العلمية بيروت ، معجم لغة الفقهاء :ص/۳۲۵ ، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراچي)

(۱۹؍واں فقہی سمینار منعقدہ بمقام ہانسوٹ گجرات، بعنوان: کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت، تجویز نمبر:۲، مقالۂ جعفریہ: جز نمبر:۱، کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت)

(٦) ما في " درر الحكام شرح المجلة " : المادة (۱۳۹۸) : (إذا عمل أحد في صنعته مع ابنه الذي في عياله فكافة الكسب لذلك الشخص ويعد ولده معينًا كما أنه إذا غرس أحد شجرًا فأعانه ولده الذي في عياله فيكون الشجر لذلك الشخص ولا يشاركه ولده فيه) . [مجلة الأحكام العدلية] . وفي درر الحكام : إذا عمل أحد في صنعته هو وابنه الذي في عياله واكتسبا أموالا ولم يكن معلوما أن للابن مالا سابقا فكافة الكسب لذلك الشخص ولا يكون لولده حصة في الكسب بل يعد ولده معينا وليس له طلب أجر المثل . (۳/۴۲۰ ، كتاب الشركة ، شركة العنان ، شرح المجلة : ص/۸۴۱ ، المادة :۱۳۹۸ ، رد المحتار :۶/۳۹۲ ، الفتاوى الهندية : ۲/۳۲۹)

(۷) ما في " الموسوعة الفقهية " : فشركة الأموال : عقد بين اثنين فأكثر على أن يتجروا في رأس مال لهم ، ويكون الربح بينهم بنسبة معلومة ، سواء علم مقدار رأس المال عند العقد أم لا ، لأنه يعلم عند الشراء ، وسواء شرطوا أن يشتركوا جميعاً في كل شراء وبيع ، أم شرطوا أن ينفرد كل واحد بصفقاته أم أطلقوا ، وليس حتما أن يقع العقد بلفظ التجارة ، بل يكفي معناها . (۲۶/۳۶ ، شركة)

ما في " المبسوط للسرخسي " : ثم يذكر فيما كان فيه من ربح فهو بينهما على قدر رؤوس أموالهما وما كان من وضيعة أو تبعة فكذلك اشتركا على ذلك في شهر كذا من سنة كذا .... فأما في المال العين إذا تساويا في رأس المال واشترطا أن يكون الربح بينهما أثلاثاً ، أو تفاوتاً في رأس المال فكان لأحدهما ألف وللآخر ألفان ، واشترطا أن يكون الربح بينهما نصفين يجوز عندنا .
(۱۱/۱۶۸، ۱۶۹ ، كتاب الشركة ، ط : دارالكتب العلمية بيروت)

ما في " الفتاوى الهندية " : أما الشركة بالمال فهي أن يشترك اثنان في رأس مال فيقولان اشتركنا فيه على أن نشتري ونبيع معا أو شتى أو أطلقا على أن ما رزق الله عزّ وجلّ من ربح فهو بيننا على شرط كذا ، أو يقول أحدهما ذلك ويقول الآخر نعم . كذا في البدائع .
(۲/۳۰۲ ، كتاب الشركة ، الباب الأول في بيان أنواع الشركة الخ)

(۸) ما في " بدائع الصنائع " : وأما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في =

....

=المقرض للحال ، وثبوت مثله في ذمة المستقرض للمقرض للحال ، وهذا جواب ظاهر الرواية.
(۶/۵۱۹ ، كتاب القرض، ط: دار الكتاب ديوبند)

ما في " الفتاوى الهندية " : والقرض هو أن يقرض الدراهم والدنانير أو شيئاً مثلياً يأخذ مثله في ثاني الحال . (۵/۳۶۶)

ما في " رد المحتار " : إن الديون تقضى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض ، لأن قبضه بنفسه على وجه التملك ، ولرب الدين على المديون مثله . (۵/۶۷۵)

ما في " بحوث في قضايا فقهية معاصرة " : القرض يجب في الشريعة الإسلامية أن تقضى بأمثالها . (ص/۱۷۴)

(۹) (درر الحكام شرح المجلة :۳/۴۲۰ ، كتاب الشركة ، شركة العنان ، شرح المجلة : ص/۸۴۱ ، المادة :۱۳۹۸ ، رد المحتار :۶/۳۹۲ ، الفتاوى الهندية :۲/۳۲۹)

(۱۰) ما في " الأصول والقواعد للفقه الإسلامي " : قاعدة (۷۰): اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ أَنْكَرَ . (ص/۱۳۷)

(۱۱) (الموسوعة الفقهية :۲۶/۳۶ ، شركة ، المبسوط للسرخسي : ۱۱/۱۶۸، ۱۶۹ ، كتاب الشركة ، ط : دارالكتب العلمية بيروت ، الفتاوى الهندية :۲/۳۰۲ ، كتاب الشركة ، الباب الأول في بيان أنواع الشركة الخ)

(۱۲) (الموسوعة الفقهية : ۱۱/۲۱۰، موت المورّث ، حاشية السراجي في الميراث :ص/۳ ، رد المحتار : ۱۰/۴۹۳ ، كتاب الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۲۹/۱۴۵ ، كتاب الفرائض ، البحر الرائق : ۹/۳۶۵ ، كتاب الفرائض)

(۱۳) (الموسوعة الفقهية :۲۶/۳۶ ، شركة ، المبسوط للسرخسي : ۱۱/۱۶۸، ۱۶۹ ، كتاب الشركة ، ط : دارالكتب العلمية بيروت ، الفتاوى الهندية :۲/۳۰۲ ، كتاب الشركة ، الباب الأول في بيان أنواع الشركة الخ)

(۱۴) (الموسوعة الفقهية : ۱۱/۲۱۰، موت المورّث ، حاشية السراجي في الميراث :ص/۳ ، رد المحتار : ۱۰/۴۹۳ ، كتاب الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۲۹/۱۴۵ ، كتاب الفرائض ، البحر الرائق : ۹/۳۶۵ ، كتاب الفرائض)

(۱۵) ما في " اللباب في شرح الكتاب " : الهبة تصح بالإيجاب والقبول ، وتتم بالقبض . (الكتاب) وفي اللباب : (وتتم) الهبة له (بالقبض) الكامل الممكن في الموهوب ؛ فالقبض الكامل=

....

= في المنقول ما يناسبه ، وكذا العقار كقبض المفتاح أو التخلية ، وفيما يحتمل القسمة بالقسمة، وفيما لا يحتمل بتبعية الكامل . (۹۲/۲ ، كتاب الهبة ، التنوير مع الدر والرد : ۴۹۳/۸ ، كتاب الهبة ، البحر الرائق : ۲۸۴/۷ ، كتاب الهبة ، تبيين الحقائق : ۴۷۱/۷ ، كتاب الهبة)

ما في " الجوهرة النيرة " : قوله : (ولا تجوز الهبة فيما يقسم إلا محوزة مقسومة) .... ومعنى قوله : " لا تجوز " أي : لا يثبت الملک فيها ؛ لأنها في نفسها وقعت جائزة ، لكن غير مثبتة للملک قبل تسليمها محوزة ، فإنه لو قسمها وسلمها مقسومة صحت . (۱۶/۲ ، كتاب الهبة ، مختصر القدوري مع التصحيح والترجيح :ص/۲۷۷ ، الصبح النوري : ۳۸۶/۲)

(۱۶) (الموسوعة الفقهية : ۳۶/۲۶ ، شركة ، المبسوط للسرخسي : ۱۶۸/۱۱ ، ۱۶۹ ، كتاب الشركة ، ط : دارالكتب العلمية بيروت ، الفتاوى الهندية : ۳۰۲/۲ ، كتاب الشركة ، الباب الأول في بيان أنواع الشركة الخ)

(۱۷) (الموسوعة الفقهية : ۲۱۰/۱۱ ، موت المورّث ، حاشية السراجي في الميراث :ص/۳ ، رد المحتار : ۴۹۳/۱۰ ، كتاب الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۱۴۵/۲۹ ، كتاب الفرائض ، البحر الرائق : ۳۶۵/۹ ، كتاب الفرائض)

(۱۸) ما في " الجوهرة النيرة " : (وهبة المشاع في ما لا يقسم جائزة) .... ؛ لأن الإشاعة فيما لا يحتمل القسمة غير مؤثرة في الهبة . (۱۶/۲ ، كتاب الهبة)

ما في " اللباب في شرح الكتاب " : (وهبة المشاع في ما لا يقسم) أي لا يبقى منتفعا به بعد القسمة أصلا كعبد ودابة ، أو لا يبقى منتفعا به من جنس الانتفاع الذي كان قبل القسمة كالحمّام الصغير والرحى (جائزة) ؛ لأن القبض القاصر هو الممكن فيكتفى به . (۳/۲ ، كتاب الهبة)

(۱۹) (الموسوعة الفقهية : ۳۶/۲۶ ، شركة ، المبسوط للسرخسي : ۱۶۸/۱۱ ، ۱۶۹ ، كتاب الشركة ، ط : دارالكتب العلمية بيروت ، الفتاوى الهندية : ۳۰۲/۲ ، كتاب الشركة ، الباب الأول في بيان أنواع الشركة الخ)

(۲۰) ما في " الدر المختار مع الشامية " : اعلم أن أسباب الملک ثلاثة : ناقل كبيع وهبة ، وخلافة كإرث ، واصالة وهو الاستيلاء حقيقة بوضع اليد ، أو حكما بالتهية كنصب شبكة لصيد .
(۴۶/۱۰ ، كتاب الصيد ، ط : دار الكتاب ديوبند)

(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے :ص/۱۸۶، تجویز نمبر:۴، ۱۹/ واں فقہی سمینار ، بمقام ہانسوٹ، گجرات، مقالۂ جعفریہ: جواب جز نمبر:۳،۵،سن۲۰۱۰ء)=

....

=(۲۱) ما في " ما في " الجوهرة النيرة " : فإذا فسدت صارت إجارة ؛ لأن الواجب فيها أجر المثل . (۱/۲۲۴، كتاب المضاربة ، بيروت)

ما في " رد المحتار " : وإجارة فاسدة إن فسدت فلا ربح للمضارب حينئذ بل له أجر مثل عمله مطلقاً ربح أو لا . (۸/۳۷۴، كتاب المضاربة) (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے :ص/۱۸۶،تجویز نمبر:۴، ۱۹/ واں فقہی سمینار، مقالہ جعفریہ: جواب جز نمبر:۵)

(۲۲) (الموسوعة الفقهية : ۱۱/۲۱۰، موت المورّث ، حاشية السراجي في الميراث :ص/۳، رد المحتار : ۱۰/۴۹۳ ، كتاب الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۲۹/۱۴۵ ، كتاب الفرائض ، البحر الرائق : ۹/۳۶۵ ، كتاب الفرائض)

(۲۳) ما في " رد المحتار " : لو اجتمع اخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ، ولو اختلفوا في العمل والرأي . اهـ . ... ثم هذا في غير الابن مع أبيه ؛ لما في القنية : الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينًا له . (۶/۵۰۲ ، كتاب الشركة ، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية ، ط : دار الكتب العلمية)

ما في " الموسوعة الفقهية " : اتفق الفقهاء على أن انتقال التركة من المورِّث إلى الوارث يكون بعد وفاة المورِّث حقيقة أو حكما أو تقديرا . (۱۱/۲۱۰، تركة ، الشرط الأول ، موت المورّث)

ما في " حاشية السراجي في الميراث " : (التركة) واصطلاحه : ما بقي بعد الميت من ماله صافيًا عن تعلّق حق الغير بعينه . (ص/۳ ، مقدمه ، رد المحتار : ۱۰/۴۹۳ ، الفرائض ، المبسوط للسرخسي : ۲۹/۱۴۵ ، كتاب الفرائض ، البحر الرائق : ۹/۳۶۵ ، كتاب الفرائض ، ط : ديوبند)

(۲۴) ما في " السنن الكبرى للبيهقي " : أن رسول الله ﷺ قال : " لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه " . (۶/۱۶۶ ، كتاب الغصب ، رقم : ۱۱۵۴۵)

ما في " مسند أحمد " : عن عبد الله بن مسعود قال : قال رسول الله ﷺ : " من اقتطع مال امرئ مسلم بغير حق لقي الله عزّ وجلّ ، وهو عليه غضبان " . (۱۶/۱۱۴ ، رقم : ۲۱۷۴۵)

وما في " مسند أحمد " : عن أبي حميد الساعدي : أن رسول الله ﷺ قال: " لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه ، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم " .

(۱۷/۵۰ ، رقم : ۲۳۴۹۶)

ما في " رد المحتار " : لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي . =

....

=(٦/٧٧ ، كتاب الحدود ، مطلب في التعزير بأخذ المال ، كذا في البحر الرائق :٥/٦٨ ، كتاب الحدود ، فصل في التعزير)

ما في " الموسوعة الفقهية " : لا يجوز أخذ مال إنسان بغير سبب شرعي . (١٢/ ٢٧١)

ما في " الخانية على هامش الهندية " : ولا يجوز لأحدهما التصرف في نصيب شريكه إلا بإذن الشريك . (٣/٦١٢ ، كتاب الشركة)

ما في " شرح المجلة " : كل من الشركاء في شركة الملك أجنبي في حصة سائرهم فليس أحدهم وكيلاً عن الآخر ، ولا يجوز له من ثم أن يتصرف في حصة شريكه بدون إذنه .

(ص/١٠٦ ، المادة : ١٠٧٥)

ما في " قواعد الفقه " : لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك بغير إذنه . (ص/١١٠ ، قاعدة : ٢٧٠)

(٢٥) ما في " شرح المجلة " : كل يتصرف في ملكه كيفما شاء . (ص/٦٠٤، المادة :١١٩٢)

(٢٦) ما في " بدائع الصنائع " : وأما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في المقرض للحال ، وثبوت مثله في ذمة المستقرض للمقرض للحال ، وهذا جواب ظاهر الرواية .

(٦/٥١٩ ، كتاب القرض، ط: دار الكتاب ديوبند)

ما في " الفتاوى الهندية " : والقرض هو أن يقرض الدراهم والدنانير أو شيئاً مثلياً يأخذ مثله في ثاني الحال . (٥/٣٦٦)

ما في " رد المحتار " : إن الديون تقضى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض ، لأن قبضه بنفسه على وجه التملك ، ولرب الدين على المديون مثله . (٥/٦٧٥)

ما في " بحوث في قضايا فقهية معاصرة " : القرض يجب في الشريعة الإسلامية أن تقضى بأمثالها .

(ص/١٧٤)

(٢٧) (عقود رسم المفتى :ص/١٧٥)

(٢٨) (قواعد الفقه :ص/١٣ ، مادة :٧)

(٢٩) ما في " المستطرف في كل فن مستظرف " : " تعاشروا كالإخوان وتعاملوا كالأجانب " .

(١/٤٠٧ ، الفصل الثالث في أمثال العامة والمولدين ، المؤلف : شهاب الدين محمد بن أحمد أبي الفتح الأبشيهي ، الناشر : دار الكتب العلمية بيروت ، تحقيق : د . مفيد محمد قميحة ، مجمع الأمثال : ١/١٥٠ ، المؤلف : أبو الفضل أحمد بن محمد الميداني النيسابوري ، الناشر : دار المعرفة بيروت ، تحقيق : محمد محي الدين عبد الحميد ، ما جاء على أفعل من هذا الباب ،=

....

= الكشكول : ۱/۲٦۳ ، المقدمة ، المؤلف : الشيخ بهاء الدين محمد بن حسن العاملي ، دار النشر : دار الكتب العلمية بيروت ، تحقيق : محمد عبد الكريم النمري)

ما في " التمثيل والمحاضرة " : " تعاشروا كالإخوان وتعاملوا كالأجانب " ؛ أي ليس في التجارة والمعاملة محاباة . (۱/۴٦ ، م : عبد الملک بن محمد بن إسماعيل أبو منصور الثعالبي ، الأمثال المولدة : ۱/۱۵۷ ، م : أبو بكر الخوارزمي ، ط: مجمع ثقافي أبو ظبي)

(۳۰) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه﴾ .
(سورة التوبة : ۲۸۲)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : قال سعيد بن جبير : ﴿وأشهدوا إذا تبايعتم﴾ ، يعني وأشهدوا على حقوقكم إذا كان فيها أجل أو لم يكن فيها أجل ، فاشهد على حقک على كل حال . (۱/۵۸۴)

ما في " التفسير المنير " : (فاكتبوه) ندبا استيثاقا للدين ودفعاً للنزاع ..... وفي أحكام التعامل بالدين المؤجل والتجارة الحاضرة غاية الحكمة والمصلحة والعدل ..... وحفظ حقه من الضياع ، ثم أكد الله النهي عن الإباء بالأمر بالكتابة بالحق ، لكون الوثيقة متعلقة بحفظ الحقوق .... إذ لا بأس من عدم الكتابة في التجارة الحاضرة أو التعامل يدا بيد ، فيطلب الاشهادعلى التبايع ، لأن اليد الظاهرة التي تجوز الشيء قد لا تكون محقه ، فيحدث النزاع والخلاف ، فكان الاشهاد أحوط ..... ومن جملة ذلک ما حذركم منه من الضرار ، وهو سبحانه يعلمكم ما فيه صلاح دنياكم وحفظ أموالكم ..... فإنما يشرعه عن علم دقيق شامل بما يدرأ المفاسد ويجلب المصالح ، وشرعه كله حكمة وعدل . (۲/۱٦ - ۲۵ ، تفسير الآية/۲۸۲)

ما في " البحر المحيط " : (فاكتبوه) أمر تعالى بكتابة ؛ لأن ذلک أوثق وآمن من النسيان ، وأبعد من الجحود ، وظاهر الأمر الوجوب .... وقال الجمهور : هو أمر ندب يحفظ به المال ، وتزال به الريبة ، وفي ذلک حث على الاعتراف وحفظه ، فإن الكتاب خليفة اللسان ، واللسان خليفة القلب . (۲/۵۵۴) (نئے مسائل اوراسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے:ص/۱۸۵،۱۹ رواں فقہی سمینار [ہانسوٹ، گجرات] بتاریخ:۲۷ر تا ۳۰ر صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق:۱۲ر تا ۱۵ر فروری ۲۰۱۰ء، کاروبار میں والد کے ساتھ اولاد کی شرکت، تجویز نمبر:۱)

(۳۱) ما في " الموافقات في أصول الشريعة " : ومجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل . (۲/۱۱ ، كتاب المقاصد ، النوع الأول ، المسئلة الأولى)

ما في " رد المحتار " : " ما كان سبباً لمحظور فهو محظور " . (۵/۲۲۳ ، مكتبه نعمانيه)

(مستفاد از؛ ذکر وفکر:ص/۸۷،۸۸)

مقاصدِ شریعت موجودہ ضرورت

لــــــغةً: قصد ومقصد ''فعل قصد'' سے مشتق ہیں، اور مقصد استقامتِ طریق، عدل وانصاف اور توسط کو کہا جاتا ہے، مقصد اسمِ مکان ہے، جمع اس کی مقاصد آتی ہے۔

اصطلاحًا: اصولیوں کے نزدیک مقاصدِ شرع سے مراد وہ معانی اور حکمتیں ہیں، جن کو شارع (اللہ رب العزت) اپنے احکام کے ذریعے ثابت کرنا چاہتا ہے۔

ہمارا اور آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی شئ بلا مقصد اور فضول و بے کار نہیں ہے، کیوں کہ کائنات اور اس کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالی ہے، قرآن پاک میں وارد ہے: ﴿**ذلكم الله ربكم لا إله إلا هو خالق كل شيء**﴾ . یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، کوئی خدا نہیں بجز اس کے، ہر شئے کا پیدا کرنے والا۔ (الأنعام: ۱۰۲)

اس کا کوئی خلق وامر بلا مقصد اور حکمت ومصلحت سے عاری وخالی نہیں ہے، تو وہ عظیم شریعت جس کو خاتم الشرائع کہا گیا، جس کو قیامت تک تمام آنے والی انسانیت کے لیے مشعلِ راہ اور دستورِ زندگی قرار دیا گیا، جس کے مطابق زندگی گزارنے پر دنیوی زندگی میں چین وسکون اور آخرت میں فلاح وبہبود کی ضمانت (Guarantee) دی گئی، اور جس کے اکمال کو اتمامِ نعمت سے تعبیر کیا گیا ہو، بھلا وہ بلا مقصد کیسے ہوسکتی ہے، اس کے بھی کچھ مقاصد ومصالح ہیں، جنہیں شارع ثابت کرنا چاہتا ہے۔

اسلامی شریعت کے احکام درحقیقت انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں، انسانیت کی دنیوی کامیابی اور اخروی سعادت ونجات کے لیے مشروع (Legal) کیے گئے ہیں، احکامِ اسلام زندگی کے ہر شعبہ اور تمام مراحل پہ اس بات کی ضمانت (Guarantee)

فراہم کرتے ہیں کہ اس دھرتی پر بسنے والی تمام انسانیت کے مابین عدل وانصاف، امن وآشتی، صداقت وراستی، اور خیر وبھلائی عام ہو، اور ہر قسم کا ظلم وزبردستی، تشدد وحق تلفی، بے انصافی اور نابرابری کا خاتمہ ہو، تاکہ ہر فردِ بشر اپنے خالق ومالک کا مطیع وفرمانبردار بن کر زندگی گزارے، اور دوسروں کے لیے نفع رساں بن کر آخرت کی ہمیشہ ہمیش کی کامیابیوں اور مسرتوں سے ہمکنار ہو، اور یہی حقیقی کامیابی اور انسان کی اصل قیمت ہے، کہ وہ دوسروں کے لیے کس قدر نفع رساں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "**خیر الناس من ینفع الناس فکن نافعاً لهم**". لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے، پس تم لوگوں کے حق میں نافع بنو۔ (کنز العمال: ۱۶/ ۵۴، رقم: ۴۴۱۴۷)

احکامِ اسلام پوری انسانی زندگی پر محیط ہیں، اور اس کے ہر ہر حکم میں انسانی فلاح ومصلحت کی روح کارفرما ہے، اور ان ہی مصالح ومقاصد کے ارد گرد تمام احکام گھومتے ہیں، اور نئے مسائل کا استنباط بھی اسی روح ومزاجِ شریعت کے مطابق کیا جاتا ہے۔

آیئے ہم ان مصالح ومقاصد پر اجمالاً روشنی ڈالتے ہیں، تاکہ اسلامی احکام کے محاسن اور خوبیاں اپنوں اور غیروں کے سامنے واضح ہوجائیں، اور نت نئے مسائل کے حل میں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

علامہ ابو اسحٰق شاطبی رحمہ اللہ نے "الموافقات" میں مقاصد ومصالحِ شرعیہ کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) مقاصدِ ضروریہ، (۲) مقاصدِ حاجیہ، (۳) مقاصدِ تحسینیہ۔

۱- مقاصدِ ضروریہ:- ان مقصدوں کو کہا جاتا ہے، جو انسانوں کی دینی ودنیوی مصلحتوں کے قیام وبقاء کے لیے ضروری ہیں، اگر یہ مقاصد فوت ہوجائیں تو دنیوی

نظام اپنا توازن کھوبیٹھتا ہے،اور دنیا میں فساد واضطراب (Commotion\ Distraction)اور اتلافِ جان ومال عام ہوجا تا ہے،اور تباہیٔ دنیا کے ساتھ ساتھ بربادیٔ آخرت بھی لازم آتی ہے،جیسا کہ آج کل کے حالات اس پر شاہدِ عدل ہیں۔

غور کیا جائے تو دینِ اسلام کے جتنے احکام ہیں، درحقیقت ان میں بنیادی طور پر پانچ مقاصد ومصالح کارفرما ہیں: حفاظتِ دین، حفاظتِ نفس، حفاظتِ نسل، حفاظتِ عقل، اورحفاظتِ مال۔" مجموع الضروريات خمسة : وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل، وقد قالوا انها مراعاة في كل ملة " .

(الموافقات للشاطبي)

۱/ حفاظتِ دین: دین، علماء شریعت کے نزدیک وہ طریق ونظام، اوراس عقیدہ وعمل کے مجموعے کا نام ہے، جسے اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی دنیوی صلاح اور اخروی فلاح کے لیے وضع فرمایا ہے، اور سلیم الفطرت لوگ اپنی مرضی واختیار سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔والدين هو وضع إلٰهي سائق لذوي العقول باختيارهم المحمود إلى الخير بالذات، وهو يشتمل العقائد والأعمال . (نور الأنوار : ص/٦)

دین انسان کی ضرورت ہے،اس کے ذریعے وہ دنیوی مصائب اور مشکلات کا قوت کے ساتھ دفاع کرتا ہے، ورنہ وہ طرح طرح کی نفسیاتی امراض (Psychics Diseases)،شکست خوردگی اور مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے،دینِ صحیح انسانی نفسیات میں ہونے والی شکست وریخت (Damage) سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے،اوراسے روحانی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے، اوراس کے خالق ومالک سے اس کے رشتے کو استوار کرتا ہے،اسی لئے اس کو مقاصدِ شریعت میں اولین ترجیح حاصل ہے۔

آج دینداری نہ ہونے کی وجہ سے پوری انسانیت مصائب ومشکلات سے دوچار اور کرب واضطراب میں مبتلا ہے، خواہ اپنے کرب واضطراب کو دور کرنے کی خاطر ہی سہی، دین کی ضرورت ان لوگوں کو بھی محسوس ہونے لگی ہے، جو آج تک دین کو دہشت گردی کا نام دے رہے تھے، اور آج وہ اس طرح کا بیان دینے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے تصوف کا سہارا لینے اور اس کو عام کرنے کی ضرورت ہے: ؎

جب دیا دکھ بتوں نے تو خدا یاد آیا!

۲/ حفاظتِ جان: دین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت جان کو حاصل ہے، تحفظِ جان ہی کے لیے اللہ رب العزت نے پوری کائنات کو بنایا اور ملائکہ کی لامتناہی تعداد کو انسان کی حفاظت پر مامور کردیا۔ ﴿**هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعًا**﴾ وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔

(سورة البقرة : ۲۹)

﴿**له معقبات من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من أمر الله**﴾ ہر ایک کے لیے باری باری آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی وہ اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ (سورة الرعد : ۱۱)

عن أبي أمامة قال : قال رسول الله ﷺ : " وكل بالمؤمن تسعون ومائة ملكٍ يذبون عنه ما لم يقدر عليه ، من ذلك النفر تسعة أملاك يذبون عنه كما يذب عن قصعة العسل من الذباب في اليوم الصائف ، وما لو بدا لكم لرأيتموه على جبل وسهل ، كلهم باسط يديه فاغر فاه وما لو وكل العبد فيه إلى نفسه طرفة عين خطفته الشياطين " .

(المعجم الكبير للطبراني : ۸/۱٦۷، ۱٦۸، رقم: ۷۷۰۴، روح المعاني : ۸/ ۱٦۲)

کائنات کی تمام چیزوں کو انسانوں کے لیے مسخر (Subdued\ Conquered) کردیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اللّٰہ الذي خلق السمٰوٰت والأرض وأنزل من السمآء مآء فأخرج به من الثمرات رزقاً لكم وسخر لكم الفلك لتجري في البحر بأمره وسخر لكم الأنهار وسخر لكم الشمس والقمر دآئبين وسخر لكم الليل والنهار﴾. اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور اور زمین کو پیدا کیا، اور آسمانوں سے پانی اتارا، پھر اس (پانی) سے (مختلف) پھل تمہارے لیے بطور رزق پیدا کئے، اور تمہارے (نفع کے) لیے کشتی کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا تا کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے، اور تمہارے (نفع کے) لیے دریاؤں کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا، اور تمہارے (نفع کے) لئے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا جو دوام رکھنے والے ہیں، اور تمارے (نفع کے) لئے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا۔ (سورة ابراهيم :۳۳)

غرضیکہ افلاک کا پورا نظام اور عالمِ ارض کی تمام چیزوں کو انسانی حفاظت پر لگادیا۔

جو چیزیں اس کے لیے مفید (Useful\Profitable) تھیں ان کو حلال، اور جو چیزیں مضر (Hurtful) تھیں ان کو حرام قرار دیا، حلال کو استعمال کرنے اور حرام کے تناول سے دور رہنے کا حکم دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿یآ أيها الرسل كلوا من الطيبٰت واعملوا صالحًا﴾. اے پیغمبرو! نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

(سورة المؤمنون : ۵۱)

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : ”يا أيها الناس ! إن اللّٰه طيب لا يقبل إلا طيب ، وإن اللّٰه تعالىٰ أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين ، فقال: ﴿يا أيها الرسل كلوا من الطيبٰت واعملوا صالحًا إني بما تعملون عليم﴾ .

وقال :﴿يا أيها الذين اٰمنوا كلوا من طيبٰت ما رزقناكم﴾ " . --- ثم ذكر الرجل يطيل السفر ، أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء : يا رب ! يا رب ! ، ومطعمه حرام ، ومشربه حرام ، وملبسه حرام ، وغُذِّيَ بالحرام ، فأنَّى يستجاب له " . (الآداب للبيهقي :ص/١٦٠ ، رقم :٥٢٠ ، باب في تطيب المطعم والملبس واجتناب الحرام واتقاء الشبهات)

قال القرطبي : سوى اللّٰه تعالىٰ بين النبيين والمؤمنين في الخطاب بوجوب أكل الحلال وتجنب الحرام. علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حلال اشیاء کے تناول اور حرام اشیاء سے احتراز کے واجب ہونے کے سلسلے میں انبیاء اور مؤمنین کو خطاب میں برابر قرار دیا ہے۔ (تفسير قرطبي :١٢/١٢٨)

تحفظِ جان ہی کے لیے قتلِ ناحق کو حرام قرار دیا گیا، اور قاتل کے لیے قصاص (Punishment\Retribution) کی سزا تجویز کی گئی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ولا تقتلوا النفس التي حرم اللّٰه إلا بالحق﴾. اور جس شخص (کی جان) کو اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے اسے قتل مت کرو، ہاں مگر حق پر۔

(سورة بني اسرائيل :٣٣)

﴿وما كان لمؤمن أن يقتل مؤمناً إلا خطأً﴾. اور یہ کسی مؤمن کے شایان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کردے بجز اس کے کہ غلطی سے ایسا ہوجائے۔

(سورة النساء : ٩٢)

﴿ومن يقتل مؤمنًا مُّتعمِّدًا فجزآءه جهنم خالدًا فيها﴾. اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کردے تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔

(سورة النساء:٩٣)

﴿من قتل نفسًا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعًا ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعًا﴾ . جوکوئی کسی کو کسی جان کے (عوض کے) یا زمین پر فساد (کے عوض) کے بغیر مار ڈالے تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مارڈالا، اور جس نے ایک کو بچالیا، تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچالیا۔
(سورة المائدة : ۳۲)

بلکہ ہر عضو کے بدلے اسی عضو سے قصاص لینے کا حکم رکھا گیا۔﴿وكتبنا عليهم فيهآ أن النفس بالنفس والعين بالعين والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص﴾. اورہم نے ان پر اس میں یہ فرض کردیا تھا کہ وہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا ناک اور کان کان اور دانت کا دانت اور زخموں میں قصاص ہے۔ (سورة المائدة : ۴۵)

تحفظِ جان کے لیے احکامِ شرعیہ میں متعدد رخصتیں دی گئیں، مثلاً:

۱/ جب تناول کے لیے کوئی حلال چیز نہ ہو، اور ہلاکت کا یا قربِ ہلاکت کا غالب گمان ہو، تو اس قدر حرام چیز کے استعمال کی اجازت دی گئی، جس سے جان بچ جائے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿فمن اضطر في مخمصة غير متجانف لإثم فإن الله غفور رحيم﴾ . ہاں! جوکوئی بھوک کی شدت سے بے قرار ہوجائے، گناہ کی طرف رغبت کیے بغیر، سواللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے۔
(سورة المائدة :۳)

الضرورة بلوغه حدًا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب ، وهذا يبيح تناول الحرام . (الموسوعة الفقهية : ۱۹۱/۲۸)

۲/ اگر کوئی شخص بیمار ہو اور علاج میں کوئی حلال چیز کارگر نہ ہو، اور حرام چیز کے

تناول سے شفا کا غالب گمان ہو، تو بقدرِ ضرورت اسے اس کے تناول کی رخصت دی گئی۔علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ففي النهاية عن الذخيرة : يجوز إن علم فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر . اهـ . وكذا اختاره صاحب الهداية في التجنيس فقال : لو عرف فكتب الفاتحة بالدم على جبهته وأنفه جاز للاستشفاء وبالبول أيضًا إن علم فيه شفاء لا بأس به ، لكن لم ينقل وهذا لأن الحرمة ساقطة عند الاستشفاء كحل الخمر والميتة للعطشان والجائع . اهـ . من البحر . (شامي : ۱/۳۶۵ ، كتاب الطهارة ، باب المياه ، مطلب في التداوي بالمحرم)

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جانیں کس قدر اہمیت کی حامل ہیں، اور محض کسی کی جانب سے لاحق خطرات، جب تک کہ وہ حقیقۃً واقع نہ ہوں کی بنا پر، اس کو موت کی نیند سلا دینا کبھی بھی جائز نہیں ہوسکتا، ورنہ ہر آدمی یہی کہے گا کہ فلاں کی جانب سے میری جان یا میرے ملک کو خطرہ لاحق ہے، اس لیے اس کو موت کے گھاٹ اتار دینا میرے لیے جائز ہے۔

یاد رکھیں! اگر اس طرح کے جواز کو ثابت کیا جائے گا، تو وہ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہوگا، اور یہ دنیا قتل وغارت گری کا میدان بن جائے گی، جیسا کہ ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

۳- حفاظتِ عقل: عقل انسان کا وصفِ امتیازی ہے، اس وصف کی وجہ سے اسے تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے، اور اسی وصف کی وجہ سے وہ شریعت کا مخاطب بھی ہے۔ والقول الصحيح في باب العقل أن العقل معتبر لاثبات

الأهلية . (أي أهلية الوجوب) . (الحسامي : ص/۱۳۷)

حفاظتِ عقل کے لیے شریعت نے تعلیم کو ضروری قرار دیا، کیوں کہ تعلیم سے عقلِ انسانی صیقل ہوتی ہے، اور عقل اوہام وخرافات سے بچ جاتی ہے۔ خدائے پاک کا فرمان ہے:﴿**اقرأ باسم ربک الذي خلق**﴾. آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام سے جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے۔ (سورة العلق : ۱)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **طلب العلم فريضة على كل مسلم**" . علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔

(شعب الإيمان للبيهقي : ۲/۲۵۴ ، رقم : ۱۶۶۶)

اور شریعت نے ایسی تمام چیزوں کے استعمال سے منع فرمایا، جو عقل کو نقصان پہنچاتی ہیں، مثلاً: شراب پینا اور نشہ آور چیز کا استعمال کرنا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:﴿**یآ أیها الذین اٰمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوه**﴾ . اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس نری گندی باتیں ہیں شیطان کے کام، سو اس سے بچتے رہو۔ (سورة المائدة : ۹۰)

ارشادِ نبوی ہے:" **کل مسکر حرام** ". ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

(صحيح مسلم : ۷/۸۹ ، رقم : ۵۱۷۶)

أسماء الأشربة المحرمة في الجملة ... أما الأسماء فثمانية : الخمر والسكر ونقيع الزبيب ونبيذ التمر والفضيخ والباذق والطلاء ويسمى المثلث و الجمهوري ويسمى أبو يوسفي .

(تحفة الفقهاء : ۳/۳۲۵ ، كتاب الأشربة)

آج اگر شراب، نشہ آور چیزوں اور منشیات کے استعمال پر پابندی لگادی جائے، اور

لوگ ان چیزوں کے استعمال سے اپنے آپ کو باز رکھیں، تو یقیناً شفا خانوں (Hospitals) پناہ گزین کیمپوں (Refugee campus) اور قید خانوں (Prisons\Jails) کی وہ تعداد باقی نہ رہے گی جو موجود ہے۔

٤- حفاظتِ نسل: اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا فرمایا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿**خلق الإنسان من علق**﴾. جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ (سورة العلق: ۲)

اور اس کا مقصد ومنشا یہ ہے کہ بنی نوع انسان تا قیامت اس کی نائب بن کر اصلاح فی الارض اور اقامتِ شرائع کا فرض انجام دیتی رہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**وإذ قال ربک للملئکة إني جاعل في الأرض خليفة**﴾. اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پرودگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔ (سورة البقرة: ۳۰)

اور یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے، جب کہ نکاح اور شادی کے ذریعے نسلِ انسانی کی افزائش ہوتی رہے، نسلِ انسانی کی افزائش کے لیے نکاح وشادی کا تعین اس لیے کیا گیا، کہ محض افزائشِ نسل مطلوب نہیں، بلکہ ایسی نسل مطلوب ہے، جو خدائی مقصد ومنشا کو پورا کرے (اصلاح فی الأرض اور اقامتِ شرائع)۔

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ یہ افزائش صحیح طریقے پر ہو، ورنہ فاسد طریقے سے ہونے والی افزائش خود فاسد ہوتی ہے، تو اس سے اصلاح فی الارض کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے، فقہ کا قاعدہ ہے: "**المبني على الفاسد فاسد**". "**ما بني على فاسد أو باطل فهو فاسد وباطل**". (موسوعة القواعد الفقهية: ۴۳۹/۹)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إنک إن تذرهم يضلوا عبادک ولا يلدوٓا إلا فاجرًا كفّارًا﴾. اگر تو انہیں رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ ہی کرتے رہیں گے، اور ان کے محض کافر و فاجر ہی اولاد پیدا ہوتی رہے گی۔ (سورة نوح: ۲۷)

جس معاشرہ نے افزائشِ نسل کے اس طریقِ صحیح سے انحراف واعراض کیا، آج وہ اپنی اس سنگین غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہے، پورا معاشرہ اس غلطی کی تباہ کاریوں سے لرز رہا ہے۔

اسلامی شریعت نے حفاظتِ نسل کے لیے نکاح پر زور دیا، اس کو سنت قرار دیا۔ عن عبيد بن سعد عن النبي ﷺ قال: "من أحب فطرتي فليستن بسنتي، ومن سنتي النكاح". (سنن الكبرى للبيهقي: ۷/۱۲۴، رقم: ۱۳۴۵۱)

عن عائشة قالت: قال رسول اللّٰه ﷺ: "النكاح من سنتي، فمن لم يعمل بسنتي فليس مني". (سنن ابن ماجه: ص/۱۳۳، أبواب النكاح)

رہبانیت کو منع فرمایا۔ عن سعد بن أبي وقاص أن اللّٰه أبدلنا بالرهبانية الحنيفيةَ السمحةَ. (كشف الخفاء للعجلوني: ۲/۳۴۵، حرف اللام ألف)

بے نکاح مرد وعورت کے نکاح کا حکم دیا۔ ﴿وأنكحوا الأيامى منكم والصٰلحين من عبادكم وإمآئكم إن يكونوا فقرآء يغنهم اللّٰه من فضله واللّٰه واسع عليم﴾. اور تم اپنے بے نکاحوں کا نکاح کرو، اور تمہارے غلام اور باندیوں میں جو اس کے (یعنی نکاح کے) لائق ہوں ان کا بھی، اگر یہ لوگ مفلس ہوں گے، تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا جاننے والا ہے۔ (سورة النور: ۳۲)

مناسب جوڑا ملنے پر نکاح کا حکم دیا۔ **عن علي بن أبي طالب أن النبي ﷺ قال له : " يا علي ! ثلاث لا تؤخرها : الصلاة إذا آنت ، والجنازة إذا حضرت ، والأيم إذا وجدت لها كفوًا " .**

(جامع الترمذي : ۱/۱۳۳ ، باب ما جاء في الوقت الأول من الفضل ، رقم : ۱۷۱)

جو لوگ نکاح پر قدرت نہیں رکھتے ان کے لیے روزوں کا حکم دیا۔ **قال رسول الله ﷺ : " يا معشر الشباب ! من استطاع منكم الباء ة فليتزوج ، فإنه أغض للبصر ، وأحصن للفرج ، ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وِجآء " .** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو قدرت رکھتا ہے، تو اسے چاہئے کہ وہ نکاح کرلیں، کیوں کہ یہ نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت میں زیادہ معاون ہے۔ اور جو نکاح پر قدرت نہ رکھتا ہو، تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے، کیوں کہ روزہ اس کے (گناہ سے بچنے کے) لیے ڈھال ہے۔

(صحيح مسلم : ۵/۲۹۴ ، رقم : ۳۳۸۴ ، صحيح بخاري : ص/۹۳۴ ، رقم : ۵۰۶۶)

نکاح کو آسان بنانے کا حکم دیا۔ **عن عائشة قالت : قال النبي ﷺ : " إن أعظم النكاح بركة أيسره مؤنة " . رواه البيهقي في شعب الإيمان .**

(مشكوة : ص/۲۶۸ ، كتاب النكاح)

پھر اس رشتہ کو مضبوط و پائیدار بنانے کے لیے مرد وعورت دونوں کے حقوق وفرائض متعین کئے۔ **﴿ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف﴾** . اور عورتوں کا (بھی) حق ہے جیسا کہ عورتوں پر حق ہے موافق دستور (شرعی) کے۔ (سورة البقرة:۲۲۸)

حفاظتِ نسل کی خاطر شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا۔ **﴿ولا تقربوا الزنآ إنه كان فاحشة وسآء سبيلاً﴾** . اور زنا کے پاس بھی مت جاؤ یقیناً وہ بڑی بے حیائی

ہے اور بری راہ ہے۔ (سورة بني اسرائيل: ۳۲)

عن أبي هريرة قال : قال رسو ل الله ﷺ: " لا يزني الزاني وهو حين يزني مؤمن " . حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: زنا کرنے والا نہیں زنا کرتا ہے جس وقت وہ زنا کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو۔ (سنن نسائي: ۴/۳۶۷، رقم: ۶۴۲۷)

زنا کرنے والوں کے لیے سخت سزا رکھی۔ **﴿الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة﴾**. زنا کار عورت اور زنا کار مرد سو(دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کو سو سو دڑّے مارو۔ (سورة النور: ۲)

اور غیر فطری جنسی عمل کو بھی حرام قرار دیا۔ **﴿وجآءه قومه يهرعون إليه ومن قبل كانوا يعملون السيئات قال يقوم هٰؤلآء بناتي هن أطهر لكم فاتقوا الله ولا تخزون في ضيفي أليس منكم رجل رشيد﴾**. اوران کے پاس ان کی قوم (کے لوگ) دوڑے ہوئے آئے اور وہ پہلے ہی سے بدکاریاں کرتے تھے، (لوط علیہ السلام) بولے اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں (بھی تو موجود) ہیں یہ تمہارے حق میں پاکیزہ ہیں، سواللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں۔ (سورة هود: ۷۸)

﴿ولوطاً إذ قال لقومهٖ أتأتون الفاحشة وأنتم تبصرون﴾. اور لوط (کو بھی ہم نے پیمبر بنا کر بھیجا تھا) جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ ارے! کیا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو، درآنحالیکہ سمجھ رکھتے ہو۔ **﴿ء إنكم لتأتون الرجال شهوة من دون النسآء بل أنتم قوم مسرفون﴾**. ارے! تم مردوں کے ساتھ

شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر! مگر ہاں تم لوگ ہی ہو جاہلیت میں (مبتلا)۔ (سورۃ النمل: ۵۴-۵۵)

﴿والـلذان يأتيانها مـنكم فآذوهما﴾. اور تم میں سے کوئی دو جو وہ کام کریں انہیں اذیت پہنچاؤ۔ (سورة النساء: ١٦)

نیز ان تمام اسباب وذرائع کو جو زنا اور بے راہ روی تک پہنچانے والے تھے، کو بھی منع کر دیا، مثلاً:

۱ر مرد وعورت کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا۔ ﴿قـل لـلـمـؤمـنـيـن يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم، ذلک أزكى لهم، إن الله خبير بما يصنعون. وقـل لـلـمـؤمـنٰـت يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن﴾. آپ ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے حق میں زیادہ صفائی کی بات ہے بیشک اللہ کو سب کچھ خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور آپ کہہ دیجئے ایمان والیوں سے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھیں۔ (سورة النور: ۲۹، ۳۰)

۲ر غیروں کے سامنے زیب وزینت کی آرائش اور جنسی ہیجان پیدا کرنے والی چیزوں کو حرام قرار دیا گیا۔ ﴿يآ أيهـا الـنبي قل لأزواجک وبناتک ونسآء الـمـؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن﴾. اے نبی آپ کہہ دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور (عام) ایمان والوں کی عورتوں سے کہ اپنے اوپر نیچی کر لیا کریں اپنی چادریں تھوڑی سی۔ (سورة الأحزاب: ۵۹)

﴿ولا يـبـديـن زيـنـتهـن إلا مـا ظهـر مـنهـا ولـيـضـربـن بخمـرهن على جيـوبهـن﴾. اور اپنا سنگار ظاہر نہ ہونے دیں مگر ہاں جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے،

اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں. (سورۃ النور: ۳۱)

﴿فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولاً معروفاً﴾.

﴿وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى﴾. تو تم بولی میں نزاکت مت اختیار کرو کہ (اس سے) ایسے شخص کو خیال (فاسد) پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے، اور قاعدے کے موافق بات کہا کرو۔ اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اور جاہلیتِ قدیم کے مطابق اپنے کو دکھاتی مت پھرو۔

(سورة الأحزاب: ۳۲، ۳۳)

۵- حفاظتِ مال: شریعت نے جس چیز کی ذاتی قیمت تسلیم کی وہ شریعت کی نگاہ میں مال ہے، ایسا مال قابلِ احترام ہے، تمام جائز طریقوں سے مال سے انتفاع درست ہے، مال مقصود نہیں بلکہ محض وہ انسان کی دنیوی ضرورتوں کی تکمیل، اور اخروی سعادت ونجات کی تحصیل کا ذریعہ ہے، اگر اس کو جائز طریقوں سے حاصل کیا جائے، اور درست مواقع میں خرچ کیا جائے، اور وہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل نہ کردے، تو یہ مال اللہ کی نعمت ہے، اور اگر اس کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے یا غلط جگہوں میں خرچ کیا جائے، یا وہ انسان کو اس کے خالق ورزاق سے غافل کردے، تو یہ نعمت نہیں زحمت ہے، اور اخروی تباہی وبربادی کا باعث ہے۔

مال کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام مال میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، اور انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اصلاً اس مال کا مالک اللہ ہے۔ ﴿إن اللّٰه اشترى من المؤمنين أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة﴾. بلاشبہ اللہ نے مؤمنین سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انہیں جنت ملے گی۔

(سورة التوبة: ۱۱۱)

﴿ومـمـا رزقـنـاهم ينفقون﴾. اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ:۳)

﴿وابتـغ فيـمـآ اٰتـاک اللّٰـه الـدار الاٰخرة ولا تنـس نصيبک من الدنيا﴾. اور جو کچھ تجھے اللہ نے دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر، اور دنیا سے (بھی) اپنا حصہ فراموش مت کر۔ (سورة القصص : ۷۷)

اور اس نے اسے انسان کے منافع کے لیے عطا فرمایا ہے، اس تعلیم کے ساتھ وہ اپنی ذات اور متعلقین کے ساتھ ساتھ سماج کے دیگر افراد کے لیے اپنے مال میں دینی ذمہ داری محسوس کرے۔﴿وفيٓ أمـوالهم حق للسآئل والمحروم﴾. اور ان کے مال میں حق رہتا تھا سوالی اور غیر سوالی (سب) کا۔ (سورة الذاريات : ۱۹)

تحصیلِ مال کے طریقوں سے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ:

۱/ اس کے لیے محنت وعمل ہو۔﴿وابتـغـوا مـن فضل اللّٰـه﴾. اور اللہ کی روزی تلاش کرو۔ (سورة الجمعة : ۱۰)

حدیث پاک میں وارد ہے:" طـلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة ". رواه البيهقي في شعب الإيمان . حلال کمائی کا طلب کرنا فرائضِ خمسہ کے بعد ایک فریضہ ہے۔ (مشکوۃ:ص/۲۴۲)

۲/ مزدور کو اس کی پوری اجرت دی جائے، اور اجرت دینے میں تاخیر نہ کی جائے۔ قال رسول الله ﷺ : " ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة ؛ رجل أعطى بي ثـم غـدر ، ورجل باع حرًّا فأكل ثمنه ، ورجل استأجر أجيرًا فاستوفى مـنه ولم يوفه أجره " . آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (حدیث قدسی ہے کہ)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کی طرف سے خود مدعی بنوں گا، ایک وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا پھر دھوکہ دیا، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچا اور اس کی قیمت کھالی، تیسرا وہ شخص جس نے مزدور سے محنت تو پوری لی مگر اس کی مزدوری نہ دی۔" (صحیح بخاري : ۱/۳۰۲، باب إثم من منع الأجیر، سنن ابن ماجه :ص/۱۷۶، الرهون، باب أجر الأجراء)

عن عبد الله بن عمرو قال : قال رسول الله ﷺ : " أعطوا الأجير الأجر قبل أن يجف عرقه " . آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔" (سنن ابن ماجه : ۲/۱۷۶)

۳/ مال گردش میں رہے، اس لیے تجارت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ عن أبي سعيد قال : قال رسول الله ﷺ : " التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء " . رواه الترمذي والدارمي والدار قطني . (مشكوة المصابيح :ص/۲۴۳، كتاب البيوع، باب المساهلة في المعاملة، جامع الترمذي : ۲/۲۵۸، كتاب البيوع، باب ما جاء في التجار وتسمية النبي ﷺ إياهم)

عن معاذ بن جبل قال : قال رسول الله ﷺ : " إن أطيب الكسب كسب التجار الذين إذا حدثوا لم يكذبوا ، وإذا اؤتمنوا لم يخونوا ، وإذا وعدوا لم يخلفوا ، وإذا اشتروا لم يذموا ، وإذا باعوا لم يطروا ، وإذا كان عليهم لم يمطلوا ، وإذا كان لهم لم يفسروا " .

(الآداب للبيهقي :ص/۳۰۴، رقم : ۱۰۰۱، باب ما يكره من التجارة)

۴/ سود کو حرام قرار دیتا ہے، کہ اس سے شفقت وہمدردی کے جذبات ختم ہوتے

ہیں۔﴿أحل اللّٰہ البیع وحرم الربوا﴾ . اللہ نے بیع کوحلال کیا ہےاورسودکوحرام کیا ہے۔ (سورۃ البقرۃ:۲۷۵)

عن جابر قال : لعن رسول اللّٰہ ﷺ آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ ، وقال : " ھم سواء " . حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر،اوراس کے لکھنے والے پراوراس کے دونوں گواہوں پر، اورفرمایا (گناہ میں) سب برابر کے شریک ہیں۔ (صحیح مسلم:۲/۲۷)

۵/ مال کے ارتکاز واحتکار(Monopoly\Monopolization)کومنع کرتا ہے، کیوں کہ اس سے عام انسانیت مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔عن معمر قال : قال رسول اللّٰہ ﷺ : " من احتکر فھو خاطیء " . رواہ مسلم .

(مشکوۃ المصابیح :ص/۲۵۰، کتاب البیوع ، باب الاحتکار ، المعجم الکبیر للطبراني : ۴۴۵/۲۰ ، رقم :۱۰۸۶ ، السنن الکبری للبیھقي :۴۹/۶ ، رقم : ۱۱۱۴۷)

عن عمر عن النبي ﷺ قال : " الجالب مرزوق والمحتکر ملعون " . رواہ ابن ماجۃ والدارمي . (مشکوۃ المصابیح :ص/۲۵۱)

مالی معاملات میں جھگڑوں اورمنازعات سے بچنے کے لیے معاملات کو صاف ستھرے طریقے سے انجام دینے کی تاکید کرتا ہے۔أما العاقد فیشترط فیہ العقل والتمییز فلا یصح عقد المجنون ولا السکران ولا الصبي غیر الممیز .... وأما المعقود علیہ فیشترط فیہ ستۃ شروط : طھارۃ العین ، الانتفاع بہ ، ملکیۃ العاقد لہ ، القدرۃ علی تسلیمہ ، العلم بہ ، کون المبیع مقبوضًا . (فقہ السنۃ :۱۵۰/۳ ، شروط البیع)

عن ابن عمر قال : قال رجل للنبي ﷺ : إني أخدَعُ في البيوع فقال : ”إذا بايعت فقل لا خلابة فكان الرجل يقوله “ . متفق عليه .

(مشكوة المصابيح :ص/۲۴۴ ، كتاب البيوع ، باب الخيار)

قال رسول الله ﷺ : ” المؤمن أخو المؤمن . فلا يحل للمؤمن أن يبتاع على بيع أخيه “ . رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مومن مومن کا بھائی ہے، لہٰذا کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے۔

(صحيح مسلم :۵/۳۱۷ ، رقم : ۳۴۴۹)

معاملات کو قیدِ تحریر میں لانے اور اس پر گواہ بنانے کا حکم دیتا ہے۔﴿يآ أيها الذين اٰمنوآ إذا تداينتم بدين إلٰى أجل مُسمًّى فاكتبوه﴾ اے ایمان والو! جب ادھار کا معاملہ کسی مدتِ معین تک کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔

﴿وأشهدوآ إذا تبايعتم﴾ اور جب خرید وفروخت کرتے ہو (تب بھی) گواہ کرلیا کرو۔ (سورة البقرة :۲۸۲)

مال داری اور غریبی کی کھائی پاٹنے اور مال میں عدل و برابری کو قائم کرنے کے لیے نیک کاموں میں خرچ کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اور بخل و کنجوسی سے منع کرتا ہے۔﴿ولا يحسبن الذين يبخلون بمآ اٰتاهم الله من فضله هو خيرًا لهم بل هو شرٌّ لهم سيطوقون ما بخلوا به يوم القيامة﴾ اور جو لوگ کہ اس مال میں بخل کرتے رہتے ہیں جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں کچھ اچھا ہے، نہیں! بلکہ ان کے حق میں (بہت) برا ہے، یقیناً انہیں قیامت کے دن طوق پہنایا جائے گا اس (مال) کا جس میں انہوں نے بخل کیا۔ (سورة آل عمران : ۱۸۰)

﴿والله لا يحب كل مختال فخور الذين يبخلون ويأمرون الناس بالبخل﴾. اوراللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔ (وہ لوگ ایسے ہیں) جو خود بھی بخل کرتے ہیں اورلوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔

(سورة الحديد: ۲۳، ۲۴)

﴿ويل لكل همزة لمزة الذي جمع مالاً وعدده يحسب أن ماله أخلده﴾. کم بختی ہے پسِ پشت عیب جوئی کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا (رہتا) ہو اوراسے گنتا رہتا ہو، وہ یہ خیال کررہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔ (سورة الهمزة: ۱-۳)

﴿والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب أليم يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لأنفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون﴾. اور جولوگ کہ سونا اور چاندی جمع کرکر کے رکھتے ہیں اوراس کوخرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں، آپ انہیں ایک دردناک عذاب کی خبر سنادیجئے، اس روز (واقع ہوگا) جب کہ اس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھراس سے ان کی پیشانیوں کو اوران کے پہلوؤں کو اوران کی پشتوں کو داغا جائے گا، یہی ہے وہ جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے، سواب مزہ چکھو اپنے جمع کرنے کا۔ (سورة التوبة: ۳۴، ۳۵)

تحفظِ مال کی خاطر مال پر دست درازی کرنے والے چوروں اور رہزنوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کی، اوردوسروں کے مال ہتھیانے والوں اوراس کونقصان پہنچانے والوں پرضمان وتاوان کوواجب کیا۔ ﴿السارق والسارقة فاقطعوآ أيديهما جزآءً بما كسبا نكالاً من الله﴾. اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے

والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو ان کے کرتوتوں کے عوض میں اللہ کی طرف سے۔ (سورة المائدة :۳۸)

﴿إنما جزآء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فسادا أن يقتلوآ أو يصلبوآ أو تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض﴾ . جولوگ اللہ اوراس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں، ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا سولی دیئے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں، یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں۔ (سورة المائدة :۳۳)

آج پوری دنیا مشکلات وپریشانیوں میں مبتلا ہے، بے چینی واضطراب کے انتہائی خطرناک بھنور میں پھنستے جارہی ہے، اوراس سے نکلنے کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں ، اور جتنے قوانین بنائے جارہے ہیں، بجائے اس کے کہ اُن سے اِن مشکلات سے خلاصی وچھٹکارامل جاتا، اس میں مزید اضافہ دراضافہ ہورہا ہے، اوردن بدن پریشانیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں، آخراس کی وجہ کیا ہے؟؟

اس کی وجہ ہے ان تدبیروں اورقوانین کا ضعف ونقص، جوان مشکلات سے خلاصی اور چھٹکارے کے لیے تجویز کئے جارہے ہیں، کیوں کہ ان کو کمزور انسانوں کے کمزور ہاتھوں اور کمزور دماغوں نے وضع کیا، جب کہ ان سے نکلنے کے لیے ایسی تدابیر اور قوانین کی ضرورت ہے، جسے مدبرِ حقیقی اورحاکمِ اصلی نے وضع کیا ہو، اوروہ ہے خالقِ کائنات کی ذاتِ مقدس، کیوں کہ حقیقی مدبر اورحاکم وہی ہے۔﴿يدبر الأمر من السمآء إلى الأرض ثم يعرج إليه في يوم كان مقداره ألف سنة مما

تعدون﴾. آسمان سے زمین تک وہی ہر امر کی تدبیر کرتا ہے، پھر (یہ امر) اس کے پاس پہنچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کی ہوگی۔ (سورة السجدة: ۵)

﴿ألا له الخلق والأمر تبٰرک الله رب العٰلمين﴾. یاد رکھو اسی کے لیے خاص ہے آفرینش (بھی) اور حکومت (بھی) برکت سے بھرا ہوا ہے، اللہ سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ (سورة الأعراف: ۵۴)

اس لیے سربراہانِ اقوامِ عالم اور قائدینِ ملل کو، عدل وانصاف کی نظر سے قوانینِ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور انہیں اپنے زیرِ اثر مملکتوں میں نافذ کر کے، اپنی رعایا کے لیے امن وسکون کی زندگی فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، تبھی وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہوسکتے ہیں، ورنہ اس تغافل وتساہل اور اعراض عن الحقیقت پر کل قیامت کے دن انہیں جواب دہ ہونا ہوگا۔

۲- مقاصدِ حاجیہ: مقاصدِ حاجیہ ان مقاصد کو کہا جاتا ہے جن سے مکلفین کی زندگی حرج وتنگی سے نکل کر وسعت وکشادگی میں آجاتی ہو، ان مقاصد کے حصول کے لیے شریعت نے بہت سے احکام جاری کیے۔ مثلاً:

ا۔ کوئی شخص قیام پر قادر نہیں، تو اس کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی، اگر زمین پر سجدہ کی قدرت نہیں تو اشارہ سے رکوع وسجدہ کے ساتھ، اگر بیٹھنے پر قدرت نہیں تو داھنی طرف کروٹ قبلہ رخ ہوکر، اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو چت لیٹ کر قبلہ کی جانب اپنے پیر رکھ کر نماز پڑھنے کی رخصت دی گئی۔

عن علي بن أبي طالب كرم الله وجهه عن النبي ﷺ قال: ”يصلي

المريض قائمًا ، فإن لم يستطع صلى قاعدًا ، فإن لم يستطع أن يسجد أومأ وجعل سجوده أخفض من ركوعه ، فإن لم يستطع أن يصلي قاعدًا صلى على جنبيه الأيمن مستقبلة ، فإن لم يستطع صلى مستلقيًا رجلاه مما يلي القبلة“ . (نصب الراية : ۲/۱۷۹)

۲/ اگر کوئی شخص سفرِ شرعی پر ہے، یا بیمار ہے تو اس کے لیے قصر وافطار کی اجازت دی گئی۔ ﴿وإذا ضربتم في الأرض فليس عليكم جناح أن تقصروا من الصلوة﴾. اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کردیا کرو۔ (سورة النساء : ۱۰۱)

﴿ومن كان مريضًا أو على سفر فعدة من أيام أخر يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر﴾. اور کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو (اس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) اللہ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔ (سورة البقرة : ۱۸۵)

۳/ اگر پانی نہ ہو، یا ہو مگر استعمال سے عاجز ہو، یا استعمال کی وجہ سے ازدیادِ مرض، یا صحت یابی میں تاخیر کا اندیشہ ہو، تو تیمّم کو جائز قرار دیا گیا۔

﴿وإن كنتم مرضىٰ أو على سفر أو جآء أحد منكم من الغآئط أو لٰمستم النسآء فلم تجدوا مآء فتيمموا صعيدًا طيبًا فامسحوا بوجوهكم وأيديكم منه ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج ولكن يريد ليطهركم﴾. اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے، یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلیا کرو، یعنی

اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کرلیا کرو، اللہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ (تو یہ) چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک وصاف رکھے۔ (سورة المائدة: ٦)

ويجوز للمريض والمسافر أن يتيمم إذا لم يستطع الوضوء أو الغسل وإن أجنب المسافر ومعه من الماء مقدار ما يتوضأ به يتيمم عندنا ، ولم يستعمل الماء ، ويتيمم لصلاة الجنازة في المصر إذا خاف فوتها وكذلك لصلاة عندنا . (المبسوط للسرخسي : ٢٥٢/١ ، باب التيمم)

۴/ حائضہ اور نفساء پر روزوں کی قضا لازم ہے، مگر نمازوں کی قضا لازم نہیں۔

عن عائشة كانت إحدانا على عهد رسول الله ﷺ إذا طهرت من حيضها تقضي الصيام ، ولا تقضي الصلاة . (نصب الراية للزيلعي : ٢٥٤/١)

۵/ شکار کو مباح کردیا گیا۔ ﴿أحل لكم صيد البحر وطعامه متاعًا لكم وللسيارة﴾. تمہارے لیے دریائی شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا تمہارے نفع کے لیے اور قافلوں کے لیے۔ (سورة المائدة : ٩٦)

٦/ پاکیزہ چیزوں سے انتفاع کو مباح قرار دیا، جیسا کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے اور سواری وغیرہ کی تمام چیزیں، بشرطیکہ ان میں اسراف اور تفاخر نہ ہو۔ قال النبي ﷺ : " كلوا واشربوا وتصدقوا والبسوا في غير مخيلة ولا سرف ، فإن الله سبحانه يحب أن يرى أثر نعمته على عبده " . (الدر المنثور : ١٤٨/٣)

قال النبي ﷺ : " كلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا في غير إسراف ولا مخيلة ، وقال ابن عباس : " كل ما شئت والبس ما شئت ، ما أخطأتك اثنتان : سَرَفٌ أو مَخيلة " . (صحيح بخاري : ص/١٠٥١ ، كتاب اللباس ، كنز العمال : ٢٧٤/٦ ، رقم : ١٧١٩٣ ، كتاب الزينة والتجمل ، الباب الأول في الترغيب

فیہ ، کذا في السنن الکبری للنسائي : ۲/ ۴۱ ، رقم : ۲۳۴۰ ، کتاب الزکاة ، الاختیال في الصدقة ، الآداب للبیهقي : ص/ ۱۹۴ ، رقم : ۶۳۱ ، باب من أحب أن یکون ثوبه حسناً)

۳- مقاصدِ تحسینیه: ان مقاصد سے مقاصدِ ضروریہ اور مقاصدِ حاجیہ کی تکمیل ہوتی ہے، ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی شارع نے مکلفین کو کچھ تعلیمات دے رکھی ہے۔ مثلاً:

۱/ مکارمِ اخلاق پر مشتمل تعلیمات۔ ﴿وعباد الرحمن الذین یمشون علی الأرض هوناً وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما والذین یبیتون لربهم سجدًا وقیامًا﴾. اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمیں پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب ان سے جہالت والے لوگ بات چیت کرتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں خیر۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ وقیام میں لگے رہتے ہیں۔ (سورة الفرقان :۶۳، ۶۴)

قال الله عز وجل :﴿والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس والله یحب المحسنین﴾. اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورة آل عمران : ۱۳۴)

عن أبي هریرة عن النبي ﷺ قال : " لیس الشدید بالصرعة ولکن الشدید الذي یملک نفسه عند الغضب ".

(الآداب للبیهقي : ص/ ۶۰ ، رقم : ۱۷۱ ، باب کظم الغیظ وترک الغضب)

عن أبي هریرة قال : قال رسول الله ﷺ : " ثلاث من کن فیه حاسبه الله حسابًا یسیرًا وأدخله الجنة " . قلت : ما هو یا رسول الله؟ قال : " تصل من قطعک ، وتعطي من حرمک ، وتعفو عمن ظلمک " .

(المعجم الأوسط للطبراني : ۱/ ۲۶۴ ، رقم : ۹۰۹)

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : " المسلم أخو المسلم لا يخونه ولا يكذبه ولا يخذله ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ عرضه وماله ودمه ، التقوى هاهنا ، بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم". (جامع الترمذي : ۱۴/۲ ، باب ما جاء في شفقة المسلم على المسلم)

عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال : " المؤمن مرآة المؤمن ، والمؤمن أخو المؤمن من حيث لقيه يكف عنه ضيعته ويحوطه من ورائه "

(شعب الإيمان للبيهقي : ۱۱۳/۶ ، رقم : ۷۶۴۵)

۲/ پاکی وطہارت کی تعلیمات ۔﴿**وثيابک فطهّر**﴾ . اوراپنے کپڑوں کو پاک رکھیے۔ (سورة المدثر : ۴)

﴿**إن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين**﴾ . بے شک اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتا ہے پاک وصاف رہنے والوں سے ۔

(سورة البقرة : ۲۲۲)

﴿**فيه رجال يحبون أن يتطهروا والله يحب المطّهّرين**﴾ . اس میں (ایسے) آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (سورة التوبة : ۱۰۸)

قال رسول الله ﷺ : " الطهور نصف الإيمان ".

(مشكوة المصابيح : ۹۷/۱ ، رقم : ۲۹۵ ، كتاب الطهارة ، الفصل الثالث)

عن سعد بن أبي وقاص – رفعه : " إن الله طيب يحب الطيب ، نظيف يحب النظافة ، كريم يحب الكرم ، جواد يحب الجود ، فنظفوا أفنيتكم ، ولا تشبهوا باليهود ". (كشف الخفاء للعجلوني : ۲۰۱/۱)

۳/ سترِ عورت ، اخذِ زینت، نفل نماز اور صدقہ کے ذریعے تقرب کی تعلیمات ۔

﴿یٰبنی اٰدم قد أنزلنا علیکم لباسًا یواري سواٰتکم وریشًا ولباس التقوی ذلک خیر﴾. اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا ہے (جو) تمہارے پردہ والے بدن کو چھپاتا ہے، اور (موجب) زینت بھی ہے اور تقوی کا لباس (اس سے بھی) بڑھ کر ہے۔ (سورۃ الأعراف: ۲۶)

﴿یٰبنی اٰدم خذوا زینتکم عند کل مسجد﴾. اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ (سورۃ الأعراف: ۳۱)

قال رسول اللّٰہ ﷺ: "إن اللّٰہ جمیل یحب الجمال، الکبر من بطر الحق وغمط الناس". (الآداب للبیهقي: ص/۱۹۴، باب من أحب أن یکون ثوبه حسنًا)

۴/ آدابِ اکل وشرب۔ عن عمر بن أبي سلمة یقول: کنت غلامًا في حجر رسول اللّٰہ ﷺ، وکانت یدي تطیش في الصحفة، فقال لي رسول اللّٰہ ﷺ: "یا غلام! سم اللّٰہ، وکل بیمینک، وکل مما یلیک، فما زالت تلک طعمتي بعد".

(صحیح بخاري: ص/۹۸۷، رقم: ۵۳۷۶، باب التسمیة علی الطعام والأکل بالیمین)

عن عبد اللّٰہ بن أبي قتادة، عن أبیه قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: "إذا شرب أحدکم فلا یتنفس في الإناء". اهـ.

(صحیح بخاري: ص/۱۰۲۷، رقم: ۵۶۳۰، باب التنفس في الإناء)

عن ثمامة بن عبد اللّٰہ قال: "کان أنس یتنفس في الإناء مرتین أو ثلاثاً، وزعم أن النبي ﷺ کان یتنفس ثلاثاً".

(صحیح بخاري: ص/۱۰۲۷، رقم: ۵۶۳۱، باب الشرب بنفسین أو ثلاثة)

۵/ فضول خرچی اور بخل سے بچنے کی تعلیم۔ ﴿ولا تبذر تبذیرًا إن المبذرین کانوٓا إخوان الشیٰطین وکان الشیطٰن لربه کفورًا﴾. اور مال کو فضولیات میں نہ

اڑا، بے شک فضولیات میں اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ (سورة بني اسرائيل : ٢٦ ، ٢٧)

﴿كلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا يحب المسرفين﴾. کھاؤ اور پیو لیکن اسراف سے کام نہ لو، بے شک وہ (اللہ) مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورة الأعراف : ٣١)

﴿والله لا يحب كل مختال فخور الذين يبخلون ويأمرون الناس بالبخل﴾. اور اللہ کسی اِترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔ (وہ لوگ ایسے ہیں) جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ (سورة الحديد : ٢٣ ، ٢٤)

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : " ما من يوم يصبح العباد فيه إلا ملكان ينزلان فيقول أحدهما : اللهم أعط منفقاً خلفاً ، ويقول الآخر : اللهم أعط ممسكاً تلفاً " . (الآداب للبيهقي :ص/ ۴۱ ، باب في فضل الإنفاق بالمعروف وكراهية البخل والإمساك)

والله ولي التوفيق !

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :

(١) الموافقات للشاطبي – أبو اسحاق الشاطبي رحمه الله

(٢) المقاسد الشرعية – شيخ نور الدين الخادمي

(٣) حجة الله البالغة – محدث شاه ولي الله الدهلوي

(٤) رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغة – مفتي سعيد صاحب پالن پوري

(٥) طرف الكشف عن مقاصد الشارع – الدكتور نعمان جغيم

فقہی مسائل اور اختلافِ ائمہ

عام طور پر یہ بات سننے میں آتی ہے کہ جب مسائل واحکام شرعیہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں، تو پھر ان میں اختلاف کیوں ہے؟ کہ ایک امام کسی چیز کو جائز کہتا ہے تو دوسرا اسے ناجائز۔ ایک کسی چیز کو مکروہ قرار دیتا ہے تو دوسرا غیر مکروہ۔ دل میں بات آتی ہے کہ اس سوال کے متعلق جواباً چند سطریں سپرد قرطاس کی جائیں، تاکہ جہاں عوام کو ان کے اس سوال کا جواب مل جائے، وہیں ہمارے طلبۂ عزیز بھی اس سے مستفید ہوں۔

فقہ اسلامی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے احکام چار طرح کے ہیں:

۱- بعض احکام وہ ہیں جو کتاب وسنت (قرآن وحدیث) سے بلا کسی تعارض واختلاف کے ثابت ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کی فرضیت اِن نصوص سے ثابت ہے:

(۱) **نماز**: ﴿ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا﴾. ''یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔'' (سورۃ النساء:۱۰۳)

(۲) **روزہ**: ﴿یا یھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون﴾. ''تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ۔'' (سورۃ البقرۃ:۱۸۳)

(۳) **زکوٰۃ**: ﴿واتوا الزکوٰۃ﴾. ''اور دو زکوٰۃ۔'' (سورۃ البقرۃ:۴۳)

(٤) **حج**: ﴿وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا﴾. ''اور اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے، (مگر سب کے ذمہ نہیں بلکہ خاص خاص کے) یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت

رکھے وہاں تک (پہنچنے کی) سبیل کی۔'' (آل عمران:۹۷)

......اس طرح کے جواحکام ہیں، ان میں کسی امام کا کوئی اختلاف نہیں، ہر مسلک و مذہب (خواہ وہ مسلک حنفی ہو یا مالکی، شافعی ہو یا حنبلی) میں اس قسم کے احکام ایک ہی طرح ہیں۔

۲- بعضے احکام وہ ہیں جو کتاب وسنت (قرآن وحدیث) سے ثابت تو ہیں، لیکن خود ان نصوص (قرآن وحدیث) میں جن سے یہ مسائل ثابت ہیں، اختلاف وتعارض پایا جاتا ہے۔ اب ایک مجتہد کسی ایک نص کو ترجیح دے کر مسئلہ بیان کرتا ہے، تو دوسرا مجتہد دوسری نص کو ترجیح دے کر مسئلہ بیان کرتا ہے، جیسے:

(الف): رکوع اور اُس سے اٹھتے وقت رفعِ یدین کے سلسلے میں یہ دو متعارض و مختلف روایتیں ہیں:

(۱) عبد اللّٰہ (ابن مسعود) رضي اللّٰه عنه قال: '' ألا أصلي بکم صلوٰة رسول اللّٰه ﷺ؟ فصلی فلم یرفع یدیه إلا مرّة واحدة ''.

''حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا: کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی طرح نماز پڑھ کر بتاؤں؟ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور صرف ایک ہی مرتبہ رفعِ یدین کیا۔''

(سنن النسائي: ۱/۱۲۰، سنن أبي داود: ص/۱۰۹)

(۲) عن سالم عن أبیه قال: رأیت رسول اللّٰه ﷺ إذا افتتح الصلوٰة یرفع یدیه حتی یحاذي منکبیه، وإذا رکع وإذا رفع رأسه من الرکوع ''.

''حضرت سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کی، تو

اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے، اسی طرح جب آپ نے رکوع کیا اور رکوع سے کھڑے ہوئے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے۔"

(جامع الترمذي : ۱/۵۹ ، سنن النسائي : ۱/۱۱۹ ، سنن أبي داود : ص/۱۰۹)

(ب): اسی طرح آمین بالجہر سے متعلق دو متعارض ومختلف روایتیں ہیں، جیسے:

(۱) عن وائل بن حجر رضي الله عنه قال : " إنه صلى مع رسول الله ﷺ فلما قرأ : ﴿غير المغضوب عليهم ولا الضّآلّين﴾ قال : امين خفض بها صوته " . "حضرت وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿**غير المغضوب عليهم ولا الضّآلّين**﴾ کہا تو آمین آہستہ آواز سے کہا۔"

(مسند أحمد : ۱۴/۲۸۵ ، شرح معاني الآثار : ص/۱۵۰)

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال : " إذا أمّن الإمام فأمِّنوا ، فمن وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدّم من ذنبه " . "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیوں کہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے مل جاتی ہے اس کے پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔"

(سنن النسائي : ۱/۱۰۷)

(ج): مسِ ذکر (مرد کا اپنے عضو مخصوص کو چھونا) اور مسِ مرأۃ (عورت کو چھونا) کے متعلق یہ دو متعارض ومختلف روایتیں ہیں:

(۱) عن طلق بن علي قال : خرجنا وفدًا حتى قدمنا على رسول الله ﷺ فبايعناه وصلّينا معه ، فلما قضى الصلاة جاء رجل كأنه بدوي

فقال : يا رسول الله ! ما ترى في رجل مسّ ذكره في الصلاة ؟ قال : ”وهل هو إلا مضغة منك ، أو : بضعة منك “ . ”حضرت طلق ابن علی کہتے ہیں کہ ہم ایک وفد کے ساتھ نکلے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، ہم نے آپ سے بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک شخص آیا گویا کہ وہ دیہاتی ہو، اس نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کیا حکم دیتے ہیں اس شخص کے بارے میں جس نے نماز میں اپنے ذکر کو چھووا ہو؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بھی تیرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔ (یعنی جیسے دوسرے اعضا کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اسی طرح اس کو چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا)۔

(سنن النسائي : ۲۱/۱ ، شرح معاني الآثار : ۶۲/۱)

(۲) عن بسرة بنت صفوان أنها سمعت رسول الله ﷺ يقول : ”إذا مسّ أحدكم ذكره فليتوضأ“ . ”حضرت بسرہ بنت صفوان سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب تم میں سے کوئی اپنے ذَکر کو چھوئے تو وہ وضو کر لے۔“ (سنن النسائي : ۲۰/۱ ، شرح معاني الآثار : ۵۷/۱)

اب اِن روایتوں میں چوں کہ تعارُض واختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے:

پہلے مسئلہ (رفعِ دین) میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلی روایت (عبداللہ ابن مسعود) کو ترجیح دیتے ہوئے عدمِ رفعِ یدین کے قائل ہوئے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ دوسری روایت (حضرت سالم) کو ترجیح دیتے ہوئے رفعِ یدین کے قائل ہوئے۔

دوسرے مسئلہ (آمین بالجہر) میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلی روایت (وائل ابن حجر) کو ترجیح دیتے ہوئے آمین بالسرّ کے قائل ہوئے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ دوسری روایت (ابوہریرہ) کو ترجیح دیتے ہوئے آمین بالجہر کے قائل ہوئے۔

تیسرے مسئلہ (مسِ ذَکر) میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلی روایت (طلق ابن علی) کو ترجیح دیتے ہوئے مسِ ذَکر سے عدمِ نقضِ وضو کے قائل ہوئے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ دوسری روایت (بسرہ بنت صفوان) کو ترجیح دیتے ہوئے مسِ ذَکر سے نقضِ وضو کے قائل ہوئے۔

اس طرح کے مسائل میں چوں کہ دونوں طرح کے نصوص پائے جاتے ہیں، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں مجتہدین ائمہ کے اقوال نصوصِ شرعیہ کے مطابق ہیں، کوئی مجتہد دوسرے مجتہد کے قول کو غلط نہیں کہہ سکتا، ہر مجتہد اور اس کے مقلدین نصِ شرعی پر عامل ہیں، اور جس نص پر بھی عمل کیا جائے وہ صواب وصحیح ہے، اور جب دونوں صواب وصحیح ہیں، تو مسلکی جھگڑا چہ معنی دارد؟

اس سے معلوم ہوا کہ مسلکی جھگڑوں کو ہوّا دینا اور اس کی بنا پر آپس میں دست وگریباں ہونا، اس کے پسِ پشت کوئی جذبۂ خیر نہیں ہوتا، بلکہ اپنے ذاتی مفادات اور شخصی اثر ورُسوخ کا تحفُّظ مقصود ہوتا ہے، جو دین نہیں، مُنافیٔ دین ہے۔

۳- بعضے احکام وہ ہیں جو ایسے نصوص (قرآن وحدیث) سے ثابت ہیں، جو متعارض ومختلف تو نہیں ہیں، مگر ان نصوص نے ان احکام کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جو مختلف معانی کا احتمال رکھتے ہیں، اور وہ معانی کبھی اَضداد کے قبیل سے ہوتے ہیں، تو مجتہد ان معانی میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دے کر مسئلہ بیان کرتا ہے، جیسے مطلقہ عورت کی عدت کا مسئلہ: ﴿والمطلّقٰت یتربّصن بأنفسھن ثلٰثة قروء﴾ ۔ ''اور طلاق دی ہوئیں عورتیں اپنے آپ کو تین قروء روکے رکھیں۔''

اب اس نص میں لفظ ''قروء'' کے مختلف معانی ہیں کہ وہ حیض کے معنی میں بھی آتا

ہے،اور طہر کے معنی میں بھی،اور دونوں ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں،اب ایک مجتہد (حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ) نے مختلف دلائل ووجوہاتِ ترجیح کی بنیاد پر معنیٔ حیض کو ترجیح دی،اور یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہیں۔ دوسرے مجتہد (حضرت امام شافعی رحمہ اللہ) نے معنیٔ طہر کو مختلف دلائل ووجوہاتِ ترجیح کی بنیاد پر ترجیح دی،اور یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ مطلقہ عورت کی عدت تین طہر ہیں۔

لہٰذا ان دونوں آراء میں سے کسی بھی رائے کو غلط نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہاں بھی ہر دو مجتہد اوران کے مقلدین عامل بالنص ہی کہلائیں گے۔

۴- بعضے احکام وہ ہیں جو صراحۃً نصوص (قرآن وحدیث) میں مذکور نہیں ہیں، بلکہ ان مسائل کو مجتہدین فقہائے کرام نے قیاس واجتہاد کے ذریعہ بیان فرمایا ہے،اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر شخص کی فکر وسوچ یکساں نہیں ہوتی، اس لیے ان اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف فطری امر ہے، اور ہر مجتہد کی رائے میں صواب وصحیح اور خطا کا احتمال ہے،اسی طرح دونوں مجتہدوں کی رائے وزن میں برابر ہیں،اور جب یہ بات ہے تو یہاں بھی ایک دوسرے کی تغلیط کی کوئی گنجایش نہیں، بلکہ ہر مجتہد اپنے اس اجتہاد میں اجر وثواب کا مستحق ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **إذا حكم الحاكم فاجتهد ثم أصاب فله أجران ، وإذا حكم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر** ". (صحيح بخاري : ص/۷ ۱۲۹ ، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة ، رقم : ۷۳۵۲ ، احياء التراث العربي بيروت)

حدیث پاک میں خطا وصواب کی جو بات کہی گئی اس کا تعلق علمِ خداوندی سے ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا،جس کی وجہ سے اب کوئی انسان اس صواب وخطا پر مطلع نہیں ہوسکتا،تو بھلا

بتلایئے ! کیا آپ کسی امام کی رائے کو قطعی وکلّی طور پر غلط کہہ سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں، البتہ آدمی جس امام کا مقلد ہو جب اس سے اپنے امام کی رائے (اجتہادی مسائل) کی بابت دریافت کیا جائے، تو علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ: میرے امام کا مذہب مسلک صواب وصحیح ہے، خطا کا احتمال ہے، اور دوسرے مجتہد کا مذہب خطا ہے، صواب کا احتمال ہے۔

" إذا سئلنا عن مذهبنا ومذهب مخالفنا قلنا وجوبًا : مذهبنا صواب يحتمل الخطأ ، ومذهب مخالفنا خطأ يحتمل الصواب ".

(رد المحتار : ۱/۳۳ ، مکتبه نعمانيه ديوبند)

علامہ شامی رحمہ اللہ کے الفاظ پر غور کیجئے کہ ان میں کس قدر حزم واحتیاط سے کام لیا گیا، لہٰذا جو حضرات کتبِ فقہ پڑھاتے ہیں انہیں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اختلافی مسائل بیان کرتے وقت کمالِ دیانت کے ساتھ فریقین کے دلائل بیان کریں، اور جس اسلوب اور ادب واحترام کے ساتھ اپنے امام اور اس کے دلائل بیان کرتے ہیں، مجتہد مخالف اور اس کے دلائل کو بھی اسی اسلوب اور ادب واحترام کے ساتھ بیان کریں، اور اپنے مذہب ومسلک کے متعلق وہی جواب اختیار کریں، جو علامہ شامی رحمہ اللہ نے تلقین وتعلیم فرمایا ہے: **" مذهبنا صواب يحتمل الخطأ ومذهب مخالفنا خطأ يحتمل الصواب ".**

قوانین اسلام انسانی ضرورتوں اور سہولتوں کے پاسدار

دینِ اسلام؛ دینِ رافت ورحمت ہے، اس نے اپنے دستورقوانین میں انسانی ضرورتوں اورسہولتوں کا پورا خیال رکھا ہے، کیوں کہ انسان ایک ہی حالت پر نہیں رہتا، اس کی نت نئی ضرورتیں، اوراسے پیش آنے والے حوارث وعوارض، اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں، کہ عام قوانین میں اس کی ضرورتوں اورسہولتوں کا خیال کیا جائے۔

اسلامی قوانین پر نظر کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ شریعت مطہرہ نے اس کا بھرپور لحاظ فرمایا، مثلاً:

(۱) انسانی ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ ملکیتوں کا تبادلہ جائز ہو، کیوں کہ کسی کے پاس اشیاء واسباب ہوتے ہیں، مگر روپیہ پیسہ نہیں ہوتا، اور اسے اپنی دیگر ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح کسی کے پاس روپیہ پیسہ ہوتا ہے مگر اپنی ضرورت کی دیگر چیزیں نہیں ہوتیں، وہ اشیاء واسباب کا محتاج ہوتا ہے، شریعت نے ہردو کی ضرورت کا خیال فرما کر خرید وفروخت کو جائز قرار دیا۔ اشاد ربانی ہے: ﴿احل اللہ البیع وحرم الربوا﴾ . اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ (سورۃ البقرۃ:۲۷۵)

(۲) اللہ پاک نے ہر فرد وبشر کے اندر کچھ ممتاز صلاحیتیں اور خوبیاں ودیعت فرمائی ہیں، جو دوسرے میں نہیں پائی جاتیں، اسی طرح ہر چیز میں کچھ ایسے فوائد اور منفعتیں رکھی ہیں جو دوسری چیز میں موجود نہیں ہوتیں۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر فرد وبشر میں نہ تو تمام صلاحیتیں اور خوبیاں ہوتی ہیں اور نہ وہ تمام چیزوں میں کا مالک ہوتا ہے، جب کہ دوسروں کی صلاحیتوں اور اس کی ملک میں موجود چیزوں کی منفعتوں کا وہ محتاج ہوتا ہے، کیوں کہ اللہ رب العزت نے کسی کو مال ودولت سے نوازا ہے تو کسی کو علم وہنر عطا کیا ہے، اور دونوں کی ضرورتیں ایک دوسرے سے وابستہ کردیں، جہاں صاحب مال، صاحب علم وہنر کی صلاحیتوں کا محتاج ہوتا ہے، وہیں صاحب مال انتفاع بملک الغیر (دوسرے کی مملوک چیز سے فائدہ اٹھانا) اور صاحب شئے، انتفاع بالاجرۃ (مزدوری کی رقم سے فائدہ اٹھانا) کا محتاج ہوتا ہے، اگر عقد اجارہ جائز نہ ہوتا تو ہر دوفریق کی ضرورت کیسے پوری ہوسکتی تھی، اس لیے شریعت نے ان دونوں کی ضرورت وحاجت کا خیال فرما کر عقد اجارہ کو جائز قرار دیا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿قالت إحداهما يآبت استأجره ان خير من استأجرت القوي الأمين قال إنيّ اريد ان انكحك احدى ابنتي هاتين علىٰ أن تأجرني ثماني حجج فان اتممت عشرا فمن عندك ومآ اريد ان اشق عليك ستجدنيّ إن شآء اللّٰه من الصّٰلحين قال ذلك بيني وبينك ايما الأجلين قضيت فلا عدوان علي واللّٰه على ما نقول وكيل﴾. پھر ان دو میں سے ایک لڑکی بولی، اے ابا! ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ اچھا نوکر وہی ہے، جو قوت دار ہو، امانت دار ہو، وہ بولے میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دیدوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو، اور اگر تم دس سال پورے کردوں تو یہ تمہاری طرف سے احسان ہے، اور میں تم پر کوئی سختی نہیں چاہتا،

تم اِن شاء اللہ مجھ کوخوش معاملہ پاؤ نگے ،موسیٰ نے کہا تو یہ بات میرے اورآپ کے درمیان ہوگئی ، میں ان دونوں میں سے جو مدت پوری کردوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا ، اور ہم جو کچھ کہہ سن رہے ہیں اللہ اس کا گواہ ہے۔ (سورۃ القصص : ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸)

مذکورہ آیات عقد اجارہ کے جواز پر دال ہیں، کیوں کہ فقہ اسلامی کا اصول ہے کہ جب اللہ رب العزت ہمارے سامنے ماقبل کی شریعتوں کی کوئی بات بلا نسخ بیان فرماتے ہیں، تو وہ ہماری لیے مستقل از سر نو شریعت بن جاتی ہے۔

(۳) مرد وعورت میں ایک دوسرے کی طرف میلان ورغبت ، خواہش وشہوت ، ایک طبعی اور فطری امر ہے، دونوں کا ایک دوسرے کے لیے حلال ہونا اپنی خواہش وتسکین کے لیے ضروری ہے، جہاں یہ حلت میاں بیوی کے جذبات کے لیے سامانِ تسکین ہے وہیں کثرتِ نسل، جنسِ انسانی کی حفاظت اور منشائے خداوندی تا قیام قیامت دنیا کی آبادی کا اہم ذریعہ ہے، شریعت نے اسی ضرورت کے پیش نظر نکاح کو حلال قرار دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**فانكحوا ما طاب لكم من النسآء مثنى وثلٰث وربٰع**﴾ . تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو دو دو سے خواہ تین تین سے خواہ چار چار سے۔ (سورۃ النساء :۳)

ان تینوں مثالوں سے واضح ہوتا ہے، کہ لوگوں کی ضرورتیں اور حاجتیں ہی عقود ومعاملات کے جائز ہونے کی بنیاد ہے، چنانچہ فقہ اسلامی کا یہ قاعدہ " **حاجة الناس أصل في شرع العقود** ". لوگوں کی حاجت ومعاملات کے جواز کی بنیاد ہے۔ (المبسوط:۱۵/۷۵) بھی اسی کا مؤید ہے۔

اب آیئے بعض ایسے قوانین کی طرف جو انسانی سہولتوں اور آسانیوں پر مبنی ہیں،

کیوں کہ انسان خلقۃً وفطرۃً کمزور ہے، اس کا علاج خود خالق کائنات نے فرمایا: ﴿یرید اللّٰہ أن یخفف عنکم وخلق الإنسان ضعیفا﴾ . اللہ کومنظور ہے کہ تمہارے ساتھ تخفیف برتے، اورانسان تو کمزور پیدا ہی کیا گیا ہے۔ (سورۃ النساء : ۲۸)

کبھی وہ ایسے حالات وعوارض کا شکار ہوتا ہے، جو اس کے لیے احکام اسلام میں سہولتوں اورآسانیوں کے داعی ہوتے ہیں، شریعت نے اس کا پورا پورا خیال فرمایا، اور ان حالات وعوارض میں اسے احکام عزیمت پر عمل کا مکلّف نہ بنا کر احکام رخص پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی۔ مثلا:

(۱) حالت سفر میں انسان مشقتوں اوردشواریوں سے دوچار ہوتا ہے، اوراس کی یہ حالت احکام میں تخفیف کی داعی ہوتی ہے، تو شارع نے خود اعلان کردیا: ﴿واذا ضربتم في الأرض فلیس علیکم جناح أن تقصروا من الصلوۃ﴾ . اور جب تم زمین مین سفر کرو تو تم پراس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کردیا کرو۔ (سورۃ النساء : ۱۰۱)

مسافر کے لیے چار رکعتوں والی نمازیں دو رکعتیں پڑھنے کی رخصت دی گئی، جماعت کی حاضری اورقربانی کا جوب اس سے ساقط کردیا گیا، روزے کے افطار کی اجازت دی گئی غیرہ۔

(۲) انسان بھوک اور پیاس سے اس قدر دوچار ہو کہ جان جانے کا اندیشہ ہے، اور کوئی حلال شئے سوائے حرام کھانے اور پینے کے موجود نہ ہو، اس کی یہ حالت اس بات کی متقاضی تھی کہ اس کے لیے اکلِ میتہ اورشربِ خمر کی حرمت ختم ہو، شریعت نے بلاکسی درخواست وطلب کے اعلان کردیا ﴿انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم

الخنزير ومآ أهل به لغير اللّٰه فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه ان اللّٰه غفور رحيم﴾ . اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جو جانور غیر اللہ کے لیے نام زد کیا گیا ہو، حرام کیا ہے، لیکن اس میں بھی جو شخص مضطر ہو جائے اور نہ بے حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے نکل جانے والا ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑا رحمت والا ہے۔ (سورة البقرة :۱۷۳)

(۳) اگر کسی شخص کو زبان سے کلمۂ کفر جاری کرنے کے لیے مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں تلفِ نفس یا تلفِ عضو کی دھمکی دی جائے، اب ایک جانب زبان سے کلمۂ کفر جاری کرنے جیسا عظیم جرم کا ارتکاب، اور دوسری جانب نہ کرنے کی صورت میں جان جانے یا عضو کے تلف ہونے کا خطرہ، شریعت نے اس کی اس حالت پر رحم فرما کر اسے کلمۂ کفر کے اِجرا کی اجازت اس شرط کے ساتھ دے دی کہ دل ایمان پر مطمئن ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿من كفر باللّٰه من بعد ايمانهٖ الا من اُكره وقلبهٗ مطمئن بالإيمان﴾ . جو کوئی اللہ سے اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کرے، بجز اس صورت کے کہ اس پر زبردستی کی جائے، دراں حالانکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ (سورة النحل : ۱۰۶)

(۴) کوئی شخص سخت مریض ہے، اس کے لے مسجد پہنچنا مشکل ہے، یا مسجد میں پہنچ تو سکتا ہے، مگر انتہائی سردی یا بارش وطوفان کی وجہ سے ضرر وتکالیف پہنچنے کا غالب گمان ہے، تو اس کے لیے گھر ہی میں نماز پڑھنا جائز ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (عن نافع ان ابن عمر يعني أذن بالصلوة في ليلة ذات برد وريح فقال :) ألا ! صلوا في الرحال ، ثم قال : إن رسول اللّٰه ﷺ كا ن يأمر المؤذن إذا كانت ليلة باردة أو ذات مطر يقول :" ألا صلوا في الرحال" . حضرت ابن

عمر رضی اللہ عنہ نے سرد ہوا والی رات میں نماز کی اذان دی تو کہا: سنو! ڈیروں میں نماز پڑھو، پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات ٹھنڈی ہوتی یا بارش والی ہوتی تو مؤذن کو حکم دیتے تھے کہ وہ کہے: اے لوگو! ڈیروں میں نماز پڑھو۔ (سنن أبي داود: ص/۱۵۲)

(۵) معاشرہ میں جو افراد بیت اللہ کا حج نہیں کر سکتے ان کی مالی حالت مصارفِ حج کی متحمل نہیں ہے، تو شارع نے ان سے فریضۂ حج کو ساقط فرمایا، اور ارشاد ہوا: ﴿ولله علی الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا﴾. اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لیے اس مکان کا یعنی اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔

(سورة آل عمران: ۹۶)

(۶) معذور ومجبور افراد کے حق میں فریضۂ جہاد کی شرکت کو ساقط کر دیا گیا، اور ارشاد ہوا: ﴿لا يستوي القٰعدون من المؤمنين غير اولي الضرر والمجاهدون في سبيل الله باموالهم وأنفسهم﴾. مسلمانوں میں بلا عذر گھر بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

(سورة النساء: ۹۵)

(۷) بھول کر کھا پی لینے کی صورت میں روزہ نہ ٹوٹنے کا حکم۔ عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: " إذا نسي فأكل أو شرب فليتم صومه نائمًا أطعمه الله وسقاه ". حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: جب کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرلے، کیوں کہ اس کو اللہ نے کھلایا اور پلایا۔ (صحيح بخاري: ۲۵۹/۱)

(۸) نماز میں بندہ جن ارکان کو ادا کرنے سے عاجز ہو، ان میں اسے اس بات کی اجازت دینا کہ جس طرح اور جس قدر ارکان ادا کر سکتے ہو، کرو، ورنہ اشارے سے نماز پڑھو۔ عن عمران بن حصين قال: كانت بي بواسير فأتيت رسول الله

ﷺ عن الصلوة فقال : " صل قائمًا فإن لم تستطع فقاعدًا ، فإن لم تستطع فعلى جنب ". حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا، میں نے نماز کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: کھڑے ہوکر نماز پڑھ، اگر کھڑے ہونے کی قدرت نہ ہوتو بیٹھ کر، اور اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر۔

(۹) وضو یا غسل نہ کر سکنے کی صورت میں تیمّم کو اس کا بدل قرار دینا۔ارشادِ خداوندی ہے: ﴿یآ أیها الذین اٰمنوآ إذا قمتم إلى الصلوة فاغسلوا وجوهکم وأيديكم إلى المرافق وامسحوا برؤوسكم وارجلكم إلى الكعبين وإن كنتم جنبًا فاطهروا وان كنتم مرضٰى او على سفر او جآء احد منكم من الغآئط او لٰمستم النسآء فلم تجدوا مآء فتيمّموا صعيدًا طيبًا فامسحوا بوجوهكم وأيديكم منه ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج ولكن يريد ليطهركم وليتم نعمته عليكم لعلكم تشكرون﴾. اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولیا کرو، اور اپنے سروں پر مسح کرلیا کرو، اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھولیا کرو، اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو، تو سارا جسم پاک وصاف کرلو، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے، یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلیا کرو، یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کرلیا کرو، اللہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے، بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک صاف رکھے، اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے، تاکہ تم شکر گذاری کرو۔

(۱۰) حائضہ عورت سے بحالتِ حیض چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا ساقط ہونا۔

عن قتادة قال : حدثتني معاذة أن امرأة قالت لعائشة : أتجزئ إحدانا

صلاتها إذا اطهرت ، فقالت : أحرورية أنت ؟ قد كنا نحيض مع النبي ﷺ فلا يأمرنا به . أو قالت : فلا نفعله " . ایک عورت نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ کیا ہم میں سے کسی ایک کی نماز ہوجاتی ہے، جب کہ پاک ہو، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ارے! کیا تو خارِجی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہمیں حیض آتا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں فرماتے تھے۔ (صحيح بخاري : ۱/۳۶)

(۱۱) نجاستِ قلیلہ یا ایسی نجاست جس سے بچنا دشوار ہو، یا جس کا اِزالہ (دور کرنا) متعذّر رہو، اسے معاف قرار دینا وغیرہ۔

یہ تمام احکام اس بات پر شاہد ہیں کہ شریعت نے بندوں کی مشقتوں اور دشواریوں سے چشم پوشی اور پہلوتہی نہیں فرمائی، بلکہ چشم کشاں اور راحت رساں رُخصتیں دے کر اپنے بندہ نواز اور آسان ہونے کا بیّن ثبوت فراہم کیا۔ سچ فرمایا ہے میرے خالق ومالک نے: ﴿**وما جعل عليكم في الدين من حرج**﴾ . اور اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی۔ (سورة الحج : ۷۸) -- سچ فرمایا میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: " **إن الدين يسر** " . دین آسان ہے۔ (صحيح بخاري : ۱/۱۰)

سچ کہا ہے فقہائے ملت نے: " **المشقة تجلب التيسير** " . مشقت آسانی پیدا کرتی ہے۔ (درر الحكام : ۱/۳۵ ، المادة : ۱۷)

اور " **الحكم يختلف باختلاف أحوال الناس** " . لوگوں کے احوال بدلنے سے احکام بدلتے ہیں۔ (المبسوط : ۱۱/۵)

ملکی قوانین اور مسلم پرسنل لاء

الحمد للّٰہ رب العالمین ، والصلوۃ والسلام علی رسولہ الأمین ؛ سیدنا محمد ، وعلی آلہ وصحبہ ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین ، أما بعد !

انسان، اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں مقامِ اشرفیت پر فائز ہے، اللہ رب العزت نے اپنی تمام مخلوقات کی غذائی ضرورتوں کا بھرپور انتظام فرمایا، لیکن انسان چوں کہ ''بہیمیت'' اور'' ملکوتیت'' دونوں کا مجموعہ ہے، اس لیے جہاں اسے اپنے جسمانی بقا کے لیے مادی غذا کی ضرورت ہے، وہیں روحانیت کو باقی رکھنے کے لیے غذائے روحانی کی بھی حاجت ہے، اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر واحسان کہ اس نے اس کی ان دونوں غذاؤں کا انتظام فرمایا، مادی غذاؤں سے تو ہم اور آپ اچھی طرح واقف ہیں، روحانی غذاؤں سے مراد انبیاء ورُسُل کی تعلیمات ہیں، جو انسانوں کو ایک جامع ومکمل نظامِ حیات سے روشناس کرواتی ہیں، سب سے آخر میں نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا، اور آپ کے ذریعہ قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کو جو مکمل نظامِ حیات دیا گیا، اسی کا نام شریعتِ اسلامی ہے، اس شریعت کو جاننا ''فقہ'' اور جاننے والے کو ''فقیہ'' کہا جاتا ہے: **'' الفقہ عبارۃ عن العلم والفھم .... ولکن صار بعرف العلماء عبارۃ عن العلم بالأحکام الشرعیۃ الثابتۃ لأفعال المکلفین '' .** (المستصفی من علم الأصول : ۱/ ۴ ، بیان حد أصول الفقہ)

شریعتِ اسلامی کا مقصد انسانوں کی دنیوی واخروی سعادت ہے۔ **وغایتہ الفوز بسعادۃ الدارین .** (درمختار مع شامیہ: ۱/ ۱۲۱)، شریعتِ اسلامی اور دوسرے قانون ساز اداروں، پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

شریعت کے قوانین انسان کے تمام شعبوں ؛ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق سب کو حاوی ہیں، شریعت کے قوانین میں وہ تقسیم نہیں جو آج کی بیشتر حکومتوں کے دستوروں میں پائی جاتی ہے، کہ ایک قسم کو پرسنل لاء (Personal Law) یعنی احوالِ شخصیہ کا نام دیا جاتا ہے، جو کسی انسان کی شخصی اور عائلی زندگی سے متعلق ہوتی ہے، اور اس کے متعلق یہ غلط تأثر دیا جاتا ہے کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے کا اسے اختیار حاصل ہے، اسی تأثر کا یہ اثر ہے کہ آج جن لوگوں کو مسلم دانش ور کہا جاتا ہے، وہ یہ کہتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتے کہ **"مذہب میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے"**، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں چاہوں تو اس پر عمل کروں، اور چاہوں تو نہ کروں، حالاں کہ اُن کی یہ سمجھ غلط ہے، کیوں کہ **"مسلمان"** کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں شریعتِ اسلامی کا پابند ہے، مختار نہیں۔

دوسری قسم مشترک قانون (Common Law) کے نام سے معروف ہے، جو کسی ملک کے تمام باشندوں کے لیے یکساں ہوتے ہیں، اسلام اس تقسیم کا قائل نہیں، انسانی مسائل خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، تمدن وثقافت اور مال وزر سے اُن کا تعلق ہو یا اخلاقی بے راہ روی اور جرائم سے، سب کا حل شریعتِ اسلامیہ نے یکساں طور پر پیش کیا ہے، اور ہر مسلمان پر ان تمام احکام کی پیروی ضروری قرار دی گئی ہے، اس کے قوانین میں شخصی اختیار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

شریعت کے ان قوانین میں ایسی گہرائی اور لچک ہے کہ اُن کی روشنی میں ہر زمانے، حتی کہ آج کے اس ترقی پذیر دور میں پیش آمدہ نت نئے مسائل کا حل پیش کیا جاسکتا ہے، اور کیا بھی جارہا ہے، جیسا کہ دورِ حاضر کی اسلامک فقہ اکیڈمیوں اور مجلسوں کے فیصلے اس پر شاہد ہیں۔

ہمارے اس وطنِ عزیز میں رائج قوانین کی دو اہم قسمیں ہیں:

سِوِل کوڈ(Civil Code)،اورکریمنل کوڈ(Crimnal Code)

دوسری قسم میں جرائم کی سزائیں اور بعض انتظامی امور آتے ہیں، ظاہر ہے اس قسم کے قوانین تمام اہلِ ملک کے لیے یکساں ہیں، ان میں کسی نوعیت کی تفریق ،نسل ومذہب کی بنیاد پر از روئے دستور نہیں کی گئی۔پہلی قسم''سول کوڈ'' کے دائرہ میں وہ تمام قوانین آتے ہیں جن کا تعلق معاشرتی ،تمدنی اور معاملاتی امور سے ہے،اس قسم کے بیشتر قوانین بھی تمام اہلِ ملک کے لیے یکساں ہیں۔البتہ سول کوڈ کے ایک حصہ (جسے پرسنل لاء''Personal Law'' کہا جاتا ہے) میں ملک کی بعض اقلیتوں کو جن میں مسلمان بھی ہیں،اُن کے مذہب کے لحاظ سے کچھ خصوصی شعبوں میں الگ مذہبی قوانین پر عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، جسے''پرسنل لاء کی آزادی'' کا نام دیا گیا ہے،اسی کے تحت مسلمانوں کو بھی دستورِ ہند میں یہ حق دیا گیا ہے کہ نکاح ،طلاق ،ایلاء،ظہار،خلع ،مباراۃ ،فسخِ نکاح، رضاعت، حضانت اور وقف سے متعلق مقدمات اگر سرکاری عدالتوں میں دائر کیے جاتے ہیں اور دونوں فریق مسلمان ہوں،تو سرکاری عدالتیں اسلامی شریعت کے مطابق ہی فیصلے کریں گی،انہی قوانین کے مجموعے کو''مسلم پرسنل لاء'' کہا جاتا ہے۔

مسلم پرسنل لاء میں قانون کی ایک دفعہ''عدت'' ہے:

طلاق کے بعد آثارِ نکاح ختم ہوجانے کے لیے شریعت نے عورت کے واسطے جو مدت مقرر کی ہے،اُسے عدت کہتے ہیں، مطلقہ کی عدت ،اگر اُسے حیض آتا ہے تو مکمل تین حیض ہے، اور اگر کم عمری یا زیادہ عمر کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو تو تین قمری مہینے ہیں (فتاویٰ ہندیہ: ۱/۵۲۶ ،اسلام کے عائلی قوانین:ص/۲۱۲) ،عدت کی اِس مدت میں عورت طلاق دینے والے کی طرف سے رہائش ،نفقہ وخرچے کی حق دار ہے (ہدایہ:۲/۴۲۳)، عدت کے بعد وہ اجنبیہ ہے،اس لیے عدت کے بعد طلاق دینے والے کے ذمہ اُس کی

رہائش ونفقہ واجب نہیں ہے۔ (اسلام کے عائلی قوانین:ص/۱۲۲)

سرکاری عدالتیں مسلم مرد اور عورت کے حق میں نفقۂ عدت سے متعلق اِسی دفعہ کے مطابق فیصلے کی مکلّف و پابند ہیں۔

۱۹۸۵ء میں ''شاہ بانو'' مقدمہ کا سپریم کورٹ نے اِس دفعہ کے خلاف یہ فیصلہ دیا تھا کہ اُس کا شوہر عدت کے بعد بھی اُس کے نفقے وخرچے کو اُٹھاتا رہے گا، تو اِس فیصلے کے مخالفِ شرع ہونے کی وجہ سے تمام ہندوستانی مسلمانوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، جس کے نتیجے میں ۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ نے مسلم خواتین کے لیے ایک نیا قانون پاس کیا، جس سے سپریم کورٹ کا وہ فیصلہ کالعدم قرار پایا۔

اس کے باوجود آج پھر سرکاری عدالتیں نکاح، طلاق اور عدت وغیرہ سے متعلق ایسے فیصلے صادر کررہی ہیں، جو مسلم پرسنل لاء کے خلاف ہیں، جن میں سے ایک عدت کے بعد وجوبِ نفقہ کا فیصلہ بھی ہے، جسے عام زبان میں ''کھاؤٹی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے- کہ عدت کا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی طلاق دینے والے پر اِس اجنبیہ کا نفقہ وخرچہ لازم کیا جاتا ہے۔

نکاح، طلاق اور عدت وغیرہ سے متعلق سرکاری عدالتوں کے اِس طرح کے فیصلے جہاں ''مسلم پرسنل لاء'' میں مداخلت ہیں، وہیں مسلمانوں کو دستورِ ہند میں حاصل حق سے محروم کرنے اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی منصوبہ بند سازش کا حصہ ہے۔

مگر اِس میں ہم مسلمان بھی برابر کے قصوروار ہیں کہ اپنے اِس طرح کے نزاعات وجھگڑوں کو اپنے مذہبی اداروں (دارالافتاء، دارالقضاء، شرعی پنچایت) سے حل کرنے کے بجائے سرکاری عدالتوں کا رخ کرتے ہیں، اور اُنہیں مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کے مواقع فراہم کرتے ہیں، جب کہ کسی سرکاری عدالت کے اس فیصلے سے کہ- طلاق دینے والے پر عورت کی عدت کے بعد بھی اُس کا نفقہ وخرچہ لازم ہے- عورت اور اُس کے سرپرستان کے لیے اس نفقہ کا لینا شرعاً درست نہیں ہے، لہٰذا جو شخص اللہ، رسول اور آخرت کی جزا وسزا پر

یقین رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے معاشرتی، تمدنی اور معاملاتی امور کو اپنے مذہبی اداروں سے ہی حل کرائے، اسی میں اس کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات ہے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا في أنفسهم حرجًا مما قضیت ویسلموا تسلیما﴾ . ’’سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو، آپ کو حکم نہ بنالیں، اور پھر جو فیصلہ آپ کردیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں۔‘‘ (سورۂ نساء:۶۵)

اس آیت نے یہ صاف کردیا کہ رسول ﷺ کی عدالت میں مقدمات محض لے آنا ہرگز ایمان کے لیے کافی نہیں، عقلی واعتقادی حیثیت سے اطمینان بھی رسول کے فیصلے پر ہونا چاہیے، ہاں اس کے بعد بھی کوئی طبعی تنگی باقی رہ جائے، تو غیر اختیاری ہونے کی بنا پر معاف ہوگی - حتی یحکموک فیما شجر بینهم - آپ کی حیاتِ مبارک میں تو آپ کا حَکَم بننا ظاہر ہی تھا، بعد وفات آپ کی شریعت حَکَم بننے کے لیے کافی ہے، فقہاء نے اس آیت سے استنباط کیا ہے کہ جو کوئی اللہ یا اس کے رسول ﷺ کے کسی حکم میں شک وشبہ کرے، یا ماننے سے انکار کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

وفي هذه الآية دلالة علی أن من ردّ شیئا من أوامر اللّٰه أو أوامر رسول اللّٰه ﷺ فهو خارج من الإسلام ، سواء رده من جهة الشک فیه ، أو من جهة ترک القبول والامتناع من التسلیم .

(أحکام القرآن للجصاص: ۲/۲۶۸ ، تفسیر ماجدي)

عصری تعلیم کی افادیت اسلامی ماحول میں

(مقالہ: دس روزہ تربیتی پروگرام برائے اساتذۂ مدارس (12-21 رجنوری 2010ء) مرکز پیشہ وارانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد زیر اہتمام: جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، ضلع نندربار، مہاراشٹر)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ، من يهد الله فلا مضلله ، ومن يضلله فلا هادي له ، ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله ، فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم . بسم الله الرحمن الرحيم : ﴿اقرأ باسم ربک الذي خلق ο خلق الإنسان من علق ο اقرأ وربک الأكرم οالذي علم بالقلم ο علم الإنسان ما لم يعلمο﴾ . (سورة العلق : ١-٥)

وقال تعالى : ﴿والله أخرجكم من بطون أمهاتكم لا تعلمون شيئًا وجعل لكم السمع والأبصار والأفئدة لعلكم تشكرونο﴾ . (سورة النحل : ٧٨)

محترم عالی جناب پروفیسر شاہ محمد مظہر الدین صاحب فاروقی، اور آپ کے دیگر رفقاء، اور معزز سامعین!

میرے مقالہ کا عنوان ہے ’’عصری تعلیم کی افادیت اسلامی ماحول میں‘‘، میں اپنے اس مقالہ میں پہلے عصری تعلیم کی اباحت وعدمِ اباحت کے سلسلے میں سماج میں موجود، دو فکری دھاروں اور ان کی دلائل (Prooff) کا تفصیل کے ساتھ ذکر کروں گا، پھر ان دلائل (پروف) کے تجزیہ وتنقیہ کے بعد عصری تعلیم کی اباحت، اور اسلامی ماحول میں اس کی افادیت سے متعلق کچھ باتیں گوش گزار کروں گا، کیوں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی بھی شیٔ کی افادیت پر کلام اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے، جب کہ شرعاً اس کی اباحت

بھی موجود ہو، ورنہ حرمت وممانعت کے ساتھ کسی بھی شئ کی افادیت ونافعیت خواہ کتنی بھی ہو، معتبر نہیں ہوا کرتی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیهمآ إثم کبیر ومنافع للناس وإثمهمآ أکبر من نفعهما﴾ . (لوگ) آپ سے شراب اور قمار کی بابت دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں، اوران کا گناہ اُن کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ (سورة البقرة : ۲۱۹)

ایک ضروری وضاحت: میرے اس مقالہ کا پیغام مدرِک حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں، مسبوق اور لاحق نہیں؛ یعنی وہ افراد واشخاص جو از اول تا آخر بغور اسے سماعت کریں گے، اور جو شخصیات مقالہ کا کچھ حصہ گزر جانے کے بعد شریکِ اجلاس ہوں، یا ابتداءً تو شریک رہے ہوں، مگر درمیان میں اپنی کسی ضرورت سے تشریف لے گئے ہوں، وہ مقالہ کے مدعا اور مقصود کو نہیں سمجھ سکتے، اس لیے درخواست ہے کہ تمام ہی حضرات بحیثیتِ مدرک مقالہ کے اختتام تک شریکِ مجلس رہیں۔ فجزاکم اللہ أحسن الجزاء!

محترم سامعین! آج کل مسلم معاشرے میں دینی وعصری تعلیم کے سلسلے میں دو طرح کے نظریے پائے جاتے ہیں، اور یہ دونوں نظریے افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔

(۱)...... مسلم معاشرہ وسماج میں ایک طبقہ وہ ہے جو محض دینی تعلیم ہی کو روشن مستقبل کا ضامن سمجھتا ہے، قطعِ نظر عصری تعلیم کے۔

(۲)......اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو صرف عصری تعلیم ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، بلکہ بعضے نام نہاد، دانشورانِ قوم تو یہ تک کہہ گئے کہ: **"ہمارا مستقبل اسی وقت روشن ہوگا، جب اس قوم میں ماہر ڈاکٹرس، انجینئرس، آفیسرس، ججس اور سائنٹسٹ پیدا ہوں گے،**

صرف علما وفضلا تیار کرنے سے بات بننے والی نہیں ہے۔‘‘

۱ر...... پہلا طبقہ اپنے نظر وفکر کے لیے ان دلائل کا سہارا لیتا ہے:

(۱) ارشادِ خداوندی ہے: ﴿ولو أنهم اٰمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السمآء والأرض﴾ . اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور پرہیز گاری اختیار کی ہوتی، تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔

(سورة الأعراف : ۹٦)

اس آیت سے پتہ چلا کہ مسلمانوں کو عصری علوم کی قطعاً ضرورت نہیں، کیوں کہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، وجود وبقا، عزت وسرخ رُوئی اور فلاح وترقی، ایمان، علمِ شرعی، عملِ صالح، تقویٰ وطہارت اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر موقوف ہے، نہ کہ دنیوی علوم پر، بلکہ دنیوی علوم پر ’’علوم‘‘ کا اطلاق ہی غلط ہے۔

(۲) ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين﴾. تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن رہے۔ (سورة آل عمران : ۱۳۹) یعنی ہماری عزت وسرخ رُوئی، رفعت وبلندی، فنا وبقا ایمانِ کامل کے ساتھ مشروط ہے۔

(۳) نیز ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وتلك القرىٰ أهلكنٰهم لما ظلموا وجعلنا لمهلكهم موعِدًا﴾ ۔ اور یہ بستیاں وہ ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر ڈالا، جب انھوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت متعین کیا تھا۔

(سورة الكهف : ۵۹)

پتہ چلا کہ ہلاکت وبربادی، ذلت ونکبت، پستی وپس ماندگی کا سبب ظلم وزیادتی ہے، نہ کہ علومِ عصریہ سے عدمِ واقفیت۔

(۴) ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هو يحيي ويميت﴾ ۔ وہی زندگی اور موت دیتا

ہے۔﴿قل اللّٰھم مٰلک الملک تؤتي الملک من تشآء وتنزع الملک ممن تشآء وتعز من تشآء وتذل من تشآء بیدک الخیر إنک علی کل شيء قدیر﴾ ۔آپ کہیے: اے سارے ملکوں کے مالک تو جسے چاہے حکومت دیدے، اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے، تو جسے چاہے عزت دے، اور تو جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۂ آل عمران:۲۶)، یعنی اللہ ہی فنا کے گھاٹ اتارتا ہے، اور عزت وذلت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(۵) نیز ارشادِ خداوندی ہے: ﴿قل ھل یستوي الذین یعلمون والذین لا یعلمون إنما یتذکر أولوا الألباب﴾ ۔آپ کہیے کہ کیا علم والے اور بے علم کہیں برابر بھی ہوتے ہیں؟ نصیحت تو بس وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (سورۃ الزمر: ۹)

علامہ عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾ محاورۂ قرآنی میں ''علم'' سے مراد علم حقائق سے ہوتی ہے، اور بے علمی سے مراد اسی علم سے محرومی ہے، علم سے قرآن مجید نے کہیں بھی وہ چیزیں مراد نہیں لی، جنہیں دنیا میں علوم وفنون کہا جاتا ہے۔ (تفسیر ماجدی مع ترجمہ قرآن)

(۶) ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿یرفع اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم والذین أوتوا العلم درجٰت﴾ ۔اللہ تم میں ایمان والوں کے اور ان کے جنہیں علم عطا ہوا ہے درجے بلند کریگا۔ (سورۃ المجادلۃ : ۱۱)

علامہ عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''یہ وعدۂ درجاتِ عالی، مجموعہ مخاطبین میں سے صرف اہلِ ایمان اور اہلِ علم کے لیے، ان کے غایتِ خلوص وغایتِ خشیت کی بناپر مخصوص رہ گیا۔'' (تفسیر ماجدی مع ترجمہ قرآن)

اسی طرح علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''فتح الباری شرح صحیح البخاری:۱/ ۱۸۶'' پرمذکورہ آیتِ شریفہ ﴿یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم . الخ﴾ کی تفسیر میں یوں رقم طراز ہیں کہ ''ایمان وعلم کے سببِ رفعِ درجات کا مطلب کثرتِ ثواب ہے، جس کی وجہ سے درجات بلند ہوتے ہیں، اور بلندیٔ درجات، درجاتِ معنوی وحِسّی دونوں کو شامل ہے، یعنی اللہ رب العزت اہلِ ایمان وعلم کو دنیا میں بھی اونچے مقام ومرتبہ اور مقبولیتِ عامہ سے نوازتے ہیں، اور آخرت میں بھی جنت میں ان کا مقام بلند وبالا ہوگا، اور علم سے مراد ''علمِ شرعی'' ہی ہے، جس کا مدار علمِ تفسیر، علمِ حدیث اور علمِ فقہ پر ہے۔'' -- علاوہ ازیں ''احکام القرآن للتھانوی'' ۵/۲۳، پر ہے کہ علم سے علمِ شرعی ہی مراد ہے، نہ کہ علمِ دنیوی۔

اسی طرح صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ کی دونوں حدیثوں: '' من سلک طریقا یلتمس فیہ علمًا سهّل الله له به طريقًا إلى الجنة ''. (صحیح مسلم: ۲/ ۳۴۵)، اور '' طلب العلم فريضة على كل مسلم ''. (ابن ماجہ: ص/۲۰) میں علم سے مراد علمِ شرعی ہے، نہ کہ علمِ دنیوی۔

قوله : " طلب العلم فريضة على كل مسلم " .... وقال البيضاوي : المراد من العلم هنا ما لا مندوحة للعبد عن تعلمه كمعرفة الصانع والعلم بوحدانيته ونبوة رسوله وكيفية الصلاة ، فإن تعلمه فرض عين . (زجاجه على هامش ابن ماجه : ص/ ۲۰)

قال الشيخ أبو حفص السهروردي : وقيل هو طلب علم الحلال حيث كان أكل الحلال فريضة ، وقيل هو علم البيع والشراء والنكاح

والطلاق إذا أراد الدخول في شيء من ذلک يجب عليه طلب علمه .

اهـ . (زجاجه على هامش ابن ماجه: ص/ ۲۰)

غرضیکہ علم سے علمِ شرعی ودینی کا مراد ہونا، نہ صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے ثابت ہے، بلکہ عرف ورواج بھی اس پر شاہد عدل ہے، کہ لوگ جن فنون کو حاصل کرتے ہیں، انہیں ان ہی فنون کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مثلاً: کہا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب، انجینئر صاحب، پروفیسر صاحب، وغیرہ۔

خلاصہ: یہ تھا پہلے طبقہ کا نظریہ اوران کے مستدلات، جو بالتفصیل میں نے آپ لوگوں کے گوش گزار کردیا، اب ملاحظہ ہوں دوسرے طبقہ کا نظریہ اوران کے دلائل۔

۲/...... دوسرا طبقہ اپنے نظر وفکر کے لیے ان مستدلات سے استدلال کرتا ہے، مثلاً وہ: (۱) ارشادِ خداوندی: ﴿**وعلمناه صنعة لبوس لكم**﴾ اور ہم نے انہیں زرہ کی صنعت تمہارے (نفع) کے لیے سکھلادی تھی۔ (سورۃ الانبیاء: ۸۰)......اور ﴿**وألنا له الحديد**﴾ اور داؤد کے واسطے ہم نے لوہے کو نرم کردیا۔ (سورۂ سبا: ۱۰) سے صنعتِ زرہ سازی کے لیے۔ اور ﴿**وأسلنا له عين القطر**﴾ اور ہم نے ان کے لیے تانبے کا چشمہ بہادیا۔ (سورۂ سبا: ۱۲) سے مختلف مصنوعات، مثلاً: برتن اور دیگر ضروری اشیاء کی صنعت کے لیے۔...... ﴿**واصنع الفلك بأعيننا ووحينا**﴾ اور تم کشتی ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے تیار کرو۔ (سورۂ ہود: ۳۷) سے کشتی وجہاز سازی وغیرہ کی صنعت کی اباحت۔ اور ﴿**وهو الذي مرج البحرين هذا عذب فرات وهذا ملح أجاج وجعل بينهما برزخًا وحجرًا محجورًا**﴾ اور وہ وہی (اللہ) ہے جس نے دو دریاؤں کو ملایا ایک شیریں تسکین بخش ہے، اور ایک کھاری اور تلخ ہے، اور

دونوں کے درمیان ایک حجاب اور ایک مانع قوی رکھ دیا۔ (سورۂ فرقان:۵۳)، اور ﴿مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان﴾ اس نے دو دریاؤں کو ملایا کہ باہم ملے ہوئے بھی ہیں (اور) دونوں کے درمیان ایک حجاب (بھی) ہے کہ دونوں (آگے) بڑھ نہیں سکتے۔ (سورۂ رحمٰن:۱۹،۲۰) سے سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم کی اہمیت، افادیت اور فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے استدلال کرتا ہے۔

(۲) اسی طرح اس کا کہنا یہ ہے کہ: ﴿اقرأ باسم ربک الذي خلق ٥ خلق الإنسان من علق﴾ آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ (سورۂ علق:۱،۲) میں اگر لفظ ''خلق'' کے معنی ومفہوم پر غور کیا جائے، تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے مخصوص علوم کا انتخاب نہیں کیا گیا، بلکہ علم کا میدان کھلا رکھا گیا ہے، اور '' الذي خلق'' کے اطلاق وعمومیت میں نصابِ تعلیم کی وسعت کا ذکر ہے، کہ اپنے رب کے نام سے ہر اس شئ کا علم حاصل کر جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ (پتہ چلا کہ '' الذي خلق'' میں تمام علوم، خواہ وہ علومِ دینیہ شرعیہ ہوں یا علومِ عصریہ ہوں، شامل ہیں۔) نیز اسلام نے صرف قرآن مجید، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف وغیرہ تک ہی نصابِ علم کو محدود نہیں کیا، بلکہ اسلام سائنسی علوم اور اپنے عہد کی جدید ترین ٹیکنالوجی کو بھی شاملِ نصاب کیا ہے۔

اسی طرح لفظِ ''علق'' کا استعمال بھی سائنسی علوم کے نصاب علومِ دینیہ میں شامل ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ ''علق'' کا معنی جما ہوا خون بھی کیا جاتا ہے، یہ ایک حیاتیاتی اصول ہے، جس کا عملِ تخلیق کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام کے تصورِ علم میں نصاب کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ (یعنی تمام علوم کو شامل ہے۔)

تجزیہ وتنقیہ: اب آیئے ہم دونوں طبقوں کے نظریات وافکار کا موازنہ کرتے

ہیں،...... یہ دونوں طبقے افراط وتفریط کے شکار ہیں،اور شریعتِ محمدی میں افراط وتفریط دونوں غیر محبوب ہیں، کیوں کہ یہ امت ِ وسط ہے ، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿**جعلنكم أمة وسطاً**﴾ ہم نے تمہیں ایک امت عادل بنادیا ہے۔(سورۂ بقرہ:۱۴۳) کہ امتِ محمدیہ افراط وتفریط سے الگ اعتدال کے راستے پر چلتی ہے،اور فقہ کا قاعدہ ہے:" **خير الأمور أوساطها**" . (قواعد الفقه :ص/۸۰)

اس لیے ہم بھی علومِ دینیہ وعصریہ کے سلسلے میں اعتدال کا راستہ اپناتے ہوئے کہتے ہیں کہ" علومِ عصریہ کا حاصل کرنا نہ صرف مباح بلکہ فرضِ کفایہ ہے"۔جیسا کہ علامہ حصکفی رحمہ اللہ" درمختار" میں فرضیتِ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں: آدمی اپنے دین کے لیے جس قدر علم کا محتاج ہے،اس کا حاصل کرنا فرضِ عین ہے،(جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **طلب العلم فريضة على كل مسلم**")۔اور اس سے زائد دوسروں کی نفع رسانی کے لیے جس علم کا محتاج ہے اس کا حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے"۔ (**واعلم أن تعلم العلم يكون فرض عين ؛ وهو بقدر ما يحتاج لدينه . وفرض كفاية ؛ وهو ما زاد عليه لنفع غيره**) .

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف"**رد المحتار**" **المعروف** بالشامی میں درمختار کی عبارت:(**فرض كفاية ؛ وهو ما زاد عليه لنفع غيره**) کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فرضِ کفایہ علمِ دینی ودنیوی دونوں کو شامل ہے،علمِ دینی جیسے نمازِ جنازہ ، اور علمِ دنیوی جیسے ضروری مصنوعات کا علم ،...... صاحبِ تبیین المحارم فرماتے ہیں کہ: فرضِ کفایہ سے مراد ہر ایسا علم ہے،جس کے بغیر دنیوی امور انجام پذیر نہیں ہوسکتے ،مثلاً:

طب، حساب اور اصولِ صناعت وزراعت وغیرہ۔''

وفرض كفاية : يتناول ما هو ديني كصلاة الجنازة ، ودنيوي كالصنائع المحتاج إليها ؛ .... قال في تبيين المحارم : وأما فرض الكفاية من العلم ؛ فهو كل علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب .... وأصول الصناعات والفلاحة كالحياكة والسياسة والحجامة . اهـ . (رد المحتار: ١/١٢٦)

اسی طرح شیخ الاسلام، فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے اپنی کتاب ''آسان ترجمۂ قرآن مع تشریحات'' میں، آیتِ کریمہ: ﴿**وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة**﴾ اور ان سے مقابلہ کے لیے جس قدر بھی تم سے ہو سکے سامان درست رکھو قوت سے۔ (انفال:٦٠) کی تشریح کرتے ہوئے، تحریر فرمایا: ''یہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے ابدی حکم ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی دفاعی طاقت جمع کرنے کا اہتمام کرے، قرآن کریم نے ''طاقت'' کا عام لفظ استعمال کر کے بتا دیا ہے کہ جنگ کی تیاری کسی ایک ہتھیار پر موقوف نہیں، بلکہ جس وقت، جس قسم کی دفاعی قوت کارآمد ہو، اُس وقت اُسی طاقت کا حصول مسلمانوں کا فریضہ ہے، لہٰذا اس میں تمام جدید ترین ہتھیار اور آلات بھی داخل ہیں، اور وہ تمام اسباب ووسائل بھی جو مسلمانوں کی اجتماعی، معاشی اور دفاعی ترقی کے لیے ضروری ہوں۔

افسوس ہے کہ اس فریضے سے غافل ہو کر آج مسلمان دوسری قوموں کے دستِ نگر بنے ہوئے ہیں، اور ان سے مرعوب ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو اس صورتِ حال سے نجات عطا فرمائے''۔ (آسان ترجمۂ قرآن:١/٥٤٥)

علامہ دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " أي من کل ما یتقوی به في الحرب کائناً ما کان " (روح) ''قوۃ'' کا لفظ عام ہے، عددی قوت، سامانِ جنگ کی قوت، آلاتِ حرب کی قوت، سب کچھ اس کے اندر آ گیا، یہاں تک کہ بڑھے ہوئے ناخن بھی۔

صاحب روح المعانی نے آیت کے تحت میں بندوق کا ذکر تصریح کے ساتھ کیا ہے، اور اگر (وہ) آج ہوتے تو مشین گن، طیارہ اور ٹینک اور جیپ اور ایٹم بم وغیرہ سب کے نام لکھ جاتے۔ (تفسیر ماجدی)

خلاصۂ کلام یہ کہ علمِ دین کا حاصل کرنا فرضِ عین ہے، اسی میں ہماری بقا وفلاح اور عزت وترقی مضمر ہے، اور علومِ دنیویہ کا حاصل کرنا نہ صرف جائز ومباح، بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔

اور ہمارے اس موقف کی تائید فخرِ گجرات، مفتیٔ بے مثال، حضرت مولانا قاری مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کے ایک فتویٰ سے بھی ہوتی ہے، آپ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''فتاویٰ رحیمیہ'' میں ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایسے اسکول قائم کرنا جس میں بقدرِ ضرورت گجراتی، انگریزی وغیرہ دنیوی علوم وفنون سکھلائے جائیں، اور صنعت وحرفت کے کلاس قائم کرنا، جس سے حلال روزی حاصل کرنے میں مدد مل سکے، بلا شبہ جائز اور کارِ خیر وموجبِ ثواب ہے، لیکن دینی تعلیم کو اور دینی مدارس کی امداد کو مقدم سمجھا جائے۔''

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ ناچیز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

(مرحوم اکبر الہ بادی) (فتاوی رحیمیہ: ۳/۱۳۰، کتاب العلم والعلماء)

جب علوم وفنون کام نہیں آتے اور نجات دینے والا معمولی ہنر انسان کے کام آتا ہے:

دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری فنون وہنر کی تعلیم کی ضرورت تجربات وواقعات سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی وتعمیری کردار'' میں ایک سبق آموز قصہ نقل کیا ہے:

''راوی صادق البیان کہتا ہے کہ ایک بار چند طلبہ تفریح کے لیے ایک کشتی پر سوار ہوئے، طبیعت موج پر تھی، وقت سہانا تھا، ہوا نشاط انگیز وکیف آور تھی، اور کام کچھ نہ تھا، یہ نوعمر طلبہ خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے، غیر تعلیم یافتہ ملاّح ان کی دل چسپی کا اچھا ذریعہ اور فقرے بازی، مذاق وتفریحِ طبع کے لیے نہایت موزوں تھا، چنانچہ ایک تیز وطرّار صاحب زادے نے اس سے مخاطب ہوکر کہا: ''چچا میاں آپ نے کون سے علوم پڑھے ہیں؟'' ملاّح نے جواب دیا: میاں میں کچھ پڑھا لکھا نہیں، صاحب زادے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''ارے آپ نے سائنس نہیں پڑھی؟'' ملاّح نے کہا: میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔ دوسرے صاحب زادے بولے: ''اقلیدس'' اور ''الجبرا'' تو آپ ضرور جانتے ہوں گے؟'' ملاّح نے کہا: حضور یہ نام میرے لیے بالکل نئے ہیں۔ اب تیسرے صاحب زادے نے شوشہ چھوڑا: ''مگر آپ نے جغرافیہ وتاریخ تو پڑھی ہی ہوگی؟'' ملاّح نے جواب دیا: سرکار یہ شہر کے نام ہیں یا آدمی کے؟ ملاّح کے اس جواب پر لڑکے اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے، اور انہوں نے قہقہہ لگایا، پھر انہوں نے پوچھا: چچا میاں تمہاری عمر کیا ہوگی؟ ملاّح نے بتایا: یہی کوئی تیس سال! لڑکوں نے کہا آپ نے اپنی آدھی عمر برباد کی، اور کچھ پڑھا لکھا نہیں، ملاّح بے چارہ

خفیف ہوکر رہ گیا، اور چپ سادھ لی۔

قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کشتی کچھ ہی دور گئی تھی کہ دریا میں طوفان آ گیا، موجیں منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی تھیں، اور کشتی ہچکولے لے رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبی تب ڈوبی، دریا کے سفر کا لڑکوں کو پہلا تجربہ تھا، ان کے اوسان خطا ہو گئے، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، اب جاہل ملاّح کی باری آئی، اس نے بڑی سنجیدگی سے منہ بنا کر پوچھا: ''بھیّا تم نے کون کون سے علم پڑھے ہیں؟''

لڑکے اس بھولے بھالے جاہل ملاّح کا مقصد نہیں سمجھ سکے، اور کالج یا مدرسہ میں پڑھے ہوئے علوم کی لمبی فہرست گنانی شروع کر دی، اور جب بھاری بھرکم اور مرعوب کُن نام گنا چکے، تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا: ٹھیک ہے یہ سب تو پڑھا، لیکن کیا پیراکی بھی سیکھی ہے؟ اگر خدانخواستہ کشتی اُلٹ جائے تو کنارے کیسے پہنچ سکو گے؟ لڑکوں میں کوئی بھی پیرنا نہیں جانتا تھا، انہوں نے بہت افسوس کے ساتھ جواب دیا:

''چچا جان یہی ایک علم ہم سے رہ گیا، ہم اسے نہیں سیکھ سکے۔''

لڑکوں کا جواب سن کر ملاّح زور سے ہنسا اور کہا: میاں میں نے تو اپنی آدھی عمر کھوئی، مگر تم نے پوری عمر ڈبوئی، اس لیے کہ اس طوفان میں تمہارا پڑھا لکھا کچھ کام نہ آئے گا، آج پیراکی ہی تمہاری جان بچا سکتی ہے، اور وہ تم جانتے ہی نہیں۔''

دنیوی ترقیات کے حصول میں ہمارے اور غیروں کے اصول جداگانہ ہیں!:

بعض دانش ور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری فلاح وبقا، عزت وترقی علومِ دینیہ پر منحصر ہوتی، تو غیروں نے کہاں علومِ دینیہ حاصل کیے، جب کہ آج وہ زندگی کے ہر میدان

میں آگے ہیں، اور دن بدن ترقی کرتے جارہے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں بھی ترقی کے وہی اصول اپنانے ہوں گے، جو انہوں نے اختیار کرر کھے ہیں، لیکن یہ فہم وفکر قیاس مع الفارق اور خود فریبی ہے، کیوں کہ ہمارے اور غیروں کی ترقی کے اُصول جدا جدا ہیں۔ غیر چوں کہ احکامِ شرعیہ کے مکلّف نہیں، اس لیے دنیوی ترقی کے لیے انہوں نے جو غیر شرعی اصول اپنا رکھے ہیں، دنیا میں ان پر اس کا کوئی وبال نہیں ہوگا، اور وہ ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے جائیں گے، جب کہ مسلمان شریعت کے مکلّف ہیں، اگر وہ اصولِ شرعیہ کو چھوڑ کر، غیر شرعی اصولوں کو اپنا کر، ترقی کرنا چاہتے ہیں تو وہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے، اور اگر کچھ ترقی کر بھی لی، تو وہ پائیدار نہیں ہوسکتی، کیوں کہ ہماری دنیوی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم دنیوی فنون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی حاصل کریں، جس سے فکرِ آخرت پیدا ہوتی ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے: ﴿**یعلمون ظاهرًا من الحیوة الدنیا وهم عن الاٰخرة هم غٰفلون**﴾ ۔ یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں، اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں۔ (سورۂ روم: ۷)، آیت کا مفہوم صاف ہے کہ علم ظاہر حیات کے ساتھ ساتھ فکرِ آخرت ضروری ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿**بل ادّٰرک علمهم في الاٰخرة بل هم في شک منها بل هم منها عمون**﴾ ۔ بلکہ آخرت (کے بارے) میں ان کا علم منتہی (پنکچر Punctur) ہو چکا ہے، بلکہ وہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ اس سے اندھے ہو رہے ہیں۔ (سورۂ نمل: ٦٦)

لہٰذا آج کے ان بدلتے حالات میں، اسلامی ماحول میں عصری تعلیم دینا نہ صرف

مباح بلکہ یہ قوم وملت کی اجتماعی، معاشی اور دفاعی ترقی کے لیے ضرورت بن چکی ہے، اس لیے کہ:

آج مسلم قوم کو......ضرورت ہے، اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص ڈاکٹروں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص، فارمیسٹوں اور کیمسٹوں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص ٹیچروں اور پروفیسروں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص انجینئروں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص ماہرینِ اقتصادیات کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص ماہرینِ سیاست کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص سائنس دانوں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص ججوں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص اہلِ صحافت کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلص کاشت کاروں کی،
اسے ضرورت ہے اچھے دین دار، ایمان دار، مخلصین منتظمین کی،

اور قوم کی یہ ضرورتیں اسی صورت میں پوری ہوسکتی ہیں، جب کہ ہم دینی ماحول میں، نونہالانِ قوم وملت کو، ان کے دین کی اساسی وبنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے لیے عصری تعلیم کا معقول انتظام کریں گے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج اس فریضے سے غافل ہوکر مسلمان دوسری قوموں کے دستِ نگر بنے ہوئے ہیں، اور ان سے مرعوب ہیں۔

محترم سامعین! قوم وملت کی اسی ضرورت کو پورا کرنے اور اپنے فرض سے سبک

دوش ہونے کے لیے، مفکرِ قوم وملت ، خادمِ قرآن وسنت، حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی دامت برکاتہم نے اس عظیم دینی درس گاہ ’’جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم‘‘ کے احاطہ وکیمپس میں بی یو ایم ایس کالج، بی اینڈ ڈی فارمیسی کالج، آئی ٹی آئی کالج، بی ایڈ وڈی ایڈ مراٹھی کالج وغیرہ قائم کیے، اور مستقبل قریب میں بہت جلد ’’بی ای انجینئرنگ کالج، اور ایم بی بی ایس کالج‘‘ کے قیام کا عزم رکھتے ہیں۔

ان کالجوں کے بڑے اچھے اثرات ونتائج ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ان کالجوں کے فارغین نے نہ صرف خود اپنی دنیا بنالی، بلکہ وہ قوم وملت کے لیے نفع رساں بھی ثابت ہورہے ہیں۔لیکن! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف دینی ماحول میں عصری تعلیم کا نظم کرنے سے قوم وملت کی وہ ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا، بلکہ ان کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کی صحیح ، اسلامی ،فکری تربیت کی جانب خاص توجہ دینا لازمی وضروری ہے، اوران میں اس احساس کو پیدا کرنا ضروری ہے، کہ وہ خیر امت کے افراد ہیں، ان کا مقصدِ حیات اللہ رب العزت کی عبادت ، پوری دنیا میں اس کے کلمہ کی بلندی، اوراس کے دین کی تبلیغ واشاعت ہے۔

اگر ہم نے ان کی ذہنی وفکری تربیت کی طرف توجہ نہیں دی، اور کچھ ظاہری اسلامی آثار کو دیکھ کر خوش ہوتے رہے، جو ہمارے اس دینی ماحول کا اثر ہے، تو یہ خودفریبی سے کم نہ ہوگا، کیوں کہ جب وہ یہاں سے کسی اور ماحول میں جائیں گے، توان پر وہاں کی تہذیب وثقافت اورآدابِ زندگی غالب آجائیں گے، جواُس ماحول کا اثر ہوگا، اور اس طرح ہماری تمام محنتیں رائگاں وبے کار ہوجائیں گی۔

اس لیے ہم اساتذہ کرام وٹیچرس حضرات پر واجب ہے کہ، ہم ان کی ظاہری تربیت

سے زیادہ ذہنی وفکری تربیت پر توجہ دیں، کیوں کہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ ''جب انسان اندر سے بدلتا ہے، تو اس کا ظاہر بھی بدلتا ہے، اور پھر اندر سے بدلے ہوئے انسان کو بدلنا انتہائی مشکل ہوتا ہے''، تو ہمیں وہی کام کرنا چاہیے جس کے نقوش واثرات کو دوسرا ماحول اور افراد نہ بدل سکیں، اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ خود استاذ وٹیچر،......؛

فکرِ اسلامی کا حامل ہو، مادی کا نہیں،

فکرِ اخروی کا حامل ہو، دنیوی کا نہیں،

نفعِ عام کی فکر کا حامل ہو، ذاتی وشخصی کا نہیں،

اور یہ کام منتظمین ومینجمنٹ کا ہے کہ وہ ایسے اساتذہ کا تقرر عمل میں لائیں، جو ان اوصاف سے متصف ہوں۔ ورنہ تعلیم کے نتائج ہمارے اور آپ کے سامنے ہیں کہ:

☆ ''طلبہ کے دلوں میں اساتذہ کی تعظیم نہیں، کیوں کہ طلبہ تعلیم حاصل نہیں کررہے ہیں، بلکہ خرید رہے ہیں، اور اساتذہ تعلیم دے نہیں رہے ہیں، بلکہ فروخت کررہے ہیں۔''

☆ ''استاذ کی تعظیم طلبہ کے دلوں میں، اسکولوں کی دیواروں پر اقوالِ زرّین کندہ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ یہ اس صورت میں پیدا ہوتی ہے، جب اساتذہ طلبہ کو اپنا حقیقی اثاثہ سمجھیں۔''

☆ ''تعلیم سے مالی مفادات وابستہ ہوچکے ہیں، اس لیے تعلیمی معیار گھٹ گیا، استاذ مالی منفعت کے لیے پڑھا رہا ہے اور طالبِ علم مالی منفعت کے لیے پڑھ رہے ہیں۔''

امام سرخسی رحمہ اللہ اور کنویں میں ''مبسوط'' کی تالیف:

امام سرخسی رحمہ اللہ کے ایک عبرت آموز واقعہ پر اپنی اس مختصر تحریر کو ختم کرتا ہوں،

امام سرخسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۳۸ھ) کا پورا نام محمد بن احمد بن ابوبکر ہے، وہ پانچویں صدی کے ان علماء میں سے ہیں، جنہیں آیۃ من آیات اللّٰہ (اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی) کہنا چاہیے، آپ اصلاً خراسان کی ایک بستی ''سرَخس'' کے رہنے والے تھے، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ کو''سرَخسی'' کہا جاتا ہے، آپ تحصیلِ علم کے لیے ''کرغیزستان'' کے شہر ''اوزجند'' تشریف لے گئے تھے، اور بعد میں آپ نے وہیں سکونت اختیار کی، آپ نے حاکمِ وقت کی مرضی کے خلاف کوئی فتویٰ دیا، یا کوئی بات نصیحت کے طور پر کہی جس کی وجہ سے حاکمِ وقت ''خاقان'' نے آپ کو ایک کنویں نما گڑھے میں قید کردیا۔

ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے ''شرح السیر الکبیر'' کے مقدمہ میں اس قید کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ خاقان نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کرلیا تھا، امام سرخسی رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا، تو اس نے انہیں قید کردیا، اور وہ سالہاسال کے لیے اس کنویں نما گڑھے میں قید رہے، جہاں ان کے لیے چلنا پھرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے شاگردوں کو اس واقعے سے کتنا دکھ ہوا ہوگا، انہوں نے اپنے استاذ کی دل بستگی کے لیے درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے، آپ ہمیں کچھ املا کرادیا کریں۔

علامہ سرخسی رحمہ اللہ پہلے سے چاہتے تھے کہ امام حاکم شہید رحمہ اللہ کی کتاب ''الکافی'' کی شرح لکھیں، چنانچہ انہوں نے اسی کنویں سے اپنی عظیم کتاب ''المبسوط شرح الکافی'' املا کرانی شروع کی، اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہ کار، اوزجند کے ایک کنویں نما قید خانے میں اس طرح وجود میں آیا کہ ۳۰ ضخیم جلدوں کی یہ کتاب کنویں

سے بول بول کر، کنویں کے منہ پر بیٹھے ہوئے شاگردوں کو لکھوائی گئی، جو آج فقہ حنفی کے لیے معتبر ومستند مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں، اور کوئی بھی فقیہ اپنی بات کے اعتبار واعتماد کے لیے اس سے مستغنی وبے نیاز نہیں ہوسکتا۔

امام سرخسی رحمہ اللہ کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ کنویں سے جو املا کراتے تھے، وہ خالص اپنی یادداشت کی بنیاد پر کراتے تھے، کسی کتاب کی مدد انہیں حاصل نہیں تھی، اور یہ بات ظاہر بھی ہے کہ کنویں میں قید ہونے کی حالت میں دوسری کتابوں سے باقاعدہ استفادہ بظاہر ممکن نہ تھا۔ جن حضرات نے مبسوط سے استفادہ کیا وہ اس کرامت کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں، کہ اتنی تحقیقی کتاب جو بعد والوں کے لیے فقہ حنفی کا مستند ماخذ بن گئی، کس تمام تر حافظے سے لکھوائی گئی ہے۔

امام سرخسی رحمہ اللہ کا یہ واقعہ مجھے اور آپ کو یہ درس دیتا ہے کہ:

(۱) استاذ میں اپنے کام کی دُھن اور لگن ہونی چاہیے، حالات خواہ موافق ہوں یا مخالف، فضا سازگار ہو یا ناسازگار، آدمی قید وبند کی صعوبت میں ہو یا آزاد۔

(۲) استاذ میں یہ جذبہ موج زن ہونا چاہیے کہ اس کے پاس جو بھی علم وفن ہے، وہ کسی نہ کسی طریق سے محفوظ ومعقول ہاتھوں اور ذہنوں وسینوں میں پہنچ جائے، کیوں کہ یہ علم وفن اس کے پاس اللہ کی امانت ہے، اور ہر امانت کی حفاظت اس کے مناسبِ حال ہوا کرتی ہے، علم وفن جیسی امانت کی حفاظت یہی ہے کہ صاحبِ علم وفن، اُس علم وفن کے حامل افراد کو پیدا کریں، جسے ہم افراد سازی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۳) اس واقعے سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے، کہ استاذ ہمہ وقت اپنے پاس پڑھنے والے طلبہ واسٹوڈینٹس کے نفع ومفاد کو مقدم رکھیں، نہ کہ اپنا نفع وآرامِ جان، اور یہی

فقہ کا قاعدہ بھی ہے کہ ''نفعِ عام کی خاطر ضررِ خاص کو برداشت کیا جاتا ہے'' "**یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام**" . (درر الحکام : ۱/ ۴۰ ، المادۃ : ۲۶)

(۴) آج کل طلبہ میں تعلیمی رجحان کے کم ہونے کی جہاں بہت ساری وجوہات ہیں، انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم اساتذہ کی پیشِ نظر طلبہ کا نفعِ عام نہ رہا، بلکہ اپنا نفع ہر وقت مقدم رہتا ہے، جس کا ہم اور آپ کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں، مثلاً: تعلیمی اوقات میں اگر استاذ کو اپنا کوئی ذاتی کام پیش آجائے، تو وہ طلبہ کے نفعِ عام کی خاطر اس کام کو مؤخر یا ملتوی نہیں کرتا، بلکہ تعلیمی حرج کو برداشت کر کے اپنے ذاتی کام کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح تعلیمی اوقات میں عین دورانِ درس کسی کے موبائل کی گھنٹی بجتی ہے، تو وہ سلسلۂ درس کو موقوف کر کے، کال ریسیو کرتا ہے، اور نہ صرف یہ کہ ضروری بات پر اکتفا کیا جاتا ہے، بلکہ لایعنی باتوں اور ہنسی مذاق میں طلبہ کا قیمتی وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معمولی معمولی کاموں کے لیے اسکولوں اور کالجوں سے چھٹیاں لی جاتی ہیں، جب کہ اس میں بھی زیرِ تعلیم طلبہ کا بڑا حرج ونقصان ہوتا ہے۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود ہم اساتذہ کے نزدیک ہمارے اس پیشہ کی اہمیت وعظمت باقی نہ رہی، اور نہ یہ خیال کبھی وہم وگمان میں بھی آتا ہے کہ ہم قوم کے معمار ہیں، جب کہ ''ماضی میں ایک استاذ اور ٹیچر اپنے آپ کو قوم کا معمار خیال کیا کرتا تھا، اور اس کا عمل بھی اپنے اس خیال کے عین مطابق ہوا کرتا تھا، آج نہ تو یہ خیال رہا اور نہ ہی عمل، اور اگر معدودے افراد میں یہ خیال ہو بھی، تو وہ خیال؛ محض ایک خیال ہے، کیوں کہ اس کے پیچھے عمل وکردار کی جو پختگی درکار ہے وہ موجود نہیں۔''

جب کہ ہمارے سامنے ہمارے اسلاف کے حالات وواقعات موجود ہیں، کہ انہوں نے کس طرح سے ہمیشہ اپنے پاس پڑھنے والے طلبہ کے نفع ومفاد کو مقدم رکھا، مثلاً:

(۱) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کے بیٹے کا انتقال ہوا، تجہیز وتکفین کے بعد اس روز بھی سبق کا ناغہ نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا: ''بیماری میں تو علاج کی وجہ سے تشویش اور مشغولی ہوتی تھی، اب تو ایسی تشویش نہیں رہی، سبق کا ناغہ کیوں کیا جائے۔''

(۲) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میری بہن کا انتقال ہوگیا، اس پر سب طلبہ نے کہا ہم آج سبق نہیں پڑھیں گے، میں نے کہا: ''میاں پڑھو بھی، اس کا بھی ثواب ہوگا، فائدہ ہوگا۔''

(۳) حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمہ اللہ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوا، تجہیز، تکفین اور تدفین کے جملہ مراحل سے فراغت کے بعد اسباق جاری رکھے، اسباق پڑھانے کے بعد طلبہ سے فرمایا'' کچھ پڑھ پڑھا کر بخش دینا۔'' (حیاتِ صدیق: ص/۲۲۰)

یہ ہیں ہمارے اسلاف کے چند واقعات جو'' مشتِ نمونہ از خروارے'' پیش کیے گئے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے: ؎

وائے ناکامی کہ متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اللہ ہمیں اپنے اس عظیم منصب وذمہ داری کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

تعلیم وتبلیغ (ہی اور بھی میں فرق)

الحمد لله رب العالمين ، والصلوة والسلام على رسوله الكريم ، وعلى آله الطيبين الطاهرين ، أما بعد : فقد قال الله تعالى في كتابه المبين ، فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ٥ بسم اللّٰه الرحمن الرحيم :﴿لقد منّ الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولا من أنفسهم يتلو عليهم آيٰته ويزكّيهم ويعلّمهم الكتٰب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين﴾ . وقال رسولنا وحبيبنا وسيدنا محمد ﷺ : " تعلّمُوا العلم وعلّموه الناس " . وقال : " بلّغوا عني ولو آية " . وقال أيضًا : " ألا فليبلّغ الشاهد الغائب " . صدق الله مولانا العظيم ، وصدق رسوله النبي الكريم ، ونحن على ذلک لمن الشاهدين والشاكرين ، والحمد لله رب العالمين .

محترم ومکرم برادرانِ اسلام اور طالبانِ علومِ نبوت !!

قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم وتبلیغ دونوں چیزیں فرض ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاموں میں تعلیم اور تبلیغ دونوں ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم کی یہ آیات اس پر شاہد ہیں:

﴿لقد منّ الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولا من أنفسهم يتلو عليهم اٰيٰته ويزكّيهم ويعلّمهم الكتٰب والحكمة﴾ . (حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے رسول کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں، کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔)

﴿يآ ايها الرسول بلّغ مآ أنزل إليک من ربک وإن لم تفعل فما

بلّغت رسٰلَتہ﴾ . (اے رسول-صلی اللہ علیہ وسلم!-جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا آپ سب پہنچا دیجئے، اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے، تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نہیں پہنچایا۔)

تعلیم کے لیے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور تبلیغ کے لیے آپ خود تشریف لے گئے، تعلیم کے معنی ''سیکھنے'' کے ہیں، سیکھنے کے لیے معلّم کے پاس آنا ہوتا ہے، اور تبلیغ کے معنی ''پہنچانا''، اس کے لیے مبلّغ کو دوسروں کے پاس جانا بھی ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں یہ دونوں کام کیے، اور اپنے بعد یہ دونوں کام امت کے سپرد فرمائے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تعلَّموا العِلمَ وعلِّمُوہ الناس''. ''تعلَّمُوا الفَرائِضَ وعلِّمُوھَا الناسَ''. ''بَلِّغُوا عَنِّي ولَو آیة'' اور ''ألا فلیُبلِّغ الشاھد الغائب''(جو شخص حاضر ہے، جس نے براہِ راست مجھ سے دین سیکھا ہے وہ غائب تک پہنچا دے)۔ چنانچہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کے ہر ہر جز کی تبلیغ فرمائی ہے، اس لیے کہ دین کا ہر حکم امانت ہے، جس کا امت تک پہنچانا ضروری ہے۔

تبلیغ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں دین سیکھنے اور اس پر عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے، تبلیغ سے ہرگز یہ تصور نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھا جا رہا ہے، اور ان کو کلمہ پڑھایا جا رہا ہے۔

آج کل اس کام پر متعدد اعتراض کیے جاتے ہیں، اس لیے دل نے چاہا کہ آج کی اس مجلس میں انہی اعتراضات کے جوابات منقول ومعقول طریقہ پر دیئے جائیں، تاکہ یہ اعتراضات کام کرنے والے ساتھیوں میں تشویش پیدا نہ کریں، اور انہیں اپنے

کام کی صحت پر پورا اطمینان ہو۔

۱- پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں تبلیغ کا ثبوت کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں میں تبلیغ کا ثبوت ہے، ''فیض الباری:۲/ ۲۵۵'' پر ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی درخواست پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ فرمایا، جو ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی، اور یہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ تھے۔

(مستفاد: ۱- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقے کے اُمراء کو چاہیے کہ وہ مرکز کو عامۃ الناس کی دینی حالت اور ضرورت سے مطلع کریں، اور ضرورت کی بقدر جماعتوں کو بھیجنے کی درخواست کریں، اور مرکز میں موجود امیر المسلمین یا شوریٰ کو چاہیے کہ وہ علاقوں کے تقاضوں پر جماعتیں روانہ کرنے کی فکر کریں۔

مستفاد:۲-اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مدارس کے طلبہ، اسکول وکالجز کے اسٹوڈینس کی جماعتیں نکلنی چاہیے، اور بہتر یہ ہے کہ ان کے امیران کے اساتذہ ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے معقل بن یسار رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت کو بصرہ، اور عبادہ بن صامت اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کی ایک جماعت کو ملکِ شام روانہ کیا، یہ جماعتیں مسلمانوں کے پاس گئیں اور ان میں تعلیم وتبلیغ کا کام کیا۔ (فتاویٰ محمودیہ:۵/ ۵۶)

۲- دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ تبلیغ پہلے گھر میں ہونی چاہیے، پھر باہر، یعنی گھر کے ہر فرد میں سوفی صد دین آجائے، اس کے بعد باہر تبلیغ کے لیے نکلنا چاہیے، نہ یہ کہ

گھر کے افراد، محلّہ کے لوگ، اور بستی کے باشندے دین سے دور ہوں اور آپ گاؤں گاؤں تبلیغ کرتے پھریں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ- اتنی بات تو حقیقت ہے، اپنے گھر اور بستی کا حق مقدم ہے۔ ﴿وأمر أهلک بالصلوة واصطبر علیها﴾ (آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے اور خود اس پر جمے رہیے)، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ گھر اور بستی والے جب تک پورے پابند نہ ہو جائیں دوسروں کو تبلیغ نہیں کی جاسکتی، مثلاً: کسی جگہ دینی مدرسہ ہے، جیسے آپ کا اپنا مدرسہ ’’اشاعت العلوم‘‘ یہاں اس کی پابندی نہیں کی گئی کہ ’’اکل کوا‘‘ کا ہر آدمی حافظِ قرآن، قاریٔ قرآن اور عالمِ دین بن جائے، تب ہی دوسری جگہ کے طالبِ علم کو داخلہ کی ترغیب دی جائے۔

اسی طرح نہ کسی بزرگ کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے گھر اور بستی کی اصلاحِ تام کے بغیر باہر کے آدمیوں کی بیعت نہ کی ہو، بلکہ اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ گھر اور بستی والے فیض حاصل نہیں کرتے، باہر والے کر لیتے ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف وغیرہ تشریف لے جانے سے پہلے کیا مکہ کے سب لوگوں کو مسلمان کر لیا تھا؟ نہیں! معلوم ہوا بات ایسی نہیں ہے جیسا کہ عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں، تبلیغ کا مقصود محنت ومجاہدہ کر کے اپنے دین کو پختہ کرنا ہے، اور ہر آدمی صلابت فی الدین یعنی عقائد وتعمیلِ احکام میں پختگی کا مکلّف و پابند ہے۔

۳- تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ تبلیغ کا شرعی ثبوت کہاں ہے؟

جواباً عرض ہے کہ نفسِ تبلیغ کا حکم تو کتاب وسنت سے ثابت ہے، اور ہر زمانے میں اس پر عمل بھی ہوتا رہا ہے، البتہ ہر زمانے کے حالات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اپنے

مخصوص بندوں کے قلوب میں مفید طریقے اِلقا فرماتے رہے ہیں، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہفتہ میں ایک یا دو دفعہ لوگ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہوتے اور وہ ان کو احادیث سناتے، مسائل بتلاتے، بخاری شریف میں ہے: **عن أبي وائل قال: " كان عبد اللّٰه يُذكِّر الناس في كل خميسٍ ".** (صحيح بخاري: ۱/۱۶)

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن منبر کے قریب کھڑے ہوکر احادیث سنایا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم: ۱/۱۹۰)

پھر ایک وقت آیا، مشائخ نے تصوف اور توجہ باطن کے ذریعے، علماء نے مدارس قائم کر کے، واعظین نے وعظ کہہ کر، تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیا، غرض یہ کہ امت فریضۂ تبلیغ سے کبھی غافل نہ ہوئی، اور اوپر ذکر کردہ طریقوں میں سے ہر طریقہ اُس زمانے کے اعتبار سے مؤثر رہا، آج کے دور میں تبلیغی جماعت کا طریقہ اصول کی پابندی کے ساتھ تبلیغِ دین میں نہایت مؤثر ومفید ہے۔

اب جس طرح مدارس، مکاتب، خانقاہوں کے قیام کو نیا طریقہ کہہ کر غلط نہیں کہا جاسکتا، اسی طرح تبلیغ کے اس طریقے کو غلط نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ مسلمانوں کا اپنے دین میں پختہ ہونا - اس سے بھی غیر مسلموں میں تبلیغ ہوتی ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ خود ہی اُس طرف مائل ہوں، رہی غیر مسلموں میں مستقلاً تبلیغ، تو اس سے انکار نہیں، وہ بھی ہورہی ہے۔

۴- چوتھا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جماعت میں جو چلہ ہوتا ہے، کیا دین میں اس کی کوئی اصل ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دین کا سیکھنا سکھانا اور اس پر عمل کرنا فرض ہے، اب اسی دین کو سیکھنے کے لیے بعض لوگوں کے لیے سہولت اس میں ہے کہ وہ مدارسِ دینیہ میں داخل ہوکر باقاعدہ پورا نصاب پڑھیں، تو وہ یہی صورت اختیار کریں، اور جس کے پاس اتنا وقت نہیں، یا اتنی مالی وسعت نہیں، یا عمر زائد ہوچکی ہے، یا حافظہ وذہن ایسا نہیں، تو خواہ خود آہستہ آہستہ دین سیکھے، کتابیں پڑھ کر، تقریر سن کر، تبلیغ میں نکل کر، چنانچہ لوگ اپنے اپنے اعتبار سے وقت لگاتے ہیں، کوئی ایک دن، کوئی دو دن، کوئی تین دن، کوئی دس دن، کوئی چالیس دن، کوئی چار ماہ، کوئی ایک سال، کوئی تین سال، جس کو جتنا وقت ملا وہ نکلا۔

اب رہی یہ بات کہ چلہ کی دین میں کوئی اصل ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چلہ کی اصل دین میں موجود ہے، جیسا کہ ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ نطفہ ماں کے رحم میں چالیس روز گزرنے پر علقہ بنتا ہے، پھر چالیس روز گزرنے پر مضغہ، پھر چالیس روز گزرنے پر اس کی روزی، اس کی عمر، موت، شقی وسعید لکھا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا طبیعت کی تبدیلی میں چلہ کو بڑا دخل ہے۔

(عن) عبد اللّٰه بن مسعود قال: حدثنا رسول الله ﷺ — وهو الصادق المصدوق —: " إن خلق أحدكم يجمع في بطن أمه أربعين يومًا، ثم يكون مضغة مثل ذلك، ثم يبعث اللّٰه إليه ملكًا فيؤمر بأربع كلمات فيكتب رزقه وأجله وعمله، ثم يكتب شقي أو سعيد، ثم ينفخ فيه الروح ". الحديث. متفق عليه. (سنن أبي داود)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: " **من صلى أربعين يومًا في جماعة**

لم تفُته التكبيرة الأولى كتب الله له برأتين : برأة من النار وبرأة من النفاق ". (سنن ترمذي ، جمع الفوائد) (جوشخص چالیس روز تکبیرِ اولیٰ سے نماز باجماعت پڑھتا ہے، اللہ پاک اس کے لیے دو برأتیں لکھ دیتے ہیں، ایک جہنم سے برأت، دوسری نفاق سے برأت۔)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد:" من أخلص أربعين يومًا ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه ". (جس نے چالیس روز اخلاص کا معاملہ کیا، اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔)

۵- پانچواں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جماعت والے کسی بھی معمولی اُردو خواں شخص کو جماعت کا امیر بناتے ہیں، جو نہ عالم ہوتا ہے، نہ کسی مدرسے کا فارغ؟

جواباً عرض ہے کہ جب فرائضِ خمسہ کی امامت کے لیے ایسا شخص موجود نہ ہو، جس میں امامت کی اعلیٰ صفات پائی جاتی ہوں، تو بدرجۂ مجبوری کم درجے کے آدمی کو امام بنایا جاتا ہے، اسی طرح جب جماعت میں امارت کے لیے ایسا آدمی موجود نہیں ہوتا، جس میں اعلیٰ صفات موجود ہوں، تو کم درجے والے کو امیر بنا دیا جاتا ہے، اور جیسے پہلی صورت میں آپ امامت کو ناجائز نہیں کہتے، ایسے ہی دوسری صورت میں امارت کو ناجائز نہیں کہہ سکتے۔

۶- چھٹا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد مبارک میں لوگ کہاں تبلیغی گشت کرتے تھے؟

جواباً عرض ہے کہ اس پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ لوگوں میں دین کی طلب اور اس پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا دین وعبادت ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

”**تعلموا العلم وعلموه الناس**“ اور”**طلب العلم فریضة علی کل مسلم**“ سے مفہوم ہوتا ہے۔تو گشت کے ذریعے بھی لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے،اور پھر ان کو دین کی بات بتائی جاتی ہے،تو گشت کا مقصود لوگوں کو جمع کرکے دینی باتیں بتلانا ہے،اور فقہ کا قاعدہ ہے:”**حکم الوسائل حکم المقاصد**“(جو حکم مقاصد کا ہے وہی وسائل کا ہے)گشت کا مقصد دین کی دعوت ہے،تو اس کا ذریعہ”گشت“ بھی دین ہے،جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آج کی طرح دینی مدارس،اساتذہ، طلبہ،کتابیں،درس گاہیں،کمرے اور مطبخ وغیرہ جن کا ہم انتظام کرتے ہیں،یہ چیزیں کہاں تھیں؟ یہ سب دین سیکھنے،سکھانے،عمل کرنے اور اس کی اشاعت کے لیے اختیار کی گئیں،جو سراسر خیر ہیں،تو ایسے ہی عملِ گشت بھی سراسر عملِ خیر ہے۔

۷- ساتواں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کیا تبلیغ فرض ہے؟

جواباً عرض ہے کہ تبلیغِ دین ہر زمانے میں فرض ہے،اور موجودہ زمانے میں بھی فرض ہے،لیکن فرضِ کفایہ،جہاں جتنی ضرورت ہو اسی قدر اس کی اہمیت ہوگی،اور جس میں جیسی اہلیت ہو اس کے حق میں اسی قدر ذمہ داری ہوگی،جیسا کہ:﴿**ولتکن منکم أمة یدعون إلی الخیر ویأمرون بالمعروف وینهون عن المنکر**﴾ . (آل عمران:۱۰۴)سے مستفاد ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے بعض ساتھیوں کی طرف سے احکامِ دینیہ سے ناواقفیت کی بنا پر ایسی باتیں بھی سننے کو ملتی ہیں کہ **تبلیغ ھی دین ھے**،جب کہ بات ایسی نہیں ہے،صحیح بات یہ ہے کہ **تبلیغ بھی دین ھے**،کیوں کہ دین کا ہر کام دین ہے،محض دین کے کسی ایک کام پر دین کا انحصار کرنا غلط اور نادانی

ہے، دینی کام کرنے والے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے کام کے ساتھ لفظ ''**ھی**'' لگانا چھوڑ دیں، کیوں کہ اس سے امت بڑا نقصان اٹھا چکی ہے، اگر ہم مزید نقصان سے بچنا چاہتے ہیں، تو لفظ ''**بھی**'' کو اپنائیں، اور یہ کہا کریں کہ:

''جو کام مدارس کررہے ہیں وہ بھی دین ہے، جو کام خانقاہیں کررہی ہیں وہ بھی دین ہے، جو کام تبلیغ کررہی ہے وہ بھی دین ہے، جو کام مختلف دینی، سماجی تنظیمیں اور ادارے کررہے ہیں وہ بھی دین ہے۔''

اگر ہم ''ہی'' کو چھوڑ کر ''بھی'' کو اپناتے ہیں، تو تمام دینی ادارے اور اس سے متعلق افراد ایک دوسرے سے قریب ہوں گے، جس سے ہر ایک کے کام کو تقویت پہنچے گی، اور ہر ایک اپنے کام کے مقاصد ونتائج کو اپنی آنکھوں سے بہت جلد دیکھ لے گا۔

عزیزو!! تبلیغ وتعلیم سے متعلق یہ چند باتیں ذہن میں آئیں جو آپ حضرات کے سامنے پیش کی گئیں، اللہ پاک مجھے اور آپ کو دین کی صحیح سمجھ اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین!

علمائے مستقبل ہوشیار ہو جائیں!!

انسان کی پوری زندگی ایک سفر ہے، اور دنیا ایک ایسی رباط اور سرائے ہے جہاں رہ گزر آتے ہیں، اپنا کچھ وقت گزارتے ہیں، اور پھر اپنی اصل منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی کے اس سفر میں وہ بہت سے اسفار کرتا ہے، مثلاً سفر برائے تجارت، سفر برائے سیاحت، سفر برائے عبادت اور سفر برائے تعلیم وغیرہ، اس طرح زندگی کا یہ سفر ''سفر در سفر'' سے عبارت ہو جاتا ہے۔

گزشتہ چند برسوں پہلے کی بات ہے کہ بندے نے ششماہی تعطیلات میں اپنے کچھ عزیز واقارب کے ہمراہ ہندوستان ہی کے کچھ تاریخی وسیاحتی مقامات کو دیکھنے کی غرض سے رختِ سفر باندھا تھا، ان ہی میں سے ایک تاریخی مقام ''فتح پور سیکری'' بھی ہے، جب یہاں پہنچے تو ذہن ماضی کی اوراق گردانی کرنے لگا کہ یہ وہی مقام ہے، جہاں ہندوستانی بادشاہ ''جلال الدین محمد اکبر'' نے ۴۳۴ر برس پہلے ایک عالی شان عمارت تعمیر کی تھی، اور اسے عبادت خانے کے نام سے موسوم کیا تھا، عمارت کے بہت بڑے ہال میں ایک بلند چبوترے پر اس کے لیے ایک نشست بنائی گئی تھی، جس کے سامنے درجنوں کرسیاں علمائے وقت کے لیے مخصوص ہوا کرتی تھیں، بادشاہ کی دعوت پر حضراتِ علماء تشریف لاتے اور اپنی معلومات سے بادشاہ کے مذہبی علم میں اضافہ کرتے، جس کا طریقہ یہ تھا کہ بادشاہ سلامت کوئی سوال اٹھاتے، تو اس سوال سے متعلق جو روایات ہوتیں، علماء انہیں بیان کرتے، اور اس کے بعد انہیں آپس میں بحث ومباحثہ کی اجازت دی جاتی، علماء اپنے موقف کو بیان کرنے کے لیے کتابوں کے

حوالے دیتے، بزرگوں کے اقوال نقل کرتے، بادشاہ سلامت ان میں سے کسی کے علم وفضل کی داد دیتے، یعنی اسے انعام واکرام سے نوازتے، انعام کی اسی امید میں ہر فریق اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے نادر دلائل پیش کرتا، بادشاہ کی تعریف سے دی جانے والی اس لالچ کا انجام یہ ہوا کہ اب ان علماء کی بحث کا مقصد تلاشِ حق نہیں رہا، بلکہ طلبِ انعام بن گیا، اور رفتہ رفتہ علماء کے درمیان بحث کا معیار یہ ہوگیا کہ جس کے پاس اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ہوتی وہ اپنے مدِ مقابل کی عیب جوئی پر کمر کس لیتا، اور اسے کافر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرتا–نوبت بایں جا رسید–کہ اکبر بادشاہ کا یہ عبادت خانہ ایک ایسی ہجوم میں تبدیل ہوگیا جس میں لوگ ایک دوسرے کی دستارِ فضیلت کو اپنے قدموں میں روندنے لگے۔

جب اکبر بادشاہ نے دیکھا کہ علماء کی یہ بحثیں دھینگا مستی بن گئیں، تو اس نے ملا عبد القادر بدایونی کو یہ خدمت سونپی کہ جب مجلس کا کوئی شریک غیر مہذب گفتگو کرے، تو آپ اسے ہماری اس مجلس سے نکال باہر کریں، ملا بدایونی نے کہا کہ اگر گفتگو میں شمولیت کی شرط ''تہذیب'' ہے، تو علماء کی اکثریت عبادت خانے سے باہر ہوجائے گی، بادشاہ سلامت نے ملا کے اس جملے کا لطف لیا، اور اپنی مجلس میں بحث میں حصہ لینے والے علماء کے گوش گزار بھی کیا۔

عبادت خانے کی ان علمی ابحاث سے اکبر بادشاہ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کے ذریعہ اس کے مذہبی علم میں اضافہ ہو، بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ علماء آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑیں، بحث ومباحثہ کریں، جس سے عوام کے دلوں میں ان کی وقعت کم ہوجائے، اور علماء کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر وہ مذہب کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے،

اور وہ ان دونوں مقصدوں میں کامیاب بھی ہوگیا، کہ اس نے ان مجلسوں کے برپا کرنے کی مدت کے اندر اندر انہی علماء سے ایک ایسا فتویٰ تیار کرالیا، جس کی رُو سے اسلام کی تاویل وتشریح کے اختیارات بادشاہ سلامت کو دیئے گئے، اس فتوی پر اس دور کے جید علماء نے دستخط ثبت فرمادیئے، اور اس طرح اکبر کی تاویلات کی روشنی میں **"دینِ الٰھی"** تشکیل پاگیا، جو سراسر دینِ اسلام کے مخالف اور گمراہیوں کا مجموعہ تھا۔

الغرض! اکبر چلا گیا، اس کی مجلس کے علماء بھی پیوندِ خاک ہوگئے، مگر آج بھی اکبری ذہنیت کے لوگ موجود ہیں، جو حضراتِ علمائے کرام کو فروعی اور مسلکی مسائل میں الجھا اور لڑا کر، اپنی خواہشات کے مطابق شریعتِ اسلامیہ کی تشکیل میں مصروف وکوشاں ہیں، اور اسی گروہِ نامراد کی طرف سے وقتاً فوقتاً شریعتِ اسلامیہ کے متعلق مختلف غیر معقول باتیں سننے کو ملتی ہیں، مثلاً: شرعی احکام فرسودہ ہوچکے ہیں۔ علمائے کرام کو چاہیے کہ ان پر دوبارہ نظرِ ثانی کریں۔ تو کبھی یہ کہ زمانے کے بدلنے سے احکام بدلا کرتے ہیں؛ اس لیے احکامِ اسلام میں تبدیلی ہونی چاہیے، وغیرہ۔

جب کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قوانینِ اسلام قیامت تک کے لیے ہیں، اور ان میں وہی تازگی وشادابی، جو چودہ سو سال پہلے تھی، آج بھی ہے۔ اور رہے گی۔ وہ فرسودہ نہیں ہوئے، بلکہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کررہے ہیں، ان کی فکریں زنگ آلود ہوگئیں، انہیں صیقل کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ سراپا اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے صیقل ہوا کرتی ہیں۔

اسی طرح انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ شرعی احکام میں تبدیلی کی اجازت خود نبی کو نہیں تھی، تو ان کے وارثین حضرات علماء کو یہ حق کیوں کر حاصل ہوسکتا ہے، خود اللہ رب

العزت نے اپنے نبی کی زبانی قرآن میں یہ اعلان کروادیا: ﴿قل ما يكون لي أن أُبدّله من تلقآئ نفسي اِن اَتّبع اِلا ما يُوحىٰ اِليَّ اِنّيٓ اَخافُ اِن عصيتُ ربي عذابَ يومٍ عظيمٍ﴾ ۔ ”آپ کہہ دیجیے! میں یہ نہیں کرسکتا کہ اس میں اپنے جی سے ترمیم کردُوں، میں تو بس اسی کی پیروی کروں گا جو میرے پاس وحی سے پہنچتا ہے، اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، تو میں یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں“۔ (سورۂ یونس:۱۵)

یعنی آپ ﷺ حاملِ شریعت ہیں، بانیٔ شریعت نہیں، احکامِ الٰہی کا اتباع آپ ﷺ پر بھی اُسی درجہ میں ضروری تھا، جتنا کسی اور فردِ بشر پر، اوران احکام میں فرمائشی ترمیم پر عمل کرنا آپ ﷺ کی بساط سے باہر ہے۔

نیز انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ” لا ينكر تغيّر الأحكام – الاجتهاديّة – بتغيّر الأزمان“یعنی ”زمانے کے بدلنے سے اجتہادی احکام کے بدلنے کا انکار نہیں کیا جاتا“۔ یہ فقہ اسلامی کا قاعدہ ضرور ہے، مگر اس کا تعلق صرف انہی اجتہادی مسائل واحکام سے ہے، جن کی بنیاد صاحبِ مذہب مجتہد نے اپنے زمانے کے عرف وعادت پر رکھی ہو، اور وہ بدل جائیں، احکامِ منصوصہ وقطعیہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ قیامت تک اپنی اصل حالت پر باقی رہیں گے، اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

” ثم اعلم ؛ أن كثيرًا من الأحكام التي نصّ عليها المجتهد صاحب المذهب : بناءً على ما كان في عرفه وزمانه قد تغيّرت بتغيّر الأزمان ، بسبب فساد أهل الزمان أو عموم الضرورة “.......... ” (فهذا) كله صريحٌ فيما قلنا : من العمل بـ ”العرف “ ما لم يخالف الشريعة ؛ كالمكس والرّبا ونحو ذلک ، فلا بدّ

للمفتي والقاضي بل والمجتهد من معرفة أحوال الناس " .

(رسم المفتي : ص/١٧٦–١٨١)

''موسوعۃ القواعد الفقہیہ'' میں ہے:

" إن تغيّر الأوضاع والأعراف والأحوال الزمنية له تأثير كبير في كثير من الأحكام الشرعية الاجتهادية ؛ لأن ما كان من الأحكام الشرعية مبنيًّا على عرف الناس وعاداتهم ، أو على مصلحة من المصالح ، أو وضع خاصّ من الأوضاع فإن هذه الأحكام تكون قابلة لتغيير كيفيّة العمل بمقتضى الحكم بسبب اختلاف العادة أو المصلحة ، أو الوضع عن الزّمن السّابق ، أما أصل الحكم الثابت بالنصّ فلا يقبل التغيير بحال " .

(٨/١١٠٠ ، القاعدة الحادية والسبعون بعد المئة)

لہٰذا علمائے مستقبل کو چاہیے کہ وہ اکبری ذہنیت کے لوگوں سے ہوشیار رہیں، اوران کا آلۂ کار نہ بنیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبیں، جیسا کہ اکبر اپنی مجلس کے علماء کو لے ڈوبا۔

الحذار! الحذار! یا علماء المستقبل !!!

حج وعمرہ وِیزوں کی خرید وفروخت

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : " **العمرة إلى العمرة كفارة ما بينهما ، والحج المبرور ليس له جزاء إلا الجنة** " کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ کے ما بین گناہوں کا کفارہ ہے، اور حج مبرور کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔ (سنن ابن ماجہ:ص/ ۲۰۷، ابواب المناسک) حج عبادتِ مالی وبدنی ہے، حج اللہ کی راہ میں جہاد ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کو مشروع فرما کر اپنے محتاج بندوں پر انتہائی فضل وکرم فرمایا، کیوں کہ حج کے ذریعہ بندوں کو اپنے خالق ومالک کا قرب ونزدیکی، اپنے گناہوں سے طہارت وپاکی نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **إن الإسلام يهدم ما كان قبله وأن الهجرة تهدم ما كان قبلها ، وأن الحج يهدم ما كان قبله** " کہ اسلام ماقبل یعنی جاہلیت کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے، اور ہجرت بھی اس سے پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ (کنز العمال: ۱/ ۶۷، کتاب الایمان والاسلام) اور ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: " **من حج فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته أمه** ". جس شخص نے پورے آداب کی ساتھ حج کیا، دورانِ حج اپنے آپ کو رفث وفسق سے بچائے رکھا، وہ ایسے لوٹتا ہے جیسے آج ہی اس کی ولادت ہوئی، یعنی اس کے تمام گناہ معاف ہوتے ہیں۔ (صحیح بخاری: ۱/ ۲۰۶)

حج کو جانے والے لوگ جاتے ہوئے اور لوٹتے ہوئے خدائی ضمانت اور سیکورٹی (Securitay) میں ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **الحاج في**

ضمان اللّٰہ مقبلا ومدبرًا ". (کنز العمال:۵/ ۸)

حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہوتے ہیں، اللہ تعالی نے خود انہیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی، اس لیے اس کے دربار میں حاضر ہوئے، اب وہ جو کچھ مانگیں گے اللہ ان کو عطا کرے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:"**الغازي في سبيل اللّٰہ، والحاج والمعتمر وفد اللّٰہ دعاهم فأجابوه وسألوه فأعطاهم**".

(سنن ابن ماجہ: ص/ ۲۰۸، ابواب المناسک)

اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کرے اور اسی سال اس کا انتقال ہو جائے، تو وہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:" **من حج أو اعتمر فمات من سنته دخل الجنة**". (کنز العمال:۵/ ۱۵)

حاجی ادائیگیٔ حج میں جو کچھ خرچ کرتا ہے، اللہ اس کے بدلے اسے سات سو گنا عطا فرماتے ہیں:" **الحج في سبيل اللّٰہ تضعف فيه النفقة بسبع مائة ضعف**".

(کنز العمال:۵/ ۴، کتاب الحج)

لیکن آج کل اس عظیم اور مبارک عبادت کی ادائیگی میں کچھ تو حکومتوں نے اور کچھ اپنے ہی لوگوں نے اس قدر مصیبتیں اور دشواریاں لا کھڑی کر دیں کہ الامان والحفیظ! مثلاً: ٹور والوں کا حج ویزوں کو فروخت کرنا، آفیسروں کا حج کے امیدواروں سے ان کے نام قرعہ اندازی میں نکلوانے کے لیے مختلف طریقوں سے رقمیں اینٹھنا، ویزا آفیسروں کا ویزا اسٹامپنگ (Stamping) کے لیے دلالوں اور ایجنٹوں (Ejant,s) سے رقمیں وصول کرنا، اور دلالوں کا حج امیدواروں وغیرہ سے۔ گویا حج جیسی عظیم عبادت کو ان لوگوں نے بزنس (Business) اور تجارت بنالیا، جب کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو لوگ اس عبادت کی ادائیگی کے خواہاں ہیں، ہر طرح سے ان کی مدد کی

جاتی، نیکی کے کاموں میں تعاون کر کے اپنے آپ کو ثواب کا مستحق ٹھہراتے۔

آج کل کئی جگہوں سے یہ سوال کیا جارہا ہے کہ کیا ٹور والوں کے لیے حج وِیزا فروخت کرنا جائز ہے؟ -- اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے خرید وفروخت کی اسی صورت کو حلال فرمایا، جس میں عوضین (یعنی جو چیز بیچی جارہی ہے، اور جو اس کی قیمت بن رہی ہے) مال کے قبیل سے ہو، جیسا کہ بیع کی تعریف: " **هو مبادلة المال بالمال بالتراضي** " باہمی رضامندی کے ساتھ مال کا تبادلہ مال سے کرنا۔ (تبیین الحقائق: ۴/ ۲۷۵، کتاب البیوع) سے مفہوم ہورہا ہے، شریعت کی نگاہ میں مال وہ ہے جس کی ذخیرہ اندوزی ممکن ہو، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے مال کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: " **المال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة** ".

(ردالمحتار: ۷/ ۷، کتاب البیوع)

اب اگر کسی کو یہ اشکال ہو کہ عقد اجارہ (مزدوری کا معاملے) میں ایک جانب منافع اور دوسری جانب مال ہوتا ہے، تو یہاں پر بیع کی تعریف صادق نہیں آرہی ہے، اس لیے عقد اجارہ بھی جائز نہیں ہونا چاہیے؟ اس اشکال کا جواب یہ دیا جائے گا کہ عقد اجارہ کو خلافِ قیاس جائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ اگر عقد اجارہ جائز نہ ہوتا، تو لوگوں کی حاجتیں اور ضرورتیں پوری نہ ہوتیں۔ جیسا کہ اس قاعدۂ فقہیہ سے مفہوم ہوتا ہے: " **حاجة الناس أصل في شروع العقود، شرع عقد البيع لحاجة الناس إلى تبادل الأملاك، وشرع عقد الإجارة لحاجة الناس إلى تبادل المنفعة** ". (موسوعة قواعد الفقه: ۴/ ٦٦) لوگوں کی ضرورتیں ہی مشروعیت عقود کی بنیاد ہے، عقد بیع اس لیے شروع ہوا کہ لوگوں کو تبادُلِ املاک کی ضرورت تھی، اور عقد اجارہ اس لیے شروع ہوا کہ لوگوں کو تبادُلِ منفعت کی ضرورت تھی۔

حج وِیزا کی خرید وفروخت نہ تو عقد بیع میں داخل ہے اور نہ عقد اجارہ میں داخل ہے، عقد بیع میں اس لیے نہیں کہ وِیزا مال نہیں ہے، جس کی خرید وفروخت کی جاسکے، اور عقد اجارہ میں اس لیے داخل نہیں کہ عقد اجارہ کہتے ہیں ایسے عقد کو جس میں آدمی اَعیان کے منافع کا مالک ہوتا ہے۔" عقد الإجارة علی منافع الإعیان ". (درر الحکام: ۱/۴۵۲) جب کہ وِیزا عینِ شئے ہے ہی نہیں، کہ جس کو باقی رکھ کر اس کے منافع حاصل کیے جاسکیں، حج وِیزا سعودی حکومت کی طرف سے حکومتوں اور ٹورز (Tours) والوں کو مفت حاصل ہوتے ہیں، اس پر سعودی حکومت ان سے کسی قسم کی کوئی رقم نہیں لیتی، اور نہ یہ کوئی مال ہے کہ حکومتوں اور ٹور والوں کو ان کا مالک بنایا گیا ہو، اور وہ اپنے حقِ ملک کی وجہ سے اس کو فروخت کررہے ہوں، بلکہ حج ویزا خالصۃً ایک اجازت نامہ ہے، جس کی بنیاد پر آدمی سعودی حکومت کی حدود میں ایک مخصوص وقت تک داخل ہوسکتا ہے اور قیام کرسکتا ہے۔ اور بس!

اب بعض لوگوں نے ٹور اینڈ ٹراویلس کمپنیاں قائم کی، اور اس نام سے سعودی حکومت سے حج ویزا حاصل کرکے اس کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری کردیا، اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کی یہ ایک اچھا، منافع بخش اور حلال کاروبار ہے، جب کہ یہ ایک حرام اور ناجائز کاروبار ہے، اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حکم وہی ہے جو مالِ حرام کا ہے، بعض ٹور والے یہ کہتے ہیں کہ ہم ویزا فروخت نہیں کرتے بلکہ جو رقم ہم حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں سے لیتے ہیں، وہ ان کے دورانِ سفر مکہ ومدینہ کے طعام وقیام وغیرہ کی فیس ہے۔ بھلا یہ تو بتائیں کہ آپ جو حاجیوں کو کھانا کھلارہے ہیں اور جس جگہ قیام کروارہے ہیں کیا واقعی وہ اس قدر مہنگا ہے؟

اگرنہیں ہےتو کیا یہ غریب مسلمانوں کا استحصال نہیں ہے، جو محض مجبوری میں آپ کو اتنی بڑی بڑی رقمیں دے رہے ہیں، اور آپ اس کو صرف حلال ہی نہیں بلکہ مبارک ومسعود خیال کررہے ہیں، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه** ". (جمع الجوامع:۹/۷، رقم:۲۶۷۶) کسی مسلمان شخص کا مال دوسرے کے لیے اس کی رضامندی اور خوش نودی کے بغیر حلال نہیں۔

ان ٹور والوں کو ایک بات یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب مالِ حرام مالِ حلال سے ملتا ہے، تو وہ اسے ہلاک وبرباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

تعجب تو اس پر ہے کہ اتنی خطیر رقمیں وصول کرنے کے بعد پھر یہ اشتہار دیئے جاتے ہیں:

''حاجیوں کی خدمات ہمارا نصب العین''، ''ٹور سے جایئے اور اطمینان وسکون سے حرمین میں عبادت کیجئے۔''

بھلا بتلایئے یہ کیسی خدمت ہے کہ خدمت کے بعد مخدوم بجائے راحت محسوس کرنے کے تکلیف محسوس کرے، جب آپ نے اس کو پوری طرح سے نچوڑ لیا، تو وہ حرمین میں اطمینان وسکون سے کیسے عبادت کرے گا۔ ہاں! سکون واطمینان اس اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ اب اپنے جیب میں پیسہ ہی نہیں، تو بازار وغیرہ کیا جائیں۔لیکن کسی کو اس کی عبادت میں اس طرح سکون واطمینان مہیا کرانا شریعتِ اسلامیہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر البراک فرماتے ہیں: جو شخص حج کا ارادہ نہیں رکھتا اس کے لیے ویزا حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔اگر کسی ایسے شخص نے ویزا حاصل کیا جس کا حج کرنے کا ارادہ تھا، مگر اب کسی وجہ سے اس کا ارادہ نہیں ہے، تو اس کے لیے اس ویزا کو اس سے زائد قیمت میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے، جو اس نے اس کے لیے حاصل کرنے میں خرچ کی، یعنی حج کے ویزا کو ایسی تجارت نہ بنایا جائے، جس میں ضعیف اور حج کے حریص مسلمانوں سے ناحق فائدہ اٹھایا جائے، بلکہ ایک مسلمان کے شایانِ شان تو یہ ہے کہ وہ کارِ خیر میں

معاون اور مددگار بنے، اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد ونصرت کرے، نہ یہ کہ ان سے ناحق فائدہ اٹھائے۔

(دیکھئے WWW.Saaid.het/warathah/ALBarak.com)

یہی موقف الشیخ عبداللہ بن الجبرین کا ہے۔

(دیکھئے WWW.Jebren.com/Fatawa.com, WWW.Islam q a .com)

اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اگر ٹورس اینڈ ٹراویلس بند کیے جائیں گے، تو بہت سے لوگ حج سے محروم رہ جائیں گے، یہ خیال بس خیال کی حد تک ہی درست ہے، مگر حقائق ایسے نہیں ہیں، کیوں کہ چند سال قبل اس طرح کے ٹورس تو نہیں تھے، اس کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد حج کی دولت سے مالا مال ہوتی رہی، اسی طرح اگر کوئی ٹور والا یہ کہے کہ ہم چوں کہ رشوت دے کر ویزا نکالتے ہیں، اور حاجیوں سے وہی رقم وصول کرتے ہیں ویزا فروخت نہیں کرتے، تب بھی ان کا یہ عمل شرعاً صحیح نہیں، کیوں کہ کسی اور کو ویزا دلانے کے لیے آپ رشوت دینے اور آفیسروں کی مٹھائیاں گرم کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس لیے کہ بوقت ضرورت خود صاحبِ حق اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دے سکتا ہے، نہ کہ ٹورس اینڈ ٹراویلس والے اپنی تجارت اور بزنس (Business) کے لیے، خدارا اِس طرح کے حیلے بہانے بنا کر غیر شرعی طریقے سے دوسروں کے مال کو کھانے سے کلی اجتناب کریں، کیوں کہ دنیوی زندگی چندروزہ اور اُخروی زندگی دائمی ہے، یہاں کے چندروزہ عیش وعشرت کی خاطر ہمیشہ ہمیش والی زندگی کو خراب نہ کریں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "**الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت**" دانش ور، عقل مند وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو پہچان لے اور ایسے اعمال کرے، جو مابعد الموت فلاح وکامیابی کا سبب بنے، اللہ تعالیٰ ہمیں پوری طرح دین پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔

❁......❁......❁

دعوت جو رسم بن رہی ہے!

حج بیت اللہ اسلام کے خاص شعائر میں سے ہے، اور اس کی پانچ بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے، جو شخص سفر حج کا سامان رکھتا ہو اور اس کو ایسی سواری میسر ہو جو اسے بیت اللہ تک پہنچا سکے، یعنی وہ زاد وراحلہ پر قادر ہو، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، بڑے ہی نیک بخت اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حج جیسی عظیم الشان عبادت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، کیوں کہ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک بار درِ خداوندی پر حاضر ہو کر اس کا دیدار اور روضۂ مقدسہ پر جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرلیں۔

جس طرح پورے عالم سے حاجیوں کے قافلے سرزمین حجاز پہنچ رہے ہیں، ہندوستان بھر سے بھی حجاج کرام کی ایک بڑی تعداد، حج کمیٹی آف انڈیا اور پرائیوٹ ٹورس کے ذریعے پہنچ چکی ہے، اور کچھ پابہ رکاب ہے، اللہ پاک سب کو حج مبرور ومقبول نصیب فرمائیں، اور ان کے اس حج کو ان کی زندگیوں میں انقلاب کا ذریعہ بنائیں۔

اس موقع پر حجاج کرام کو جس اہم بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ ہے ''سفر حج سے پہلے خود حاجی کا اپنے دوست واحباب اور اعزاء واقارب کی دعوت کرنا، یا دوست واحباب اور اعزہ واقارب کا حاجی کی دعوت کرنا''، طرفین سے یہ دعوت گرچہ فی نفسہٖ مباح ہے، مگر جس طرح اس کا التزام کیا جارہا ہے، وہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، کیوں کہ فقہ کا یہ ضابطہ ہے کہ ''جب لوگ کسی امر مباح کا التزام کرنے لگ جائیں تو وہ مباح باقی نہیں رہتا، بلکہ مکروہ بن جاتا ہے۔'' **''فکم من مباح یصیر بالالتزام**

من غير لزوم والتخصيص من غير مخصص مكروها". (مجموعہ رسائل لکنوی:۳/۴۹۰) "**الإصرار على المندوب يبلغه إلى حد الكراهة**". (السعایۃ: ۲/۲۶۵)۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ:

"میری امت میں بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کو کھانا کھلائے، مگر اس کھلانے میں ریا اور شہرت مقصود نہ ہو، اور جو شخص کسی کو ریا اور شہرت کی غرض سے کھانا کھلائے گا اللہ پاک قیامت کے دن اس کے پیٹ میں ایک آگ رکھ دیں گے، یہاں تک کہ وہ حساب وکتاب سے فارغ ہو"۔ (کنز العمال:۹/۱۰۸، حدیث نمبر:۲۵۸۳۵)

ہم اس فقہی ضابطہ اور حدیث پاک پر ذرا غور کرلیں! کہ ہماری یہ دعوتیں اس فقہی ضابطہ اور حدیث میں وارد وعید کا مصداق بن رہی ہیں یا نہیں؟ ظاہر تو یہی ہے کہ ہماری یہ دعوتیں شرعاً ممنوع ہیں، کیوں کہ حاجی صاحبان نے اس دعوت کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے، اور اگر کوئی نہ کرنا چاہے تب بھی سماج ومعاشرہ کا دباؤ، اور دوست واحباب کی جانب سے تقاضے، اسے اس پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں تک دیکھا گیا کہ حاجی دس دس، بیس بیس پائیلی کا کھانا پکا کر اپنے دوست واحباب اور اعزہ واقارب کو کھلا رہا ہے، اگر کسی کے پاس اس کی گنجائش نہیں تو وہ قرض لے کر اس کا انتظام واہتمام کررہا ہے، اور جن کے پاس اس کی گنجائش ہے وہ ریا وشہرت کے جذبہ سے سرشار ہوکر ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کررہے ہیں، بعض حاجی صاحبان تو اس دعوت کے لیے ایسے دعوت نامے بھی چھپوارہے ہیں، جیسے وہ اپنے بچہ یا بچی کی شادی میں چھپواتے ہیں، اور بڑی لمبی چوڑی دعوتوں کا سلسلہ چل پڑا ہے، ہمارے شہر مالیگاؤں کی آبادی گنجان ہے، گلیاں اور راستے تنگ ہیں، اور ان کی ہر دو جانب سے ہر صاحبِ مکان نے ان کے کچھ حصوں پر ناجائز قبضہ نہ صرف اپنا حق سمجھ رکھا ہے، بلکہ زندگی بھر اس کی بقا کے لیے کوشاں بھی ہے، جس کی وجہ سے راستے اور سڑکیں پہلے سے ہی تنگ ہیں،

اب جب شادی بیاہ یا مذکورہ دعوت کا موقع ہوتا ہے تو سرِ راہ کرسیاں لگائی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ مزید تنگی کا شکار ہوجاتی ہیں، اور راہ گیروں کو بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے، شرعاً یہ عمل ایذا رسانی میں داخل ہوکر ممنوع وحرام ہے، اب اگر کوئی اہلِ علم وعقل اس پر احتجاجاً کچھ کہتا ہے، تو اس کی ایسی اصلاح کی جاتی ہے کہ دوبارہ اس طرح کی اصلاح کا خیال بھی اس کے ذہن ودماغ میں نہیں آسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگانِ دین نے حج کی اس طرح کی دعوتیں جن میں ریا اور فخر کی شان ہو، اور انہیں لازم وضروری تصور کیا جائے، اپنے پاس پیسہ نہ ہونے کی صورت میں قرض لے کر کی جائیں، یا ان میں دیگر مفاسد ومنکرات پائی جائیں، ان سے پرہیز کا حکم دیا ہے، کہ اس طرح کی دعوتیں نہ کھلائیں اور کھائیں؛ کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے: ''ممنوع ومحظور کا سبب بھی ممنوع ومحظور ہوتا ہے۔'' **''ما کان سببًا لمحظور فهو محظور''** . (شامی: ۵/۲۲۳، نعمانیہ، فتاوی محمودیہ: ۱۰/۴۵۹، ط: کراچی)

نوٹ:- حضرات علمائے کرام سے گزارش ہے کہ حاجیوں کی یہ دعوت جو رسم بنتی جارہی ہے، اس سے عوام کو روکنے کی کوشش کریں، کیوں کہ ابھی ابتدا ہے، اگر اس رسم نے معاشرہ میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی، تو پھر آئندہ ہمیں اس کے خلاف اپنی تحریروں اور تقریروں میں ویسی ہی آواز اٹھانی ہوگی جیسے تلک وجہیز کی رسم کے خلاف، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ہمیں وہ کامیابی نہیں ملے گی جس سے آج ہم سرفراز ہوسکتے ہیں۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے:

ولكن اخو الحزم ليس نازلا☆به الخطب إلا هو للقصد مبصر

''عقل مند انسان وہ ہے جو مصیبت وآفت کی آمد سے پہلے اس کے دفاع کا سامان تیار رکھے''۔ اللہ پاک ہمیں رسومات وخرافات سے بچائے!

وما علينا إلا البلاغ!

۞......۞......۞

نکاح نعمت، طلاق ضرورت

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**ومن آیٰته أن خلق لکم من أنفسکم أزواجًا لتسکنوٓا إلیها وجعل بینکم مودة ورحمة**﴾. اوراسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اوراس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت وہمدردی پیدا کردی۔ (سورۃ الروم: ۲۱)

نکاح اللہ کی ایک نعمت ہے، جب یہ رشتہ قائم کیا جاتا ہےتو اس میں پائیداری ودوام مقصود ہوتا ہے، اس رشتے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ زوجین کواولاد کی نعمت سے نوازتا ہے، اوراللہ رب العزت کا یہ فیصلہ کہ دنیا تاقیامِ قیامت آباد رہے، پورا ہوتا ہے۔

”**فإنه لما حکم اللّٰه تعالی ببقاء العالم إلی یوم القیامة ومعلوم أنه لا یبقی ما لم یکن بینهم معاملة یتهیأ بها معاشهم من البیع والإجارة ونکاح مبقیًا لهذا الجنس بالتوالد**“. (نور الأنوار: ص/۱۷۸)

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ رب العزت نے بہت سی حکمتوں، مصلحتوں اور منفعتوں کے پیشِ نظر نکاح کو جائز قرار دیا، من جملہ ان مصالح وحِکَم کے ایک حکمت ومصلحت یہ ہے کہ اس روئے زمین پرنوعِ انسانی، اصلاحِ ارض اوراقامتِ شرائع کے لیے اس کی نائب بن کر قیامت تک باقی رہے، اور یہ مصلحتیں اسی وقت متحقق ہوسکتی ہیں جب کہ ان کی بنیاد مضبوط اور مستحکم ستونوں پر ہوں، اور وہ ہے نکاح۔

ویسے تو نسلِ انسانی کا وجود مردوعورت کے ملاپ سے ممکن تھا، خواہ وہ ملاپ کسی بھی طرح کا ہوتا، لیکن اس ملاپ سے جو نسل وجود میں آتی وہ اصلاحِ ارض اوراقامتِ شرائع کے لیے موزوں ومناسب نہ ہوتی، نسلِ صالح نکاح سے ہی وجود میں آسکتی ہے، کیوں کہ قاعدہ ہے :”فاسد سے فاسد اور باطل سے باطل وجود میں آتا ہے“۔ ”**ما بني علی فاسد أو**

باطل فهو فاسد وباطل ''. (موسوعة القواعد الفقهية: ۹/ ۴۳۹)

نکاح کے ذریعے انسان اولاد حاصل کرتا ہے، جب وہ ان کی تعلیم وتربیت کو بہتر طریقے سے انجام دیتا ہے، تو یہی اولاد اس کے لیے دنیوی زندگی میں آنکھوں کی ٹھنڈک، اور اس کے مرنے کے بعد ذکرِ حسن ہوا کرتی ہے، اولاد لطفِ روحانی (Soul enjoyment) اور رونقِ زندگانی (Gaity of life) ہے، اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ عزیز میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**المال والبنون زينة الحيوة الدنيا والبٰقيٰت الصّٰلحٰت خير عند ربك ثواباً وخيرٌ أملا**﴾. مال اور اولاد دنیوی زندگی کی ایک رونق ہیں، اور باقی رہ جانے والے اعمالِ صالحہ آپ کے پروردگار کے ہاں ثواب کے اعتبار سے بھی کہیں بہتر ہے، اور امید کے اعتبار سے بھی کہیں بہتر۔ (سورۃ الکہف: ۴۶)

انسان کی آنکھ بند ہونے کے بعد یہی اولاد اس کی نام لیوا ہوتی ہے، اور اس کے لیے دعائے خیر کرتی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے، مگر تین چیزوں سے اس کو برابر فائدہ پہنچتا رہتا ہے''، آپ ﷺ نے ان میں ایک نیک اولاد کو بھی ذکر فرمایا۔ **عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: '' إذا مات الإنسان انقطع عمله إلا من ثلاثة أشياء؛ من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له''.**

(سنن أبي داود: ۲/ ۳۹۸، صحيح مسلم: ۲/ ۴۱، كتاب الوصية)

نکاح مرد وعورت دونوں میں ملاپ کا بہترین ذریعہ ہے، اور یہی ملاپ عورت میں پائی جانے والی کمی کو پورا کرنے کا سبب بنتا ہے، کیوں کہ ہر کوئی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ عورت پیدائشی طور پر کمزور ہے، مرد جن اعمالِ شاقہ (Difficult workes) کا متحمل ہے عورت اس کا تحمل نہیں کرسکتی، عورت کو مرد کی ضرورت ہے،

تا کہ مرد کسبِ معاش میں اس کا معاون و مددگار، اور اس کی عزت و آبرو کا پاسبان ہو، ٹھیک اسی طرح مرد کو بھی عورت کی ضرورت ہے، تا کہ وہ اس کے مال کی حفاظت وصیانت اور اس کے امورِ خانہ داری کے فرائض کو انجام دے، اور متاعبِ حیات (Troublesome of life) کو اس سے دور کردے، اور مرد کی یہ ضرورت اسی وقت پوری ہوگی جب کہ وہ کسی عورت سے رشتۂ نکاح کو قائم کرے، اسی مقدس رشتے کو قرآنِ حکیم نے میثاقِ غلیظ سے تعبیر فرمایا: ﴿وأخذن منكم ميثاقاً غليظاً﴾. اور وہ (بیویاں) تم سے ایک مضبوط اقرار لے چکی ہیں۔ (سورۃ النساء:۲۱)

نکاح خاندانوں میں اتحاد وارتباط اور اسبابِ بغض وعداوت کے دور کرنے اور عفت و پاک دامنی کا بہترین ذریعہ ہے۔ (ردالمحتار:۴/ ۵۸)

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے:" يا معشر الشباب ! من استطاع منكم الباءة فليتزوج ؛ فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج ، ومن لم يستطع فعليه بالصوم، فإنه له وجاء " . اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں جو نکاح کی استطاعت رکھے اسے چاہیے کہ وہ نکاح کرلے، کیوں کہ اس سے نگاہیں نیچی رہتی ہیں اور شرم گاہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ (متفق عليه واللفظ لمسلم)

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لیے ہو، اس کو توڑنے اور ختم کرنے کی نوبت ہی نہ آئے، کیوں کہ اس معاملہ کے ٹوٹنے کا اثر صرف میاں بیوی پر ہی نہیں پڑتا، بلکہ نسل واولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بری طرح متأثر ہوتا ہے۔ اسی لیے شریعتِ اسلامیہ نے میاں بیوی کو وہ ہدایتیں دی، جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ رشتہ زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر بیوی کی طرف سے کوئی ایسی صورت پیش آئے جو شوہر کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو، تو شوہر کو حکم دیا گیا کہ وہ افہام وتفہیم اور زجر وتنبیہ سے کام لیں، اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے، تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرلیا جائے۔ ارشادِ خداوندی ہے:﴿وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها إن يريدآ إصلاحًا يوفق الله بينهما﴾ . اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو، تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کردو، اگر دونوں کی نیت اصلاحِ حال کی ہوگی، تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ (سورۃ النساء:۳۵) لیکن بعض اوقات میاں بیوی کے مزاج کا ہم آہنگ نہ ہونا، اور دونوں میں اس قدر بغض وعداوت ہوجانا کہ دونوں ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کرسکتے ہوں، اور اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام ہوچکی ہوں، اور تعلقِ نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے میاں بیوی کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہو، تو ایسی صورت میں اس ازدواجی تعلق کو ختم کرنا ہی طرفین کے لیے سامانِ راحت وسلامتی ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے طلاق کو مباح قرار دیا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محاسنِ طلاق میں یہ داخل ہے کہ شریعت نے طلاق کا اختیار صرف مرد کو دے رکھا ہے، کیوں کہ وہ عورت کے مقابلے میں کامل العقل ہوتا ہے، اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے عواقب ونتائج پر غور کرلیتا ہے، جب کہ عورت کی صفتِ عقل ودین میں نقصان ہوتا ہے، اور وہ خواہشات سے مغلوب ہوتی ہے۔ اور یہ بھی محاسنِ طلاق میں داخل ہے کہ آدمی کو دینی ودنیوی مکارِہ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ (ردالمحتار:۲/۴۲۹) لیکن اس خلاصی وچھٹکارے کے لیے اسی طریق وترتیب کو اپنانا ضروری ہے جو شریعت نے بتلائی ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا شرعاً حرام ہے۔

مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’شریعت نے معاہدۂ

نکاح کو توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ وہ نہیں رکھا، جو عام خرید وفروخت کے معاملات اور معاہدات کا ہے، کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا، تو اسی وقت اسی منٹ فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، اور ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کر لے، بلکہ معاملۂ نکاح کو بالکل قطع کرنے کے لیے اول تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی گئی''۔ (معارف القرآن:۱/ ۵۵۷)

طلاق کا شرعی طریقہ

(۱) طلاق کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی مدخولہ بیوی کو ایسے طہر کی حالت میں جس میں اس سے صحبت نہ کی ہو، ایک طلاقِ رجعی دے، یعنی یوں کہہ دے کہ'' میں نے تجھے ایک طلاقِ رجعی دی''، اور اس کو چھوڑ دے یعنی دوسری طلاق نہ دے، یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے، اس طلاق کو طلاقِ احسن کہتے ہیں، کیوں کہ اگر شوہر کو اپنے فعلِ طلاق پر ندامت ہو تو وہ تدارک پر قادر ہوگا، یعنی اگر عدت کے اندر رجوع کرنا چاہے تو رجوع کر سکتا ہے، اور اگر عدت گزر گئی اور دوبارہ نکاح کرنا چاہے، تو بلا حلالہ نکاحِ جدید کر سکتا ہے۔

طلاقِ رجعی میں عدت کے اندر رجوع کرنے کے لیے نہ تجدیدِ نکاح کی ضرورت ہے، نہ ہی عورت کی رضامندی ضروری ہے، نہ عدت میں ترکِ زینت کا حکم ہے، نہ میاں بیوی کو زمانۂ عدت میں علیحدہ رہنے کا حکم ہے، بلکہ زوج اور زوجہ کے لیے ایک گھر میں رہنا جائز ہے۔(غایۃ الأوطار:۲/ ۱۰۸)

(۲) اپنی مدخولہ بیوی کو ایسے تین طہر میں جس میں اس سے صحبت نہ کی ہو، ایک ایک کر کے تین طلاقیں دے دینا طلاقِ حسن ہے، کیوں کہ اس طرح طلاق دینے کی صورت میں اگر دو طلاقیں دینے کے بعد شوہر اپنے اس اِقدام پر نادم وشرم سار ہو، تو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔

(۳) ا/ مدخولہ بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دینا۔

۲/ ایسے طہر میں طلاق دینا جس میں عورت کے ساتھ صحبت کر چکا ہو۔

۳/ طلاقِ بائن دینا۔

۴/ ایک طہر میں ایک سے زائد (دو یا تین) طلاق دینا۔

۵/ غیر مدخولہ کو بیک وقت ایک سے زائد طلاق دینا۔

۶/ نابالغہ یا آئسہ (جس عورت کو حیض آنا بند ہو چکا ہو) کو ایک مہینے میں ایک سے زائد طلاق دینا، یہ سب طلاقِ بدعت ہے، اس طرح طلاق دینے سے آدمی گناہ گار ہوتا ہے، البتہ طلاق بہر صورت واقع ہو جاتی ہے۔

ایک غلط فہمی

عامۃً لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نکاح کے بندھن کو ختم کرنے کے لیے تین طلاق دینا ہی ضروری ہے، اور جب تک تین طلاقیں نہیں دی جائیں گی نکاح ختم نہیں ہوگا، اس کی وجہ احکامِ شرعیہ سے ناواقفیت ہے۔ایک طلاق دے کر بھی نکاح ختم کیا جا سکتا ہے (جس کا طریقہ اوپر گزر چکا)، نیز طلاق ضرورۃً مباح ہے، اور جو چیز ضرورۃً مباح ہوتی ہے وہ بقدرِ ضرورت ہی مباح ہوتی ہے، اور رضرورت ایک طلاق سے پوری ہو جاتی ہے، فقہ کا قاعدہ ہے:" **الضرورات تبيح المحظورات** ". " **وما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها** ". (الأشباه والنظائر: ۱/۳۰۷، ۳۰۸) ،اس لیے زائد طلاقیں دینے سے پرہیز کیا جائے، تاکہ گناہ لازم نہ آئے۔فقط

واللہ أعلم بالصواب

ایک مجلس کی تین طلاق اور تعددِ اَزواج

ایک مجلس کی تین طلاق، تین ہی واقع ہوتی ہیں!

(قرآن، حدیث، آثارِ صحابہ، اجماعِ امت اور مجلس ہیئتِ کبارِ علماء سعودیہ کا فیصلہ)

ایک مجلس میں دی گئیں تین طلاقیں تین ہی واقع ہوتی ہیں، وہ حضرات جو تین طلاق کو ایک ہی شمار کرتے ہیں، ان کا نظریہ سراسر غلط، گمراہ کن اور قرآن وحدیث، اجماعِ صحابہ، فقہاء، مشائخ اور ائمہ مسلمین، نیز سعودی عرب کے جید علماء کی نام زد ومنتخب تحقیقاتی کمیٹی کے متفقہ فیصلے کے خلاف ہے۔ چنانچہ درج ذیل سطور میں تین طلاق کا ثبوت قرآن وحدیث، آثارِ صحابہ واجماعِ امت اور مجلس ہیئتِ کبارِ علمائے سعودیہ کے حوالے سے پیش کیا جارہا ہے۔

تین طلاق کا ثبوت قرآنِ کریم سے: ﴿الطّلاق مرّتٰن﴾. ﴿فإن طلّقها فلا تحلُّ له من بعد حتّی تنكح زوجًا غيره﴾.

مفسرینِ عظام اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ بے حساب واَن گنت طلاقیں دیا کرتے تھے، اور کوئی یہ کرتا کہ طلاق دیتا اور جب عدت ختم ہونے کا وقت قریب آتا، تو ایذا رسانی کی نیت سے رجعت کرلیتا، پھر طلاق دیتا پھر رجعت کرتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ: ﴿الطلاق مرّتٰن﴾ نازل فرمائی، "مرتان" یہاں " اثنتان " کے معنی میں ہے، اسی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے نظمِ قرآن سے زیادہ مناسب اور سببِ نزول سے خوب

چسپاں بتایا ہے، یعنی طلاقِ رجعی دو ہیں، اس کے بعد رجعت کا حق نہیں، نیز اس آیت کا مقصد طلاقِ رجعی کی حد اور طلاقوں کی انتہائی تعداد بیان کرنا ہے، قطعِ نظر اس کے کہ یہ طلاق بلفظ واحد دی گئی ہو یا بالفاظِ مکررہ، ایک مجلس میں دی گئی ہو، یا مختلف مجلسوں میں، دو طلاقیں دی ہے تو دو ہی واقع ہوں گی، اسی طرح تین دی ہے تو تین ہی واقع ہوں گی۔ (۱)

تین طلاق کا ثبوت احادیث نبوی ﷺ سے:

محمود بن لبید سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کو خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیدی، تو آپ ﷺ غضب ناک ہوئے، اور ارشاد فرمایا: ''کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا ہے؟ حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں''، آپ ﷺ کا یہ غصہ دیکھ کر ایک صحابی کھڑے ہو گئے، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اسے قتل نہ کردوں؟ (۲)

حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ساتھ دی جانے والی تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اگر واقع نہ ہوتیں، تو آپ ﷺ غضب ناک نہ ہوتے، اور فرما دیتے کوئی حرج نہیں، رجوع کرلو۔

حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ کو حضور ﷺ کے سامنے تین طلاقیں دیدی، اور آپ ﷺ نے ان کو نافذ کردیا، یعنی تین کو ایک نہیں قرار دیا۔ (۳)

عامر شعبی کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس سے کہا کہ آپ اپنی طلاق کا قصہ بیان کیجئے، تو انہوں نے کہا: میرے شوہر یمن گئے ہوئے تھے، انہوں نے وہیں سے مجھے تین طلاقیں دیدیں، اور آپ ﷺ نے ان تینوں طلاقوں کے واقع ہوجانے کا فتویٰ صادر فرمایا۔ (۴)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار وفتاویٰ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا شخص لایا جاتا، جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوتی، تو آپ اس کو سزا دیتے، اور دونوں میں تفریق کر دیتے۔ (۵)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا فتویٰ:

معاویہ ابن یحی فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدی ہے، تو آپ نے جواب دیا: تیری بیوی تجھ سے تین طلاقوں سے جدا ہوگئی۔ (۶)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر وفتویٰ:

حضرت حبیب ابن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیدی ہے، تو آپ نے فرمایا: تین طلاقوں سے عورت تجھ سے بائنہ ہوگئی۔ (۷)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر وفتویٰ:

ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: ایک آدمی نے اپنی بیوی کو سو (۱۰۰) طلاقیں دیدی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان میں سے تین معتبر ہیں، اور بقیہ ستانوے (۹۷) غیر معتبر۔ (۸)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ:

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کسی

ایسے شخص کے متعلق سوال کیا جاتا، جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہو، تو آپ جواب دیا کرتے: اگر ایک بار یا دو بار طلاق دی ہوتی تو رجعت کرسکتا تھا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو اسی کا حکم دیا تھا، لیکن اگر تین طلاقیں دی ہے، تو وہ حرام ہوگئی، جب تک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے۔(۹)

اجماعِ صحابہ، فقہاء، مشائخ اور ائمۂ مسلمین سے تین طلاق کا ثبوت:

علامہ شامی رحمہ اللہ طلاقِ بدعی کے الفاظ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک کلمہ میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی واقع ہوں گی، اور یہ مذہب جمہور صحابہ، تابعین اور ان کے بعد تمام ائمۂ مسلمین کا ہے، اور یہی بات فتح القدیر اور دیگر کتبِ فقہیہ میں مذکور ہے۔(۱۰)

سعودی عرب کے جید علماء کی نامزد ومنتخب تحقیقاتی کمیٹی کا متفقہ فیصلہ:

”**مجلس هيئة كبار العلماء**“ کے سامنے ”**الطلاق الثلاث بلفظ واحد**“ یعنی ایک لفظ سے تین طلاق کا مسئلہ پیش ہوا، اس مسئلے کے متعلق مجلس کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں ایک ساتھ دی جانے والی تین طلاقوں کے؛ تین واقع ہونے، یا صرف ایک واقع ہونے کے دلائل پیش کیے گئے، پھر ان کا تجزیہ ومناقشہ کیا گیا، مسلسل چھ ماہ انتہائی محنت اور سیر حاصل بحث کرنے کے بعد کمیٹی کی اکثریت نے واضح الفاظ میں فیصلہ کردیا کہ ”ایک لفظ سے دی گئی تین طلاقیں بھی تین ہی ہیں۔“(۱۱)

تعددِ اَزواج

(کتاب وسنت ائمہ اربعہ اور جمہور مسلمین کے اجماع کی روشنی میں)

تعددِ اَزواج کا ثبوت قرآنِ کریم سے:

ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وإن خفتم ألا تقسطوا في اليتٰمى فانكحوا ما طاب لكم من النسآء مثنىٰ وثُلٰث ورُبٰع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة أو ما ملكت أيمانكم ذلك أدنىٰ ألا تعولوا○﴾. ''اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکو گے، تو (ان سے نکاح کرنے کے بجائے) دوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرلو، جو تمہیں پسند آئیں، دو دو سے، تین تین سے، اور چار چار سے۔ ہاں! اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان بیویوں) کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے، تو پھر ایک ہی بیوی پر اِکتفا کرو، یا ان کنیزوں پر جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ اس طریقے میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔'' (سورۂ نساء، آیت نمبر:۳) (۱۲)

تعددِ اَزواج کا ثبوت احادیث سے:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ غیلان بن اسلمہ ثقفی (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوئے، اُس وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، اور وہ بھی مسلمان ہوگئی تھیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ قرآنی کے مطابق ان کو حکم دیا، کہ ان دس میں سے چار کو منتخب کرلیں، باقی کو طلاق دے کر آزاد کردیں، غیلان بن اسلمہ ثقفی

نے حکم کے مطابق چار عورتیں رکھ کر باقی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ (۱۳)

امام ابن ابی شیبہ اور امام نحاس رحمہما اللہ نے قیس بن الحارث الاسدی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں جب مسلمان ہوا، تو میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں، میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو، باقی کو طلاق دے دو، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ (۱۴)

مشکوۃ شریف اور مسند امام شافعی میں نوفل بن معاویہ دیلمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ وہ جب مسلمان ہوئے، تو ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بھی ایک عورت کو طلاق کا حکم دیا، چنانچہ آپ نے چار کو اپنے نکاح میں باقی رکھا اور ایک کو طلاق دیدی۔ (۱۵)

تعددِ ازواج ائمہ اربعہ کے نزدیک:

ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک آزاد مرد کے لیے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے۔ (۱۶)

تعددِ ازواج جمہور مسلمین کے نزدیک:

اسی طرح جمہور مسلمین کے نزدیک بھی آزاد مرد کے لیے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے۔ (۱۷)

تعددِ ازواج کا ثبوت دیگر اقوامِ عالَم میں:

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی آیت ﴿فانکحوا ما طاب لکم من

النسآء مثنیٰ وثُلٰث ورُبٰع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة﴾ کا مطلب آسان انداز میں بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جاہلیت کے زمانے میں بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی، ایک شخص بیک وقت دس دس، بیس بیس عورتوں کو نکاح میں رکھ لیتا تھا۔ اس آیت نے اس کی زیادہ سے زیادہ حد چار تک مقرر فرمادی، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ انسان تمام بیویوں کے درمیان برابری کا سلوک کرے۔ اور اگر بے انصافی کا اندیشہ ہو، تو ایک ہی بیوی اکتفا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کو منع فرمادیا گیا ہے۔''(۱۸)

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی مایۂ ناز تفسیر ''معارف القرآن'' میں رقم طراز ہیں:

''ایک مرد کے لیے متعدد بیویاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی تقریبا دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا، عرب، ہندوستان، ایران، مصر، بابل وغیرہ ممالک کی ہر قوم میں کثرتِ ازواج کی رسم جاری تھی، اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا، دورِ حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعدُّدِ ازواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی، تو اس کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں کی صورت میں برآمد ہوا، بالآخر فطری قانون غالب آیا، اور اب وہاں کے اہلِ بصیرت حکماء خود اس کو رواج دینے کے حق میں ہیں۔ مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے، تعدد ازواج کی حمایت میں انجیل کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: ''ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں، بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی

ہے۔‘‘اسی طرح پادری نکسن اور جان ملٹن اور ایزک ٹیلر نے پُر زور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے۔اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعدد ازواج کو جائز رکھتی ہے، اور اس سے دس دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے اجازت معلوم ہوتی ہے۔کرشن جو ہندؤوں میں واجب التعظیم اَوتار مانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیبیاں تھیں۔

جو مذہب اور قانونِ عفت وعصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو، اور زنا کاری کا انسداد ضروری جانتا ہو،اس کے لیے کوئی چارہ نہیں کہ تعدد ازواج کی اجازت دے،اس میں زنا کاری کا بھی انسداد ہے، اور مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے،اس کا بھی علاج ہے،اگر اس اجازت نہ دی جائے،تو داشتہ اور پیشہ ور کسبی عورتوں کی افراط ہوگی، یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعدد ازواج پر تو پابندی ہے،مگر بطور دوستانہ جتنی بھی عورتوں سے مرد زنا کرتا ہے،اس کی پوری اجازت ہے،کیا تماشہ ہے کہ نکاح ممنوع اور زنا جائز۔غرض اسلام سے پہلے کثرتِ ازواج کی رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی، ممالک اور مذاہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی، نہ یہود ونصاریٰ نے، نہ ہندؤوں اور آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ رسم بغیر تحدید کے جاری رہی،لیکن اس غیر محدود کثرتِ ازدواج کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اول اول تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے،مگر پھر اُن کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے،اور یہ عورتیں اُن کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارتی تھیں، پھر جو عورتیں ایک شخص کے نکاح میں ہوتیں ان

میں عدل ومساوات کا کہیں نام ونشان نہ تھا، جس سے دل بستگی ہوئی اس کو نوازا گیا، جس سے رُخ پھر گیا اس کے کسی حق کی پرواہ نہیں۔

اسلام نے تعددِ ازواج پر ضروری پابندی لگائی اور عدل ومساوات کا قانون جاری کیا۔ قرآن نے عام معاشرے کے اس ظلمِ عظیم کو روکا، تعددِ ازواج پر پابندی لگائی اور چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا، اور جو عورتیں ایک ہی وقت میں نکاح کے اندر ہیں، ان میں مساواتِ حقوق کا نہایت مؤکد حکم اور اس کی خلاف ورزی پر وعید شدید سنائی، آیتِ مذکورہ میں ارشاد ہوا: ﴿**فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنیٰ وثُلٰث ورُبٰع**﴾، یعنی جو حلال عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر سکتے ہو، دو دو، تین تین، چار چار۔ اس آیت میں ایک طرف تو اس کی اجازت دی گئی کہ ایک سے زائد دو، تین، چار عورتیں نکاح میں جمع کر سکتے ہیں، دوسری طرف چار کے عدد تک پہنچا کر یہ پابندی بھی عائد کر دی کہ چار سے زائد عورتیں بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کی جا سکتیں۔ نیز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تعامل سے آیتِ قرآنی کی مراد بالکل واضح ہوگئی، کہ چار سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ (۱۹)

متعدد بیویوں میں مساوات اور عدل پر قدرت نہ ہو، تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کیا جائے، مذہبِ اسلام نے چار بیویوں تک کی اجازت دے کر فرمایا: ﴿**فإن خفتم أن لا تعدلوا فواحدة أو ما ملکت أیمانهم**﴾ . یعنی اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے، تو ایک ہی بیوی پر بس کرو، یا جو کنیز شرعی اصول کے مطابق تمہاری مِلک ہو اس سے گزارہ کر لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے، جب کہ شریعت کے مطابق سب بیویوں میں برابری کر سکے، اور سب کے حقوق کا لحاظ رکھ سکے، اگر اس پر قدرت نہ ہو، تو ایک ہی بیوی رکھی جائے، زمانۂ جاہلیت میں یہ ظلم عام تھا کہ ایک ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھ لیتا تھا، اور بیویوں کے حقوق میں مساوات اور عدل کا مطلق خیال نہ تھا، جس کی طرف زیادہ میلان ہو گیا اس کو ہر حیثیت سے نوازنے اور خوش رکھنے کی فکر میں لگ گئے، اور دوسری بیویوں کے حقوق نظرانداز کر ڈالتے، قرآن کریم نے صاف صاف فرمادیا کہ اگر عدل نہ کرسکو، تو ایک ہی بیوی رکھو، یا کنیز سے گزارہ کرلو۔ (یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مملوک کنیز جس کا ذکر آیت میں ہے اس کی خاص شرائط ہیں، جو عموماً آج کل مفقود ہیں، اس لیے اس زمانے میں کسی کو مملوک شرعی کنیز کہہ کر بے نکاح رکھ لینا حرام ہے۔) چنانچہ جب ایک سے زائد نکاح کا ارادہ کرو، تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لو، کہ سب کے حقوق عدل ومساوات کے ساتھ پورا کرنے کی قدرت بھی ہے یا نہیں، اگر یہ احتمال غالب ہو کہ عدل ومساوات قائم نہ رکھ سکو گے، تو ایک سے زائد نکاح پر اِقدام کرنا اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ میں مبتلا کرنے پر اِقدام ہے، اس سے باز رہنا چاہیے، اور اس حالت میں صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ (متعدد بیویوں میں عدل ومساوات قائم نہ رکھنے کی وجہ سے سخت گناہ تو ہوگا ہی، اور جس بیوی کی حق تلفی ہورہی ہو، وہ قاضی کی عدالت میں شوہر کے خلاف مقدمہ دائر کر کے اپنا حق وصول بھی کرسکتی ہے۔) کیوں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب بیویوں کے درمیان پوری مساوات وعدل کی سخت تاکید فرمائی ہے، اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعیدیں سنائی ہیں، اور خود اپنے

عمل کے ذریعے بھی اس کو واضح فرمایا ہے، بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان معاملات میں بھی مساوات فرماتے تھے، جن میں مساوات لازم نہیں۔ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جس شخص کے نکاح میں دو عورتیں ہوں اور وہ ان کے حقوق میں برابری اور انصاف نہ کر سکے، تو وہ قیامت میں اس طرح اُٹھایا جائے گا، کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔''(۲۰)

البتہ یہ مساوات ان اُمور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، مثلاً نفقہ میں برابری، شب باشی میں برابری، رہا وہ اَمر جو انسان کے اختیار میں نہیں، مثلاً قلب کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہوجائے، تو اس غیر اختیاری معاملے میں اس پر کوئی مواخَذہ نہیں، بشرطیکہ اس میلان کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: '' **اللّٰهم هذا قسمي فيما أملك فلا تلمني فيما تملك ولا أملك** '' . ''یا اللہ! یہ میری برابر والی تقسیم ہے، اُن چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضے میں ہے، میرے اختیار میں نہیں ہے، اس پر مجھ سے مؤاخذہ نہ کرنا۔''(۲۱)

ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسول معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی دوسرا کیسے قادر ہوسکتا ہے، اس لیے قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس غیر اختیاری معاملے کا ذکر اس طرح فرمایا: ﴿**ولن تستطیعوٓا ان تعدلوا بین النسآء**﴾ -''عورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کرسکو گے۔''

جس میں بتلا دیا کہ میلانِ قلب اور محبت ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، اس میں

برابری کرنا انسان کے بس میں نہیں، لیکن آگے اس غیر اختیاری معاملہ کی اصلاح کے لیے بھی ارشاد فرمایا: ﴿فلا تمیلوا کل المیل﴾ یعنی اگر کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو، تو اس میں تم معذور ہو، لیکن دوسری بیوی سے کلی بے اعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز نہیں، یہ وہی اُمور اختیاریہ کا عدل ہے کہ اس میں بے اعتدالی گناہِ عظیم ہے، اور جس شخص کو اس گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب:

بعض لوگ سورۂ نساء کی آیتِ مذکورہ اور اس آیت کو ملانے سے ایک عجیب مغالطے میں مبتلا ہو گئے، وہ یہ کہ آیتِ سورۂ نساء میں تو یہ حکم دیا گیا کہ اگر عدل ومساوات قائم نہ رکھنے کا خطرہ ہو، تو پھر ایک ہی نکاح پر بس کرو، اور اس دوسری آیت میں قطعی طور پر یہ واضح کر دیا کہ عدل ومساوات ہو ہی نہیں سکتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سے زائد نکاح مطلقاً جائز نہ رہے، لیکن ان کو سوچنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا مقصود ان تمام آیات میں ایک سے زائد نکاح کو روکنا ہی ہوتا، تو بھی اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ ﴿فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنی وثلٰث وربع﴾، یعنی نکاح کرو جو پسند آئیں تم کو عورتیں، دودو، تین تین، چار چار۔ اور پھر اس ارشاد کے کیا معنی کہ ﴿فان خفتم ان لا تعدلوا﴾، یعنی اگر تمہیں بے انصافی کا خطرہ ہو۔ کیوں کہ اس صورت میں تو بے انصافی یقینی ہے، پھر خطرہ ہونے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی اور قولی بیان اور مسلسل تعامل بھی اس پر شاہد ہے کہ ایک سے زائد نکاح کو

کسی وقت اسلام میں نہیں روکا گیا، بات وہی ہے جو اوپر بیان ہوچکی ہے کہ سورۂ نساء کی پہلی آیت میں امورِاختیاریہ کے عدل ومساوات کا ذکر ہے، اور دوسری آیت میں محبت اور قلبی میلان میں عدمِ مساوات پر قدرت نہ ہونے کا بیان ہے، اس لیے دونوں آیتوں میں نہ کوئی تعارض ہے، اور نہ ان آیات میں مطلقا تعددِازواج کی ممانعت کی کوئی دلیل ہے۔ (۲۳)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ: ایک مجلس میں تین طلاقیں خواہ ایک ساتھ دی گئی ہوں، یا علیحدہ علیحدہ بہرحال تین ہی واقع ہوتی ہیں، یہ حکم کتاب وسنت، اجماعِ امت اور قیاس؛ چاروں دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہے، یہی چاروں اماموں؛ امام اعظم ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی امام احمد بن حنبل اور جمہور فقہاء ومحدثین کا مسلک ہے۔اسی طرح جو شخص بیویوں کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھ سکتا ہے، اس کے لیے متعدد (چار) بیویاں رکھنا جائز ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا تین واقع ہونا، اور مرد کے لیے کئی (بیک وقت چار) بیویاں رکھنے کا جائز ہونا، یہ دونوں ایسے حکم شرعی ہیں کہ وہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں، اور کتاب وسنت ہم مسلمانوں کی شریعت کا سرچشمہ ہیں، اس سے ثابت احکام میں قیامت تک کسی قسم کی تبدیلی جائز ورَوا نہیں ہے، اور نہ ہی کسی فرد، ادارہ، حکومت وعدالت کو شریعت نے اس کا حق دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جب دستورِ ہند ترتیب دیا گیا، تو ہمارے بزرگوں نے مسلمانوں کے لیے کتاب وسنت پر عمل کی آزادی کو ان کا دستوری حق تسلیم کروایا۔لیکن موجودہ حکومت، سماجی اصلاحات، عورتوں کی ہم دردی وہم نوائی، عزت وحمایت اور ہر شہری کے بنیادی حقوق کا سہارا

لے کر اسے ختم کرنے کی مذموم ومسموم کوشش میں لگی ہوئی ہے، جو درحقیقت یکسا سول کوڈ کی راہ کو ہموار کرنا ہے، تاکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے یکسا قانون کا نفاذ ہوجائے، اور مسلمان اپنے دین وشریعت پر عمل نہ کرسکیں، اور ہندو تہذیب وثقافت میں ضم ہوکر اپنے اسلامی تشخص وامتیاز سے محروم ہوجائیں، حکومتِ وقت کی یہ کوشش ملک میں موجود اقلیتوں کو اُن کے دستوری حقوق سے محروم کردینے کے ایک طویل ناجائز وناپاک منصوبے کا حصہ ہے، جسے عملی جامہ پہنانے میں وہ بے چین وبے قرار ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے تین طلاقوں اور تعددِ ازواج کے خلاف ملک کی عدالتِ عالیہ میں اپنا حلف نامہ داخل کیا ہے، اور عدالتِ عالیہ کے لاءکمیشن نے اسی کی ہدایت پر ایک سوال نامہ جاری کرکے مسلمانوں سے اس سلسلے میں اُن کی رائے طلب کی ہے، کہ وہ ان دونوں اسلامی قوانین کے موافق ہیں یا مخالف؟!...... اِن نازک حالات میں ہم مسلمانوں کے کتاب وسنت پر ایمان، اور اللہ واُس کے رسول سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بیک آواز وباتفاقِ رائے، عدالتِ عالیہ کو یہ باور کرائیں کہ کتاب وسنت اور اس سے ثابت احکام پر ہمارا ایمان ویقین ہے، اور اُس پر عمل کرنا ہمارا دستوری حق ہے۔ لہٰذا! ہم اِن قوانینِ اسلام میں مُداخلت، اور دستوری حق کو چھیننے کی کسی بھی کوشش کو، کسی صورت میں اور کسی قیمت پر برداشت نہیں کریں گے۔

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿الطلاق مرّتٰن﴾ . (سورة البقرة : ۲۲۹)

ما في " روح المعاني " : عن عروة قال : كان الرجل إذا طلق امرأته ثم ارتجعها قبل أن تقضي عدتها كان ذلک له ، وإن طلقها ألف مرة ، فعمد رجل إلى امرأته فطلقها حتى إذا ما شارفت انقضاء عدتها ارتجعها ثم طلقها ، ثم قال : والله لا آويک إليّ ولا تخلينّ أبدًا ، فأنزل الله تعالى الآية .=

....

=(۲۰۴/۲)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : روي عن ابن عباس وغيره أنهم كانوا يطلقون ما شاء وا من العدد ثم يراجعون ، فقصروا على الثلاث ونسخ به ما زاد ، ففي هذه الآية دلالة على حكم العدد المسنون من الطلاق . (۱/ ۴۵۹)

ما في " روح المعاني " : يدل على أن معنى (مرتان) اثنتان ...... ولعله أليق بالنظم ، ...... وأوفق بسبب النزول . (۲/ ۲۰۴)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : ﴿الطلاق مرتان﴾ منتظم لجميع الطلاق المسنون ، فلا يبقى شيء من مسنون الطلاق إلا وقد انطوى تحت هذا اللفظ ، فإذا ما خرج عنه فهو على خلاف السنة ، فثبت بذلك أن من جمع اثنتين أو ثلاثاً في كلمة فهو مطلق لغير السنة . (۱/ ۴۵۹)

ما في " التفسير المظهري " : ﴿فإن طلقها فلا تحل له من بعد﴾ لأن قوله تعالى : ﴿الطلاق﴾ على هذا التأويل يشتمل الطلقات الثلاث أيضًا ، وعلى كلا التأويلين يظهر أن جمع التطليقتين ، أو ثلاث تطليقات بلفظ واحد ، أو بألفاظ مختلفة في طهر واحد حرام بدعة مؤثم ، خلافاً للشافعي، فإنه يقول : لا بأس به ، لكنهم أجمعوا على أنه من قال لإمرأته : أنت طالق ثلاثاً ، يقع ثلاثاً بالإجماع . (۱/ ۳۳۴)

(۲) ما في " سنن النسائي " : عن محمود بن لبيد قال : أخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعاً ، فقام غضباناً ثم قال : " أيلعب بكتاب الله وأنا بين أظهركم ؟ " . حتى قام رجل وقال : يا رسول الله ! ألا أقتله ؟ . (۲/ ۸۲ ، كتاب الطلاق)

(۳) ما في " سنن أبي داود " : عن ابن شهاب ، عن سهل بن سعد في هذا الخبر قال : " فطلقها ثلاث تطليقاتٍ عند رسول الله ﷺ فأنفذه رسول الله (ﷺ) " . (ص/ ۳۰۶)

(۴) ما في" سنن ابن ماجة " : عن عامر الشعبي قال : قلت لفاطمة بنت قيس : " حدثيني عن طلاقك ، قالت : طلقني زوجي ثلاثاً ، وهو خارج إلى اليمن ، فأجاز ذلك رسول الله ﷺ " .

(ص/ ۱۴۵)

(۵) ما في " المصنف لإبن أبي شيبة " : عن أنس : " كان عمر إذا أتي برجل قد طلّق امرأته ثلاثاً في مجلس، أوجعه ضرباً وفرّق بينهما " . (۹/ ۵۱۹ ، من كره أن يطلق الرجل امرأته ثلاثاً)

(۶) ما في " هامش المصنف لعبد الرزاق " : عن معاوية بن يحي قال : جاء رجل إلى عثمان بن عفان ، فقال : طلقت امرأتي ألفاً ، فقال : " بانت منك بثلاث " . (۶/ ۳۹۴ ، باب المطلق ثلاثا)

(۷) ما في " المصنف لإبن أبي شيبة " : عن حبيب ، عن رجل من أهل مكة قال : جاء رجل=

....

= إلى علي فقال : إني طلقت امرأتي ألفاً ، قال : " الثلاث تحرمها عليك ، واقسم سائرهنّ بين أهلك " . (۵۲۳/۹)

(۸) ما في " المصنف لعبد الرزاق " : أن رجلاً قال لإبن عباس : رجل طلّق امرأته مأة ، فقال ابن عباس : " يأخذ من ذلك ثلاثاً ، ويدع سبعاً وتسعين " . (۳۹۶/٦ ، باب المطلق ثلاثاً)

(۹) ما في " صحيح البخاري " : عن نافع : كان ابن عمر إذا سئل عمن طلق ثلاثاً ، قال : " لو طلقت مرة أو مرتين ، فإن النبي ﷺ أمرني بهذا (المراجعة) ، فإن طلّقها ثلاثاً حرمت ، حتى تنكح زوجاً غيره " . (۷۹۲/۲ ، كتاب الطلاق)

(۱۰) ما في " رد المحتار " : (والبدعي ثلاث متفرقة) ، وكذا بكلمة واحدة بالأولى .... قال : إن الناس قد استعجلوا في أمر كان أناة ، فلو أمضيناه عليهم ، فأمضاه عليهم ، وذهب جمهور الصحابة والتابعين ، ومن بعدهم من أئمة المسلمين إلى أنه يقع ثلاث .

(۳۲۰/۴ ، كتاب الطلاق ، كذا في فتح القدير : ۳/ ۴۵۱، كتاب الطلاق)

ما في " بدائع الصنائع " : أما الألفاظ التي يقع بها طلاق البدعة فنحو أن يقول : أنت طالق طلاق الشيطان ، فإن نوى ثلاثاً فهو ثلاث .... أما حكم طلاق البدعة فهو أنه وقع عند عامة العلماء .

(۱۵۳/۳ ، كتاب الطلاق ، حكم طلاق البدعة)

ما في " الموسوعة الفقهية " : البدعي أن يطلّقها مرتين أو ثلاثاً في طهر واحد معاً أو متفرقاً .

(۳۴/۲۹)

وفيه أيضًا : اتفق جمهور الفقهاء على وقوع الطلاق البدعي ، مع اتفاقهم على وقوع الإثم فيه على المطلق لمخالفته السنة المتقدمة .(۳۵/۲۹ ، طلاق)

(۱۱) ما في " مجلة البحوث الإسلامية " : بعد الاطلاع على البحث المقدم من الأمانة العامة لهيئة كبار العلماء ، والمعدّ من قبل اللجنة الدائمة للبحوث والإفتاء في موضوع : " الطلاق الثلاث بلفظ واحد " وبعد دراسة المسألة وتداول الرأي واستعراض الأقوال التي قبلت فيها، ومناقشة ما على كل قول من إيراد توصل المجلس بأكثريته إلى اختيار القول بوقوع الطلاق الثلاث بلفظ واحد ثلاثا .

(بحوالہ خیر الفتاوی:۵/ ۶۴۹، محقق ومدلل جدید مسائل:۲/ ۲۳۱-۲۳۶، کتاب الطلاق، مسئلہ نمبر:۱۸۵، طبع اول)

(۱۲) ما في " القرآن الكريم " : ﴿وإن خفتم ألا تقسطوا في اليتٰمى فانكحوا ما طاب لكم من النسآء مثنىٰ وثُلٰث ورُبٰع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة أو ما ملكت أيمانكم ذلك أدنىٰٓ ألا تعولوا۝﴾ . (سورة النساء :۳)=

....

=مـا فـي " الـموسوعة الفقهية " : تعدد الزوجات إلى أربع مشروع ورد به القرآن الكريم في قوله تعالى : ﴿فانكحوا ما طاب لكم من النسآء مثنیٰ وثُلٰث ورُبٰع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة أو ما ملكت أيمانكم﴾ . اهـ . (۱۲/۲۳۲ ، تعدد ، تعدد الزوجات)

(۱۳) ما في " الدر المنثور في التفسير المأثور " : أخرج الشافعي وابن أبي شيبة وأحمد والترمذي وابـن مـاجة والنحاس في ناسخه والدار قطني والبيهقي عن ابن عمر ، أن غيلان بن سلمة الثقفي أسلم وتحته عشر نسوة فقال له النبي ﷺ : " اختر منهن – وفي لفظ – أمسک أربعًا وفارق سائرهن " .

(۲/۲۱۰ ، سـورة الـنسـاء/ الآية :۳ ، مشـكـوة الـمصـابيح :ص/۲۷۴، كتـاب النكـاح ، بـاب المحرمات ، الفصل الثاني ، ط: قديمي)

مـا فـي " تـفسير المظهري " : وأيضًا عدم جواز ما فوق الأربع من النساء ثبت بحديث ابن عمر أن غيـلان بن سلمة الثقفي أسلم ، وله عشر نسوة في الجاهلية فأسلمن معه فقال النبي ﷺ : " أمسک أربعًا وفارق سائرهن " رواه الشافعي وأحمد والترمذي وابن ماجه .

(۲/۲۱۸، سورة النساء ، الآية/۳)

(۱۴) مـا فـي " الـدر الـمنثور في التفسير المأثور " : وأخرج ابن أبي شيبة والنحاس في ناسخه عن قيـس بـن الـحـارث قـال : أسـلـمت وكان تحتي ثمان نسوة فأتيت رسول اللّٰه ﷺ فأخبرته ، فقال : "اختر منهن أربعًا وخل سائرهن ، ففعلت " .

(۲/۲۱۰ ، سورة النساء/ الآية :۳ ، سنن أبي داود :ص/۳۰۴)

مـا فـي " تـفسيـر المظهري " : .... ان الآية نزلت في قيس بن الحارث ، قال البغوي : روي أن قيـس بـن الحارث كانت تحته ثماني نسوة فلما نزلت هذه الآية قال له رسول اللّٰه ﷺ: " طلق أربعًا وأمسک أربعًا " قال : فجعلت أقول للمرأة التي لم تلد مني يا فلانة أدبري ، والتي قد ولدت أقبلي .

(۲/۲۱۷ ، سورة النساء ، الآية/۳)

(۱۵) مـا فـي " مشـكـوة المصابيح " : وعن نوفل بن معاوية قال : " أسلمت وتحتي خمس نسوة فسـألـت الـنبـي ﷺ فقال : فارق واحدة وأمسک أربعًا فعمدت إلى أقدمهن صحبة عندي عاقر منذ ستين سنة ففارقتها " . رواه في شرح السنة .

(ص/۲۷۴ ، كتاب النكاح ، باب المحرمات، الفصل الثاني ، ط : قديمي)

مـا فـي " تـفسير المظهري " : وحديث نوفل بن معاوية قال : أسلمت وتحتي خمس نسوة فسألت النبي ﷺ فقال : "فارق واحدة وأمسک أربعًا " فعمدت إلى أقدمهن صحبة عندي عاقر منذ=

....

= ستين سنة ففارقتها " . رواه الشافعي والبغوي في شرح السنة . وعلى حصر الحل في أربع انعقد الإجماع . (۲/۲۱۸، سورة النساء، الآية/۳)

(۱۶-۱۷) ما في " تفسير المظهري " : (مسألة) لا يجوز أن يتزوج ما فوق الأربعة من النساء عند الأئمة الأربعة وجمهور المسلمين . (۲/۲۱۷ ، سورة النساء ، الآية/۳)

(۱۸)(توضیح القرآن:ص/۱۸۴،۱۸۵)

(۱۹)(ملخص از معارف القرآن شفیعی:۲/۲۸۶-۲۸۹)

(۲۰) ما في " مشكوة المصابيح " : وعن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال : " إذا كانت عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط " . رواه الترمذي وأبو داود والنسائي وابن ماجة والدارمي . (ص/۲۷۹ ، كتاب النكاح ، باب القسم ، الفصل الأول ، ط : قديمي)

(۲۱) ما في " مشكوة المصابيح " : عن عائشة أن النبي ﷺ كان يُقسم بين نسائه فيعدل ويقول : " اللّٰهم هذا قسمي فيما أملك فلا تلمني فيما تملك ولا أملك " . رواه الترمذي وأبو داود والنسائي وابن ماجة والدارمي . (ص/۲۷۹ ، كتاب النكاح ، باب القسم ، الفصل الثاني ، سنن أبي داود:۲/۲۰۱، سنن النسائي :۷/۶۴ ، ط : التجارية الكبرى ، جامع الترمذي :۳/۴۳۸)

(۲۲) ما في " تفسير المظهري " : ﴿فإن خفتم﴾ .... (مسألة) تعليق الاختصار على الواحدة أو التسري بخوف الجور يدل على أنه عند القدرة على أداء حقوق الزوجات والعدل بينهم الأفضل الإكثار في النكاح . (۲/۲۱۹)

ما في " أحكام القرآن للجصاص " : وأما قوله تعالى : ﴿مثنى وثلاث وربٰع﴾ ، فإنه إباحة للثنتين إن شاء ، وللثلاث إن شاء ، وللرباع إن شاء ، على أنه مخير في أن يجمع في هذه الأعداد من شاء ، قال : فإن خاف أن لا يعدل اقتصر من الأربع على الثلاث ، فإن خاف أن لا يعدل اقتصر من الثلاث على الاثنتين ، فإن خاف أن لا يعدل بينهما اقتصر على الواحدة . ... فأفاد ذكر " الواو " إباحة الأربع لكل أحد ممن دخل في الخطاب . ... فجميع ما أباحته الآية من العدد أربع لا زيادة عليها .

(۲/۶۹، سورة النساء ، تزويج الصغار)

ما في " الموسوعة الفقهية " : ويرى الحنفية إباحة تعدد الزوجات إلى أربع إذا أمن عدم الجور بينهنّ فإن لم يأمن اقتصر على ما يمكنه العدل بينهن ، فإن لم يأمن اقتصر على واحدة لقوله تعالى : ﴿فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة﴾ . (۴۱/۲۲۰ ، نكاح)

ما في " الموسوعة الفقهية " : من معاني العدل في اللغة : القصد في الأمور والاستقامة وهو =

....

....

....

....

....

=خلاف الجور ...... وفي الاصطلاح : التسوية بين الزوجات في حقوقهنّ من القسم والنفقة والكسوة . والقسم بين الزوجات أثر من آثار العدل ولوازمه .

(۱۸۲/۳۳، ۱۸۳، قسم بين الزوجات)

ما في " الموسوعة الفقهية " : وقد اتفق الفقهاء على أنه يجب على الرجل إن كان له أكثر من زوجة أن يعدل في القسم بين زوجاته ، وأن يسوي بينهنّ فيه ؛ لأن ذلک من المعاشرة بالمعروف التي أمر اللّٰه عز وجل بها في قوله سبحانه وتعالى : ﴿وعاشروهنّ بالمعروف﴾ . اهـ .

ذهب الفقهاء إلى أنه يجب ....

على الزوج العدل بين زوجتيه أو زوجاته في حقوقهن من القسم والنفقة والكسوة والسكنى ، وهو التسوية بينهن في ذلک ، والأصل فيه قول اللّٰه تعالى : ﴿فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة﴾ عقيب قوله تعالى : ﴿فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنى وثلث وربع﴾ ، ندب اللّٰه تعالى إلى نكاح الواحدة عند خوف ترک العدل في الزيادة، وإنما يخاف على ترک الواجب ، فدل على أن العدل بينهن في القسم والنفقة واجب ، وإليه أشار في آخر الآية بقوله عز وجل : ﴿ذلک أدنى ألا تعولوا﴾ ، أي : تجوروا ، والجور حرام ، فكان العدل واجبا ضرورة ؛ ولأن العدل مأمور به في قوله تعالى : ﴿إن اللّٰه يأمر بالعدل والاحسان﴾ على العموم والإطلاق إلا ما خص أو قيد بدليل ؛ ولأن النساء رعية الزوج ، فإنه يحفظهن وينفق عليهن ، وكل راع مأمور بالعدل في رعيته .

(۱۸۳/۳۳، ۱۸۳، ۱۸۵، قسم بين الزوجات ، الحكم التكليفي ، ما يتحقق به العدل في القسم ، بدائع الصنائع : ۳۳۲/۲ ، ط : المكتبة العلمية بيروت)

(۲۳) (معارف القرآن:۲/۲۹۳-۲۹۶)

اپنی سودی رقم اپنے اصول وفروع اور عزیز واقارب کو نہ دیں!

سود کی حرمت نصِ قطعی سے ثابت ہے، نیز اس میں مشغول ہونے والوں کو کتاب وسنت میں بڑی سخت وعیدیں سنا کر اس سے روک دیا گیا ہے، حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، سود دینے والے پر، اس کا حساب کتاب کرنے والے پر اور اس کے شاہد پر لعنت فرمائی ہے، وہ سب لوگ گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔'' (مسلم شریف: ۹/۲)

نیز شریعتِ اسلامی نے جہاں نیک کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے، وہیں برے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، ارشادِ ربانی ہے: ''ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقویٰ میں کرتے رہو، اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔'' (سورۂ مائدہ: آیت نمبر: ۲)

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہائے کرام بینکوں میں روپیہ پیسہ رکھنے سے منع کرتے ہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے سودی کاروبار میں مدد کے علاوہ سودی لعنت میں ملوث ہونے کا خطرہ ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ: ص/۴۳۱)

لیکن اگر کسی شخص نے جہالت ونادانی یا قانونی مجبوری یا دیگر کسی اور مجبوری کی وجہ سے بینک میں روپیہ رکھا، تو اس پر اس کو سود ملتا ہے، اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سودی رقم بینک سے وصول کی جائے یا نہیں؟ کیوں کہ اگر یہ رقم وہاں سے نہیں لی گئی تو یہ رقم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوگی، اور اس میں ایک طرح کا

اسلام مخالف علاقوں کا تعاون لازم آتا ہے، اس لیے حضرات فقہائے کرام نے فقہی قاعدہ: ''جو شخص دو بلاؤں میں گرفتار ہوا سے چاہیے کہ کم ضرر والی بلا کو اختیار کرے'' کے تحت یہ حکم فرمایا کہ سودی رقم بینک سے لی جائے، لیکن ہے تو یہ مالِ حرام، اور مالِ حرام پر قبضہ کرنے سے، قبضہ کرنے والا اس کا مالک نہیں بنتا، بلکہ اس کا جو اصل مالک ہے وہی اس کا مالک رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر اصل مالک معلوم ہو تو مال حرام اس کو واپس کرنا ضروری ہے، اگر وہ نہ ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹانا لازم ہے، اور اگر اصل مالک یا اس کے ورثاء کو لوٹانا مشکل ہو، (جیسے بینکنگ کا موجودہ نظام، اس میں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ڈپازٹر Depositer کی رقم کس شخص کو سودی قرض میں دے کر اس سے یہ سود حاصل کیا گیا، کہ اسے یہ سودی رقم لوٹائی جاسکے)، تو اس صورت میں یہ سودی رقم اصل مالکوں کی طرف سے غرباء اور محتاجوں کو صدقہ کر دینا واجب ہے، جب کہ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ یہ سودی رقم رفاہِ عام کے کاموں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے، جیسا کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمینار کی اس تجویز سے معلوم ہوتا ہے:

''اکثر شرکائے سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقاتِ واجبہ کے علاوہ رفاہِ عام پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہیے۔''

(دوسرا فقہی سمینار [دہلی]، بتاریخ: ۸-۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ مطابق: ۸-۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء)

اب وہ حضرات علمائے کرام جن کے نزدیک اس رقم کا صدقہ کرنا ہی واجب ہے، اور رفاہی کاموں میں اس کا استعمال درست نہیں، وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ سودی رقم مستحقین زکوۃ کو دینا ضروری ہے۔ اور آدمی کا اپنے اصول وفروع؛ یعنی باپ، دادا، دادی، ماں، نانا، نانی، خواہ وہ کتنے ہی اوپر کے درجہ کے ہوں، اور اپنی اولاد اور اولاد کی

اولاد، خواہ کتنے ہی نچلے درجہ کے ہوں- کو زکوۃ دینا درست نہیں، تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُن کے نزدیک بینک سے ملی ہوئی اپنی سودی رقم اپنے مستحق ومحتاج اصول وفروع کو دینا بھی جائز نہیں ہوگا؟

اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اپنے اصول وفروع کو زکوۃ دینا کیوں منع کیا گیا؟ اس کی علت اور وجہ کیا ہے؟ تو اس بابت امام فخر الدین عثمان بن علی زیلعی حنفی رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ:

''اصول وفروع کے درمیان منافع میں ایک طرح کا اتصال ہوتا ہے، کہ وہ عادۃً ایک دوسرے کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جس کی وجہ سے تملیک کا تحقُّق پوری طرح نہیں ہو پاتا۔'' (تبیین الحقائق: ۱۲۲/۲، کتاب الزکاۃ) جب کہ زکوۃ میں تملیک (مالک بنانا) ادائے زکوۃ کی صحت کا رکن ہے، اس لیے اپنے اصول وفروع کو زکوۃ دینا درست نہیں۔

علامہ زیلعی رحمہ اللہ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ اصول وفروع کو زکوۃ دینا اس لیے منع ہے کہ اس میں پوری طرح سے تملیک نہیں پائی جاتی۔

اب آیئے اصل مدعا پر، یعنی بینک سے ملی ہوئی اپنی سودی رقم اپنے مستحق ومحتاج اصول وفروع کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں بندے کا اپنا رجحان یہ ہے کہ: ''یہ جائز ہے'' کیوں کہ بینک سے جو رقم بطور سود ملتی ہے، آدمی اُس کا مالک نہیں ہوتا، اور نہ اس کا اصل مالک معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُسے لوٹائی جا سکے، تو یہ رقم لقطہ کے حکم میں ہوگئی، جسے اس کے اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے، نہ کہ سودی رقم حاصل کرنے والے کی طرف سے، اور یہاں تملیک اصل مالک کی طرف سے ہو رہی ہے،

نہ کہ سودی رقم حاصل کرنے والے کی طرف سے، اس لحاظ سے اپنے اصول وفروع کو زکوۃ دینے کی جوعلتِ ممانعت تھی، وہ یہاں نہیں پائی جاتی، اور جب علت نہیں پائی گئی تو اس کا حکم یعنی عدم جواز بھی ثابت نہ ہوگا، اور آدمی کے لیے بینک سے حاصل شدہ اپنی سودی رقم اپنے اصول وفروع کو دینا جائز ہوگا۔

بندے کے اِس نقطۂ نظر کی تائید مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحریر سے ہوتی ہے، آپ فرماتے ہیں:

''مالِ حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مالِ حرام نہیں، بلکہ صرف وہ مالِ حرام ہے جس کے مالک نامعلوم یا لا پتہ ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جاسکتا، نیز یہ کہ یہ مال ایسی صورت میں بحکم لقطہ ہوجاتا ہے اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے، اس لیے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لیے یہ حرام نہیں، اور اسی بنا پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر بھی کرسکتا ہے، کیوں کہ اس کا صدقہ نہیں، بلکہ اصل مالک کا ہے، کما فی عبارۃ الہندیۃ۔''

(جواہر الفقہ: ۲۸۲/۳، مکتبہ تفسیر القرآن جامع مسجد دیوبند)

'' وسئل يوسف بن محمد عن غاصب ندم على ما فعل وأراد أن يردّ المال إلى صاحبه وقع له اليأس عن وجود صاحبه فتصدق بهذا العين ، هل يجوز للفقير أن ينتفع بهذا العين ؟ فقال لا يجوز أن يقبله ولا يجوز له الانتفاع وإنما يجب عليه ردّه إلى من دفعه إليه ، قال رضي الله عنه انما أجاب بهذا الجواب زجرًا لهم كيلا يتساهلوا في أموال الناس ، أما لو سلك الطريق في معرفة المالک فلم يجده فحكمه حكم اللقطة .... كذا في التتارخانية '' .

(هنديه :۱۵۷/۵ ، كتاب الغصب ، الباب الرابع عشر في المتفرقات ، مكتبه زكريا ديوبند)

لیکن ہوسکتا ہے کہ صورتِ مذکورہ کے اِس اصل جواب سے لوگ اپنی سودی رقم اپنے

اُن اصول وفروع کو بھی دینا شروع کردیں جو خود اُن کی اپنی کفالت میں ہیں، اوراس طرح خود اپنی سودی رقم سے فائدہ اٹھانے لگ جائیں، اورسود کے استعمال کا دروازہ کھل جائے، اس لیے ''سدً اللذرائع'' احتیاط اسی میں ہے کہ اپنی سودی رقم اپنے اصول وفروع (ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، بیٹا، بیٹی وغیرہ) اورعزیز واقارب کو بھی نہ دیں۔ اوراس نقطۂ نظر کی تائید بھی حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی شہید رحمہ اللہ کی کتاب ''آپ کے مسائل اوران کا حل'' میں موجود اس سلسلے میں ایک سوال وجواب سے ہوتی ہے:

''**سوال:** کسی مجبوری کی بنا پر میں نے سود کی کچھ رقم وصول کرلی ہے، اس کا مصرف بتادیں، آیا میں وہ رقم اپنی غریب رشتہ داروں (مثلاً نانی) کو بھی دے سکتا ہوں؟

جواب: اپنے عزیز واقارب کے بجائے کسی اجنبی کو، جو غریب ہو، بغیر نیت صدقہ کے دیدی جائے۔'' (۷/۳۴۰، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

خلاصۂ کلام یہ کہ بینک سے حاصل شدہ اپنی سودی رقم اپنے اصول وفروع اورعزیز واقارب کو دینا جائز تو ہے، مگر احتیاط اسی میں ہے کہ نہ دیں۔ فقط

هذا ما ظهر لي والله أعلم بالصواب!

عقدِ اجارہ (Wage contract)
اور مالک اور مزدور کے جھگڑوں کا سبب

تاجر، صنعت کار اور زمین دار کو مزدور کی، اور مزدور کو روزگار کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان دونوں کی ضرورت روزگار فراہم کرتی ہے، اور یہ خدائی نظام ہے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: ﴿**نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحيوة الدنيا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجٰت ليتخذ بعضهم بعضًا سُخريًّا**﴾. دنیوی زندگی میں ہم نے ان کی روزی تقسیم کر رکھی ہے، اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے، تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔ (سورۃ الزخرف:۳۲)

انسانی ضرورتوں کا ایک دوسرے سے مربوط ہونا ہی عقدِ اجارہ کے جائز ہونے کی بنیاد ہے، جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے: "**حاجة الناس أصل في شرع العقود**". (لوگوں کی حاجت معاملات کے جواز کی بنیاد ہے)۔ (المبسوط للسرخسي: ۱۵/۷۵)

کسی زمانے میں مزدور کو مظلوم تصور کیا جاتا تھا، کیوں کہ وہ کمزور اور ضرورت مند تھا، اس لیے اس کے حقوق کا استحصال کیا جاتا تھا، مگر انقلابِ روس کے بعد یہ صورتِ حال یکسر بدل گئی، اور عالمی پیمانہ پر مزدوروں نے اپنی اپنی تنظیمیں اور یونینس بنالیں، اور اس اجتماعی طاقت کے بل بوتے انہوں نے سرمایہ داروں، مل مالکوں کے ناک میں دم کر دیا، اور بسا اوقات ان کے کروڑوں کے کاروبار کو خاک میں ملا کر رکھ دیا، دوسری جانب ان کے ردِ عمل میں سرمایہ داروں، مل مالکوں نے بھی اپنی تنظیمیں اور یونینس بنالیں، اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ جب مزدور اپنی یونین کے ذریعے اپنے

مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کرتے ہیں، تو کارخانہ دار تالہ بندی کا حربہ استعمال کرتے ہیں، اوراس ہڑتال وتالہ بندی کی وجہ سے عام لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہے کہ ان کو ان کی ضرورت کی چیزیں بروقت دستیاب نہیں ہوتیں، یا بہت مہنگی خریدنی پڑتی ہیں۔

اس غیر مناسب صورت کا علاج کرنے اور سرمایہ ومحنت کے تنازعہ کا حل نکالنے اور آجر(Employer)واجیر(Employee)کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے انسانی بستی کے دانش وروں، داناؤں اور ماہرینِ معاشیات نے جو کوششیں کی ہیں، اور اقوامِ متحدہ(The united nation)کے زیرِ نگرانی عالمی ادارۂ محنت کا قیام عمل میں آیا، اوراس کے تیار کردہ قوانینِ محنت پوری دنیا میں، خواہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم، نہ صرف رواج پذیر ہیں، بلکہ ان کو قانون کا درجہ حاصل ہے، مگر ان قوانین سے بجائے اس کے کہ مالک ومزدور کا یہ تنازعہ ختم ہوتا کچھ زیادہ ہی اُلجھ گیا، جس کی وجہ سے ان چارہ گروں کی نادانی ہے، جو دل درد کا علاج پنڈلی پر پٹی باندھ کر کرنا چاہتے ہیں۔

مالک اور مزدور کے اس تنازعہ کا حل:

اسلام دینِ فطرت ہے، اس کا قانونِ محنت واجرت اخوت و بھائی چارہ پر مبنی ہے، دین نام ہے خیر خواہی کا، اور جذبۂ خیر خواہی زندگی کے ہر میدان میں ضروری ہے[1]،

جب کہ آج مالک ومزدور دونوں اس جذبہ سے عاری اور خود غرضی ومفاد پرستی کی ذہنیت کے مالک ہیں، مالک یہ چاہتا ہے کہ مزدور سے زیادہ سے زیادہ کام لے، پیداوار زیادہ کرے، زیادہ سے زیادہ نفع کو یقینی بنائے، اور مزدور یہ چاہتا ہے کہ کام

چوری کرے، کارخانہ کی پیداوار خواہ کچھ بھی ہو، مجھے میری اجرت زیادہ سے زیادہ ملے، دونوں کی یہی خودغرضانہ، مفاد پرستانہ ذہنیت ہے جو سرمایہ دار کومزدوروں کے حقوق کے استحصال پر، اورمزدوروں کوانتقامانہ بغاوت پرابھارتی ہے۔

اسلام نے مالک اورمزدور کے مابین خوش گوارتعلقات بنے رہیں، اس کے لیے کچھ بنیادی احکام دیئے ہیں۔

مزدوروں کے حقوق:

مالک ومزدور، آقا وغلام، کاشت کار وزمین دار، ہیڈ ماسٹر وٹیچرس، منتظم واساتذہ، سب انسانی حقوق میں یکساں اور برابر ہیں(۲)، فریقِ اول کواپنے آپ کو برتر اور فریقِ ثانی کوکمتر سمجھنے کا کوئی حق نہیں، فریقِ اول چوں کہ اپنے آپ کو برتر اورفریقِ ثانی کوکمتر تصور کرتا ہے، اوراس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتا ہے، جواس بات کا تأثر دیتا ہے کہ میں برتر ہوں اورآپ کمتر، یہیں سے آپسی تنازعات واختلافات شروع ہوتے ہیں، اوراس مشن کی ترقی یا تورک جاتی ہے یا وہ ختم ہی ہوجاتا ہے، جودونوں کے لیے میدانِ عمل ہے، کاش کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم پرعمل پیرا ہوتے:

''تمہارے غلام، خادم، ملازم، مزدورتمہارے بھائی ہیں، لہٰذاتم میں جس کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو، تو اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے، اوراس کوایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو، اور کبھی ایسا کام کرنے کو کہےتو خودبھی اس کا ہاتھ بٹائے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد سے درجِ ذیل باتوں پر روشنی پڑتی ہے:

۱/ مالک ومزدور آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے خادم، نوکر، اور ملازم کے ساتھ نہ

صرف برابری بلکہ بھائیوں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔ (۳)

۲/ جو مالک کھائے اور پہنے وہ اپنے ملازم ونوکر کو کھلائے اور پہنائے، یعنی آپ جس معیارِ زندگی گزارتے ہیں نوکر بھی اسی معیار کا حق دار ہے، مزدوروں کا حق مارکر مالک کو عیاشانہ اور امیرانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یا تو مالک نوکر کو اس قدر اجرت دے کہ وہ بھی مالک کے معیارِ زندگی کی طرح زندگی گزار سکے، اور اگر یہ ممکن نہیں تو مالک اپنی معیارِ زندگی کو اس سطح تک نیچے لے آئے جس سطح تک وہ اپنے مزدور اور ملازم کی معیارِ زندگی کو بلند کرسکتا ہے۔

۳/ مزدور کو ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کی وہ استطاعت نہیں رکھتا، یہیں سے مزدور کے اوقاتِ کار کی تعیین کا اصول مستنبط ہوتا ہے، کہ ایک عام انسان ایک دن میں یا ایک ہفتے میں کس حد تک اور کتنے گھنٹے کام کرسکتا ہے، جو اس کی صحت پر اثر انداز نہ ہو، اور نہ ہی اس کو اپنی ضرورتیں اور اس کے لواحقین و متعلقین کی ضرورتیں متأثر ہوں۔

زائد محنت کا معاوضہ:

۴/ اگر کوئی کام وہ نہ کرسکتا ہو تو اس سے یہ کام نہ لے، اور اگر ضرورت ہے تو خود اس میں اس کا ہاتھ بٹاؤ، یہ اخلاق کا بلند تر درجہ ہے، جس میں مالک کی بالادستی و برتری کے تصور کا ایک حد تک علاج بھی ہے، اور اگر ایسا نہیں کرسکتا تو اس کام کے لیے آدمی بڑھادے، اور اگر کسی کام کا تقاضا یہ ہو کہ وہ اسی دن پورا کرنا ضروری ہے اور مزدور بھی اس کے تکمیل پر راضی ہے، تو اس کو زائد وقت کا معاوضہ دیا جائے۔

مزدور اور غلام کی عزتِ نفس:

مالک پر لازم ہے کہ وہ اپنے ملازم ونوکر کی عزتِ نفس کا پورا خیال رکھے، اس کو ایسے

القاب والفاظ سے نہ بلائے جس سے اس کی عزتِ نفس پر زد پڑتی ہو، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ان کی ماں سے عار دلائی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا کہ اے ابوذر! تو نے اس کو اس کی ماں سے عار دلائی، تو ایسا شخص ہے جس میں ابھی تک جاہلیت باقی ہے۔ (۴)

مزدور کی مزدوری اور اجرت کی فوری ادائیگی:

آج کل مالک اپنے مزدوروں اور ملازموں سے کام لے لیتے ہیں، اور اجرت کے لیے انہیں چکر کٹواتے ہیں جو سراسر ظلم وزیادتی ہے، بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس ظلم کے مرتکب ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔''(۵)

بعض مزدور نادہندہ مالک کے بار بار چکر کٹوانے کی وجہ سے اپنی اجرت چھوڑ دیتے ہیں، اور یہ مالک اس کو مالِ غنیمت سمجھ کر استعمال کرتے رہتے ہیں، جب کہ یہ گناہِ کبیرہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کی طرف سے خود مدعی بنوں گا، ایک وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا پھر دھوکہ دیا، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچا اور اس کی قیمت کھالی، تیسرا وہ شخص جس نے مزدور سے محنت تو پوری لی، مگر اس کی مزدوری نہ دی۔''(۶)

مزدور کی اجرت کتنی ہو؟

مزدور کو اتنی اجرت دینی چاہیے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوسکیں، اور بہتر یہ

ہے کہ ان ضروریات کا معیار وہی ہو جو خود مالک کا ہو۔

ویسے شرعاً وہ مقدار اجرت بن سکتی ہے جس پر وہ دونوں فریق راضی ہوں، لیکن ایسا نہ ہو کہ فریقِ اول، فریقِ ثانی کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اس کو اجرت کم دے، یا فریقِ ثانی فریقِ اول کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اجرت زیادہ لے، کیوں کہ ایسا کرنا تعلیماتِ شرعیہ کی خلاف ورزی ہے۔(۷)

والله أعلم بالصواب وعلمه أتم وأحكم

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " صحيح البخاري " : عن جرير بن عبد الله قال : " بايعت رسول الله ﷺ على إقام الصلوة وإيتاء الزكوة والنصح لكل مسلم " .

(۱۳/۱ ، باب قول النبي ؛ الدين النصيحة)

ما في " سنن الترمذي " : عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : " الدين النصيحة " ثلاث مرار ، قالوا : يا رسول الله ! لمن ؟ قال : " لله ولكتابه ولأئمة المسلمين وعامتهم " .

(۱۴/۲ ، باب ما جاء في النصيحة)

ما في " سنن الترمذي " : وعنه قال : قال رسول الله ﷺ : " المسلم أخو المسلم ؛ لا يخونه ولا يكذبه ولا يخذله ، كل المسلم على المسلم حرام ؛ عرضه وماله ودمه ، التقوى هاهنا ، بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم " .

(۱۴/۲ ، باب ما جاء في شفقة المسلم على المسلم)

(۲) ما في " صحيح البخاري " : عن المعرور بن سويد قال : لقيت أبا ذر بالربذ وعليه حلة وعلى غلامه حلة فسألته عن ذلک فقال : إني ساببت رجلاً فعيرته بأمه فقال لي النبي ﷺ : يا أباذر ! أعيرته بأمه ؟ إنک امرؤ فيک جاهلية ، إخوانكم خولكم جعلهم الله تحت أيديكم ، فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل ، وليلبسه مما يلبس ، ولا تكلفوهم ما يغلبهم ، فإن كلفتموهم فأعينوهم " . (۹/۱ ، كتاب الأيمان ، باب المعاصي)=

....

....

....

....

....

....

=(۳) مـا في " سنن الترمذي " : قال رسول اللّٰه ﷺ : " المسلم أخو المسلم ؛ لا يخونه ولا يكذبه ولا يخذله " . (۱۴/۲)

(۴) (صحيح البخاري : ۱/ ۹ ، كتاب الأيمان ، باب المعاصي)

(۵) مـا في " سنن ابن ماجة " : عن عبد اللّٰه بن عمرو قال : قال رسول اللّٰه ﷺ : " أعطو ا الأجير الأجر قبل أن يجف عرقه " . (۱/۱۷٦ ، باب الرهون)

(٦) مـا فـي " صـحيـح البـخاري " : عن أبي هريرة قال : قال رسو ل اللّٰه ﷺ : قال اللّٰه : "ثـلاثة أنـا خـصـمهـم يوم القيامة ، ومن كنت خصمه خصمته يوم القيامة ؛ رجل أعطى بي ثم غدر ، ورجل با ع حرًّا فأكل ثمنه ، ورجل استأجر أجيرًا فاستوفى منه ولم يوفه أجره " .

(۱/۳۰۲ ، كتـاب الإجـارة ، بـاب اثـم مـن منع الأجير ، سنن ابن ماجه : ۱/۱۷٦ ، أبواب الرهون ، باب أجر الأجراء)

مـا فـي " صـحيـح البـخـاري " : عـن أبـي هريرة قال : قال رسول اللّٰه ﷺ : " مطل الغني ظلم". (۱/۳۲۳ ، كتاب الاستقراض)

(۷) مـا في " الموسوعة الفقهية " : الأجرة هي ما يلزم به المستأجر عوضًا عن المنفعة التي يتـمـلـكهـا ، وكل مما يصلح أن يكون ثمنًا في البيع يصلح أن يكون أجرة في الإجارة ، وقال الجمهور : إنه يشترط في الأجرة ما يشترط في الثمن . (۱/۲٦۳ ، إجارة)

نیا سال منانے کا حکمِ شرعی !

عید ہر اس دن کو کہتے ہیں جس میں خوشیاں منائی جائیں۔(تھذیب اللغة للأزهري :۳/ ۱۳۱، ۱۳۲) ہر قوم وملت کے لیے عید کا دن ہوتا ہے جس میں وہ اپنی خوشیوں، مسرّتوں، شادمانیوں اور فرحتوں کا اظہار کرتی ہے۔

ہم مسلمانوں کے لیے بھی اسلام نے کچھ دنوں کو عید قرار دیا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔(صحیح البخاری:۱/ ۱۳۰، کتاب العیدین، باب سنة العیدین لاہل الاسلام)

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ کا دن، قربانی کا دن، اور منیٰ کے دن (۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذی الحجہ) ہم مسلمانوں کی عید ہیں۔(ابوداؤد:ص/ ۲۲۸، کتاب الصیام)

عیدوں اور تہواروں کے متعلق یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام میں عیدوں کا معاملہ محض توقیفی ہے، یعنی جن دنوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عید فرمادیا، وہی عید ہے، ان کے علاوہ دیگر ایّام کی عیدوں اور تہواروں جیسے کرسمس ڈے، برتھ ڈے، مَدَرْس ڈے، ویلنٹائن ڈے، اور دوسرے جتنے بھی ڈیز ہوسکتے ہیں- کو بطور عید منانا اوران سے متعلق رسومات یا اعمال کو انجام دینا ناجائز ہے۔آج ہم جس مہینے سے گزر رہے ہیں، وہ اسلامی اعتبار سے بھی آخری مہینہ ہے، اور عیسوی اعتبار سے بھی۔اب نئے سال کی آمد آمد ہے، اس مناسبت سے حکومتیں نئے سال کے پہلے دن سرکاری دفاتر میں عام چھٹی رکھ کر اور عوام کاروبارِ زندگی بند کرکے جشن منائیں گے، جو

درحقیقت یہودیوں کا تہوار ہے، وہ لوگ اس دن بگل بجا کر جشن مناتے ہیں، اور اس دن کام کاج کو ایسا ہی حرام اعتقاد رکھتے ہیں، جیسے سنیچر کے دن ان کے نزدیک کام کرنا حرام ہے، نیز ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس دن اسحاق علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں قربانی پیش کی تھی، ان کے نزدیک یہ دن ایسا ہی مقدس اور متبرک ہے جیسے مسلمانوں کے نزدیک عیدالاضحیٰ۔ (الأعياد وأثرها على المسلمين :ص/۳۰)

یہودیوں نے اپنی تہذیب وثقافت، اور مذہبی اقدار کو اتنا فروغ دیا کہ عیسائی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور انہوں نے بھی اس عید کو اتنی دھوم دھام اور تزک واحتشام کے ساتھ منانا شروع کیا کہ اب وہ عیسائیوں کا ہی تہوار سمجھا جانے لگا، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اب یہ تہوار بعض مسلم ممالک بھی منانے لگ گئے، اور ان کے یہاں بھی سالِ ماضی کو الوداع کہنے، اور سالِ نو کے استقبال کے لیے سرکاری دفاتر میں چھٹیاں رکھی جاتی ہیں، اور لوگ اپنے کاروبار بند رکھ کر جشن مناتے ہیں، جو سراسر غیر اسلامی رسم ہے، اسلام میں اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں، بل کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی تہواروں میں ایک طرح کی شرکت ہے، اور ان کے ساتھ مشابہت ہے، جس سے اہلِ اسلام کو روکا گیا، اور غیروں کی مشابہت پر سخت وعید وارد ہوئی ہے: ''**من تشبه بقوم فهو منهم**''. جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے۔ (المعجم الكبير للطبراني ، مجمع الزوائد :۵/۱۶۹)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے غیروں کے رسم ورَواج اور طور وطریق کو اختیار کرے، وہ اللہ رب العزت کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔ **عن ابن عباس قال : قال رسول الله ﷺ :**

”أبغض الناس إلى اللّٰه ثلاثة ؛ ملحد في الحرم ، مبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ، ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق ليهريق دمه“ . رواه البخاري . (مشكوة المصابيح : ص/۲۷ ، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہیں: (۱) محارمِ خداوندی کی بے عزتی کرنے والا۔ (۲) اسلام میں جاہلیت کی رسم ورَواج کا طالب۔ (۳) ناحق کسی مسلمان کے خون کا طالب۔

اس لیے نئے سال کی آمد پر پٹاخے پھوڑنا، تالیاں بجانا، سیٹیاں بجانا، ناچ گانا کرنا، Happy New Year کہنا، یا نئے سال کی مبارک بادی پر موبائل سے SMS کرنا، جیسا کہ نیوایئر کے موقع پر اہلِ مغرب کی دیکھا دیکھی مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ اور فیشن کا دل دادہ طبقہ کرتا ہے، یہ سب غیر شرعی رسمیں ہیں، اس سے کلی طور پر اجتناب، دینی وشرعی فریضہ ہے، لہٰذا مسلمان اس طرف توجہ دیں! قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿یآ ایها الذین اٰمنوا قوآ انفسکم واهلیکم نارًا﴾ . اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے۔

(سورۃ التحریم: آیت:٦ پ:۲۸)

تِل سنکرات (بسنت) کا تہوار منانا شرعاً جائز نہیں ہے!

اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے، اور مسلمان صرف اور صرف اسی پر عمل کرنے کے پابند ومکلّف ہیں۔قرآنِ کریم نے صاف الفاظ میں اعلان فرمایا ہے:﴿ان الدین عند اللّٰہ الإسلام﴾. ''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔'' (آل عمران:۱۹)

اور آپ ﷺ نے اپنی امت کو اغیار کی مشابہت سے منع فرمایا۔[۱]-اس لیے مسلمانوں کے لیے غیروں کے طور وطریق کو اپنانا اور غیر اسلامی تہواروں میں کسی بھی طرح شرکت کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

تِل سنکرات بھی ایک غیر اسلامی تہوار ہے جس میں پتنگ بازی، ناچ گانا، وقت[۲]، مال[۳] اور جانوں کا ضیاع[۴] جیسی عظیم قباحتیں اور برائیاں موجود ہیں، جو شرعاً ناجائز وحرام ہیں۔اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ایسی غیر اسلامی رسموں اور تہواروں میں شرکت سے باز رکھیں!![۵]

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " سنن ابي داود " : " من تشبه بقوم فهو منهم " . (ص/۵۵۹ ، كتاب اللباس)

(۲) ما في " القرآن الكريم " : ﴿و من الناس من يشترى لَهوَ الحديث لِيُضلّ عن سبيل الله بغير علم﴾ . ''اور کوئی انسان ایسا بھی ہے جو اللہ سے غافل کرنے والی باتیں خرید کرتا ہے تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے (دوسروں کو) گمراہ کرے۔'' (سورۂ لقمان:٦)=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

=ما في " الدر المختار مع الشامية " : (و) كره (كل لهو) لقوله عليه الصلوة والسلام : "كل لهو المسلم حرام إلا ثلاثةٌ : ملاعبته أهله ، وتأديبه لفرسه ، ومناضلته بقوسه " . (۵٦٦/۹)

(۳) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ان المبذرين كانوآ اخوان الشيٰطين وكان الشيطٰن لربه كفورًا﴾ . "بے شک فضولیات میں اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں، اور شیطان اپنے پرودگار کا بڑا ہی ناشکرہ ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل:۲۷)

(۴) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تلقوا بايديكم إلى التهلكة﴾ . "اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔" (سورۃ البقرہ:۱۹۵)

(۵) ما في " القرآن الكريم " : ﴿يآ ايها الذين اٰمنوا قوآ انفسكم و اهليكم نارًا﴾ . "اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے۔" (سورۂ تحریم:٦)

❁......❁......❁

ویلنٹائن ڈے

(VALENTINEDAY)

منانا شرعاً ممنوع ہے!

امتِ مسلمہ کی اپنی ایک تہذیب وثقافت ہے، جس سے اس کا امتیاز واختصاص قائم ہے، اس کے لیے عید وتہوار کے دن بھی شریعت کی طرف سے مخصوص ومتعین ہیں، اس لیے اس کے لیے نہ تو دوسروں کی تہذیب وثقافت کو اختیار کرنا جائز ہے، اور نہ ان کے تہواروں اور رسموں میں شرکت کی اجازت۔

ویلنٹائن ڈے (یومِ عاشقاں) ایک ایسے شخص کی یاد میں منایا جاتا ہے، جس نے احیاءِ تقاضۂ فطری کی خاطر اپنی جان ضائع کی تھی، جب کہ شریعت ان پاک نفوس کے ایامِ شہادت کو بھی بطورِ یاد وعید منانے کی اجازت نہیں دیتی، جنہوں نے احیاء دین کی خاطر اپنی جانیں دیدیں۔ اس لیے ویلنٹائن ڈے (یومِ عاشقاں) منانا نقلاً، اِجماعاً اور عقلاً بالکل جائز نہیں ہے۔ (تلخیص از فتاویٰ اشاعت العلوم اکل کوا)

کرکٹ کھیلنے کا شرعی حکم!

ہر ایسا کھیل جو انسان کو اس پر واجب حقوق ''خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد'' سے غافل کردے، یا منکرات ومنہیاتِ شرعیہ پر مشتمل ہو، یا اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہوں، ناجائز ومکروہِ تحریمی ہے، اور شریعتِ اسلامیہ اپنے ماننے والوں کو اس طرح کا کھیل کھیلنے سے منع کرتی ہے۔ (أحكام القرآن للتهانوي :۳/۲۰۱)

اس ضابطۂ اسلامی کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کرکٹ کھیلنا شرعاً ناجائز ہے، کیوں کہ یہ بہت سی دینی ودنیوی خرابیوں کا مجموعہ ہے، مثلاً:

۱/ اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت فوت ہوتی ہے، جب کہ نماز باجماعت واجب ہے۔ (رد المحتار: ۲/۲۸۷)

یا نمازیں قضا کرنی پڑتی ہیں، جب کہ نمازوں کو جان بوجھ کر قضا کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔
(رد المحتار: ۲/۵۱۸)

۲/ ملازمین کے فرائض وواجبات میں کوتاہی وخلل واقع ہوتا ہے، جب کہ اصحابِ حقوق کے حقوق میں کوتاہی کرنا حرام ہے۔ (سورة التطفيف: ۱)
(معارف القرآن :۸/ ۶۹۳، تفسیر مظهری : ۱۰/ ۱۸۹)

۳/ مدارس ومساجد جو پڑھنے لکھنے اور عبادت کی جگہیں ہیں، وہاں اسی عنوان پر گفت وشنید اور تذکرہ وتبصرہ ہوتا ہے، جب کہ مساجد کا ادب واحترام واجب ہے۔

(مشكوة المصابيح :ص/۷۱، رد المحتار : ۲/۴۳۶، البحر الرائق : ۲/۴۷۷)

۴/ کھیل کے دنوں میں سرکاری ونیم سرکاری، شخص ونجی ادارے معطل ہوکر رہ جاتے ہیں، جس سے قومی وملکی اور شخصی وذاتی زبردست مالی نقصان، اور تضییعِ اوقات

لازم آتا ہے، جب کہ مال ووقت دونوں کو ضائع کرنا شرعاً حرام ہے، علامہ یوسف القرضاوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ وقت کو ضائع کرنا مال کے ضائع کرنے کی حماقت وسفاہت سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے، کیوں کہ مال دوبارہ حاصل ہوسکتا ہے، لیکن وقت نکل جانے کے بعد دوبارہ نہیں لوٹتا۔ (الألعاب الرياضية : ص/ ۳۲۰)

۵/ مدارس، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ واسٹوڈنس کی تعلیم متأثر ہوتی ہے، جب کہ طلبِ علم فرض ہے۔ (المعجم الأوسط للطبراني : ۶/ ۲۳۱)

۶/ کسی ٹیم کے ہار جانے پر اس کو سخت رسوا وذلیل کیا جاتا ہے، جب کہ یہ امر شرعاً حرام ہے۔ (جامع الترمذي : ۲/ ۳۹، ۱۴، مشكوة المصابيح : ص/ ۴۲۲)

۷/ بسا اوقات اس کھیل کے شرکاء کو سخت جسمانی اذیت ونقصان اٹھانا پڑتا ہے کہ بعض کی ٹانگیں ٹوٹتی ہیں، اور بعض کے پیٹ میں ایسی سخت چوٹ لگتی ہے کہ وہ لبِ مرگ ہوجاتا ہے، جب کہ اسلام نے اپنے آپ کو اس طرح کی اذیت پہنچانے والے ہر عمل سے منع کیا۔ (سورة البقرة : ۱۹۵)

۸/ جب یہ کھیل دو قومی ٹیموں کے مابین ہوتا ہے، تو دنگے فساد کا سبب بنتا ہے، جس سے بے شمار جانیں فوت اور بے انتہا مال تلف ہوتا ہے، جب کہ حفاظتِ جان ومال مقاصدِ شرعیہ میں داخل ہے۔

(الموافقات للشاطبي : ۲/ ۳۲۶، طرق الكشف عن مقاصد الشارع : ص/ ۳۵، مقاصد الشريعة الإسلامية لإبن عاشور : ص/ ۹۲، المقاصد الشرعية للخادمي : ص/ ۵۸)

۹/ اس کھیل میں شریک ٹیموں کے ہار وجیت پر بڑا جوا کھیلا جاتا ہے، جو شریعت کی نگاہ میں حرام ہے۔

(سورة المائدة : ۹۰، ۹۱، الموسوعة الفقهية : ۳۵/ ۲۶۹، الفتاوى الهندية : ۵/ ۳۲۴)

۱۰/ جب کھیل آبادی کے اندر ہوتا ہے، تو راہ گیروں کی اذیت، مکانوں کی کھڑکیوں کے ٹوٹنے اور شیشوں کے پھوٹنے کا سبب بنتا ہے، جب کہ کسی کو جسمانی یا مالی نقصان پہنچانا شرعاً حرام ہے۔ (جامع الترمذي: ۲/ ۳۹/ ۱۴، مشكوة المصابيح: ص/ ۴۲۲)

۱۱/ دورانِ کھیل تالیاں اور سیٹیاں بجائی جاتی ہیں، جو کفارِ یورپ کے مشابہت کی وجہ سے ممنوع ہے۔

(سورة الأنفال: ۳۵، سنن أبي داود: ص/ ۵۵۹، رد المحتار: ۹/ ۵۶۶)

جب یہ کھیل اتنی ساری دینی ودنیوی خرابیوں کا ذریعہ ہے، تو وہ شرعاً ناجائز ہوگا، کیونکہ شریعت ہر اس ذریعہ کو بھی منع کرتی ہے جو انسان کو برائی تک پہنچاتا ہے۔

(اعلام الموقعين: ۳/ ۱۷۵، الفروق للقرافي: ۲/ ۶۲، المقاصد الشرعية: ص/ ۴۶)

الغرض! کرکٹ کھیلنے، کھلانے، میدان میں یا ٹی وی پر دیکھنے، دکھانے، اسی طرح ریڈیو پر اس کی کامینٹری (Commentory) سننے اور سنانے، اور اس پر بحث ومباحثہ کرنے سے معصیت ونافرمانی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا، اور زندگی کے قیمتی اوقات کو ضائع کرنا لازم آتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں شرعاً حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پورے طور سے احکامِ اسلام کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یا رب العالمین!

اپریل فول منانا شرعاً ناجائز وحرام اور گناہِ کبیرہ ہے!

بعض لوگ یکم اپریل کو ''اپریل فول'' مناتے ہیں، جس کی صورت وحقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس دن آدمی بطورِ مزاح ومذاق خوب جھوٹ بول کر اپنے دوستوں، متعلقین اور حکومتی اداروں کو خوف وبے چینی میں مبتلا کر دیتا ہے، مثلاً: کسی کو یہ فون کرنا کہ آپ کے عزیز کا انتقال ہوگیا، کسی خاتون کو یہ فون کرنا کہ آپ کے شوہر نے آپ کو تین طلاق دیدی، کسی ملازم کو یہ فون کرنا کہ آپ کے ادارہ یا کمپنی نے آپ پر فلاں الزام لگا کر آپ کو سبک دوش کر دیا، یا کسی حکومتی ادارہ مثلاً: فائر بریگیڈ اسٹیشن کو یہ فون کرنا کہ فلاں جگہ انتہائی خطرناک آگ لگ گئی، اور اس نے سیکڑوں مکانوں اور انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، وغیرہ۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس طرح کی کذب وغلط بیانی فی نفسہ حرام ہونے، دوسروں کو خوف وبے چینی میں مبتلا کرنے، اکبرِ خیانت کو مستلزم ہونے، کم عقلی وبے وقوفی کو رواج دینے، ایسی تقلیدِ باطل کو عام کرنے، جو نہ اسلامی تعلیمات سے پیدا ہوئی اور نہ اسلامی ماحول میں پرورش پائی، اور مسلمانوں کے غیروں کے ساتھ ان کی عاداتِ رذیلہ اور اعمالِ سخیفہ (بے عقلی) میں مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے ناجائز وحرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جھوٹ ہر دن حرام ہے، کسی دن جھوٹ بولنے اور غلط بیانی کی شرعاً اجازت نہیں ہے، مسلمان کا جھوٹ کی ترویج واشاعت اور اس میں تعاون کرنا حرام ہے۔

....

الحجة على ما قلنا :

ما في " القرآن الكريم " : " ان يقولون الا كذبا " . (سورة الكهف :۵)

ما في " التفسير الكبير للرازي " : (إن يقولون إلا كذبا) فعلمنا أن كل خبر لا يطابق المخبر عنه فهو كذب ، سواء علم القائل بكونه مطابقا أو لم يعلم . (۴۲۶/۷)

ما في " القرآن الكريم " : ﴿وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب﴾ . (سورة المائدة : ۲)

ما في " سنن أبي داود مع هامشه " : " ويل للذي يحدث فيكذب ليضحک به القوم ، ويل له ، ويل له " . قوله : (ويل له) والحاصل أن الكذب حرام ، ولم يرخص إلا في مواضع الضرورة . وأما ليضحک الناس فلا ضرورة فيه للكذب ، بل لا فائدة فيه ، فهذا الكذب أشد حرمة في أنواعه فاستحق الويل . ۲ ۱ . (ص/۶۸۱ ، باب التشديد في الكذب ، سنن الترمذي : ۵۷/۲ ، باب ما جاء من تكلم بالكلمة ليضحک الناس)

ما في " سنن أبي داود " : عن عبد الرحمن بن أبي ليلى قال : حدثنا أصحاب محمد ﷺ أنهم كانوا يسيرون مع النبي ﷺ فنام رجل منهم ، فانطلق بعضهم إلى حبل معه فأخذه ففزع ، فقال النبي ﷺ : " لا يحل لمسلم أن يُرَوِّعَ مسلمًا " . (ص/۶۸۳ ، باب من يأخذ الشيء من مزاح ، سنن الترمذي : ۳۹/۲ ، باب ما جاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلما)

ما في " مشكوة المصابيح " : عن ابن عباس قال : قال رسول الله ﷺ ؛ " أبغض الناس إلى الله ثلاثة : ملحد في الحرم ، مبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ، ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق ليهريق دمه" . رواه البخاري . (ص/۲۷ ، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ما في " سنن أبي داود " : " من تشبه بقوم فهو منهم " . (ص/۵۹۹ ، كتاب اللباس)

ما في " فتاوى معاصرة " : واعتبر النبي ﷺ من أكبر الخيانة أن تكذب على من يثق بک ، ويصغى إليک بأذنه وقلبه ، وأنت تكذب عليه يقول : " كبرت خيانة أن تحدث أخاک هو به مصدق ، وأنت له به كاذب " . (فتاوى معاصرة : ۶۳۹/۱ ، كذبة أول نسيان " أبريل " ، سنن أبي داود :ص/۶۷۹ ، كتاب الأدب ، باب في المعاريض)

فلم ''الرسالۃ'' بنانا دِکھانا اور دیکھنا شرعاً ناجائز ہے!

قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی سے یہ ثابت ہے کہ حق کی اشاعت ہر زمانے میں اس امت کا ایک اہم فریضہ رہا ہے، اور ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وذكر فان الذكرى تنفع المؤمنين﴾ . آپ لوگوں کو سمجھاتے رہیے، کیوں کہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دے گا۔ (سورۂ ذاریات:۵۵)

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے: '' يآ ايها الناس إن الله تعالى يقول لكم : '' مروا بالمعروف و انهون عن المنكر'' . اے لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ (كنز العمال :۳/ ۳۱ ، حديث : ۵۵۱۸)

مگر تبلیغِ حق واشاعتِ اسلام کے وہی طریقے اپنائے جاسکتے ہیں، جو شرعاً جائز ومباح ہوں، آج کل '' الرسالة '' نامی فلم نے فلم بینی کے شوقین خصوصاً مسلمانوں میں بڑی دھوم مچا رکھی ہے، اور لوگ اسے نہ صرف فلم بلکہ کارِ ثواب سمجھ کر دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ذریعے دورِ رسالت کے واقعات وشخصیات سے نہ صرف واقفیت حاصل ہوتی ہے، بلکہ اسلامی واقعات وشخصیات کے پیغام وسوانح عام ہوتی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اس طرح کی فلمیں بنانا، دیکھنا اور دِکھانا، ناجائز وحرام ہے، کیوں کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ تصویریں بناتے ہیں، قیامت کے دن ان کو سخت عذاب دیا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ تم نے جو تصویر بنائی اس میں جان ڈالو۔

عن نافع أن عبد الله بن عمر أخبره أن رسول الله ﷺ قال : '' إن الذين

يصنعون هذه الصور يعذبون يوم القيامة ، يقال لهم : احيوا ما خلقتم '' .

(صحيح البخاري : ۸۸۰/۲)

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: '' **كل مصور في النار** '' . ہر تصویر بنانے والا جہنم میں جائے گا۔ (کنز العمال: ۴/ ۱۷، حدیث: ۹۳۷۴، مشکوۃ المصابیح: ص/ ۳۸۵)

تصویر کشی صرف اس کا نام نہیں کہ قلم سے تصویر بنائی جائے ، یا پتھر وغیرہ کا بت تراشا جائے ، بلکہ وہ تمام صورتیں تصویر کشی میں داخل ہیں جن کے ذریعے تصویر تیار ہوتی ہے، خواہ آلاتِ قدیمہ کے ذریعے ہو، یا آلات جدیدہ؛ فوٹو گرافی اور طباعت وغیرہ سے، کیوں کہ کسی بھی کام میں آلات مقصود نہیں ہوتے ، بلکہ مقصد اصل ہوتا ہے اور احکام کا تعلق بھی مقصد ہی سے ہوتا ہے۔ '' **الأمور بمقاصدها** ''. (الأشباه: ۱۱۳/۱)

احکامِ اسلام پر غور فکر کرنے سے یہ حقیقت آشکارہ ہوتی ہے کہ شریعت نے جن چیزوں کو فرض وواجب قرار دیا، اُن کے اسباب وذرائع بھی فرض وواجب قرار دیئے، تاکہ فرضیت ووجوب قائم رہ سکے، اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا اُن کے ذرائع واسباب کو بھی حرام قرار دیا، تاکہ حرمت وممانعت قائم رہ سکے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں سدّ ذرائع کہا جاتا ہے۔ (اعلام الموقعين : ۱۷۵/۳ ، الفروق للقرافي : ۴۰۶/۳)

تصویر سازی حرام ہے۔ اور جو کام ناجائز وحرام ہیں، وہ مقصد کے اچھا ہونے سے جائز ومباح نہیں ہو سکتے ، مثلاً: اگر کوئی آدمی اس لیے سودی کاروبار کرے کہ اس سے نفع حاصل ہونے والے منافع کو اشاعتِ دین میں خرچ کروں گا، یا اس لیے بدکاری کرے کہ اس سے ہونے والی اولاد کو جہاد میں بھیجوں گا، تو اس کی حسنِ نیت سے عملِ بد کی بدی ختم نہیں ہوتی ، بلکہ یہ عمل شرعاً ناجائز وحرام ہی رہتا ہے۔

فقیہ عصر، مجاہد ملت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' کسی

عمل کی حرمت اور برائی اس لیے دور نہیں ہو جائے گی کہ اس کا مقصد اچھا ہے، اور نہ نیک مقصد کی خاطر حرام ذرائع کا استعمال کرنا صحیح ہے۔'' (فتاویٰ قاضی: ص/۱۱۰)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شریعتِ اسلامیہ میں جاندار کی تصویر بنانا مطلقاً معصیت ہے، خواہ کسی کی تصویر ہو، اور خواہ مجسمہ ہو یا غیر مجسمہ، کسی مسلمان کی تصویر بنانا اور زیادہ معصیت ہے کہ اس میں ایسے شخص کو آلۂ معصیت بنانا ہے، جو اس کو اعتقاداً قبیح (برا) جانتا ہے۔

مقصود کی مشروعیت اباحت کو مستلزم نہیں: جب ایسی فلموں کے قبائح معلوم ہو گئے، تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ بقدر اپنی قدرت کے گو وہ قدرت حکومت سے استعانت ہی کے طور پر ان کے انسداد (روک تھام) میں کوشش کریں، اور تمام دیکھنے والوں کو ان قبائح پر مطلع کر کے شرکت سے روکیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ سب عقابِ خداوندی میں گرفتار ہوں۔ (امداد الفتاویٰ: ۴/ ۲۵۷-۲۶۱) (کنز العمال: ۳/ ۳۱، حدیث: ۵۵۱۸)

مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سینما (بائسکوپ) محض لہو ولعب ہے، ہر حال میں اس کا دیکھنا ناجائز ہے۔'' ودلت المسئلة أن الملاهي كلها حرام'' . (رد المحتار : ۹ / ۵۰۲) (کفایت المفتی: ۹/ ۲۰۱، ۲۰۲)

الغرض! فلم بنی فی نفسہٖ مطلقاً ناجائز ہے، اور جب اس فلم میں واقعات وشخصیاتِ اسلام کو فرضی کرداروں کے ساتھ فلمایا گیا ہو، تو اس کی قباحت وشناعت انتہائی بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ اسلام اور تاریخ اسلام کے ساتھ یہ انتہائی بدترین وسنگین قسم کا مذاق ہے، کیوں کہ آج اس فلم میں بعض واقعات وشخصیاتِ اسلام کو فلمایا گیا، کل یہی لوگ پیغمبر اسلام، خلفائے راشدین اور امہات المؤمنین وغیرہ کی غلط فرضی شبیہ فلما کر

تھیئٹروں اور سنیما ہالوں میں دکھائیں گے، اور توہینِ رسالت وخلفائے راشدین وامہات المؤمنین وغیرہ کے اس سیلابِ عظیم کی زد میں اور کون کون آئے گا، ہم بتلا نہیں سکتے، اور نہ اس وقت اسے روکنا ہمارے بس میں ہوگا، جب کہ ان کی عزت وعظمت ناموس وعصمت ہمارے ایمان کا جز ہے۔ بعض خودساختہ دانش وروں کی طرف سے یہ باتیں کی جارہی ہیں: (۱) کبھی شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

(۲) اس طرح کی فلم بنانے، دکھانے اور دیکھنے سے ہمارے بچے حضراتِ صحابہ کو آئیڈیل بنائیں گے، واقعات اسلام سے واقف ہوں گے، اور گانوں کو گنگانے کی بجائے اسلامی ترانے ان کی زبان پر ہوں گے۔

(۳) گناہوں کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کے لیے اس طرح کی فلمیں بڑا بند تو نہیں، لیکن ریت کا ذرّہ ضرور ثابت ہوں گی، اور بڑا بند باندھنے میں ریت کے ذرّہ کی جو بنیادی اہمیت ہے، وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔

(۴) اور......اخلاق سوز فلموں کے طوفان میں یہ فلم ''نعم البدل'' ہے۔

(۵) ہم ہزار کوششوں کے باوجود نہ مسلمانوں کو فلموں اور نغموں سے روک پائے ہیں، اور نہ ٹی وی اور سی ڈی پلییئر کو گھر لانے سے، اس لیے اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں بدترین شیطانی دھوکہ اور مزاجِ شریعت سے ناواقفیت وجہالت کی شہادت اور اس کی پیداور ہیں۔ ان کے اس غلط طرزِ استدلال پر ہم یہ کہیں گے:

(۱) شر میں خیر کا پہلو اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ غیر اختیاری ہو، نہ کہ اختیاری، ورنہ آدمی خیر کو چھوڑ کر شر ہی کو اختیار کرے گا کہ اس میں خیر کا بھی پہلو ہوتا ہے۔

(۲) اسلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابۂ کرام کو نمونہ اور آئیڈیل بنانے کی

دعوت ضرور دیتا ہے، لیکن ایسا آئیڈیل جو فلموں اور سنیما گھروں کی راہ سے آئے وہ آئیڈیل کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

(۳) برائیوں کے سیلاب کو روکنے کے لیے خیرِ قلیل کی مثال بڑے بند باندھنے کے لیے ریت کے ذرّہ کی حیثیت ضرور رکھتا ہے، مگر معصیت کو خیر کہہ کر قبول کرنا معقول ومنظور نہیں ہوسکتا۔

(۴) فلم '' الرسالة ''کو''اعظم السیئات'' تو کہنا صحیح ہے، لیکن ''نعم البدل'' نہیں مانا جاسکتا، کیوں کہ عام فلمیں اخلاق سوز ہیں، جب کہ اس طرح کی فلمیں ایمان سوز ہیں، اور ایمان سوزی قباحت میں اخلاق سوزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

(۵) اگر ہم مسلمان کو برائیوں سے نہیں روک سکے، تو یہ کچھ حد تک تو صحیح مانا جاسکتا ہے، مگر اس کی وجہ سے ناجائز وحرام کو جائز ومباح کہنا، اور کسی امرِ معصیت میں ابتلائے عام سے اس کی معصیت طاعت میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔

عام لوگوں کو احکامِ اسلام میں اس طرح کی رائے دہی سے اجتناب ضروری ہے، کیوں کہ اسلام نام ہے پوری طرح احکامِ اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکا دینے کا۔

الإسلام : هو الخضوع والانقياد لما أخبر به رسول الله ﷺ .

(كتاب التعريفات للجرجاني :ص/۱۹)

وقال الله تعالى في كلام المجيد : ﴿يآ ايها الذين اٰمنوا ادخلوا في السلم كآفّة ولا تتبعوا خطوات الشيطٰن انه لكم عدو مبين﴾ . اے ایمان والو! اسلام میں پور ے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(سورة البقرة :۲۰۸)

یومِ اساتذہ منانے کا شرعی حکم!

دین کے عظیم اصولوں میں سے ایک اصول، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مودّت ومحبت، اور کافروں سے اظہارِ بیزاری وبرأت ہے۔ اس لیے کافروں کی عیدوں، تہواروں، اسی طرح بطورِ عید منائے جانے والے دِنوں (ڈیز)، جن کی کوئی دینی اصل وحیثیت نہ ہو، بلکہ وہ کافروں کی اِیجاد، اور منکراتِ شرعیہ (غیر اللہ کی تعظیم وغیرہ) پر مشتمل ہوں، ان میں مسلمانوں کی شرکت بالکل جائز نہیں ہے، تاکہ اُن کی عیدوں، تہواروں اور غیر شرعی دنوں (ڈیز) سے بیزاری وبرأت کا اظہار ہو سکے، لیکن اگر کوئی دِن؛ قومی یا عالمی دِن ہو، منکراتِ شرعیہ سے خالی ہو، اور اس میں شرکت نہ کرنے سے مسلمانوں کی مصلحتیں فوت ہوتی ہوں، یا کوئی قانونی مجبوری ہو، اور اُس کے غیر شرعی ہونے پر دِل مطمئن ہو، تو ضرورۃً اس میں شرکت کی گنجائش ہوگی، لہٰذا یومِ عاشقاں (Velentineday)، یومِ اساتذہ (Teacher,day)، یومِ حقوقِ نسواں (Women day)، یومِ گلاب (Rose,day)، یومِ اطفال (Children,day) یومِ دوستاں (Friendship,day)، یومِ سیاہ (Black friday) وغیرہ، میں شرکت درست نہیں ہوگی، کیوں کہ ان میں شرکت نہ کرنے سے مسلمانوں کی کوئی مصلحت فوت نہیں ہوتی ہے، بلکہ شرکت کرنے پر دینی مفاسد اور خرابیاں لازم آتی ہیں [1]، جب کہ فقہ کا قاعدہ ہے: " درأ المفاسد أولی من جلب المنافع " - " دینی خرابیوں سے بچنا تحصیلِ منافع سے اولیٰ ہے"۔ [2]

اور عالمی یومِ صحت (World health day)، یومِ انسدادِ منشیات

(Banishing day of liquor)، یومِ تعلیم (Educational Day) یومِ آزادی (Independence Day) یوم جمہوریہ (Republic,Day) وغیرہ، ان دنوں کے منانے میں پوری انسانیت کے لیے خیر اور نفعِ عام ہے، نہ ان میں غیر اللہ کی تعظیم اور معنیٔ عید موجود ہے، اور نہ یہ کافروں کی خصائص وعادات میں داخل ہیں، اور نہ ہی یہ امورِ غیر شرعیہ پر مشتمل ہیں، نیز ان میں شرکت کے بغیر مسلمانوں کے لیے کوئی چارۂ کار بھی نہیں، کیوں کہ شرکت نہ کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی مصلحتیں فوت ہوتی ہیں، اور کچھ قانونی مجبوریاں بھی ہیں، اس لیے ان ایام میں شرکت کی گنجائش ہوگی۔ (۳)

۵ ر ستمبر کو پورے ہندوستان میں یومِ اساتذہ منایا گیا، طلبہ وطالبات کی طرف سے اس مناسبت سے پروگرام پیش کیے گئے، جن کا مقصد طلبہ میں اپنے اساتذہ کے لیے قدر واحترام کے جذبات کو پیدا کرنا ہوتا ہے، لیکن یہ جذبات وقتی نہیں بلکہ دائمی ہونا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ماں باپ کے بعد کسی بھی انسان کا سب سے بڑا محسن اس کا استاذ ہوتا ہے، استاذ باپ کا درجہ رکھتا ہے، معلوم ہوا کہ استاذ کا مقام بہت اونچا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص جتنے اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے، اسی نسبت سے اُس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ تو استاذ میں ہمیشہ اپنے شاگردوں کے لیے باپ کی سی محبت وشفقت، اور شاگردوں میں بیٹوں، بیٹیوں کی طرح اطاعت وفرماں برداری ہونی چاہیے، تب تو اس طرح کے پروگرام اپنے مقصد میں کامیاب ہیں، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلے میں دونوں جانب سے کوتاہی ہو رہی ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم وتعلُّم کا یہ مقدس پیشہ آج

تجارت وکاروبار بن چکا ہے، درس وتدریس اسکولوں اور کالجوں کی ملازمت بن کر رہ گئی، کہ نہ استاذوں میں باپ کی سی شفقت ومحبت پائی جاتی ہے، اور نہ شاگردوں میں اولاد کی سی اطاعت ووفا شعاری۔

الغرض! جو پیشہ تعلیمِ انسانیت کا تھا وہ خالص تجارت بن گیا۔

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " القرآن الكريم " : ﴿ولا تركنوٓا إلى الذين ظلموا فتمسّكم النار﴾ .

(سورة هود :۱۱۳)

ما في " حاشية القونوي على تفسير البيضاوي " : قال ابن عباس : أي لا تميلوا ، والركون المحبة والميل بالقلب ، وقال أبو العالية : لا ترضوا بأعمالهم ، وقال عكرمة : لا تطيعوهم ؛ قال البيضاوي : لا تميلوا إليهم أدنى ميل ، فإن الركون هو الميل اليسير كالتزيي بزيهم وتعظيم ذكرهم . (۱۰/۲۲۶ ، تفسير المظهري :۴/۴۳۰)

(۲) ما في " صحيح البخاري " : " إذا أمرتكم بشيء فافعلوه ما استطعتم ، وإذا نهيتكم عن شيء فانتهوا ". (۲/۱۰۸۲ ، كتاب الإيمان ، باب الاعتصام بالكتاب والسنة ، سنن ابن ماجه: ص/۲ ، المقدمة ، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ)

ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : " لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات " . (ص/۷۸) (قواعد الفقه:ص/۸۱ ، قاعدة :۱۳۳)

(۳) ما في " الأشباه والنظائر لإبن نجيم " : " الضرورات تبيح المحظورات " – " ما أُبيح للضرورة يتقدر بقدرها " . (۱/۳۰۷ ، ۳۰۸)

''یوگا'' کی شریعتِ مطہرہ میں کوئی گنجائش نہیں!

اسلام ایک فطری، طبعی، نظری اور کامل دین ہے، اس نے اپنے احکام میں اپنے ماننے والوں کی تمام ضرورتوں اور حاجتوں کا خیال رکھا ہے، اسی لیے اس نے ہر اس چیز کو جائز قرار دیا، جس میں انسان کے لیے دنیوی راحت اور اُخروی سعادت ہے، اور ہر اس چیز کو منع کیا جو اس کے لیے دنیا میں تکلیف اور آخرت میں ناکامی ونامرادی اور خدائی ناراضگی کا باعث ہوسکتی ہے، صحت وتندرستی شرعاً مطلوب ہے، اس لیے اس کی خاطر ریاضت وورزش بھی مطلوب ہے، کیوں کہ صحت وتندرستی کا ایک ذریعہ ورزشِ جسمانی بھی ہے، اور فقہ کا قاعدہ ہے: ''جو احکام مقاصد کے ہوتے ہیں، وہی احکام وسائل وذرائع کے بھی ہوتے ہیں''۔ **''وسیلة المقصود تابعة للمقصود وکلاهما مقصود''**. (اعلام الموقعین :۱۷۵/۳)

لیکن مقاصد حسنہ کی تحصیل کے لیے وہی ذرائع اور وسائل اختیار کیے جاسکتے ہیں، جو شرعاً مباح ہوں، اس لیے صحت وتندرستی کی تحصیل کے لیے بھی وہی ورزشیں اور ریاضتیں جائز ہوں گی، جو شرعاً مباح ہوں۔

آج کل ایک ورزش جسے ہم ''یوگا'' کے نام سے جانتے ہیں، بہت عام ہورہی ہے، جب کہ اس کی حقیقت کو جاننے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقائد اسلام، تعلیماتِ اسلام کے سراسر خلاف اور متصادم ہیں، مثلاً:

(۱) یوگیوں کا یہ عقیدہ کہ یوگا سے صحت وتندرستی حاصل ہوتی ہے، یہ اسلامی عقیدے

کے سراسر منافی ہے، کیوں کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ صحت وتندرستی اللہ کا عطیہ ہے، اور ہر بیماری سے شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے، نہ کہ یوگا۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وإذا مرضت فهو يشفين﴾ . (سورة الشعراء : ۸۰)

نیز شریعت ہمیں اپنی دعاؤں میں بھی اس کی تعلیم دیتی ہے، جیسے:

" أذهب البأس رب الناس ، واشف أنت الشافي ، لا شفاء إلا شفاؤک لا يغادر سقمًا " . (سنن النسائي : ۲۵۸/۴، رقم : ۷۵۰۸)

شریعتِ مطہرہ نے شفا کے جو طریقے بیان کیے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں: عقلی ونقلی، نقلی طریقے، مثلاً: قرآن کی آیات، اسمائے الٰہیہ وغیرہ پڑھ کر دم کرنا، دعا کرنا، آبِ زم زم شفا کی نیت سے پینا، شہد استعمال کرنا، کلونجی کا استعمال، پچھنہ لگوانا، روزہ رکھنا وغیرہ۔

عقلی طریقے، مثلاً: وہ طریقے جو ماہرینِ طب دواؤں اور جڑی بوٹیوں پر تجربہ کرکے بیان کرتے ہیں، مگر ہر صورت میں مسلمان کا یہ اعتقاد ہوگا کہ مؤثر بالذات ومؤثر حقیقی صرف اور صرف اللہ ہی ہے، یہ تمام چیزیں مؤثر حقیقی نہیں ہیں۔

(۲) اسی طرح یوگی کہتے ہیں کہ یوگا کرنا حصولِ سعادت اور اس کا ترک شقاوت کا ذریعہ ہے، یہ بھی عقیدۂ اسلام کے خلاف ہے، کیوں کہ سعادت وشقاوت مقدر من اللہ ہے، سعادت نہ یوگا سے حاصل ہوتی ہے، اور نہ ہی ترکِ یوگا موجبِ شقاوت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: عن عبد الله بن مسعود يقول : « الشقي من شقي في بطن أمه ، والسعيد من وعظ بغيره » .

(السنن الكبرى للبيهقي : ۶۹۲/۷، رقم : ۱۵۴۲۴)

(۳) نیز یوگیوں کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ یوگا سے عمر میں زیادتی ہوتی ہے، عمر بڑھتی ہے، ان کا یہ عقیدہ بھی اسلامی عقائد کے سراسر خلاف ہے، کیوں کہ عمر مقدر من اللہ

ہے، نہ اس میں کمی ہوسکتی ہے اور نہ بیشی (زیادتی)، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**وما يعمر من معمر ولا ينقص من عمره إلا في كتاب**﴾ . اور نہ عمر پاتا ہے کوئی بڑی عمر والا، اور نہ گھٹتی ہے کسی کی عمر مگر لکھا ہے کتاب میں۔ (سورۂ فاطر : ١١)

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو طویل عمر عطا فرماتے ہیں، وہ پہلے ہی لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، اسی طرح جس کی عمر کم رکھی جاتی ہے وہ بھی سب لوحِ محفوظ میں پہلے ہی درج ہے، کسی کو عمر طویل دی جاتی ہے، کسی کو کم۔ امام نسائی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ((**من سره أن يبسط له في رزقه وينسأ في أثره فيلصل رحمه**)) . جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی (برکت) ہو، تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

(ملخص از معارف القرآن: ٧/ ٣٢٧، ٣٢٨)

عن حذيفة بن أسيد يبلغ به النبي ﷺ قال : " يؤكل الملك على النطفة بعد ما تستقر في الرحم أربعين يومًا ، أو خمس وأربعين ليلة فيقول : أي رب ! ماذا أشقي أو سعيد ؟ فيقول الله عز وجل : فيكتبان ثم يقول : أي رب ! ذكر أم أنثى ؟ فيقول الله عز وجل : فيكتبان ، فيكتب عمله وأجله ورزقه وأثره ، ثم ترفع الصحف فلا يزاد فيها ولا ينقص " . (سنن الكبرى للبيهقي :٧/ ٦٩٢)

(٤) اسی طرح یوگیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یوگا سے روحانی صفائی (تزکیۂ نفوس) حاصل ہوتی ہے، جب کہ روحانی صفائی اور تزکیۂ نفس کے لیے وہی طریقہ معتبر ہے، جو شریعت نے ہمیں بتلایا ہے، وہ یہ کہ جس طرح جسم کی غذا روٹی پانی وغیرہ ہے، ایسے ہی

روح کی غذا ذکراللہ ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فاذكروني أذكركم﴾. (سورة البقرة: ۱۵۲) . (تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا)۔ ذکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں، اور ذکر کا نتیجہ ہے: ﴿ألا بذكر الله تطمئن القلوب﴾. (ذکراللہ سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)۔ (سورۃ الرعد: ۲۸)

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿استعينوا بالصبر والصلوة﴾ . (صبر اور نماز کے ذریعہ مدد طلب کرو)۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۳)

آیتِ کریمہ میں '' استعينوا ''عام ہے، یعنی صبر اور نماز یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جا سکتی ہے، جیسے: قلبی سکون، روحانی صفائی، تزکیۂ نفس وغیرہ، اور نماز تمام ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اِکسیر اور مؤثر بالخاصہ ہے، بشرطیکہ کما حقہ اس کے تمام آداب کی رعایت اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھی جائے۔

(ملخص از معارف القرآن: ۱/۳۹۱-۳۹۵)

(۵) علاوہ ازیں یوگیوں کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ یوگی تمام افکار سے متجرد ہوتا ہے، جب کہ اسلامی تعلیمات مسلمان کو فکرِ آخرت کی تلقین کرتی ہیں، اور ایک مسلمان ہمہ وقت نہ صرف اپنی موت کو یاد کرتا ہے، بلکہ اسے اس کا حکم بھی دیا گیا ہے: '' أكثروا ذكر هازم اللذات '' .

(سنن الترمذي: كتاب الزهد، رقم: ۲۳۰۷، سنن النسائي: ۱/۲۰۱، رقم: ۱۹۵۰)

یوگا سے متعلق علمائے اسلام کے فتاوی وآراء:

ملیشیا کی ''مجلسِ اسلامی کبیر'' کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ''یوگا'' حرام ہے، کیوں کہ یہ ریاضت بودھ مذہب کے دین اور بدھسٹوں (Bugghist) سے مربوط ہے، اور اس کا طریقہ اس مذہب کی حرکاتِ دینیہ پر مشتمل ہے۔ کویتی علمائے دین نے اس فتویٰ سے اپنے اتفاق کا اظہار کیا ہے۔

اسی طرح دکتور عجيل النشمي (جو علوم شرعیہ کے مشہور ومعروف اسکالر ہیں)، دکتور بسام الشطبي (فقہ وشریعت کے مشہور ومعروف عالم)، دکتور عبد اللّٰه الهبدان (نور الاسلام ویب سائٹ)، فوز بنت عبد اللطيف الكردي (ماہر علم عقائد وادیانِ معاصرہ) وغیرہ، اوران کے علاوہ بہت سارے علمائے کرام نے ''یوگا'' کو حرام قرار دیا ہے۔

مفتیٔ مصر فضيلة الشيخ علي جمعة فرماتے ہیں:

تعد اليوجا من طرق التمسک الهندوكية ؛ فلا يجوز اتخاذها طريقًا للعبادة ..... فإتخاذها بهذه الصفة التعبدية ضلال قطعًا ..... أما من يقوم بحركات تشبهها ولم تخطر بباله ارتباطها بتمسک الهندوک ؛ فهو من باب التشبه المنهي عنه شرعًا ؛ والأصل في ذلک ما ورد عن النبي ﷺ أنه نهى في كثير من أحاديثه عن التشبه بغير المسلمين في ملبسهم ومشربهم ومأكلهم ، فهذا التشبه من باب الحرام . (فتاوی عصرية: ص/۴۵۱)

خلاصۂ فتویٰ: یوگا، یوگیوں کے عقائد کا التزام نہ کرنے کے باوجود بھی حرام ہے، کیوں کہ یہ اس تشبہ میں داخل ہے، جو شرعاً ممنوع ہے، کیوں کہ ''یوگا'' ایک خاص قسم کی

ورزشی نشست ہے، جو بدھسٹوں کا شعار ہے،اور جب وہ ایک خاص قوم کا دینی شعار ہے،تو وہ خواہ ریاضت ہی ہو،ہمیں اس طرح کی ریاضت سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ صومِ عاشورا فی نفسہٖ عبادت ہے،مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں بھی ہمیں یہود کی مخالفت کا حکم دیا،اور ارشاد فرمایا کہ صرف دسویں تاریخ کا روزہ نہ رکھو، بلکہ اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی ایک روزہ رکھ لو، تا کہ یہود کی مشابہت لازم نہ آئے۔ **روي عن ابن عباس أنه قال : ((صوموا التاسع والعاشر وخالفوا اليهود))** . (سنن الترمذي : ۱/ ۱۵۸ ، سنن الكبرى للبيهقي : ۴/ ۴۷۵ ، رقم : ۸۴۰۵)

جب ہمیں عبادتوں میں غیروں کی مشابہت سے منع کیا گیا،تو ریاضتوں اور ورزشوں میں بدرجۂ اَولیٰ یہ ممانعت ہوگی،خصوصاً جب کہ وہ ریاضتیں کسی قوم کا شعار،مشرکانہ کلمات ،اور غیر اسلامی عقائد وافکار پر مشتمل ہوں۔اللہ رب العزت کا فرمان ہے: **﴿لا تركنوآ إلى الذين ظلموا فتمسكم النار﴾** . اوران لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں (اپنے حق میں) ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ چھو جائے گی۔
(سورۃ ہود:۱۱۳)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مراد ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو، اوران کا کہا نہ مانو ،ابن جریج نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابو العالیہ نے فرمایا کہ ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو(قرطبی)،سدّی نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو، یعنی ان کے برے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔ (معارف القرآن:۴/ ۶۷۳)

قال ابن عباس : أي لا تميلوا ، والركون المحبة والميل بالقلب ، وقال أبو العالية : لا ترضوا بأعمالهم ، وقال عكرمة : لا تطيعوهم ؛ قال البيضاوي : لا تميلوا إليهم أدنى ميل ؛ فإن الركون هو الميل اليسير كالتزيي بزيهم وتعظيم ذكرهم .

(حاشية القونوي على تفسير البيضاوي : ۱/۲۲۶ ، تفسير المظهري : ۴/۴۳۰)

ما في الحديث : '' من تشبه بقوم فهو منهم '' .

(سنن أبي داود: ص/۵۵۹ ،كتاب اللباس)

أي من شبه نفسه بالكفار ، مثلاً في اللباس وغيره أو بالفساق والفجار أو بأهل التصوف والصلحاء والأبرار .(مرقاة المفاتيح :۸/۲۲۲ ، رقم :۴۳۴۷)

قال مالک بن دينار رحمه اللّٰه : أوحى اللّٰه تعالى إلى نبي من الأنبياء ، أن قل لقومک : '' لا يدخلوا مداخل أعدائي ، و لا يلبسوا ملابس أعدائي ، ولا يركبوا مراكب أعدائي ، ولا يطعموا مطاعم أعدائي ، فيكونوا أعدائي كما هم أعدائي '' . (الزواجر عن اقتراف الكبائر:ص/۲۵)

اگرکسی کو ریاضت وورزش کر کے صحت وتندرستی ہی حاصل کرنی ہے،تو وہ مباح ورزشوں اورریاضتوں کواپنائے ،مثلاً:سباحت ،گھڑسواری،تیراندازی،وغیرہ۔

عن عقبة بن عامر قال (في حديث طويل) : سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول : ليس من اللهو إلا ثلاث : تأديب الرجل فرسه ، وملاعبته أهله ، ورميه بقوسه ونبله . الحديث . (سنن أبي داود : رقم :۲۵۱۳)

حرم عليه الصلاة والسلام كل لعب واستثنى الملاعبة بهذه الأشياء المخصوصة فبقيت الملاعبة بما ورائها على أصل التحريم ، إذ الاستثناء تكلم بالباقي بعد الثنياء .(بدائع الصنائع : ۸/۲۴۶ – ۲۴۸ ، كتاب السباق . رد المحتار : ۹/۵۰۲)

اسلامی عبادتوں میں جہاں عبادت وبندگی کا پہلو ہے، وہیں ان میں صحت وتوانائی، تندرستی وچستی کا بھرپور سامان موجود ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کی حیثیت تبعیت کی ہے، اصل کی نہیں، اصل تو وہ عبادتیں ہی ہیں، اگر کوئی مسلمان اسلامی عبادتوں کو پورے اہتمام واعتنا کے ساتھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طرق ونقوش کے مطابق انجام دے، تو یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ نہ صرف ان سے اخروی فلاح وبہبودی حاصل ہوگی، بلکہ اس دنیا میں بھرپور صحت وتندرستی بھی مل جائے گی، جیسا کہ نماز وروزہ کی حکمتوں اور اسرار ورموز پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

نماز بہت سے امراض سے انسان کو دور رکھتی ہے، مثلاً: دماغی امراض (Mental Disesases)، اعصابی امراض (Nerve Diseases)، نفسیاتی امراض (Psychics Diseases)، بے سکونی، ڈپریشن اور بے چینی کے امراض (Restlessness Depression&Anxiety)، دل کے امراض (Heart Diseases)، جوڑوں کے امراض (Arthritis)، یورک ایسڈ سے پیدا ہونے والے امراض (Diseases Due To Urik Acid)، معدے اور السر کی شکایت (Stomach Ulcer)، شوگر اور اس کے مابعد اثرات (Suger&Its After Effects)، آنکھوں اور گلے کے امراض (Eye&E.N.T Diseases)۔

اسی طرح روزہ جہاں ایک خالص عبادت ہے، وہیں یہ بے شمار دنیوی فوائد سے مالا مال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صوموا تصحوا''. روزہ رکھا کرو تندرست رہا کروگے۔ (کنز العمال:۸/۶۰۰، ۲۳۶۰۰)

ایک نہیں بے شمار مبارک احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ امراضِ جسمانی کے لیے شفا ہے۔ (سنت نبوی اور جدید سائنس)

لیکن کیا کہیں اور کس کو کہیں؟ آج ہر شخص قومی یک جہتی، سیکولرازم، جمہوریت نوازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں ایسا لگا ہوا ہے کہ وہ یہ تک نہیں سوچ رہا ہے کہ اس قومی یک جہتی، سیکولرازم اور جمہوریت نوازی سے میرے کن عقائد اور افکار ونظریات پر زد پڑتی ہے۔ اور کبھی یہ کہہ کر دین میں مداہنت کو برداشت کرلیا جاتا ہے، کہ قوم وملت کے لیے مصلحت اسی میں ہے۔

یاد رکھیں! کسی قوم کی دوسری قوم کے ساتھ اس طرح کی یک جہتی کہ اس کا اپنا تشخص وامتیاز ہی ختم ہو، اور وہ اپنے افکار ونظریات سے دست بردار ہو، یہ یک جہتی نہیں بلکہ اس قوم کے عقائد اور اس کے افکار ونظریات سے ہم آہنگی ہے، اور یہی غیروں کا مقصد بھی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿**ولن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم قل إن هدى الله هو الهدى ولئن اتبعت أهوآئهم بعد الذي جاءك من العلم مالك من الله من ولي ولا نصير**﴾ . اور آپ سے یہود ونصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے، جب تک کہ آپ ان کے مذہب کی پیرو نہ ہوجائیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی (بتلائی ہوئی) تو راہ بس وہی ہے، اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے، تو آپ کے لیے اللہ کی (گرفت) کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار۔

(سورۃ البقرۃ: ۱۲۰)

اگر یوگا کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا جائے کہ مسلمان یوگیوں کے مخصوص کلمات کی جگہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر پڑھیں، تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کس کس کو یہ

بتانے جائیں گے؟ اور ہوسکتا ہے کہ کوئی مسلمان ان کلمات کو اپنے زبان سے ادا کرے کہ دیکھیں، انہیں کہنے سے کیا سکون وطمانینت حاصل ہوتی ہے، اور بالفرض اگر اسے کچھ راحت وسکون مل جائے، اوراس کو معمول بنائے، تو کیا آپ اس کو روک سکیں گے؟ اور کیا یوگا کی اجازت دینا انحراف واعراض عن الاسلام کی اجازت دینے کے مترادف نہیں ہوگا؟ اس لیے خدارا! کسی بھی چیز کو جائز قرار دینے سے پہلے ذرا یہ غور کرلیں کہ کیا ان قیود اور شرطوں کا پاس ولحاظ رکھا بھی جائے گا، جو آپ نے اس چیز کے جواز کے لیے لگا رکھی ہیں؟ عام لوگ تو ہمارے جواز ہی کو لے اڑیں گے، کہ علمائے اسلام نے یوگا کو جائز قرار دیا، جیسا کہ بعض علماء کے اس طرح کے بیانات کو اخباروں نے شائع بھی کیا ہے۔

اگر کوئی یوگا کرنے والا شخص یہ کہے کہ ہم وہ کلمات اپنی زبان سے ادا نہیں کرتے جو یوگی کرتے ہیں، اور نہ ہی ہمارا وہ عقیدہ ہے جو ان یوگیوں کا ہے، تب بھی سداً للذرائع یہ ورزش منع ہوگی، کیوں کہ شریعتِ اسلامی نے ان تمام ذرائع اور طریقوں کو اپنانے سے بھی منع کیا، جن سے دانستہ ونادانستہ انسان شرک وکفر اور معصیت میں مبتلا ہوسکتا ہے، یا جن سے غیروں کی، ان کی عبادات وافعال میں مشابہت لازم آتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے طلوع وغروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا، اورآپ نے اس ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے مابین طلوع اور غروب ہوتا ہے، اوراس وقت کفار اسے سجدہ کرتے ہیں۔

ہم اور آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ہر مومن صرف اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے، اور بہت سے لوگوں کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ سورج کا طلوع اوراس کا غروب شیطان

کے دوقرنوں (سینگوں) کے مابین ہوتا ہے، اور کفار اسے سجدہ کرتے ہیں، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دووقتوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا، تاکہ کسی بھی طرح کافروں کی مشابہت لازم نہ آئے، اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ مشرکین اپنی جن کفریہ وشرکیہ عبادتوں کو انجام دیتے ہیں، مسلمانوں کو ان کی ظاہری شکل وصورت اختیار کرنے سے بھی منع کیا جائے گا، خواہ مسلمانوں کا قصد وارادہ وہ نہ بھی ہو، جو کافروں کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی آدمی کو سجدہ کرے خواہ اس کا یہ قصد وارادہ نہ ہو کہ یہ میرا الٰہ ومعبود ہے، تب بھی اسے اس سجدے سے منع کیا گیا، کیوں کہ اس سے غیر اللہ کے لیے مشابہتِ سجود لازم آتی ہے۔

(الشرک باللّٰہ أنواعه وأحکامه : ص/۲۰۵، الموسوعة الفقهية : ۱۲/۱۳)

" ما أفضى إلى الحرام كان حرامًا " . (موسوعة قواعد الفقهية : ۹/۴۲)

جو چیز خلافِ کتاب وسنت ہو، خواہ وہ ان دانش وروں کے نزدیک مصلحت ہو، لیکن شرعاً وہ کبھی بھی مصلحت نہیں ہوسکتی، کیوں کہ مصلحت اور شریعت دونوں میں تضاد ہے ہی نہیں، اگر دونوں میں تضاد ہو تو سمجھ جاؤ کہ وہ مصلحتِ شرعیہ نہیں، بلکہ مصلحتِ مظنونہ وخیالیہ ہے، اور کسی بھی حال میں اس کا اعتبار کرنا صحیح نہیں ہے۔

فقد ثبت بالدليل الذي لا يقبل الريب أن إجماع الصحابة والتابعين وأيمة الفقه قد تم على أن المصلحة لا يمكن لها أن تعارض كتابا ولا سنته فإن وجدنا ما يظن أنه مصلحة وقد عارضت أصلا ثابتًا من أحدهما فليس ذلك بمصلحة إطلاقًا ، ولا تعتبر بحال .

(ضوابط المصلحة للبوطي : ص/۱۹۳، الاجتهاد المقاصدي : ص/۱۵۱)

''یوگا'' کے علاوہ ''الطب البدیل'' کے نام سے اور بھی بہت سی ریاضتیں اور ورزشیں دنیا کے مختلف خطوں میں رائج اور شائع ہیں، مثلاً:

(۱)فلسفۂ طاویہ کا ایک طریقہ(KI QI CHI)

(۲)نظامِ شکرات(CHAKRAT)

(۳)تاتشیون(TACHYONS)

(۴)تای شی شوان(COMBINED WITH UNIV)

(۵)فینغ شوی(FENG SHUI)

(۶)تأملِ ارتقائی (TRANSCENDENTAL MEDITATION)

(۷) N.L.P.---(NEURO LINGUISTIC PROGRAMMING)

(۸)ماکروبیٹک(MACROBIOTIK)

(۹)تصویرِ اُورا(AURA PHOTOGRAPHY)

جن میں ''یوگا'' ہی کی طرح شرکیات اور تشبہ کی آمیزش ہے، اس لیے یہ سب بھی ناجائز ہیں، کیوں کہ جب ہمارے پاس طبِ اصیل (طب نبوی ﷺ) موجود ہے، تو ہمیں غیروں کی طبِ بدیل (ALTERNATIVE MEDICINE) کو اختیار کرنے کی ایسی کونسی ضرورت لاحق ہے کہ اس کے کلماتِ کفر وشرک اور تشبہِ ممنوع پر مشتمل ہونے کے باوجود وہ ہمارے لیے جائز ہو؟ اس لیے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہم اپنے عقائد اور افکار ونظریات کی پوری حفاظت کریں، اور ہر اس فکر ونظر، طرز

وادا سے پوری طرح پرہیز کریں، جس سے عقائدِ اسلام اور اس کے افکار ونظریات پر زد پڑتی ہو، اور ہمارے اسلامی تشخص وامتیاز کو خطرہ لاحق ہوتا ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿یآ ایھا الذین اٰمنوا ادخلوا في السلم کآفّۃ﴾ . اے ایمان والو! تم اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ۔ (سورۃ البقرۃ:۲۰۸)

آؤ! ہم آج یہ عہد کریں کہ اپنے قلوب کو ایمان سے معمور کریں گے، قرآن اور سنت کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گے، ادعیۂ مأ ثورہ اور دیگر شرعی طریقوں سے اپنی جسمانی وروحانی بیماریوں کا علاج کریں گے، اور غیر شرعی اُمور سے مکمل اجتناب کریں گے، تاکہ دنیا وآخرت کی کامیابی ہمارا مقدر بن جائے۔

آؤ ہم سب مل کر یہ دعا کریں:

اے اللہ! تو ہی دلوں کو پھیرنے والا ہے، ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔

اے اللہ! ہم پناہ مانگتے ہیں ان فتنوں سے جو ظاہر ہو چکے ہیں، اور جو ظاہر ہونے والے ہیں۔

اے اللہ! تو ہمیں حق کو حق گرداننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرما، اور باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔ (آمین!)

واللّٰہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم

مؤرخہ: ۲/۶/۱۴۳۰ھ

فل باڈی اسکریننگ (Full Body Screening) کا حکمِ شرعی

لباس قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے، اور یہ نعمت صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ پوری اولادِ آدم کے لیے ہے، مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر تمام لوگ لباس کو نہ صرف نعمت بلکہ اسے انسان کی ضرورت میں شمار کرتے ہیں، اللہ رب العزت نے اپنے فرمان: ﴿یٰبَنِيٓ اٰدم قد أنزلنا علیکم لباسًا یُّواري سواٰتکم وریشًا﴾ ۔(اے اولادِ آدم ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا، جو تمہارے ستر یعنی پردے والے بدن کو بھی چھپاتا اور تمہارے بدن کے لیے موجبِ زینت بھی ہوتا ہے) (سورۃ الاعراف:۲۶) میں اسی انعام کی قدردانی کا حکم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں لباس کے دو فائدے بیان فرمائے ہیں:

(۱) لباس سے ستر پوشی یعنی انسانی بدن کے وہ حصے چھپ جاتے ہیں، جو چھپانے کے قابل ہیں، اور ان کے کھلے رہنے کو انسان فطرتاً (Naturaly) قابلِ شرم سمجھتا ہے۔(۲) لباس انسان کے لیے سامانِ زیب وزینت ہے، کہ انسان اس سے زیب وزینت حاصل کرتا ہے۔

ان دونوں فائدوں میں سے پہلے فائدے کو مقدم بیان کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی لباس کا اصل مقصد ستر پوشی ہے، اسی لیے اگر کسی انسان کے لباس پہننے کے باوجود اس کے اعضائے جسمانی یا ان کی ساخت وبناوٹ، نشیب وفراز دکھائی دیتے ہوں، تو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برہنہ اور ننگا فرمایا ہے، حضرت ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

’’جہنمیوں کی دو جماعتیں ہیں، میں نے ان دونوں (کی طرح) کو نہیں دیکھا، ایک ایسی قوم ہے کہ ان کے ساتھ گایوں کی دُموں کی طرح کوڑے ہیں، جن سے وہ لوگوں کو مار رہے ہیں، اور ایسے کپڑے پہنی ہوئیں عورتیں ہیں جو برہنہ ہیں، مائل کرنے والی اور مائل ہونے والی ہیں، ان کے سر بُختی اونٹوں کے جھکے ہوئے کوہانوں کی مانند ہیں، جو جنت میں داخل نہیں ہوں گی، اور نہ وہ اس کی خوشبو پاسکیں گی، جب کہ اس کی خوشبو اتنی اتنی مسافت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔‘‘

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : ” صنفان من أهل النار لم أرهما ؛ قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس ، ونساءٌ كاسيات عاريات مميلات مائلات ، رؤوسهن كأسنمة البخت المائلة لا يدخلن الجنة ولا يجدن ريحها ، وإن ريحها لتوجد من مسيرة كذا وكذا“. (صحيح مسلم : ۲۰۵/۲، كتاب اللباس ، باب النساء الكاسيات العاريات المائلات المميلات)

حضرت آدم وحوا علیہما السلام اور اغوائے شیطانی کے واقعہ میں شیطانی حملہ کا پہلا اثر یہی ہوا کہ ان دونوں کے جسموں سے جنتی لباس اتر گئے، اور وہ ننگے رہ گئے، اور پتوں سے اپنے ستر چھپانے لگے، آج بھی شیطان اپنے شاگردوں کے ذریعے تہذیب وثقافت، آزادیٔ فکر وخیال اور جدید ترقی کے نام پر انسانوں کے لباس اُتروانے میں پوری طرح مصروف ہے، کہیں تو وہ اس فکر کو عام کررہا ہے کہ انسان چوں کہ برہنہ پیدا ہوا ہے، تو اس کا برہنہ اور ننگا ہونا فطری چیز ہے، اس لیے اسے برہنہ ہی زندگی گزارنا چاہیے، کہیں اس برہنگی کو رواج دینے کے لیے برہنہ ہوکر ہوائی سفر کرنے کے لیے،

ہوائی خدمات (Air Services) شروع کرنے پر غور کروا رہا ہے، تو کہیں اسکولی نصابوں میں سیکس اور جنسی تعلیم کو داخل کروا رہا ہے، تو کہیں ہم جنسوں کے آپسی جنسی تعلق اور شادی سے پہلے جنسی تعلق کو عدالتوں کے ذریعے پروانۂ جواز عطا کر رہا ہے، جب کہ انسانوں اور حیوانوں میں امتیاز یہی لباس اور شرم وحیا ہے، فقہ وفتاویٰ میں فقہائے کرام اور مفتیانِ عظام نے صاف طور پر اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ مردوعورت پر ستر انسانی کا چھپانا جس طرح نماز کی حالت میں فرض ہے، اسی طرح نماز کے باہر کی حالتوں میں بھی فرض ہے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحت نماز کی چوتھی شرط ستر عورت ہے، اور اس کا وجوب عام ہے، گرچہ خلوت ہی میں ہو، صحیح قول کے مطابق، مگر کسی غرضِ صحیح کے لیے اسے کھولنے کی اجازت ہے، وجوب کے عام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور نماز کے باہر دونوں حالتوں میں اس کا چھپانا فرض ہے۔

قال ابن عابدين الشامي رحمه الله : قوله : (الرابع ستر العورة) ووجوبه عام ولو في الخلوة على الصحيح ، إلا لغرض صحيح . قوله : (وجوبه عام) أي في الصلاة وخارجها . قوله : (ولو في الخلوة) أي إذا كان خارج الصلاة يجب الستر بحضرة الناس إجماعًا ولو في الخلوة على الصحيح .

(رد المحتار : ۲/۷۵ – ۷۸ ، كتاب الصلاة ، باب شروط الصلاة)

اس وقت امریکہ، برطانیہ اور مختلف مغربی ممالک نے سیکوریٹی کا ہوّا کھڑا کر کے اپنے تمام ہوائی اڈوں پر مکمل جامہ تلاشی (Full Body Screening) کا حکم صادر فرمایا، جس کی وجہ سے لباس کے نیچے اگر کوئی چیز چھپائی گئی ہو، تو اس کا پتہ چل جاتا ہے، یعنی مسافر کی ننگی ساخت دکھ سکتی ہے، اور جو شخص جامہ تلاشی سے انکار کرے اس کو سفر کی اجازت نہیں ہوگی، مغربی حکومتوں کے سیکوریٹی خدشات کے پیش نظر اس

اقدامی صورت کی بابت شرعی نقطۂ نظر سے ہماری رائے یہ ہے کہ شرعاً یہ بالکل جائز نہیں ہے، کیوں کہ:

اولاً:……تو ان حکومتوں کو ان عوامل اور محرکات کا جائزہ لینا چاہیے تھا، جن کی وجہ سے پورا عالم کرب واضطراب میں مبتلا ہے، ان کی وہ کون سی حکمتِ عملی ہے جس کی وجہ سے پوری دنیا میں حق وعدل پرست لوگ ان کے خلاف ہوتے جارہے ہیں، اوران کے وجود کو حق وانصاف کا قاتل خیال کرکے اس کو فنا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ثانیاً:……انہیں اس پر غور کرنا چاہیے تھا کہ کیا کسی ممکنہ خطرے کو دفع کرنے کے لیے اس طرح کی بے حیائی وبے شرمی پر مبنی حفاظتی تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے؟ کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ ''کسی بھی ضرر ونقصان کو اسی کے برابر یا اس سے بڑے ضرر کو اختیار کرکے زائل وختم کرنا جائز نہیں ہوتا''۔ **الضرر لا یزال بمثله** . (درر الحکام : ۱/۴۰ ، المادة :۲۵) **الضرر تجوز إزالته بضرر یکون أخف منه ولا یجوز أن یزال بمثله أو بأشد منه** . (درر الحکام : ۱/۴۰ ، تحت مادة :۲۷)

نیز یہ صرف اسلامی اصول ہی نہیں بلکہ عقلِ انسانی بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

ثالثاً:……ان حکومتوں کو چاہیے تھا خطروں سے نپٹنے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جاتی، جو اس طرح کی بے حیائی وبے شرمی اور کسی کو محض شک وشبہ کی بنا پر ذلیل ورسوا کرنے کی حماقت سے خالی وعاری ہوتی، اور آج کے اس ترقی یافتہ دور میں یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے، کیوں کہ ایسی ایسی مشینیں ایجاد ہوچکی ہیں کہ آپ اپنے گیلے ہاتھوں کو اس کے نیچے کردو، تو وہ گرم ہوا کو خارج کرکے آپ کے ہاتھوں کو خشک کرتی ہیں، آپ دروازے پر پہنچ جائے تو دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے، اور آپ گھر میں بیٹھ

کرکار کو پارکنگ (Parking) سے باہر بلوانا چاہیں، تو بلوا سکتے ہیں وغیرہ۔

مگر کیا کہیں! ان انسان نما حیوانوں کی صرف اور صرف ایک ہی فکر ہے کہ انسان کسی طرح سے بھی حیوان بن جائیں، اور وہ کسی طرح بھی جانوروں کی طرح مادرزاد برہنہ ہوکر گھومیں، اور گھومے نہیں تو کم از کم کپڑے پہننے کے باوجود اس کے وہ اعضا دکھائی دیں، جو اس نے فطری شرم وحیا کی وجہ سے چھپا رکھے ہیں۔

راقم السطور نے چند روز قبل نیٹ (Net) پر پڑھا کہ امریکہ میں دو استانی (Teacheresess) عورتوں نے اناٹومی (Anatomy) مضمون کے خشک ہونے اور طلبہ کے اس میں دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے، ان کے لیے سامانِ دلچسپی کی یہ صورت نکالی کہ خود برہنہ ہوکر طلبہ کو یہ مضمون پڑھایا، اب آپ ان کی فکری ونظری پستی اور بے عقلی کو دیکھئے کہ اگر استانیاں (Teacheresess) خود برہنہ ہو کر طلبہ کو پڑھائیں، تو طلبہ کی دلچسپی پڑھائے جانے والے مضمون سے ہوگی، یا ان معلمات واستانیوں کے ان اعضا سے جن کو عورتیں فطرتاً اجنبی مردوں کے سامنے چھپاتی ہیں۔ سچ ہے! انسان جب گمراہ ہوتا ہے تو اس کی عقل بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، اور اس کے فیصلے صحیح الفطرت، سلیم العقل انسان کے فیصلوں کے بالکل خلاف ہوا کرتے ہیں۔

اب ان حکومتوں نے فُل باڈی اسکریننگ کے فیصلے تو صادر کردیئے، لیکن ہم مسلمانوں کے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا کہ جن ممالک نے فُل باڈی اسکریننگ کیمرے اپنے ہوائی اڈے پر نصب کیے، مسلمان ان ممالک کا سفر کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں جواب یہ ہوگا کہ بلاضرورتِ شدیدہ اس طرح کے ممالک کا سفر ہرگز نہ

کریں، کیوں کہ ان ہوائی اڈوں (Airports) پرفُل باڈی اسکریننگ کیمروں سے گزرنا ایسا ہی ہے، جیسے بلاضرورت کسی کے سامنے اپنا ستر کھولنا، جوشرعاً حرام ہے۔

کما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : " يجب الستر بحضرة الناس إجماعًا ولو في الخلوة على الصحيح ". لوگوں کی موجودگی میں ستر کا چھپانا بالاتفاق واجب ہے، گرچہ تنہائی میں ہی ہو صحیح قول کے مطابق۔

(رد المحتار: ۷۸/۲ ، کتاب الصلاة ، باب شروط الصلاة)

ہاں! اگرضرورتِ شدیدہ ہو، تو ان ممالک کے سفر کرنے اورفُل باڈی اسکریننگ کیمروں (Full Body Screening Cameras) سے گزرنے کی شرعاً اجازت ہوگی، جیسے ضرورتِ علاج کے موقع پر ڈاکٹر کے سامنے بقدرِضرورت ستر کھولنے کی اجازت ہوتی ہے، کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے: **" الضرورات تبيح المحظورات "** کہ ضرورتیں ممنوعات کومباح قرار دیتی ہیں۔(الأشباه والنظائر: ص/۳۰۷) البتہ اس صورت میں مسافرہ عورت، دیکھنے والی افسر عورت کی درخواست کرے، کیوں کہ عورت کا عورت کو دیکھنا مخالفِ جنس کے دیکھنے سے کم تر ہے: **لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف .**

(التنوير مع الدر والرد : ۴۵۱/۹، ۴۵۲ ، الحظر والإباحة ، فصل في النظر والمس)

نیز فقہ کا قاعدہ بھی ہے کہ جو شخص دو مصیبتوں میں پھنسا ہو، تو وہ ان دونوں میں سے اَہون کو اختیار کرے۔ **" إن المبتلى من أمرين يختار أهونهما "** . (القواعد الفقهية لعلي أحمد الندوي: ص/۱۱۱) **" ثم الأصل في جنس هذه المسائل أن من ابتلي ببليتين وهما متساويتان يأخذ بأيتهما شاء ، وإن اختلفا يختار أهونهما ".** (الأشباه والنظائر لإبن نجيم الحنفي :ص/۷٦ ، دار الكتب العلمية بيروت)

" إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفّهما " .

(درر الحكام شرح مجلة الأحكام : ١ / ٤١ ، المادة : ٢٨ ، الأشباه والنظائر : ص/٧٦)

عام لوگوں سے انسانیت کے ناطے اور ہمارے ایک ایسے ملک کے باشندے ہونے کی بنا پر، جس کی اپنی ایک مخصوص تہذیب وثقافت (Private Culture) ہے، ایسی تہذیب جو مذہبی اقدار وروایات پر مشتمل ہے، میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ مغربی ملکوں کے ایسے بے ہودہ فیصلہ کو کلیۃً رد کردیں، نہ خود اختیار کریں، اورنہ دوسروں کو اختیار کرنے کی اجازت دیں، اورنہ ہی اس طرح کے فیصلوں کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اسے اپنے ملک میں نافذ العمل ہونے کی حوصلہ افزائی کریں۔

اللّٰهم إنا نسألك رحمة من عندك تُعصمنا بها من كل سوء . اللّٰهم إنا نسألك العفو والعافية في ديننا ودنيانا . اللّٰهم استر عوراتنا وآمن روعاتنا . اللّٰهم احفظنا من بين أيدينا ومن خلفنا وعن يميننا وعن شمالنا ومن فوقنا . ونعوذ بعظمتك أن نغتال من تحتنا۔ آمین ثم آمین!

///

مسئلۂ تکفیر

آج کل کسی کو کافر قرار دینے میں ہمارے معاشرے میں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف ذرا ذرا سے اختلاف کی بنا پر دوسروں پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں، تو دوسری طرف کوئی شخص کتنا ہی کافرانہ عقائد رکھے اس کے باوجود اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، تو اسے کافر نہیں کہا جاتا، جب کہ حق اِن دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔

تکفیر کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جب کوئی شخص دین کی بدیہی وضروری باتوں میں سے کسی بات کا انکار کرے، یعنی ایسی بات کا انکار کرے جو قرآن وسنت سے ثابت ہو، اور قرآن وحدیث کی دلالت اس بات پر بلکل واضح اور یقینی ہو، کسی دوسرے معنیٰ کا احتمال نہ ہو تو اس پر کفر کا حکم لگایا جائے گا، لیکن اگر یہ بات عام طور سے لوگوں میں دین کا حصہ ہونے کی حیثیت سے مشہور نہیں، تو پہلے اس کو متوجہ کیا جائے گا کہ آپ جس چیز کا انکار کر رہے ہیں وہ دین کی ضروری وبدیہی باتوں میں سے ہے، اور اس کی قطعیت کے دلائل بھی اس کے سامنے پیش کیے جائیں، اگر وہ مان لیتا ہے تو وہ مسلمان ہے، اور اگر نہیں مانتا تو کافر ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دین کی ضروری بات کے انکار پر کفر کا فتویٰ اسی وقت لگایا جائے گا، جب کہ انکار کرنے والے کا انکار بھی قطعی طور پر ثابت ہو، اگر کسی نے ایسا جملہ کہا جس میں انکار کے معنیٰ بھی ہوں اور کوئی دوسرا معنیٰ بھی، تو اس صورت میں کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

اسی طرح تکفیر کے باب میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ لزومِ کفر اور التزامِ کفر میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ اگر کسی آدمی نے ایسا کلمہ بول دیا جس سے کفر لازم آتا ہے، لیکن اس نے اس کا التزام اپنے اوپر نہیں کیا، یعنی بے خیالی میں کلمۂ کفر بول دیا، اگر چہ یہ کلمہ، کلمۂ کفر ہے، لیکن چوں کہ اس نے اپنے اوپر اس کا التزام نہیں کیا، اس لیے اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا، ہاں! اگر وہ یہ کہے کہ میرا مقصد کفر ہی ہے، تو پھر وہ کافر ہو جائے گا۔

فقہ وفتاویٰ کی کتابوں (مثلاً: مالا بدمنہ، فتاویٰ ہندیہ وغیرہ) میں اس سلسلے میں پورے پورے ابواب ہیں، جن میں بہت سارے جملے لکھے گئے ہیں کہ کسی نے یہ جملہ کہہ دیا تو وہ کافر ہو جائے گا، اور کسی نے یہ جملہ کہا تو وہ کافر ہو جائے گا، ان کا حاصل بھی یہی ہے کہ یہ جملے کلماتِ کفر تو ہیں مگر محض اُن کے بولنے پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا، بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس نے یہ بات کن حالات میں، کس صورت میں؟ کس ماحول میں؟ اور کس سیاق میں کہی ہے؟ اور اس کی مراد کیا ہے؟

الحجة على ما قلنا :

ما في " تفسير البيضاوي " : وفي الشرع : انكار ما علم بالضرورة مجيء الرسول به وإنما عدّ منه لبس الغيار وشدّ الزنّار ونحوهما كفرًا ، لأنها تدل على التكذيب ، فإن من صدق رسول الله ﷺ لا يجترئ عليها ظاهرًا لا لأنها كفر في أنفسها . (ص/۲۳ ، سورة البقرة)

ما في " الموسوعة الفقهية " : والكفر شرعًا : هو انكار ما علم ضرورة أنه من دين محمد ﷺ كإنكار وجود الصانع ، ونبوته عليه الصلاة والسلام وحرمة الزنا ونحو ذلك .

(۱۴/۳۵ ، كفر ، المنثور في القواعد للزركشي :۳/۸۴ ، ط : الشئون الإسلامية بالكويت)

ما في " الشرك بالله تعالى " : وأما في الاصطلاح : فقد تنوعت عبارات العلماء في تعريف الكفر : يقول ابن تيمية : الكفر : عدم الإيمان باتفاق المسلمين ، سواء اعتقد=

....

....

....

....

....

....

= بـنـقيضه وتكلم به أو لم يعتقد شيئًا ولم يتكلم . ويقول السبكي : هو : جحد الربوبية أو الـوحـدانية أو الـرسـالة أو قـول أو فـعل حكم الشارع بأنه كفر ، وإن لم يكن جحدًا . وبهذا يـظهر لنا أن الكفر قد يكون جحودًا أو قد يكون تكذيبًا وقد يكون إباءً أو استهزاءً وقد يكون اعتقادًا أو لفظًا أو عملا . (ص/۳۹ ، تعريف الكفر ، الباب الأول ، ط : دار الإيمان اسكندريه)

مـا فـي " مـعـجـم لـغة الـفقهاء " : الكفر : تكذيب النبي ﷺ بما جاء به مما هو معلوم من الـديـن بـالـضـرورة وهو ضدّ الإيمان . (ص/۳۸۳ ، الكفر ، التعريفات الفقهية :ص/۱۸۳ ، حرف الكاف ، القاموس الفقهي : ص/۳۲۱ ، الكفر ، ط : إدارة القرآن كراتشي)

مـا فـي " الـنبـراس شرح شرح العقائد النسفية " : (أهل القبلة) .. في اصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين أي الأمور التي علم ثبوتها في الشرع واشتهر فمن أنكر شيئًا من الـضروريات كحدوث العالم وحشر الأجساد وعلم اللّٰه سبحانه بالجزئيات وفرضية الصلاة والـصـوم لـم يـكـن مـن أهـل الـقبلة ..... ومعنى عدم تكفير أهل القبلة أن لا يكفر بارتكاب المعاصي ولا بانكار الأمور الخفية غير المشهورة ، هذا ما حققه المحققون فاحفظه .

(ص/۳۴۲ ، مـن قـواعـد أهـل السـنة أن لا يـكـفر أحد من أهل القبلة ، ط : مكتبه امداديه باكستان ، جواهر الفقه : ۱/۳۴ – ۳۶)

ما في " عقود رسم المفتي مع شرحه " : وكل قول جاء ينفى الكفرا . عن مسلم ولو ضعيفًا أحرى . (ص/۱۴۵ ، الضوابط المحرّرة ، رقم الشعر : ۵۰)

(فتح الملہم :۱/۵۱۴-۵۲۲،انعام الباری:۱/۳۲۲-۳۲۵)

جرائم کے ساتھ ساتھ اُن کے ذرائع پر بھی پابندی لگائی جائے ورنہ!!

''۱۸ دسمبر کو دہلی میں ایک ۲۳؍ سالہ لڑکی کی اجتماعی عصمت دری نے پورے ملک کو شرم سار کردیا'' - یہ جملہ تھا لوک سبھا اسپیکر ''میرا کمار'' کا، اس سنگین واقعہ کی بازگشت ملک کے کونے کونے میں سنائی دے رہی ہے، عوام اور خود حکومت کے اہل کار، حکومت سے سخت ترین اقدامات کا مطالبہ کررہے ہیں، اسی سلسلے میں ۲۰؍ دسمبر کو گرلز اسلامک آرگنائزیشن اور وِدیارتھی بھارتی طلبہ کی تنظیموں نے آزاد میدان میں احتجاج کیا، اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ بلا تاخیر سخت قدم اٹھائے، پورے ملک کا اس واقعہ کی سنگینی کو محسوس کرنا اور اس کے خلاف سخت اقدامات کا حکومت سے مطالبہ کرنا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آج بھی ہم ہندوستانیوں کا ضمیر برائیوں کے خلاف نہ صرف بیدار بلکہ محاذ آرائی کے لیے تیار ہے، جو کسی بھی ملک وملت اور سماج ومعاشرے کے خیر وبھلائی پر قائم رہنے کے لیے انتہائی ضروری ہے، مگر! یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کے مجرموں کے لیے سخت قانون بنانا اور ان کے خلاف سخت کارروائی کرنا، اس طرح کے واقعات آئندہ رونما نہ ہوں اس کے لیے کافی ہے، یا اس سے آگے بھی کچھ کرگزرنے کی ضرورت ہے؟؟

اس کے جواب کے لیے جب اسلامی قوانین پر نظر کی جاتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے نہ صرف برائی کو برائی قرار دیا، بلکہ اُس کے ذرائع کو بھی ممنوع قرار دے کر، مرتکبین کے لیے بلا کسی تفریق سخت سزائیں متعین کی، اور یہ بات معقول بھی ہے کہ جرم

اور اس کے تمام ذرائع ممنوع ہوں، کیوں کہ کسی بھی جرم کا انسداد اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے ذرائع بھی ممنوع قرار پائیں، مثلاً:

۱- شریعتِ اسلامیہ نے جہاں زنا کو حرام قرار دیا، وہیں اجنبیہ عورت کے ساتھ خلوت اور تنہائی اختیار کرنے کو بھی حرام کہا، کیوں کہ یہ خلوت زنا میں وقوع اور فتنہ کے حدوث کا ذریعہ ہے۔

۲ - اس نے رشوت لینے کو حرام قرار دیا، تو رشوت دینے کو بھی حرام گردانا، کیوں کہ یہ رشوت لینے والے کے فعلِ حرام میں اُس کا تعاون ہے۔

۳- اس نے جان کے تحفظ کو فرض قرار دیا، تو وہ تمام ذرائع جو انسان کو ہلاک کر سکتے تھے، انہیں بھی ممنوع قرار دیا، مثلاً زہر خوری، خودکشی، قتلِ ناحق وغیرہ۔

۴- اس نے عقلِ انسانی کے تحفظ کو ضروری قرار دیا، تو جو چیزیں اس میں مخل ہو سکتی تھیں، انہیں بھی ممنوعات کے دائرہ میں لے آئی، جیسے منشیات کا استعمال اور شراب نوشی وغیرہ۔

۵- اس نے انسان کی عزت کو تحفظ عطا کیا، تو جن چیزوں سے اُس کی ذات، یا اس کے آباء واجداد، یا حسب ونسب اور نیک نامی پر کوئی حرف آتا ہو، انہیں بھی نہ صرف منع کیا بلکہ اس پر سخت سزا تجویز کی کہ اگر کوئی انسان کسی پر زنا کی تہمت رکھے اور اُسے شرعی طریقہ سے ثابت نہ کر سکے، تو اُسے ۸۰/کوڑے لگائے جائیں۔

۶- اس نے انسان کے مال کو تحفظ دیا، تو اس چیز کو نہ صرف گناہ کہا، بلکہ اس پر سخت سزا بھی متعین کر دی، جس سے اس میں رخنہ اندازی ہوتی تھی، مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا، اور اس کی رہبری ورہنمائی کا سنگین جرم ہونا۔

۷- اس نے نسلِ انسانی کو تحفظ عطا کیا، تو ان تمام طریقوں اور ذرائع کو بھی ممنوع قرار دیا، جن سے اس میں خلل واقع ہوتا تھا، مثلاً دو ہم جنسوں کے درمیان جنسی تعلق اوراسقاطِ حمل وغیرہ کا حرام ہونا۔

۸- اس نے تحفظ نسب کو یقینی بنایا، تو ان ذرائع کو بھی سختی سے منع کیا جن سے یہ مقصد متاثر ہوتا تھا، مثلاً وقتِ واحد میں ایک ہی عورت کا دو مردوں کے نکاح میں ہونا، دوسرے کی منکوحہ یا اس کی معتدہ سے نکاح کرنا وغیرہ۔

اس کے برخلاف! جب ہم اپنے ملکی قوانین اور اُن پر عمل درآمد پر نظر کرتے ہیں، تو ایک عجیب قسم کا تضاد دکھائی دیتا ہے، مثلاً:

۱- ہمارے ملکی قانون میں رشوت لینا تو منع ہے، لیکن رشوت دینا منع نہیں، اور اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارا ملک رشوت وبدعنوانی کے معاملہ میں پوری دنیا میں آٹھویں درجے پر پہنچ چکا ہے، اور آئے دن نئی نئی بدعنوانیاں اخباروں کی شہ سرخیاں بنتی جارہی ہیں، جو لاکھوں اور کروڑوں روپیوں کی نہیں، بلکہ ایک ہزار کروڑ، دو ہزار کروڑ جیسی خطیر رقومات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا اُردو ۲۶/نومبر ۲۰۱۲ء کی یہ تحریر پڑھ کر تعجب ہوا کہ ملک کی عدالتِ عالیہ (سپریم کورٹ) نے اپنے ایک فیصلہ میں یہ کہا:

''اگر سرکاری اہل کار نے رشوت کی مانگ نہیں کی ہے، لیکن کسی نے اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی تھمادی، تو ایسے حالات میں اُسے بدعنوانی کا ملزم نہیں ٹھہرایا جاسکتا، رشوت کا مطالبہ انسدادِ بدعنوانی ایکٹ ۱۹۸۸ء کا لازمی حصہ ہے، رنگے ہاتھ پکڑے گئے سرکاری اہل کار کے خلاف یہ ثبوت ضروری ہے کہ اس نے رشوت کا مطالبہ کیا، اور

اس مطالبہ کے تحت اس نے رشوت کی رقم قبول کی۔'' (ممکن ہے سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے یہ فیصلہ کسی دفعہ کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے سنایا ہو، جس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں، مگر اسلامی نقطۂ نگاہ سے رشوت : رشوت ہے، خواہ اس کا مطالبہ کیا گیا ہو، یا نہ کیا گیا ہو، اور اس صورت میں بھی رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں مجرم وگنہگار ہیں، جیسا کہ حضراتِ فقہائے کرام یہ فرماتے ہیں کہ جب کسی انسان کو اُس کے عہدے اور منصب پر پہنچنے کے بعد کوئی شئے ہدیہ میں دی جائے، جب کہ پہلے سے اس ہدیہ دینے والی کی یہ عادت نہیں تھی، تو یہ بھی رشوت میں داخل ہے۔) (الموسوعة الفقهية)

۲- ہمارا قانون شراب پی کر ڈرائیونگ کرنے، یا بحالتِ نشہ اپنی ڈیوٹی کے فرائض کو انجام دینے کی اجازت تو نہیں دیتا، مگر شراب فروشی کو منع بھی نہیں کرتا، اور یہ کاروبار حکومت کے لائسنس کے ساتھ چلتا ہے۔

۳- ہمارا قانون کسی کی توہین وہتکِ عزت کی اجازت تو نہیں دیتا، مگر حقِ آزادیٔ رائے کے سہارے اِسے پامال کرنے کی گنجائش ہے، یہاں تک کہ اس حق کی حدود متعین نہ ہونے کی وجہ سے مذہبی پیشوا اور رہنما کی عصمت وعزت بھی محفوظ نہیں۔

۴- ہمارا قانون خواتین سے چھیڑ چھاڑ کو سخت گناہ گردانتا ہے، مگر مردوں اور عورتوں کے اختلاط پر کوئی پابندی نہیں، اور نہ ہی عورتوں کو ایسے کپڑے پہننے سے روکتا ہے، جن کی وجہ سے مرد اُن کی طرف مائل ہوکر اِس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔

۵- ہمارے قانون میں قتل وخون ریزی اور مذہب کی بنیاد پر اشتعال انگیزی تو جرم ہے، مگر اہلِ اقتدار کے عمل سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شرپسند عناصر کو اس کی کھلی اجازت ہے، حد تو یہ ہے کہ بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں اور برسرِ اقتدار شخصیتیں اس طرح کے

افراد کی نہ صرف پشت پناہی کرتی ہیں، بلکہ ان کے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں، اور اب تو ایک عرصہ سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض سیاسی پارٹیاں بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد کو اپنا پارٹی امیدوار نامزد کرکے انہیں انتخابات میں اُتار رہی ہیں، اور اُن کی کامیابی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں، نتیجتاً اسی طرح کے افراد منتخب ہوکر ایوانِ بالا وایوانِ زیریں کے اراکین بنتے جارہے ہیں۔

اس حقیقت کو عیاں کرنے کے لیے ۲۲؍دسمبر ۲۰۱۲ء کے اُردو روزنامہ ''انقلاب'' کی یہ خبر کافی ہے کہ:

''۳۶۹؍ممبران پارلیمنٹ اور اسمبلی پر خواتین کے خلاف جرائم کا الزام ہے''

۶- ہماری حکومت اور ہر شہری کی یہ چاہت ہے کہ ہندوستان کا ہر باشندہ بااخلاق، باکردار اور اچھا شہری بنے، مگر اخلاق وکردار کو تباہ وبرباد کرنے والی تحریروں، فلموں اور ڈراموں کی نہ صرف کھلی چھوٹ ہے، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ ہماری وہ نئی نسلیں جنہیں ہم اپنا مستقبل سمجھتے ہیں، انہیں پڑھائے جانے والے نصابِ تعلیم میں جنسی مضامین کو شامل کرکے، اُن کو غلط راہوں کی طرف ڈھکیلا جارہا ہے، اور پھر اُن سے یہ توقع کی جارہی ہے کہ وہ مہذب، بااخلاق اور اچھے کردار والے انسان بنیں، یہ سب تضادات ہیں، اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان جیسا امن وآشتی، اخوت وبھائی چارگی میں مثالی ملک دن بدن خطرناک بدامنی وانارکی کی طرف بڑھ رہا ہے، اور اس سے بے چین ہوکر حقیقت پسند طبیعتیں یہ پکار اُٹھ رہی ہیں کہ اگر اس دھرتی کو جرائم سے پاک کرکے امن وامان کو بحال کرنا ہو، تو اسلامی سزائیں نافذ کی جائیں، جیسا کہ ۲۲؍دسمبر ۲۰۱۲ء کا اُردو روزنامہ ''انقلاب'' کی یہ تحریر اس کا ثبوت ہے:

زانیوں کوسزا دینے کے لیے شرعی قانون نافذ کریں!

’’دہلی گینگ ریپ کا معاملہ سامنے آنے کے بعد اکھل بھارتیہ ہندو مہا سبھا کے سینئر نائب صدر اور وشو ہندو سینا کے صدر سوامی اوم جی نے کہا کہ زانیوں کو سزا دینے کے لیے شرعی قانون لاگو کیا جانا چاہیے، انہوں نے مزید کہا کہ جیسے اسلامی قانون میں زانی کو سزا دی جاتی ہے ویسے ہی ہندوستان میں بھی لاگو کیا جائے، اور اس کے لیے پارلیمنٹ میں ترمیمی بل لایا جائے، انہوں نے کہا اس معاملہ میں سعودی عرب میں جو سزا دی جاتی ہے وہی سزا ہندوستان میں بھی لاگو کی جائے، سوامی اوم جی کے مطابق انہوں نے اراکین پارلیمنٹ سے اس سلسلے میں گفتگو کی ہے، اور وہ بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، سوامی اوم جی نے کہا میں جلد سپریم کورٹ میں درخواست داخل کروں گا اور مطالبہ کروں گا کہ عدالت اس تعلق سے حکومت کو ہدایت دے۔‘‘

خلاصۂ تحریر یہ کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ جرائم کا انسداد ہو، اور مذکورہ واقعہ کی طرح مزید واقعات رونما نہ ہوں، تو ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اُن تمام ذرائع پر غور وفکر کر کے اُن پر بھی پابندی لگانی ہوگی، جن کی وجہ سے آئے دن اس طرح کی وارِدات سامنے آرہی ہیں، کیوں کہ جب تک جرائم کے ذرائع پر پابندی نہیں لگائی جاتی اس وقت تک اُن کی روک تھام ممکن ہی نہیں، اسلامی قوانین میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ: ’’حرام کام کا ذریعہ بھی حرام ہے‘‘ اور ’’ممنوع کا سبب بھی ممنوع ہے‘‘- " الوسيلة إلى الحرام حرام " – اور " ما كان سببا لمحظور فهو محظور " . (بدائع ، شامي)

اسی لیے شرعی قوانین میں معصیتوں کے ذرائع کو بھی معصیت قرار دیا گیا ہے، اور یہی اس کا وصفِ امتیازی ہے، جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی اور جس حد تک بھی نافذ ہیں،

وہاں جرائم کی شرح کم ہے۔

امید کہ ہماری اس تحریر کو اسی تناظر میں دیکھا جائے گا جس میں وہ لکھی گئی، مقصد تحریر یہی ہے کہ ہمارا یہ ملک ایسے امن وامان کا گہوارہ بنے، جس میں ہر کسی کی جان، مال، آبرو اور عزت محفوظ ہو۔ اور اس کے لیے قانون ساز اداروں، ماہر قانون دانوں، فاضل ججوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے کہ جرائم اور اُن کے ذرائع کے انسداد وروک تھام کے لیے کن کن تدبیروں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے؟!

وإلى الله المشتكي وعليه التكلان

///

کیا مالی جرمانہ جائز ہے؟

مجرم کو کسی بھی جرم کی تنبیہ کے لیے کئی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، اسے جیل کی سزا دی جاتی ہے، اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، مار پیٹ کی جاتی ہے، کوڑے لگائے جاتے ہیں، سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے، جرمانہ کے طور پر کچھ رقم وصول کی جاتی ہے، اس طرح کے مختلف طریقے ہیں جو مختلف معاشرے میں رائج ہیں، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے مجرم جرم سے باز آجائے، اس کی اصلاح ہو، دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں، اور جرائم سے دور رہیں، اور معاشرے میں نظم وضبط، امن وسکون برقرار رہے، سزا کے مختلف طریقوں میں مالی جرمانہ بھی ہے، جو بہت پُرانا اور جانا پہچانا طریقہ ہے، حکومتیں بھی جرمانہ عائد کرتی ہیں، اور گاؤں تھانہ علاقے کے ذمہ دار حضرات بھی۔

یہ جرمانہ اجتماعی بھی رہا ہے اور انفرادی بھی۔ کوئی ایسا جرم یا غفلت جو بہت سارے لوگوں سے ہو، اور جس غفلت کے برے نتائج سامنے آجائیں، ایسے موقع پر اجتماعی جرمانہ لگایا جاتا ہے، اور اگر کسی ایک یا چند حضرات کی غفلت یا جرم سے کوئی صورتِ حال سامنے آتی ہے، تو ایسے موقع پر انفرادی جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مجرم کی اصلاح اور سرزنش کے لیے جرمانہ وصول کرنا اور مالی دھچکا لگانا درست ہے یا نہیں؟ شرعی نقطۂ نظر سے مالی جرمانہ کی گنجائش کہاں تک ہے؟

عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ فقہائے کرام اسے درست نہیں مانتے، تعزیرًا کسی سے کوئی رقم لینا فقہائے کرام نے ناجائز سمجھا ہے، ''درمختار'' میں یہ صراحت موجود ہے کہ فقہائے احناف کے نزدیک جرمانہ شرعاً ناجائز ہے۔ صرف امام ابو یوسف رحمہ اللہ

سے ایک ضعیف قول نقل کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک تعزیرًا مال لینا شرعاً جائز ہے۔ ''درمختار'' میں ہے:'' **لا بأخذ مال في المذهب . بحر . وفيه عن بزازية ، وقيل : يجوز ، ومعناه أن يمسكه مدة لينزجر ثم يعيده له ، فإن أيس من توبته يصرفها إلى ما يرى . وفي المجتبى : انه كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ** '' . (الدر المختار مع الشامية : ۱/۳۲۶)

''البحر الرائق'' میں ہے کہ مالی جرمانہ جائز نہیں، بحر ہی میں بزازیہ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں (جو لوگ جواز کے قائل ہیں) اُن کا مطلب یہ ہے کہ جرمانہ کے مال کو ایک مدت تک روک کر رکھا جائے، پھر صاحبِ مال کو واپس کر دیا جائے، اگر جرم سے باز رہنے کی اُمید نہ ہو، تو اس کو حاکم اپنی صواب دید کے مطابق خرچ کرے۔ مجتبیٰ میں ہے کہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا، پھر منسوخ ہو گیا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے علاوہ اور تمام اَئمہ کے نزدیک تعزیراً اخذ المال ناجائز ہے، علامہ کی عبارت یہ ہے:

'' **قوله : (لا بأخذ مال في المذهب) قال في الفتح : وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال ، وعندهما وباقي الأئمة لا يجوز ، ومثله في المعراج ، وظاهره أن ذلک رواية ضعيفة عند أبي يوسف ، قال في الشرنبلالية : ولا يفتى بهذا لما فيه من تسليط الظلمة على أخذ مال الناس فيأكلونه ، ومثله في شرح الوهبانية عن ابن وهبان** '' . ''فتح القدیر'' میں ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ مالی جرمانہ کو جائز سمجھتے ہیں، امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے ساتھ بقیہ تینوں اماموں کے نزدیک جائز نہیں ہے، ''معراج'' میں بھی ایسا لکھا ہے، ظاہر یہ ہے کہ امام ابو یوسف سے جواز کی جو روایت ہے وہ ضعیف ہے۔

''شرنبلالیہ'' میں ہے کہ امام ابو یوسف کے قول پر فتویٰ نہیں ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں ظالم لوگ عوام کا مال ناجائز طور پر ہڑپ کر کے کھا جائیں گے۔ ابن وہبان کے حوالے سے ''شرح وہبانیہ'' میں بھی ایسا لکھا ہے۔ (ردالمحتار:۶/۶۷، ط: دارالکتاب دیوبند)

''فتاویٰ ہندیہ'' میں بھی اس مسئلے پر گفتگو موجود ہے، اور اس میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے مذکورہ قول کو نقل کرتے ہوئے کچھ تفصیل بھی کی گئی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہائے کرام تعزیرًا مال لینے کو صحیح نہیں سمجھتے، خود امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ایک وقتی چیز ہے، جسے بعد میں واپس کرنا ضروری ہے:

'' وعند أبي يوسف رحمه الله تعالى يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال، وعندهما وباقي الأئمة الثلاثة لا يجوز . كذا في فتح القدير . ومعنى التعزير بأخذ المال على القول به إمساك شيء من ماله عنده مدة لينزجر ثم يعيده الحاكم إليه، لا أن يأخذه الحاكم لنفسه أو لبيت المال كما يتوهمه الظلمة إذ لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي . كذا في البحر الرائق '' . (فتاوى هنديه : ۲/۱۶۷، ط: زكريا)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک مالی جرمانہ عائد کرنا سلطان کے لیے جائز ہے، طرفین اور باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، ایسا ہی ''فتح القدیر'' میں بھی ہے، امام ابو یوسف جواز کے قائل ہیں، لیکن ان کے یہاں جواز کی صورت یہ ہے کہ جرمانہ کر کے مجرم کا مال ایک مدت تک روک لیا جائے، تاکہ مجرم اپنے جرم سے باز آجائے (جب وہ باز آجائے، تو پھر اسے واپس کر دیا جائے) امام ابو یوسف کے قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حاکم اپنی ذات پر خرچ کرے، یا بیت المال میں جمع کر دے، جیسا کہ ظلم پیشہ لوگ سمجھتے ہیں، کیوں کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے

مسلمان کا مال بلاسببِ شرعی کے قبضہ کرے، ایسا ہی ''البحر الرائق'' میں بھی ہے۔
(فتاویٰ ہندیہ:۴/ ۱۶۷)

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ''البحر الرائق'' کی جس عبارت کا حوالہ ہے وہ یہ ہے:

" ولم يذكر محمد التعزير بأخذ المال ، وقد قيل : روي عن أبي يوسف أن التعزير من السلطان بأخذ المال جائز . كذا في الظهيرية . وفي الخلاصة : سمعت عن ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي ذلک ، أو الوالي جاز ، ومن جملة ذلک رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال . اهـ .... وفي " البزازية " : ان معنى التعزير بأخذ المال على القول به إمساک شيء من ماله عنه مدة لينزجر ثم يعيده الحاكم إليه ، لا أن يأخذه الحاكم لنفسه ، أو لبيت المال كما يتوهمه الظلمة ؛ إذ لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي ...... والحاصل أن المذهب عدم التعزير بأخذ المال " .

امام محمد رحمہ اللہ نے تعزیر بالمال کو ذکر نہیں کیا ہے، کہا گیا ہے کہ اما ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک تعزیر بالمال سلطان کے لیے جائز ہے، ایسا ہی ظہیریہ میں ہے، خلاصہ میں ہے کہ میں نے ایک معتبر شخص سے سنا ہے کہ قاضی یا والی تعزیر بالمال کرنا چاہے، تو کرسکتا ہے، مثلاً کوئی شخص جماعت میں حاضر نہیں ہوتا ہو، تو اس پر مالی جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، بزازیہ میں ہے کہ جواز کے قول کی صورت میں مالی جرمانہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ مال لے کر روک لیا جائے گا، جب مجرم اپنے جرم سے تائب ہوجائے، تو اس کو واپس کردیا جائے گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ حاکم اپنے اپنے مصرف میں استعمال کرے، یا بیت المال میں جمع کرے، جیسا کہ بعض ظالموں کا خیال ہے، کیوں کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ بلاسببِ شرعی کسی دوسرے مسلمان کا مال لے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مالی جرمانہ درست نہیں ہے۔ (البحر الرائق :٥/٦٨ ، ط : دار الكتاب ديوبند)

''الکفایہ علی الہدایہ'' کی کتاب الحدود میں ہے:" وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ المال يجوز للسلطان ". حضرت امام ابو یوسف سے روایت ہے کہ سلطان کے لیے تعزیر بالمال جائز ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کی ''فتح القدیر'' کی اس عبارت سے بھی تعزیر بأخذ المال سے متعلق اسی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے:" وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال ، وعندهما وباقي الأئمة الثلاثة لا يجوز ". امام ابو یوسف کے نزدیک مالی جرمانہ جائز ہے، طرفین اور باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک درست نہیں۔ (۵/۳۳۰، ط: بیروت)

''تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق'' میں اسی طرز کی صراحت موجود ہے:

" وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ الأموال جائز للإمام . (قوله : وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ الأموال جائز للإمام) وعندهما والشافعي ومالك وأحمد لا يجوز بأخذ المال ". حضرت امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ وہ امام کے لیے مالی جرمانہ کو جائز کہتے ہیں، امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک مالی جرمانہ درست نہیں ہے۔ (۳/۶۳۴)

درج بالا تمام فقہی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے سوا طرفین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک مالی جرمانہ جائز نہیں ہے، جو فقہائے کرام عدمِ جواز کے قائل ہیں، وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مالی جرمانہ جائز ہونے کی صورت میں ظلم پیشہ حکام لوگوں کے مال کو بلا سببِ شرعی ہڑپ کر جائیں گے، یعنی ان فقہائے کرام نے سدّ ذریعہ کے اُصول کو اختیار کر کے مالی جرمانہ کو ناجائز قرار دیا

ہے۔سدّ ذریعہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی شکل جس سے معاشرے میں کوئی فساد رونما ہوتا ہو، یا پیدا ہونے کا خطرہ ہو، تو اس شکل پر پابندی عائد کردی جائے۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی واضح اور صریح نص کی بنا پر فقہائے احناف نے مالی جرمانہ کو ناجائز قرار نہیں دیا ہے، بلکہ مالی جرمانہ کے نصوص ہوتے ہوئے سدّ ذریعہ کے اُصول کو اپنا کر، ناجائز بتایا ہے۔

موجودہ زمانے میں مالی جرمانہ کے بغیر معاشرے کی اصلاح بعض حالات میں مشکل، بلکہ ناممکن ہے، اور لوگوں کے مال کو ہڑپ کر لینے کا خطرہ غالب اور اکثری نہیں ہے، اس لیے میرے نزدیک مالی جرمانہ عائد کرنا درست ہونا چاہیے، کیوں کہ موجودہ زمانے میں سدّ ذریعہ کی وہ شکل موجود نہیں ہے، جس شکل کی بنیاد پر فقہائے احناف نے مالی جرمانہ کو ناجائز قرار دیا ہے، علاوہ ازیں محققین فرماتے ہیں کہ جن ائمہ کی طرف عدمِ جواز کے قول کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کی طرف عدمِ جواز کے قول کا انتساب غلط ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ ائمہ بھی جواز کے قائل ہیں، چنانچہ سید سابق، علامہ ابن تیمیہ رحمہما اللہ وغیرہ کی عبارتیں ذیل میں پڑھیں، عبارتیں ملاحظہ ہوں:

" وأجاز بعض الحنفية التعزير بالمال على أنه إذا تاب يرد له ". بعض احناف نے مالی جرمانہ کو اس صورت میں جائز قرار دیا ہے، جب کہ مجرم کے توبہ کرنے کی صورت میں اس کا مال اُسے واپس کردیا جائے۔

(كتاب الفقه على المذاهب الأربعة :۳۲۵/۵ ، ط: احياء التراث العربي بيروت)

" ويجوز التعزير بأخذ المال وهو مذهب أبي يوسف ، وبه قال مالك ، قال صاحب معين الحكام : ومن قال : إن العقوبة مالية منسوخة فقد غلط على المذاهب الأئمة – نقلا واستدلالا ، وليس بسهل دعوى نسخها والمدعون

للنسخ ليس معهم سنة ولا إجماع ، يصحح دعواهم إلا أن يقولوا مذهب أصحابنا لا يجوز ، وقال ابن القيم : إن النبي ﷺ عذر بحرمان النصيب المستحق من السلب وأخبر عن تعزير مانع الزكاة بأخذ شطر ماله فقال ﷺ فيما يرويه أحمد وأبو داود والنسائي : من أعطاها مؤتجرا فله أجرها ومن منعها فإنا آخذوها وشطر ماله عزمة من عزمات ربنا ‘‘ .

(فقه السنة للسيد سابق :۳/ ۶۵ ، ط : دار الفتح للإعلام العربي)

تعزیر بالمال جائز ہے، یہ امام ابو یوسف اور امام مالک کا قول ہے، صاحب ’’معین الحکام‘‘ فرماتے ہیں: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مالی جرمانہ منسوخ ہے، وہ نقلاً بھی اور استدلالاً بھی ائمہ اربعہ کی طرف غلط بات منسوب کرتے ہیں، نسخ کا دعویٰ آسان نہیں ہے، جو لوگ نسخ کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ تو سنت ہے، اور نہ اجماع، جن سے ان کا دعویٰ صحیح ثابت ہو سکے، ہاں! صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ مالی جرمانہ جائز نہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو مالِ غنیمت کے حصے سے محروم ہونے کی سزا دی، یہ بھی لکھتے ہیں کہ زکوۃ نہ دینے والوں کو ان کے مال کا ایک حصہ ضبط کرنے کی سزا دی، امام احمد، ابو داود، اور امام نسائی کی ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اجر وثواب کی امید پر راضی برضا زکوۃ دیں گے، ان کو اجر ملے گا، اور جو لوگ ادا نہیں کریں گے ان سے ہم زکوۃ بھی وصول کریں گے، اور اس کے علاوہ ایک حصہ لیں گے، یہ ہمارے رب کی طرف سے اُن پر جرمانہ ہے۔ (فقہ السنۃ)

’’المعیار المعرب:۲/ ۴۱۶‘‘ میں بھی مالی تعزیر کی متعدد روایات منقول ہیں، علامہ

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس مسئلے پر بسط وتفصیل سے شافی بحث فرمائی ہے، ذیل میں ''مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ:۲۸/۱۱۰-۱۱۲'' کی عبارت:

'' والتعزير بالعقوبات المالية مشروع أيضًا في مواضع مخصوصة في مذهب مالك في المشهور عنه ، ومذهب أحمد في مواضع بلا نزاع عنه ، وفي مواضع فيها نزاع عنه ، والشافعي في قول وإن تنازعوا في تفصيل ذلك كما دلت عليه سنة رسول الله ﷺ في مثل : إباحته سلب الذي يصطاد في حرم المدينة لمن وجده ، ومثل أمره بكسر دنان الخمر وشق ظروفه ، ومثل أمره عبد الله بن عمر بحرق الثوبين المعصفرين ، وقال له أغسلهما ؟ قال : لا بل احرقهما . وأمره لهم يوم خيبر بكسر الأوعية التي فيها لحوم الحمر ثم لما استأذنوه في الإراقة أذن ، فإنه لما رأى القدور تفور بلحم الحمر أمر بكسرها وإراقة ما فيها ، فقالوا : أفلا نريقها ونغسلها ؟ فقال : انعلوا ، فدل ذلك على جواز الأمرين ؛ لأن العقوبة بذلك لم تكن واجبة . ومثل هدمه لمسجد الضرار ، ومثل تحريق موسى للعجل المتخذ إلهًا . ومثل تضعيفه ﷺ الغرم على من سرق غير حرز . ومثل ما روي من إحراق متاع الغال ومن حرمان القاتل سلبه لما اعتدى على الأمير . ومثل أمر عمر بن الخطاب وعلي بن أبي طالب بتحريق المكان الذي يباع فيه الخمر . ومثل أخذ شطر مانع الزكاة . ومثل تحريق عثمان بن عفان المصاحف المخالفة للإمام . وتحريق عمر بن الخطاب للكتب الأوائل . وأمره بتحريق قصر سعد بن أبي وقاص الذي بناه لما أراد أن يحتجب عن الناس فأرسل محمد بن مسلمة وأمره أن يحرقه عليه ، فذهب فحرقه عليه ، وهذه القضايا كلها صحيحة معروفة عند أهل العلم بذلك ونظائره متعددة . ومن قال إن العقوبات المالية منسوخة ، وأطلق ذلك عن أصحاب مالك وأحمد فقد غلط على مذهبهما . ومن قاله مطلقًا من أي مذهب كان . فقد قال قولا بلا

دليل ولم يجيء عن النبي ﷺ شيء قط ، يقتضي أنه حرم جميع العقوبات المالية ، بل أخذ الخلفاء الراشدين وأكابر أصحابه بذلك بعد موته دليل على أن ذلك محكم غير منسوخ ، وعامة هذه الصور منصوصة عن أحمد ومالك وأصحابه ، وبعضها قول عند الشافعي باعتبار ما بلغه من الحديث ، ومذهب مالك وأحمد وغيرهما : ان العقوبات المالية كالبدنية تنقسم إلى ما يوافق الشرع وإلى ما يخالفه وليست العقوبة المالية منسوخة عندهما ، والمدعون للنسخ ليس معهم حجة بالنسخ لا من كتاب ولا سنة ‘‘ .

مالی تعزیر چند مخصوص صورتوں میں مشہور قول کے مطابق امام مالک کے نزدیک جائز ہے، امام احمد کے نزدیک چند مواقع پر جائز ہے، امام شافعی کے نزدیک ایک قول کے مطابق جائز ہے، لیکن اس سلسلے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ سنت سے مالی تعزیر کا جائز ہونا ثابت ہے، مثلاً:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حرمِ مدینہ میں شکار کرے، اس کا سامان چھین لیا جائے۔

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے گھڑوں اور برتنوں کو پھوڑنے کا حکم دیا۔

(۳) حضرت عبداللہ ابن عمر کو حکم دیا کہ وہ معصفر کپڑوں کو جلا دیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا دھوکر ان کا رنگ زائل کردوں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ جلا دو۔

(۴) جنگِ خیبر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان برتنوں کو پھوڑ دیا جائے، جن میں گدھے کا گوشت پکایا جاتا ہے، پھر لوگوں نے اجازت لی کہ برتن نہ پھوڑیں، اور گوشت پھینک دیں، تو آپ نے اجازت دے دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ حکم اس وقت دیا تھا جب آپ نے ہانڈی میں گدھے کا گوشت پکتے ہوئے دیکھا تھا، لوگوں نے کہا کہ کیا ہم گوشت پھینک کر برتن دھوکر رکھ نہ لیں، تو آپ نے فرمایا: ایسا کرلو، اس فرمان سے دونوں صورتوں کا جواز معلوم ہوا، کیوں کہ برتن کو پھوڑنا ہی ضروری نہ رہا تھا۔

(۵) آپ نے مسجد ضرار کو گرانے کا حکم دیا۔

(۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو جلانے کا حکم دیا جس کو بنی اسرائیل نے معبود بنالیا تھا۔

(۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر دو چند تاوان عائد کیا جس نے غیر محفوظ چیز کو چرایا تھا۔

(۸) نیز آپ نے خیانت کرنے والے کے سامان کو جلوا دیا، اور بعض قاتل کو اپنے مقتول کا سامان لینے سے محروم کر دیا، اس وجہ سے کہ قاتل نے اپنے امیر کی شان میں کوئی زیادتی کی تھی۔

(۹) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مکان کو جلا دینے کا حکم دیا جس میں شراب بیچی جاتی تھی۔

(۱۰) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مانعینِ زکوۃ کے مال کا ایک حصہ لے لینے کا حکم صادر فرمایا۔

(۱۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کے ایک نسخے کے سوا بقیہ نسخوں کو جلانے کا حکم دیا۔

(۱۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کتب اوائل جلا ڈالنے کا حکم دیا۔

(۱۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اس مکان کو جلا دینے کا حکم صادر کیا، جس کو انہوں نے اس لیے بنایا تھا کہ لوگ ان کے پاس (ہر وقت) نہ آسکیں، چنانچہ محمد بن مسلمہ کو حضرت عمر نے بھیج کر سعد بن ابی وقاص کے مکان کو جلوا دیا، یہ تمام واقعات صحیح ہیں، اور اہلِ علم کے درمیان مشہور ہیں، اس کے علاوہ اور بھی متعدد نظائر ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں تعزیر مالی منسوخ ہے، اور اس بات کو امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، وہ غلط انتساب کرتے ہیں، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر امام کے نزدیک نا جائز ہے، وہ بے ثبوت بات کہتے ہیں، حالانکہ کوئی ایک بھی ایسی روایت نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالی تعزیر کو حرام فرمایا ہو، بلکہ خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ کا مالی تعزیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ تعزیر مالی کا جواز قائم ہے، منسوخ نہیں ہے۔

یہ تمام صورتیں امام احمد، امام مالک اور ان کے اصحاب سے صراحۃً مروی ہیں، امام احمد اور امام مالک وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ تعزیر مالی تعزیر بدنی کی طرح ہے، جو شرع کے موافق بھی ہوسکتی ہے، اور شرع کے خلاف بھی، ان حضرات کے نزدیک تعزیر مالی منسوخ نہیں ہے، جو لوگ منسوخ ہونے کے مدعی ہیں ان کا دامن ثبوت سے خالی ہے۔

ڈاکٹر عدنان خالد الترکمانی استاذ فقہ جامعہ امام ابن سعود ریاض نے اپنی وقیع تالیف " ضوابط الملكية في الفقه الإسلامي: ص/ ۱۶۹ "میں لکھا ہے:

" ذهب جمهرة الفقهاء إلى القول بعدم جواز التعزير بأخذ المال لما أنه يؤدي إلى تسلط الظلمة على أموال الناس بالباطل وفي ذلك فساد عريض . بينما ذهب بعض المحققين من الفقهاء إلى جواز التعزير بأخذ المال في بعض

الأحوال متخذين بعض إحداث الصدر الأول دليلا على الجواز ، منها : منع النبي ﷺ من الغنيمة من سهمه وحرق متاعه ، وهكذا فعل خلفاء من بعده . أضعف ﷺ الغرم الضالة . أمر بكسر دنان الخمر . عزم على تحريق بيوت من لا يشهدون الجماعة . أمر ابن عمر أن يحرق الثوبين المعصفرين . تحريق عمر بن الخطاب حانوت الخمار بما فيه . مصادرة عمر أموال بعض ولاته عندما اكتسبوا أموالا بجاه الولاية . أغرم حاطب بن بلتعة ضعف ثمن الناقة التي سرقها رقيقة من رجل من مزينة . حرق علي بن أبي طالب طعام رجل حبسه ليغل به السعر وحرق قوم دور قوم كانوا يبيعون الخمر إلى غير ذلک من الشواهد العملية لبعض المحققين القائلين بجواز التعزير كعقوبة تعزيرية “ .

جمہور فقہاء کا موقف یہ ہے کہ تعزیر مالی جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں ظالم لوگ عوام کے مال کو ناحق دبالیں گے، اور اس سے بیکراں فساد رونما ہوجائے گا، جب کہ بعض محققین فقہاء کہتے ہیں کہ بعض حالات میں جائز ہے، ثبوت میں یہ حضرات عہد نبوت اور دورِ خلافت کے مندرجہ ذیل واقعات پیش کرتے ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت میں سے بعض حضرات کو حصہ نہیں دیا، اور اُن کے سامان کو جلا دیا، ایسا ہی ان کے خلفاء نے ان کے بعد کیا۔

(۲) گمراہ کن تحریر لکھنے والوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوچند جرمانہ عائد کیا۔

(۳) اور شراب کے گھڑوں کو توڑنے کا حکم دیا۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عزم کا اظہار فرمایا کہ جو لوگ جماعت میں حاضر نہیں ہوتے اُن کے گھروں کو جلا دیا جائے گا۔

(۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے حکم دیا کہ معصفر کپڑوں کو جلا دیں،

چنانچہ انہوں نے جلا دیا۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب کی دکانوں کو مع ساز وسامان جلا دیا۔

(۷) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض گورنروں پر مالی جرمانہ عائد کیا، جنہوں نے اپنے جاہ ومنصب کو ذاتی دولت اِکٹھا کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔

(۸) حضرت حاطب ابن بلتعہ کے ایک غلام نے قبیلۂ مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرالی، ت حاطب ابن بلتعہ پر اونٹنی کی دوگنی قیمت ادا کرنے کا جرمانہ کیا گیا۔

(۹) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے غلہ کے ڈھیر کو جلا دیا، جس نے قیمت بڑھانے کے لیے غلہ روک رکھا تھا۔ نیز جو لوگ شراب بیچتے تھے ان کے مکانات کو جلوا دیا۔ اس طرح اور بھی دوسرے شواہد ہیں جن کی روشنی میں بعض محققین فرماتے ہیں کہ تعزیر مالی جائز ہے۔

علامہ ابو یوسف قرضاوی حفظہ اللہ نے ''فقہ الزکوۃ: ۲/ ۷۱۵، ۷۱۶'' میں لکھا ہے:

" وقد ذهب بعض الأئمة إلى أن العقوبة بأخذ المال أمر غير جائز ولا سائغ ، وأن ذلك شيء حدث أول الأمر ثم نسخ ، وذلك تشدد منهم في الحفاظ على حرمة تملك واستناد إلى الحديث القائل " إن اللّٰه حرم عليكم دماء كم وأموالكم " ولأن الصحابة قاتلوا الممتنعين عن الزكاة ولم يأخذوا منهم زيادة عليها ، ولكن الحديث المذكور هنا يرد عليهم ، ولهذا رد بعضهم بالطعن في سنده ، وليس فيه مطعن معتبر . ولجأ بعضهم إلى القول بنسخه ولا دليل على ذلك ، وقد ثبتت العقوبات المالية بأكثر من دليل " . (فقه الزكاة ، ط : مؤسسة الرسالة)

بعض ائمہ کہتے ہیں کہ تعزیر مالی جائز نہیں ہے، یہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا پھر

منسوخ ہوگیا، ان حضرات کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے خون اور مال کو حرام قرار دیا ہے، ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ صحابہ نے مانعینِ زکوۃ سے قتال تو کیا، لیکن ان سے زکوۃ کی مقدار سے زیادہ کوئی رقم وصول نہیں کی، لیکن حدیث (جو علامہ قرضاوی نے اس عبارت سے قبل پیش کی ہے) ان حضرات کے خلاف ہے، اسی لیے بعض حضرات اس کی سند پر جرح کر کے اس روایت کو قابلِ احتجاج نہیں گردانتے، حالانکہ اس کی سند میں کوئی معتبر جرح نہیں ہے، بعض لوگ منسوخ ہونے کے قائل ہیں، لیکن اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے، اس کے برعکس مالی جرمانہ متعدد دلائل سے ثابت ہے۔

اسی کتاب کے ''۲/ ۷۸۱'' میں ہے:'' الصحيح أن العقوبة بالمال لم تنسخ ، وقد ذكر المحقق ابن القيم في الطرق الحكمية خمس عشرة قضية لرسول الله ﷺ والخلفاء الراشدين تحققت فيها العقوبة بالمال '' .

صحیح یہ ہے کہ مالی جرمانہ منسوخ نہیں ہے، محقق ابن قیم نے عہدِ نبوت اور دورِ خلافت کے پندرہ واقعات اپنی گراں قدر تالیف ''الطرق الحکمیۃ'' میں درج فرمائے ہیں، جن سے تحقیقی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مالی جرمانہ جائز ہے۔

''فقہ عمر بن الخطاب:۱/ ۳۶۱'' میں دکتور رویعی بن راجح الرحیلی نے اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں؛ جواز وعدمِ جواز پر مفصل گفتگو کی ہے، اور بحث کے اخیر میں لکھا ہے:

'' والظاهر أن العقوبة بالمال جائزة إذا لم يأخذ الإمام لنفسه بل يأخذ للتأديب فيضعه في بيت المال ، وإن رأى أن يعطيه للمجنى عليه جبرًا فله ذلك ، وإن رأى المصلحة فيه وله أن يتلفه كما فعله رسول الله ﷺ بمسجد الضرار وكما فعل عمر باللبن المغشوش فإنه أراقه ، اما ان العقوبة

بالمال منسوخة فدعوى لا برهان عليها ، يقول النووي : الذي ادعوه من كون العقوبة كانت بالأموال في الأول الإسلام ليس بثابت ولا معروف ، ويقول ابن القيم : إن العقوبة بالمال ليست منسوخة ، ومن قال : إنها منسوخة وأطلق ذلک فقد غلط على مذاهب الأئمة نقلا واستدلالا " .

ظاہر یہ ہے کہ تعزیر مالی جائز ہے، بشرطیکہ حاکم اپنی ذات پر خرچ کرنے کے لیے نہ لے، بلکہ تادیباً لے، اور بیت المال میں جمع کردے، اگر اس شخص کو دینے میں مصلحت سمجھے جس کا نقصان ہوا ہے، تو مجرم سے لے کر اس کو دے سکتا ہے، اور اگر جرمانہ کی رقم کو ضائع کرنا بہتر ہو تو ضائع کرسکتا ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کے سلسلے میں معاملہ فرمایا، اور جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پانی ملے ہوئے دودھ کو پھینکوادیا، تعزیر مالی کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بلا ثبوت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ کہنا کہ مالی جرمانہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا، ثابت نہیں ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ تعزیر مالی منسوخ نہیں ہے، جو لوگ منسوخ ہونے کے قائل ہیں وہ ائمہ فقہ کے مذاہب بیان کرنے میں نقلاً واستدلالاً غلطی پر ہیں۔

''موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب: ص/۲۱۳'' میں لکھا ہے:

" كان عمر يعاقب بأخذ المال وقد رأينا كيف أنه عاقب عبد الرحمن بن حاطب بن أبي بلتعة بتغريمه ضعف قيمة الناقة التي ذبحها عبيده ، وقد استمد عمر ذلک من رسول الله ﷺ ..... " من أعطى ماله مؤتجرًا فله أجرها ، ومن منعها فأنا آخذوها وشطر ماله عزمة من عزمات ربنا ليس لآل محمد منها شيء " . حضرت عمر رضی اللہ عنہ مالی جرمانہ عائد کرتے تھے، انہوں نے عبد الرحمٰن بن حاطب بن ابی بلتعہ پر اس اونٹنی کی قیمت دوچند جرمانہ کردیا جس کو ان

کے غلاموں نے ذبح کردیا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے اس عمل کے جواز کے لیے اس بات کو سامنے رکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر مالی جرمانہ عائد فرمایا، جو زکوۃ کی ادائیگی نہیں کرتے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے زکوۃ اپنی مرضی سے ثواب کی خاطر دیا، تو اس کو اس کا اجر ملے گا، اور جو شخص زکوۃ ادا نہیں کرے گا، تو ہم اس سے زکوۃ بھی لیں گے، اور اس کے مال کا ایک حصہ بھی، یہ ہمارے رب کی طرف سے تاوان ہے، اس میں سے آلِ محمد کو کچھ نہیں ملے گا۔

ہمارے سامنے جواز وعدمِ جواز؛ دو طرح کی عبارتیں ہیں، لہٰذا ''رسم المفتی'' کے اس قاعدے کے تحت کہ- قضاء میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کا اعتبار ہوگا- فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہی ہونا چاہیے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ صرف والی یا امیر کو تعزیراً أخذ المال کی اجازت دیتے ہیں، اور ہندوستان میں والی یا امیر نہیں ہے، لہٰذا آج ہر گاؤں اور قصبے میں اپنا ایک امیر یا والی منتخب کرنا ہوگا، وہ اس طرح کے مسلمان اپنی رضامندی سے کسی کو اپنا والی یا امیر بنالیں۔'' ویصیر القاضي قاضیًا بتراضي المسلمین''. (فتاوی هندیه : ۱/۱۴۶)

نیز مالی جرمانہ کی مقدار کی تعیین کے وقت مجرم کی معاشی حالت، سماجی مقام اور جرم کی نوعیت کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

''موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب: ص/۲۱۰'' (تالیف دکتور محمد رواس قلعہ جی) میں ہے:

'' تناسبها مع حالته الجاني بأن تكون رادعة له، ولذلک فإن العقوبة لجريمة معينة قد تختلف باختلاف مرتكبها، فإن كان مرتكبها من العتاة لا

یرتدع إلا بالعقوبة القاسية شددت عليه العقوبة وإن كان من الاشراف وكانت الجريمة منه هفوة عوقب بعقوبة خفيفة ''.

جرمانہ کی رقم کی تعیین میں مجرم کی حالت کی رعایت ہونی چاہیے، کیوں کہ ایک ہی جرم کی سزا مختلف مرتکب اشخاص کے حالات کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہے، اگر مرتکب سرکش ہے، تو سخت سزا کے بغیر جرم سے باز نہیں آئے گا، اس لیے اس کی سزا سخت ہوگی، اور اگر مرتکب معزز لوگوں میں سے ہے، اور اس کا جرم ہلکا ہے، تو اس کے لیے ہلکی سزا کافی ہوگی۔ ''المعیار المعرب: ۲/ ۴۱۷'' میں بھی ہے کہ مجرم کی حیثیت اور جرم کی نوعیت کو تعزیر کے وقت ملحوظ رکھا جائے گا۔

حضرت امام ابو یوسف نے مالی جرمانہ میں جو یہ شرط لگائی ہے کہ مجرم کے تائب ہونے کے بعد جرمانہ کی رقم اس کو واپس کردی جائے، تو ظاہر ہے کہ واپس کردینے کی شکل میں ''سد ذرائع معاصی'' مشکل ہوگا، کیوں مجرم جب دیکھے گا کہ اس کی رقم اس کو ایک نہ ایک دن مل جائے گی، تو اس جرمانہ کا اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہوگا، بلکہ وہ اپنے آپ کو ایسا ہی تصور کرے گا، جیسے کہ اس کو کوئی سزا نہیں دی گئی، اس لیے جرمانہ کی رقم واپس نہ کر کے قومی، ملی اور رفاہی کاموں میں خرچ کردینا مناسب ہوگا۔

نوٹ:- مرتب کے نزدیک اس سلسلے میں ''عاقلہ'' سے استدلال کرنا زیادہ مناسب ہے وہ بھی ایک اجتماعی مالی جرمانہ ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ ''جامعۃ الرشاد'' اعظم گڑھ، یوپی: ص/ ۲۰-۳۳، جنوری ۱۹۹۰ء)

گائے اور نرگاؤ کے ذبیحہ پر پابندی

(مہاراشٹر اینمل پریزرویشن-ترمیمی-ا یکٹ)

(Maharashtra Preservation 1995 Act)

ایک جائزہ

قانون نہ تو اندھا ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کی دو آنکھیں ہوتی ہیں، بلکہ صرف اور صرف اس کی ایک ہی آنکھ ہوتی ہے، جس سے وہ سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے، کیوں کہ اگر قانون اندھا ہو تو وہ دیکھ نہیں سکتا، نتیجۃً چل بھی نہیں سکتا، اور اگر اس کی دو آنکھیں ہوں، تو یہ بات قانون کے لیے حسن وخوبصورتی نہیں، بلکہ عیب ہے، اس لیے کہ وہ ان دو آنکھوں سے سب کو ایک نگاہ سے نہیں، بلکہ دو نگاہوں سے دیکھے گا، اپنوں کے لیے اس کی نگاہ کچھ اور ہوگی، تو غیروں کے لیے کچھ اور، حالانکہ کوئی بھی قانون اسی وقت کامیاب ہوتا ہے، جب کہ وہ سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھے، اور اس کا پیمانۂ انصاف بھی سب کے لیے ایک ہی ہو۔

اسلامی قوانین کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے، اور اس کے انصاف کا پیمانہ بھی سب کے لیے ایک ہی ہے، چاہے مجرم برسرِ اقتدار جماعت کا ہو، یا حزبِ مخالف سے اس کا تعلق ہو۔ تاریخ نے آپ ﷺ کے اس فرمان کو آج تک اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے:

عن عائشة أن قريشًا أهمّتهم المرأة المخزوميةُ التي سرقت قالوا : من

يكلّم رسول الله ﷺ ومن يجترئ عليه إلا أسامة بن زيد حِبُّ رسول الله ﷺ فكلّم رسول الله ﷺ فقال : " أتشفع في حدّ من حدود الله ؟ ثم قام فخطب فقال : يا أيها الناس ! إنما ضلّ من قبلكم أنهم كانوا إذا سرق الشريف تركوه ، وإذا سرق الضعيف فيهم أقاموا عليه الحدّ ، وأيم الله ! لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمدٌ يدها " . ''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ قریش کو ایک مخزومی عورت کا بہت خیال تھا، جس نے چوری کی تھی، لوگوں نے کہا کہ کون رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرے گا؟ رسول اللہ ﷺ کے محبوب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا اور کون اس کی جرأت کرسکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو، پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلے کئی قومیں ہلاک ہوگئیں، اس لیے کہ جب ان میں کا شریف چوری کرتا، تو وہ لوگ اسے چھوڑ دیتے، اور جب کوئی کمزور چوری کرتا، تو اس پر حد جاری کرتے، اور قسم ہے خدا کی! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی، تو محمد اس کے بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا''۔

(صحیح بخاری:۲/۱۰۰۳، باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد إذا رفع الی السلطان، حدیث:۱۶۹۲، سنن نسائی: حدیث:۴۹۰۱)

کچھ دنوں سے مہاراشٹر بھر میں- '' گائے اور اس کی نسل؛ بیل، بچھڑے کے ذبیحہ پر پابندی کا حکم''- اخباروں کی شہ سرخیاں بنا ہوا ہے، اس قانون کی مخالفت صرف وہی لوگ نہیں کررہے، جو گوشت خور ہیں، بلکہ وہ تمام لوگ اس کے مخالف ہیں، جن کی روزی روٹی اس کاروبار پر موقوف ہے، اور اخباری رپورٹوں کے مطابق اس کاروبار سے منسلک- ہر چار افراد میں سے تین کا تعلق- برادرانِ وطن- سے ہے، گویا اس کاروبار میں ۷۵ رفیصد وہ لوگ ہیں، جو مسلم نہیں ہیں۔

حکومتِ وقت نے چند ہفتوں پہلے، ۱۶/ سال قبل بنائے گئے ترمیم شدہ قانون (مہاراشٹر ایمنل پریزرویشن ایکٹ ۱۹۹۵ء) کو ریاستی گورنر کی سفارش کے ساتھ صدرِ مملکت کو روانہ کیا، اور صدرِ جمہوریہ نے اس پر منظوری کی دستخط ثبت کردی، اور اب یہ قانون مہاراشٹر بھر میں نافذ بھی ہوچکا ہے، جس کے متعلق ہائی کورٹ کے جسٹس وی ایم کناڈے اور جسٹس اے آر جوشی پر مشتمل بینچ نے کہا:

''مہاراشٹر کے تحفظ ماویشین (ترمیمی) قانون جس کے تحت - گائے اور نرگاؤ کے ذبیحہ پر پابندی عائد کی گئی ہے، اور نافذ العمل ہوچکا ہے، کیوں کہ سرکاری گزٹ میں اس کا اعلامیہ شائع کیا گیا ہے، جسٹس کناڈے نے کہا کہ - چوں کہ قانون نافذ ہوچکا ہے، عہدے دار جولائی سے اس بات کے پابند ہوں گے کہ اگر گائے اور نرگاؤ کا ذبیحہ کیا جائے، تو خاطیوں کے خلاف کارروائی کی جائے، انہوں نے کہا کہ اس معاملے کو مذہبی یا اَنا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔'' (بشکریہ: ترجمانِ اُردو مالیگاؤں، ۱۰/۳/۲۰۱۵ء)

ہم ہندوستانی ہیں، عدالت کے فیصلے ہمارے نزدیک قابلِ احترام وتسلیم ہیں، مگر عدالت کا عوام کو یہ مشورہ دینا کہ -:

''اس معاملے کو مذہبی یا اَنا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے''

سمجھ سے بالاتر ہے، کیوں کہ اس قانون کے وجود میں آنے کا محرک وسبب - وہ تشدُّد پسند تحریکیں اور تنظیمیں ہیں، جن کے اپنے مخصوص افکار ونظریات ہیں، اور وہ اِن افکار ونظریات کو اِس قانون کے سہارے دیگر اہلِ مذاہب پر تھوپنا چاہتی ہیں، اور انہی تنظیموں نے اس قانون کی تجویز کو اپنے مذہبی عقیدے سے جوڑ کر اُس کے نفاذ کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے۔ تو جب ایک فریق نے کسی چیز کو اپنے عقیدے سے جوڑ کر اس

کے نفاذ کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنایا ہو، تو عدالت کن بنیادوں پر دوسرے فریق کو یہ مشورہ دے رہی ہے کہ وہ اس معاملے کو مذہبی عقیدہ اور اَنا کا مسئلہ نہ بنائے۔ جب کہ ہمارا یہ ملک اور اُس کا دستور سیکولر اور جمہوری ہے، اور اسی میں اس کی خوبصورتی بھی ہے کہ یہاں ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہے، اور کسی بھی مذہب کے ماننے والے بزور زبردستی اپنے مذہبی اَفکار ونظریات کو دیگر اہلِ مذاہب پر عائد نہیں کر سکتے، حالانکہ مذکورہ قانون کے نفاذ سے اس ملک کی جمہوریت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

امید ہے کہ حکومتِ وقت اس قانون کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لے گی، اور اپنے عوام کے جذبات، خواہشات اور روزگار کا بھرپور خیال رکھ کر اس کا مناسب حل تلاش کر لے گی۔

///

❀……❀……❀

حرام غذا سے پرورده فارمی مرغیاں اور مچھلیاں

قدیم زمانے میں مرغیوں اور مچھلیوں کی افزائش وپرورش کا وہ طریقۂ کار نہیں تھا، جو آج کل وجود میں آیا ہے، اس طریقۂ کار سے جہاں انسانی غذا کی فراوانی ہوئی، وہیں کچھ نئے مسائل بھی وجود میں آئے، اُنہیں میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جو اِن کو دی جانے والی غذا سے پیدا ہوا، کہ ان مرغیوں اور مچھلیوں کو جہاں بہت سی مختلف غذائیں دی جاتی ہیں، انہیں میں سے ایک غذا بعض لوگوں کے قول کے مطابق مردار جانور کے گوشت کا پاؤڈر بھی ہے، جس میں خنزیر کا گوشت بھی داخل ہے، تو کیا ایسی مرغیاں اور مچھلیاں کھائی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

فقہ اسلامی میں اِس کی نظیر ''جلاّلہ'' ہے، لغۃً ''جلاّلہ'' اُس جانور کو کہتے ہیں جو نجاست کھاتا ہو، اور حضراتِ شوافع کی تصریحات کے مطابق ''جلاّلہ'' ہر وہ جانور ہے، جسے نجس چارا دیا جاتا ہو، جیسے بکری کا وہ بچہ جسے کتیا یا گدھی کا دودھ پلایا گیا ہو۔ [1]

اگر واقعۃً اِن مرغیوں اور مچھلیوں کو حرام غذا دی جاتی ہو، تو اِن کے کھانے کے سلسلے میں حضراتِ علمائے کرام کا اختلاف ہے:

۱- جمہورِ فقہاء جن میں احناف بھی داخل ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ اگر حرام غذا کی وجہ سے جانور کے گوشت کی فطری بُو بدل چکی ہو، اُس کا پسینہ بدبودار بن گیا ہو، تو اس کا گوشت، دودھ اور انڈے وغیرہ کا استعمال مکروہ ہے۔

۲- جب کہ شوافع اور امام احمد کی ایک روایت کے مطابق ان کا استعمال حرام ہے۔

۳- تیسرا قول حنابلہ کا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر اکثرِ غذا نجس وحرام ہے، تو گوشت اور دودھ کا استعمال مکروہ ہے، خواہ اس کے گوشت اور پسینے میں کوئی تبدیلی آئی ہو یا نہ آئی ہو۔

۴- چوتھا قول مالکیہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس طرح کے جانوروں کے گوشت میں کوئی کراہت نہیں، خواہ گوشت اور پسینے کی بُو بدل چکی ہو، کیوں کہ نجس غذائیں جب گوشت، دودھ اور انڈے کی شکل میں تبدیل ہوگئیں تو وہ نجس باقی نہ رہیں۔ (۲)

البتہ تمام فقہاء خواہ وہ قائلینِ حرمت ہوں یا کراہت، اتنی بات پر تو متفق ہیں کہ اگر اِن جانوروں کو ایک مدت تک پاک غذا دی جائے، تو اِن کی حرمت وکراہت ختم ہوجائے گی، مگر مدتِ حبس میں اختلاف ہے۔

شوافع کے نزدیک اونٹ کو چالیس دن، گائے کو تیس دن، بکری کو ایک ہفتہ اور مرغی کو تین دن محبوس رکھ کر حلال غذا دیئے جانے پر، یہ حلال ہوں گے۔

احناف مرغی کو تین دن، بکری کو چار دن، اونٹ اور گائے کو دس دن محبوس رکھنے پر اِن کی حلت کے قائل ہیں۔

امام احمد ابن محمد ابن حنبل سے اس سلسلے میں دو روایتیں ملتی ہیں:

(۱) جلّالہ، خواہ پرندہ ہو یا جانور، اسے تین دن محبوس رکھا جائے۔

(۲) گائے اور اونٹ کو چالیس دن محبوس رکھا جائے، تو وہ حلال ہوں گے۔ (۳)

صاحبِ مغنی نے اس بارے میں حسن بصری رحمہ اللہ کے حوالے سے بڑی اچھی بات نقل فرمائی، کہ وہ اس طرح کے جانوروں کے گوشت، دودھ کے استعمال کی اجازت

دیا کرتے تھے، اور یہ فرمایا کرتے کہ جانور نجاستوں کے کھانے سے نجس نہیں ہوتا، اور استدلال میں شرابی اور کافر کو پیش فرماتے، کہ شرابی کے اعضا کی ناپاکی کا حکم نہیں لگایا جاتا، اسی طرح کافر جو خنزیر اور دیگر محرمات کو تناول کرتا ہے، کوئی بھی اس کے ظاہری نجاست کا قائل نہیں، اگر وہ نجس ہوتا تو اسلام لانے اور غسل کرنے سے بھی پاک نہ ہوتا، اسی طرح جلّالہ، اگر نجاست کے کھانے سے نجس ہوجاتا، تو مقررہ مدت تک محبوس کرنے سے بھی پاک نہ ہوتا۔ (۴)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ ''امداد الفتاویٰ'' میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں یہ فرماتے ہیں: ''ایسے شتر کا گوشت حلال ہوگا، مگر ذبح سے پہلے بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ اُس کو چند روز تک حلال چارا دیا جائے، اس کے بعد اس کو ذبح کیا جائے''۔ (۱۰۵/۴)

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مرغیاں اور مچھلیاں جو حرام غذا سے پرورش کی گئیں، اگر انہیں استعمال سے پہلے چند روز (احناف کے نزدیک تین دن) حلال غذا دی جائے، اور پھر اُن کو استعمال کیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲۶۰/۱۵، فتاویٰ اسلامیہ علی شبکۃ الویب: ۵۵۰/۳)

الحجة على ما قلنا :

(۱) ما في " الموسوعة الفقهية " : الجلّالة : الدابة التي تتبع النجاسات وتأكل الجلة ، وهي البعرة والعذرة ...... والمراد بالجلالة على ما نص الشافعية : كل دابة علفت بنجس ولو من غير العذرة كالسخلة التي ارتضعت بلبن نحو كلبة أو أتان . (۲۶۰/۱۵ ، جلّالة ، التعريف)

(۲) ما في " الموسوعة الفقهية " : ذهب جمهور الفقهاء إلى أن أكل لحم الجلالة – وهي الدابة التي تأكل العذرة أو غيرها من النجاسات – وشرب لبنها وأكل بيضها مكروه ، إذا ظهر تغير لحمها بالرائحة ، والنتن في عرقها . وفي قول عند الشافعية ورواية عن أحمد : يحرم لحمها ، ولبنها .=

....

= والأصل في ذلک : حديث ابن عمر رضي الله عنهما قال : نهى رسول الله ﷺ عن الإبل الجلالة أن يؤكل لحمها ولا يشرب لبنها ولا يحمل عليها إلا الأدم ، ولا يذكيها الناس حتى تعلف أربعين ليلة . أما إذا لم يظهر منها تغير بريح ، أو نتن ، فلا كراهة عند الشافعية وإن كانت لا تأكل إلا النجاسة . وقال الحنابلة : يكره أكل لحمها وشرب لبنها إذا كان أكثر علفها النجاسة ، وإن لم يظهر منها نتن أو تغير ، ونقل صاحب المغني عن الليث قوله : " إنما كانوا يكرهون الجلالة التي لا طعام لها إلا الرجيع (الروث والعذرة) وما أشبهه . وذهب المالكية إلى أن لحم الجلالة لا كراهة فيه وإن تغير من ذلک . (١٥/٢٦٠ ، ٢٦١ ، الحكم التكليفي ، الجلالة)

ما في " رد المحتار " : قال ابن عابدين الشامي رحمه الله تعالى : أقول : الظاهر أنه أراد بالجلالة غير التي أنتن لحمها من أكل النجاسة ، إذ لو أنتن فالظاهر الكراهة بلا تفصيل ، لأنهم صرحوا بأنها لا يضحى بها كما يأتي في الأضحية . قال في شرح الوهبانية : وفي المنتقى : الجلالة المكروهة التي إذا قربت وجدت منها رائحة ، فلا تؤكل ولا يشرب لبنها ولا يعمل عليها ، ويكره بيعها وهبتها وتلک حالها ، وذكر البقالي أن عرقها نجس . اهـ . وصرح المصنف في الحظر والإباحة أنه يكره لحم الأتان والجلّالة . قال الشارح هناک : وتحبس الجلالة حتى يذهب نتن لحمها . وقدر بثلاثة أيام لدجاجة وأربعة لشاة ، وعشر لإبل وبقر على الأظهر ، ولو أكلت النجاسة وغيرها بحيث لم ينتن لحمها حلت . وبه علم أن الجلالة التي يكره سؤرها هي التي لا تأكل إلا النجاسة حتى أنتن لحمها لأنها حينئذ غير مأكولة ، ولذا قال في الجوهرة : فإن كانت تخلط أو أكثر علفها علف الدوابّ لا يكره سؤرها . اهـ . (١/٣٨٣ ، كتاب الطهارة ، باب المياه ، بيروت)

(٣) ما في " الموسوعة الفقهية " : لا خلاف بين الفقهاء الذين يقولون بحرمة أكل لحم الجلالة ، أو كراهته في أن الحرمة أو الكراهة تزول بالحبس على العلف الطاهر . ثم اختلفوا في مدة الحبس : فقال الشافعية : تحبس الناقة أربعين يومًا ، والبقرة ثلاثين ، والشاة سبعة أيام ، والدجاجة ثلاثة أيام . وعند الحنفية : تحبس الدجاجة ثلاثة أيام ، والشاة أربعة ، والناقة والبقرة عشرة أيام . وعن أحمد روايتان في ذلک : إحداهما : تحبس الجلالة ثلاثا ،=

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

= سواء أكانت طيرًا أو بهيمة ، وقالوا : إن ما طهر حيوانًا في مدة حبسه وعلفه طهر الآخر ، ولأن ابن عمر كان يحبسها ثلاثا إذا أراد كلها . والرواية الثانية تحبس البدنة ، والبقرة أربعين يومًا .

(۲۶۱/۱۵ ، حاشية ابن عابدين : ۳۸۳/۱ ، كتاب الطهارة ، باب المياه ، بيروت)

(۴) ما في " الموسوعة الفقهية " : ونقل صاحب المغني عن الحسن البصري : أنه رخص في لحومها وألبانها ، لأن الحيوان لا يتنجس بأكل النجاسات بدليل أن شارب الخمر ، لا يحكم بتنجيس أعضائه والكافر الذي يأكل الخنزير والمحرمات لم يقل أحد بنجاسة ظاهره، ولو نجس بذلک لما طهر بالإسلام والاغتسال ، ولو نجست الجلالة لما طهرت بالحبس . (۲۶۱/۱۵ ، ۲۶۲ ، زوال الكراهة بالحبس)

انسانی اعضاء کی پیوند کاری

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا﴾ . ''اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزّت بخشی ہے، اور انہیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں، اور اُن کو پاکیزہ چیزوں کا رِزق دیا ہے، اور اُن کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔''

زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ رُو بہ ترقی ہے، نئی ایجادوں نے انسانوں کو متحیر کر رکھا ہے، کل تک جس چیز کا تصور بھی مشکل تھا، وہ حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے، جدید تحقیقات وانکشافات سے آنکھیں بند کرنا بھی ممکن نہیں، اور ان سے کام لینا بھی ناشکری ہوگی، البتہ یہ دیکھنا اور سمجھنا ہم مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے کہ جن چیزوں سے، جس جس طرح کام لیا جا سکتا ہے، وہ کتاب وسنت کے خلاف تو نہیں ہے، یا عہد صحابہ اور بعد کے ائمہ نے جو اصول وقواعد متعین کیے ہیں اس سے ٹکراتا تو نہیں ہے۔نئی ایجادات سے اگر کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہ کے دائرے میں رہ کر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، تو ہمیں اس سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔

نئی ایجادات وترقیات میں سے ایک صورت - اعضاء کی پیوند کاری کی ہے، ناجائز چیز لگائی جائے، تو اس کی اجازت شریعت نہیں دے گی، لیکن اگر جائز اشیاء سے اعضاء کی پیوند کاری کا کام لیا جائے، تو پھر اسے ناجائز لکھنے اور کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ایک صحابی - رضی اللہ عنہ - کی ناک کٹ گئی تھی، انہوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگائی، مگر

وہ بھی راس نہ آئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے سونے کی ناک بنوا کر لگائی، حالانکہ سونے کا استعمال مردوں کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔

ہم عام طور پر مصنوعی دانت بنوا کر خود بھی لگا لیتے ہیں، اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی اجازت دیتے ہیں، جو پاک مسالوں سے تیار ہوتے ہیں، اور ترمذی شریف میں سونے کے تاروں سے دانتوں کے باندھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اب تو انسانی جسم کے تقریباً تمام اعضاء مصنوعی بننے شروع ہو گئے ہیں، جنہیں انسان استعمال بھی کر رہے ہیں۔...... معلوم ہوا کہ جس طرح پاک مصنوعی اعضا کا استعمال شرعاً جائز ہے، مذبوح جانوروں کے اعضا کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے، شرعاً اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ زندہ جانور کا کوئی حصہ کاٹ کر اعضا کی پیوند کاری میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے کہ وہ مُردار کے حکم میں ہے۔ جیسا کہ ''در مختار'' میں ہے: ''اَلْـمُـنْفَصِلُ مِنَ الْحَيِّ كَمَيْتَةٍ'' . ''زندہ جانور سے جدا ہونے والا عضو مردہ کے حکم میں ہے۔'' ......اور ترمذی شریف میں ہے:'' مَـا يُـقْـطَـعُ مِنَ الْبَهِيْمَةِ وَهِيَ حَيَّةٌ فَهُوَ مَيْتَةٌ'' . ''زندہ جانور کا کاٹا ہوا حصہ مردہ کے حکم میں ہے۔''

لیکن اگر کوئی انسان خود اپنے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر جسم کے دوسرے حصے میں استعمال کرے، تو اس میں کوئی اشکال نہیں، یعنی ایسا کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس طرح سے انسان صحت مند بھی ہو جاتا ہے، کوئی عیب بھی نہیں رہتا، اور بکری خریداری کی کوئی بات بھی سامنے نہیں آتی۔ فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں انسانی اَجزا کی خرید وفروخت کو انسانی عظمت کے پیش نظر عام طور پر ناجائز وحرام قرار دیا گیا، خواہ وہ زندہ انسان کا حصہ ہو یا مرنے والے کا، اس لیے کہ انسان اپنی موت کے بعد بھی ویسا ہی

قابلِ احترام ہے، جس طرح اپنی زندگی میں تھا، پس جس طرح زندہ انسان کے جز سے اِکراماً دوا کرنا جائز نہیں ہے، ایسے ہی مردہ کی ہڈی سے علاج جائز نہیں ہے۔

''مُضطَر''؛ یعنی وہ شخص جس کے لیے مُردار تک کھانے کی ''مَخْمَصَہ''(جان کی ہلاکت کے وقت) میں اجازت دی گئی ہے، اس شخص کے متعلق فقہاء لکھتے ہیں:''کوئی قریب الہلاک شخص اگر مُردار نہ پائے اور اُسے اپنی ہلاکتِ نفس کا خوف ہو، ایسی حالت میں اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ میرے ہاتھ کاٹ لو، یا یہ کہے کہ ایک حصہ کاٹ کر کھالو، تو مضطر (قریب الہلاک) کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا، اور نہ یہ حکم دینا صحیح ہوگا، اور نہ مضطر کے لیے یہ درست ہوگا کہ وہ اپنے ہی جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر کھالے۔''

نیز اگر کسی کو دھمکی دی جائے کہ فلاں کو قتل کردو، ورنہ تم کو قتل کردیا جائے گا، تو کیا اس کے لیے جائز ہوگا کہ اس کو قتل کرڈالے، اور اپنی جان بچالے، تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ ''بنوآدم'' (انسان) سب کے سب مکرم ومحترم ہیں، اور جیسے مومن شخص کو مُردہ حالت میں ایذا دینا، اس کی زندگی میں ایذا دینے کی طرح ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسانی اعضا جو اس کے پاس بطورِ امانت ہیں، اس کو حکمِ الٰہی کے خلاف ناجائز میں استعمال کی جرأت کررہا ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے جواز کے فتویٰ کے بعد انسانی عظمت خاک میں مل کر رہ جائے گی، اور انسانی اعضا کی بیع وشرا، شروع ہوجائے گی، خود انسان بھی پیٹ بھرنے، بچوں کے فاقہ اور شراب وغیرہ کی لت کی وجہ سے اپنے اعضا فروخت کرنا شروع کردے گا۔

دوسری طرف آخرت پر جن کا عقیدہ نہیں ہے، یا ہے مگر روپئے کی خاطر سارے ناجائز کاموں کو اپنے لیے جائز کرلیتے ہیں، وہ انسانوں کا اِغوا کرکے اعضائے انسانی

کی تجارت شروع کردیں گے، اور حکومتِ وقت کا کوئی قانون اس کو بچا نہیں سکے گا، خواہ وہ قانون کتنا ہی سخت اور مضبوط کیوں نہ ہو، غریب اور کمزور انسان کا جینا مشکل ہوجائے گا، اور سرمایہ دار اور قوی گھرانے غریبوں اور کمزوروں پر عرصۂ حیات تنگ کردیں گے، اور یہ کیسی دانش مندی ہوگی کہ ایک انسان کی صحت یابی کے لیے دوسرے کی صحت سے کھیلا جائے، اور مستقبل میں اس کو بیماری کا لقمۂ تر بنایا جائے۔

نیز حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک دنیا پر ہزاروں سال گزر چکے، انسان اپنی ضرورتیں پوری کرتا رہا، اس ظلم اور جور وتعدّی کا تصور تک انسانی ذہن میں نہیں آیا، یہ ظلم خواہ اپنے اوپر ہو یا غیر کے اوپر، ایک شخص تو تکلیف میں ہے ہی، دوسرے کو بھی تکلیف میں مبتلا کرنے کا راستہ کھولا جارہا ہے۔

بعض لوگ اس کو اِیثار کا نام دیتے ہیں، یہ بھی نفس کا کھلا فریب ہے، راحت سے محروم کے لیے زندہ اور مردہ انسان کے اعضا کا بخشنا تو ایثار ہے، مگر کیا محروم الراحۃ شخص پر یہ فرض نہیں ہے کہ وہ زندہ اور مردہ انسان پر رحم کھائے، اور اس کے احترامِ آدمیت کی لاج رکھے۔؟!

جس حکومت کا قانون خون ریزی، آتش زنی اور لوٹ مار کو بند نہیں کرسکتا، اس کے قانون سے اس کی توقُّع رکھنا کہ اجازت کا بے جا استعمال نہ ہوگا، عقل میں آنے کی بات نہیں، وہ منظر کس قدر بھیانک ہوگا کہ ادھر مرنے والے کی روح نے پرواز کیا، اور وہیں ہاتھوں ہاتھ پہلے سے تیار ڈاکٹر اس مردہ کی آنکھیں نکالیں گے، سینہ چاک کرکے گُردے باہر کردیں گے، اور بہت سے کمزور وغریب کے جسم کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کیے بغیر اپنے آلات کا استعمال شروع کردیں گے۔ ان لوگوں کی عقل

وفہم پر حیرت ہے جو اعضا کے عطیہ اور ہبہ کو، بال کاٹنے، ختنہ کرنے یا زخم یا آپریشن کے چیر پھاڑ پر قیاس کرتے ہیں، اس باب میں علمائے حنفیہ کے فہم وفراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ہر ہر قدم پر نصوص اور انسانی احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔

انسانی اعضاء کی وصیت

محترم قارئین! آج کل طبیہ کالجوں وغیرہ میں اس موضوع پر بحث ومُباحثہ اور تکرار ومُذاکرہ ہورہا ہے کہ ’’کیا انسان یہ وصیت کرسکتا ہے کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے اعضا، ضرورت مندوں کے جسم میں پیوندکاری کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں؟‘‘ ...... درحقیقت! اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہے کہ- انسان کا کون سا قول وفعل اچھا اور قابلِ اتباع وعمل ہے؟ اور کون سا قول وفعل نا قابلِ اتباع ونا قابلِ عمل ہے، چنانچہ اِس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ انسان کا وہ قول وفعل قابلِ اتباع وقابلِ عمل ہوتا ہے جو اچھا ہے، اور اس کا جو قول وفعل برا ہے، وہ نا قابلِ اتباع ونا قابلِ عمل ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہوگا کہ انسان کا کون سا قول وفعل اچھا ہے، اور کون سا قول وفعل برا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ- اچھائی اور برائی کو معلوم کرنے کے لیے پہلے ہمیں کوئی ایک معیار وپیمانہ قائم کرنا ہوگا، جس میں ہم کسی بھی قول وفعل کے اچھے یا برے ہونے کو پرکھ سکیں، اور اس معیار وپیمانہ میں اختلاف ہے۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ کسی دین ومذہب کو نہیں مانتے اُن کے نزدیک اچھائی اور برائی کا معیار وپیمانہ یا تو مغربی فکر وخیال ہے، یا اُن کی اپنی عقلیں، یہ لوگ ہر اُس قول وفعل کو اچھا کہتے ہیں جسے مغربی

فکر وخیال یا اُن کی عقلیں اچھا کہے، اور ہر اس قول وفعل کو برا کہتے ہیں، جو مغربی فکر وخیال یا اُن کی عقلوں سے مُتَصادِم (ٹکراتا) ہو۔

اور جو لوگ کسی دین ومذہب کو مانتے ہیں اُن کے نزدیک کسی قول وفعل کے اچھا یا برا ہونے کے لیے معیار وپیمانہ اُن کا اپنا دین ومذہب ہے، کہ اُن کے دین ومذہب نے جس قول وفعل کو اچھا کہا، وہ اُن کے نزدیک اچھا ہے، اور جس کو برا کہا، وہ برا ہے، اس معیار وپیمانہ کے اعتبار سے جو قول وفعل اچھا ہوگا، وہ قابلِ اتباع اور قابلِ عمل بھی ہے، اور جو برا ہے وہ ناقابلِ اتباع اور ناقابلِ عمل ہے۔

ہم چوں کہ مسلمان ہیں، اس لیے ہمارے نزدیک اچھائی اور برائی کا دوسرا معیار وپیمانہ ہی صحیح ودرست ہے، کیوں کہ یہ معیار اور پیمانہ اُس ذات نے عطا کیا ہے، جس نے پوری انسانیت کو عقل وفہم عطا کی، اور ظاہر بات ہے کہ اچھائی اور برائی کا وہ پیمانہ جو انسانی عقلوں پر مبنی ہے، وہ خالق کے قائم کردہ پیمانے کے مُعارِض ومُتصادِم ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ ہماری عقلیں آج کسی چیز کو حسین اور اچھا کہتی ہیں، اور آئندہ کل اُس کی نفی کرتی ہے، یا اِس کے برعکس؛ آج کسی چیز کے حسین اور اچھا ہونے کی نفی کرتی ہے، اور آئندہ کل اُس کا اِثبات۔ تو ہماری عقلیں، بالخصوص جب کہ وہ مفادات، شہوات، اَغراض، سے مغلوب ہوں- کیونکر کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کا معیار ہوسکتی ہیں؟!

دینِ اسلام جو نہ صرف مسلم قوم کے لیے، بلکہ پوری انسانیت کے لیے دینِ رحمت ہے، اور اس کے یہاں پوری مخلوقات میں حضرتِ انسان سب سے اعلیٰ، اشرف اور محترم ہے، اس لیے اُس نے اُسے ہر ایسے قول وفعل سے منع کیا جس سے اُس کا اعلیٰ، اشرف اور محترم ہونا متأثر ہوتا ہے، یا اُس میں خلل واقع ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اُس نے کسی انسان کو اپنے اعضا کی خرید وفروخت کی اجازت نہیں دی۔ کسی انسان کو جو بھوک سے مَر رہا ہو، دوسرے انسان کا گوشت کھانے کی رخصت نہیں دی۔ کسی انسان کو ناحق دوسرے انسان کو قتل کی اجازت نہیں دی۔ کسی انسان کو دوسرے کی بے عزتی وتحقیر کی اجازت نہیں دی۔ اور نہ کسی انسان کو اس بات کی وصیت کی اجازت دی کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے اعضاء دوسرے ضرورت مند کو دیئے جائیں، اس لیے کہ اس کی اجازت دینا انسانی احترام اور اس کی اشرفیت وافضلیت کے سراسر مُنافی ہے۔

بالفرض! اگر اس کی اجازت دیدی جائے، اور یہ عمل حکومتِ وقت کے زیرِ نگرانی ہو، تب بھی انسانی شرافت اور اس کے احترام کو باقی نہیں رکھا جاسکتا، کیوں کہ ہمارا مُشاہدہ ہے کہ جو حکومت اپنے قانون کے ذریعے خون ریزی، آتش زنی اور لُوٹ مار اور رِشوت سَتانی کو بند نہیں کرسکتی، وہ انسانی شرافت واحترام کو کیا باقی رکھ سکے گی؟ اور ذرا سوچو تو سہی! وہ منظر کس قدر بھیانک ہوگا، کہ اِدھر مرنے والے کی روح نے پرواز کیا، وہیں ہاتھوں ہاتھ پہلے سے تیار ڈاکٹر اُس کی آنکھیں نکالیں گے، سینہ چاک کر کے دل اور گُردے باہر کردیں گے، اور بہت سے تو کمزور وغریب کے جسم کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کیے بغیر، اپنے آلات کا استعمال شروع کردیں گے، جو انسانی شرافت واحترام کے سخت مُنافی ہے، اور عقلِ سلیم کے خلاف بھی ہے۔

محترم قارئین! یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کی لاش کو پورے احترام کے ساتھ دفنانے کا حکم دیا، اور حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے آج تک، توحید پرستوں کا اسی پر عمل ہوتا آرہا ہے، جب آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے ہابیل کو قتل کیا، اور قتل

کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی لاش کو کیا کرے؟ تو اللہ پاک نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کُریدنے لگا، تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے؟ قرآن کریم کی اِن آیتوں میں اِسی کو بیان کیا گیا ہے: ﴿**فطوّعت له نفسه قتل أخيه فقتله فأصبح من الخٰسرين O فبعث اللّٰه غرابا يبحث في الأرض ليريه كيف يواري سوأة أخيه قال يٰويلتآ أعجزت أن أكون مثل هذا الغراب فأواري سوأة أخي فأصبح من النّٰدمين O**﴾. ''آخرکار اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کرلیا، چنانچہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کرڈالا، اور نامُرادوں میں شامل ہوگیاO پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا، جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے دِکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے؟ (یہ دیکھ کر) وہ بولا: ہائے افسوس! کیا میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپادیتا، اس طرح بعد میں وہ بڑا شرمندہ ہواO''۔ (سورۂ مائدہ: آیت نمبر: ۳۰، ۳۱)

نیز قرآنِ کریم میں طریقۂ تدفین کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا: ﴿**ثم أماته فأقبره**﴾. ''پھر اُس کو موت دی، اور قبر میں دفن کردیا''۔ (سورۂ عبس: ۲۱)

جس سے معلوم ہوا کہ خدائی رہنمائی یہی ہے کہ مُردوں کو صحیح سالم دفن کیا جائے، اور اُن کے جسموں کے ساتھ کوئی کھلواڑ نہ کیا جائے، خواہ اُنہوں نے اس کی وصیت کی ہو، کیوں کہ ایسی وصیت کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، اور اگر کوئی ایسی وصیت کرے، تو اُس پر عمل کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔

انسانی اعضاء کی پیوند کاری اور اس کی وصیت سے متعلق ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کا فیصلہ

انسانی اعضا کی پیوند کاری اور اس کی وصیت سے متعلق، ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کا دوسرا فقہی سمینار، بمقام دہلی، بتاریخ: ۸؍تا ۱۱؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، مطابق ۸؍تا ۱۱؍دسمبر ۱۹۸۹ء منعقد ہوا تھا، جس میں درج ذیل تجاویز پاس کی گئی تھیں:

تجویز نمبر: ۱- کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو، اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لیے کسی متبادل کی ضرورت ہو، تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے:

الف: غیر حیوانی اجزا کا استعمال۔

ب: ایسے جانوروں کے اعضا کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے، اور جو بطریقۂ شرعی ذبح کیے گئے ہوں۔

ج: جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو، اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے، جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے لیکن بطریقِ شرعی ذبح نہیں کیے گئے ہیں، تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول اللحم یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضا کا استعمال جائز ہے، اور اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو، تو خنزیر کے اجزا کا استعمال جائز نہیں۔

تجویز نمبر: ۲- اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقتِ حاجت استعمال کیا جانا، جائز ہے۔

تجویز نمبر: ۳- البتہ اعضائے انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

تجویز نمبر: ٤- اگر کوئی مریض ایسی حالت میں پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو

اس طرح بے کار ہوکر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ کسی دوسرے انسان کا عضو اُس کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے، تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی، اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کرسکتا، اور ماہر قابلِ اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضوانسانی کی پیوندکاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے، اور عضوانسانی کی پیوندکاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظنِ غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی، اور متبادل عضوانسانی اس مریض کے لیے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالَم میں عضوانسانی کی پیوندکاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لیے مباح ہوگا۔

تجویز نمبر : ۵- اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اگر اس کے دو گُردوں میں سے ایک گُردہ نکال لیا جائے، تو بظاہر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گُردہ اگر نہیں بدلا گیا، تو بظاہرِ حال اس کی موت یقینی ہے، اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گُردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے۔

تجویز نمبر : ٦- اگر کسی شخص نے ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوندکاری کے لیے استعمال کیے جائیں، جسے عرفِ عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جاسکتا، اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابلِ اعتبار نہیں۔

روایاتِ اسلاف کے امیں چل بسے!

(وفات امیر شریعت حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمہ اللہ)

سرزمینِ ہند کو جن اہلِ علم واخلاص نے ایمان ویقین اور دین کے علم صحیح سے جگمگا رکھا ہے، اب وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں، اور ہر جانے والا اپنے پیچھے ایسا خوفناک ومہیب خلا چھوڑ کر جا رہا ہے، جس کے پُر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی، گزشتہ چند ہفتوں قبل ہی کی بات ہے، علاقۂ مراٹھواڑہ کی قدیم دینی درس گاہ؛ جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد کے ناظم حضرت مولانا ریاض الدین فاروقی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ)، جنہوں نے ایک طویل عرصے تک نہ صرف جامعہ کاشف العلوم کی نظامت کا بارِگراں اُٹھایا، بلکہ پورے علاقے کے مسلمانوں کی دینی، ملی وقومی رہنمائی بھی فرمائی، اِس دنیا سے چل بسے۔

اس کے کچھ دنوں بعد، جامعہ اشرفیہ راندیر (گجرات) کے ناظم، شیخ الحدیث حضرت مولانا یعقوب اشرف صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اِس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔

پھر ایک آدھ ہفتے کے بعد ہی، ملک کے معروف عالمِ دین، جامع مسجد شافعی ممبئی کے امام وخطیب حضرت مولانا سید شوکت علی عبد الغفور نظیر، جو مہاراشٹر کے کوکن خطے کی تقریباً تمام ہی دینی تحریکوں اور اداروں کے سرپرستِ اعلیٰ تھے، اپنے رب سے جا ملے۔

اور آج ۱۷/۱۰/اکتوبر، بعد نمازِ مغرب اپنے ایک عزیز، فاضلِ جامعہ، مفتی اظہر صاحب اشاعتی (جو امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں زیر تربیتِ قضا ہیں) کے ذریعے یہ خبر موصول ہوئی کہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ)

بھی راہیٔ آخرت ہو گئے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون!

حضرت مولانا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، ایسی دل نواز، حیات افروز، باغ وبہار شخصیت تھی کہ اس کی خصوصیات اس مختصر مضمون میں سمانا مشکل ہے، کیوں کہ آپ بڑی نسبتوں کے مالک تھے، اور کیوں نہ ہو، کہ جہاں آپ کے والد قاضی سید حسین رحمۃ اللہ علیہ، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید تھے، وہیں آپ کے استاذ وشیخ، پیر طریقت، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور پھر سونے پر سہاگہ آپ امیرِ شریعت رابع، حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی کے تربیت یافتہ تھے۔

آپ کا قوتِ حافظہ، حسنِ انتظام، وسعتِ مطالعہ، ذوقِ کتب بینی، اکابر واسلاف کے تذکروں سے آپ کا شغف، علماء دیوبند کے ٹھیٹھ مسلک پر سختی کے ساتھ عمل کے باوجود، دیگر جماعتوں، فرقوں بلکہ قوموں کے ساتھ آپ کی وسعتِ قلب ونظر اوررَواداری، دین کے لیے اخلاص، دین داروں سے محبت والفت، للّٰہیت، سادگی اور بے تکلفی کا حسین امتزاج، ذوقِ مہمان نوازی، عالمانہ لطائف وظرائف؛ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں ہم بھلائے بھی نہیں بھول سکتے۔

مختصر سوانحی خاکہ:

نام: سید نظام الدین

تخلص: فرحت گیاوی

ولادت: ۳۱/مارچ ۱۹۲۷ء مطابق ۱۳۴۵ھ

مقام: محلّہ پرانی جیل، گیا (بہار)

والد بزرگوار:	قاضی سید حسین رحمۃ اللہ علیہ (تلمیذ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ)
والدہ کی وفات:	۱۹۳۰ء
ابتدائی تعلیم (رسم بسم اللہ):	۱۹۳۱ء
مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخلہ:	۱۹۴۱ء
والد کی وفات:	۱۹۴۲ء
دارالعلوم دیوبند میں داخلہ:	۱۹۴۲ء
حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ملاقات:	جون ۱۹۴۲ء
رشتۂ ازدواج سے انسلاک:	۳۱/مارچ ۱۹۵۰ء
امیر شریعت رابع سے پہلی ملاقات:	۱۹۵۸ء
مدرسہ رشید العلوم چترا میں صدر مدرس:	۱۹۶۳-۶۴ء
امارت سے وابستگی اور ناظم امارتِ شرعیہ:	۱۹۶۵ء تا ۱۲/مئی ۱۹۹۱ء
مسلم پرسنل لاء کنونشن:	۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء
آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام:	۸/اپریل ۱۹۷۳ء
مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سیکرٹری نامزد:	مئی ۱۹۹۱ء
سنٹرل وقف کونسل کے رکن:	۱۹۷۲ء تا ۱۹۹۷ء
نائب امیر شریعت منتخب:	۱۲/مئی ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۸
شہادتِ بابری مسجد کے احتجاج میں گرفتاری (صدر تھانہ دہلی):	۹/جنوری ۱۹۹۳ء
امیر شریعت منتخب:	۱/نومبر ۱۹۹۸ء تا وفات
رکن دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:	۱۹۹۶ء تا وفات
رکن دارالعلوم دیوبند:	۱۹۹۷ء تا وفات

خدمات وکارنامے:

ویسے تو آپ کی پوری عمر ملک وملت کی خدمت میں صرف ہوئی، اور آپ نے مختلف تحریکوں وتنظیموں سے وابستہ رہ کر قوم وملت کی جو ہمہ جہت خدمت فرمائی، اسے قید تحریر میں لانا، ناممکن تو نہیں، مگر مشکل ضرور ہے، آپ کی نمایاں خدمات وکارناموں میں، مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی کا چودہ سالہ، اور مدرسہ رشید العلوم چترا کا دو سالہ زمانہ؛ اِن اداروں کے لیے ایک یادگار وزریں عہد ہے، جس میں آپ نے بحیثیتِ صدر مدرس طالبانِ علومِ نبوت کی، تعلیمی، تربیتی، اخلاقی اور اصلاحی خدمات انجام دیں۔

۱۹۶۵ء تا ۱۲ر مئی ۱۹۹۱ء کا زمانہ، جس میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے امارتِ شرعیہ پھلواری شریف کے عہدۂ نظامت پر فائز رہ کر، امارتِ شرعیہ کو ہمہ جہت ترقی دے کر ملک وبیرونِ ملک میں مقبول ومشہور بنایا، اور احاطۂ امارت میں مختلف تعلیمی وتکنیکی، رفاہی وسماجی شعبے قائم فرما کر، ملتِ اسلامیہ کی عظیم خدمت انجام دی، مثلاً: امارتِ شرعیہ کی نئی عمارت کی تعمیر، مولانا سجاد ہسپتال کا قیام، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء کی تاسیس، وفاق المدارس بہار اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ وغیرہ کا قیام۔

۱۹۹۱ء تا وفات کا زمانہ، جس میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مسلمانوں کی دینی، مذہبی، سماجی اور سیاسی مسائل میں بھرپور بصیرت کے ساتھ رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

۱۹۹۶ء تا وفات، اور ۱۹۹۷ء تا وفات کا زمانہ، جس میں آپ نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور دار العلوم دیو بند کے رکنِ شوریٰ کی حیثیت سے اِن دونوں اداروں کے تعلیمی، تربیتی، تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں کے لیے نہ صرف صحت وصواب پر مبنی اپنی

آراء پیش کیں، بلکہ اُنہیں عملی جامہ پہنانے میں ہر طرح کا تعاون بھی کیا۔

جلوسِ جنازہ:

۱۷/۱ اکتوبر ۲۰۱۵ء بوقت شام تقریباً ۶/ بجے قوم وملت کے اِس سچے ومخلص خادم نے آخری سانس لی، اور اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے، غسل وتکفین کے بعد آپ کے جسد خاکی کو احاطۂ امارتِ شرعیہ ہی میں، آپ کے عقیدت مندوں، مریدوں اور عوام الناس کے آخری دیدار وزیارت کے لیے رکھا گیا، اور اگلے دن نمازِ ظہر کے بعد تقریباً سوا دو بجے سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر، مفکر اسلام، نائب امیر شریعت، حضرت مولانا سید ولی صاحب رحمانی دامت برکاتہم نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اور حاجی حرمین قبرستان پھلواری شریف میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

آپ کی نمازِ جنازہ میں عوام کا سیلاب اُمڈ پڑا، جس میں بڑی تعداد میں علمائے کرام، خاص طور سے ناظم امارتِ شرعیہ حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، جملہ کارکنانِ امارتِ شرعیہ، ذیلی اداروں کے ذمہ داران، پورے بہار سے مدارسِ اسلامیہ کے ذمہ داران، ان کے علاوہ ممبئی، لکھنؤ، کولکاتہ، دہلی، جھارکھنڈ وغیرہ کے مختلف اداروں کے سربراہ، ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا خالد غازی پوری، مولانا محمود حسن ندوی، مولانا ملک ابراہیم، مولانا شاہد ناصری، اور اڑیسہ وجھارکھنڈ سے امارتِ شرعیہ کے متعلقین علمائے کرام کے علاوہ ملی، سماجی وسیاسی لوگوں کے ساتھ ساتھ ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ بھیڑ اس قدر تھی کہ امارتِ شرعیہ کا چپہ چپہ بھرا ہوا تھا، نہ صرف کھلی جگہوں پر بلکہ اندرونی حصہ اور چھتوں کے علاوہ سامنے والی سڑک پر، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے ٹم ٹم پڑاؤ تک لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آرہا تھا۔ جنازے کو کندھا

دینے کے لیے لوگوں میں ہوڑ لگی تھی، اور قبر پر مٹی ڈالنے کا سلسلہ بھی دیر تک جاری رہا۔ اور اس طرح لوگوں نے غم زدہ دلوں، نم ناک آنکھوں، زبان پر جاری کلمات - اللّٰهم اغفره وارحمه وسكّنه في الجنة - کے ساتھ ایک سچے، مخلص، خادمِ قوم وملت کو سپردِ خاک کرتے ہوئے الوداع کہا۔

تأثراتِ اہلِ زماں بر وفاتِ میرِ کارواں:

نائب صدر جمہوریہ ہند جناب حامد انصاری صاحب نے حضرت امیر شریعت کے انتقال پر گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''بلاشبہ مولانا کا انتقال ملت کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے، مولانا مرحوم مشہور مجاہد آزادی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد تھے۔''

کانگریس صدر محترمہ سونیا گاندھی نے حضرت امیر شریعت کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

''امیر شریعت بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا نظام الدین صاحب کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بہت زیادہ صدمہ ہوا ہے، مولانا کی موت سے نہ صرف بہار بلکہ پورے ملک کے عوام کو زبردست نقصان پہنچا ہے، ملک نے ایک ممتاز شخصیت کو کھودیا ہے، مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی بہار اور ملک کے عوام کی خدمت میں صرف کی، حضرت مولانا مرحوم مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان اتحاد کے علم بردار ہونے کے ساتھ ساتھ پرامن وباہمی رشتوں کے حمایتی تھے۔''

وزیر اعلیٰ بہار جناب نتیش کمار نے آپ کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے

ہوئے اسے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور کہا:

''امیر شریعت کے انتقال سے وہ بہت زیادہ غم زدہ ہیں، وہ پچھلے سترہ سالوں سے امیر شریعت کی ذمہ داری بخوبی نبھاتے رہے، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ساتھ پورے ملک کی کئی تنظیموں سے بھی وابستہ رہے۔''

سابق وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی وسابق ایم ایل سی بہار کونسل ڈاکٹر پدما شا جھا نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

''حضرت مولانا نظام الدین صاحب کے انتقال پر اُنہیں گہرا دکھ ہوا، مولانا موصوف کو وہ برسوں سے جانتی تھیں، وہ سبھی طبقے کے غریب لوگوں کی مدد کرتے تھے، خاص طور سے مجبور اور معذور خواتین کے حمایتی تھے۔''

اخبار ''قومی تنظیم'' کے چیف ایڈیٹر و منیجنگ ایڈیٹر اشرف فرید وطارق فرید صاحبان نے کہا:

''امیر شریعت کا انتقال نہ صرف بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے لیے، بلکہ پورے ملک کے مسلمانوں کے لیے ایک حادثۂ جانکاہ ہے، اور ایک زریں عہد کا خاتمہ ہے، آپ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ملک کے مسلمانوں کے دینی وملی قائد ورہنما اور مرجع رہے، آپ نے امارتِ شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم سے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔''

خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں، مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ولی صاحب رحمانی نے آپ کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار فرمایا، اور کہا:

''حضرت مولانا نظام الدین صاحب جید عالم دین، ملت کے بڑے قائد تھے، مولانا کا انتقال ملت کا عظیم خسارہ ہے۔''

خادمِ کتاب وسنت، معمارِ مدارس ومساجد، حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی دامت برکاتہم نے فرمایا:

''حضرت امیرِ شریعت بزرگوں کی روایتوں کے امین، اُن کے اخلاق واوصاف کا مظہر، اور قوم وملت کے سچے ومخلص خادم تھے، آپ پوری عمر نہ صرف اتحادِ قوم وملت کے علَم بردار رہے، بلکہ اخیری دم تک اس کے لیے کوشاں بھی رہے، آپ کا وصال امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔''

صدر جمعیۃ علمائے ہند مولانا سید ارشد مدنی صاحب نے امیر شریعت کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''مولانا مرحوم دار العلوم دیوبند کے ہونہار فضلاء میں شمار کیے جاتے تھے، مولانا کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کی کسک ہندوستانی مسلمان مدتوں محسوس کریں گے۔''

کچھ یادیں اپنی

نمازوں کا اہتمام:

۱۹۸۸ء میں جب یہ حقیر، سراپا تقصیر، امارتِ شرعیہ پھلواری شریف میں شعبۂ افتا وقضا میں زیر تربیت وتدریب تھا، تو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنی پیرانہ سالی اور ضعفِ بصارت کے باوجود، بلا ناغہ، فجر کی نماز کے لیے اولِ وقت میں اپنے گھر سے امارتِ شرعیہ تشریف لے آتے، کارکنان وطلبہ کو نماز کے لیے جگاتے، اذان

کے بعد سنت فجر ادا فرماتے، اور پھر جماعت کھڑی ہونے تک تلاوت، ذکر واذکار اور دعا میں مشغول ومصروف ہوجاتے۔

فجر بعد کی مجلس:

نماز سے فراغت پر دفترِ نظامت میں جلوہ افروز ہوتے، تو بعضے آپ کے عقیدت مند، کارکنانِ امارت، اور ہم طلبہ بھی حاضرِ خدمت ہوجایا کرتے تھے، اور اچھی خاصی مجلس جم جاتی تھی، جس میں آپ موقع ومحل کی مناسبت سے کبھی تو اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے حالات وواقعات، کبھی اپنے تجربات ومشاہدات، کبھی حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، کبھی مسلمانوں کے عدمِ اتحاد واتفاق پر اپنا کرب واضطراب، کبھی قومی وملی مسائل اوران کے حل کی تدبیریں، اور کبھی خالص علمی نکات بیان فرماتے، جس سے ہم خدام کو عظیم علمی خزانہ ہاتھ آجاتا، اور معلوم ہوتا کہ واقعۃً آپ ہر علم وفن میں معلومات کا خزانہ اور اپنی اعلیٰ نسبتوں کا مظہر ہیں۔ مجلس کے اخیر میں تمام شرکاءِ مجلس کے لیے آپ کے جیب خاص سے چائے بسکٹ کا نظم ہوتا، جس کے لیے آپ نے ایک شخص کو مامور کررکھا تھا۔

طلبۂ افتا وقضا کے ساتھ خیر خواہی:

احقر کے زمانۂ تدریب فی الافتاء ہی میں جامعہ رحمانیہ مونگیر میں کتاب ''اسلام کے عائلی قوانین'' کی تدوین کی مناسبت سے ملک کے معروف فقہاء؛ استاذ محترم حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی برہان الدین صاحب سنبھلی دامت برکاتہم وغیرہ جمع ہوئے تھے، تو اِن بزرگوں سے استفادہ اور تربیتِ طریقۂ استنباط وتخریج کی غرض سے آپ رحمۃ اللہ علیہ ہم طلبۂ افتاء وقضاء کو بھی اپنے ہمراہ جامعہ

رحمانیہ مونگیر لے گئے، جہاں ہم نے اِن بزرگوں کی علمی، فقہی نشستوں میں شرکت کی، اور جی بھر کر استفادہ بھی کیا، وہیں ہمیں یہ علم بھی ہوا کہ حضرت ناظم صاحب (امیر شریعت رحمہ اللہ) کو فقہ اور اصولِ فقہ پر کس قدر کامل دسترس حاصل ہے، اور آپ کا علمی استحضار کیسا قابلِ رشک ہے۔

بھاگل پور کا فساد:

فرقہ وارانہ فسادات، قدرتی آفات، زلزلوں، سیلابوں سے متأثر افراد، یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور معذوروں کے لیے آپ دلِ دردمند رکھتے تھے، اور اُن کی ہر ممکن مدد کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا کرتے تھے، بھاگلپور فساد کے موقع پر بچشم خود میں نے دیکھا (اُس وقت حضرت امیر شریعت امارتِ شرعیہ کے ناظم تھے)، کہ کس حوصلہ مندی، تن دہی، حاضر دماغی، حکمتِ عملی، اور اپنی تمام انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فساد متأثرین کی نہ صرف مدد فرمائی، بلکہ اُن کی باز آبادکاری کے مشکل وسنگین مرحلے کو کن خوش اسلوبیوں کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

کام کی دُھن:

آپ رحمۃ اللہ علیہ کو امارتِ شرعیہ کے کاموں سے انتہائی لگن ودُھن تھی، اکثر وبیشتر دوپہر کا کھانا اور قیلولہ بھی اِن کاموں کی نذر ہو جایا کرتا، احقر کے امارتِ شرعیہ میں قیام کے دوران ہی کا واقعہ ہے کہ حضرت امیر شریعت رابع الشاہ سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھاگلپور فساد سے متأثر افراد کی امدادی کاموں کی بنفسِ نفیس نگرانی کی غرض سے تقریباً ایک مہینہ امارتِ شرعیہ میں قیام فرمایا، جب آپ نے حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بارہا دیکھا کہ دوپہر کے کھانے اور قیلولے کا وقت ہے، مگر آپ ہیں کہ

اپنے کاموں میں مصروف ہیں، نہ کھانے کی فکر، نہ قیلولہ کی، تو آپ کی اِسی دُھن ولگن کو دیکھ کر حضرت امیر شریعت رابع نے فرمایا:

''مولانا نظام الدین صاحب! اگر چاہتے ہو کہ کچھ مدت اور قوم وملت کی خدمت کرسکو، تو دوپہر میں کھانے کے بعد کچھ قیلولہ کرلیا کرو''

حضرت ناظم صاحب نے حضرت امیر شریعت کے اِس ارشاد کا جواب محض اپنی ہلکی سی مسکراہٹ سے دیا اور بس! خدا جانے آپ کی اِس معنی خیز مسکراہٹ کا کیا مطلب تھا؟ مگر یوں لگتا ہے کہ گویا آپ اپنی اِس ہلکی سی مسکراہٹ سے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو مؤدبانہ انداز میں یہ جواب دے رہے ہوں کہ: حضرت! آپ اپنے اِس ارشادِ عالی سے ہم خُردوں پر اپنی شفقتیں بہرہ ور فرمارہے ہیں یہ آپ کا مقامِ عالی ہے، لیکن عہدۂ نظامت پر فائز ہونے کے بعد زندگی کا ہر لمحہ امارتِ شرعیہ کے کاموں اور قوم وملت کی خدمت میں صرف کردوں، یہ میرا فرض ہے، اور اِس فرضِ منصبی سے عہدہ برآں ہونے کے لیے میں ہر لمحہ کوشاں وسرگرداں رہتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرا لمحہ، لمحۂ موت ہو، اور اِس فرض کی ادائیگی میرے ذمہ باقی رہ جائے۔ (واللہ اعلم)

قومی مال میں احتیاط:

امارتِ شرعیہ کے زمانۂ قیام میں، میں نے بارہا دیکھا، کہ جب بھی امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی بذریعۂ ٹرین لکھنؤ، دہلی اور دیوبند وغیرہ کا سفر فرماتے، اور پٹنہ ریلوے اسٹیشن سے آپ کا گزر ہوتا، تو حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نیازمندانہ انداز میں حضرت امیر شریعت کی زیارت وملاقات کے لیے تشریف لے جاتے، کبھی ہم طلبہ کو بھی ساتھ لے لیتے، اور جب واپسی ہوتی، تو فوراً بیت المال

میں جاکر امارتِ شرعیہ کی گاڑی میں استعمال ہونے والے ڈیزل کی لاگت ادا کردیتے، جس سے قومی مال میں آپ کا کمالِ احتیاط ثابت ہوتا ہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دینی، ملی، سماجی اور رفاہی تمام خدمات کو قبول فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل، اور جن اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کے آپ سربراہ وذمہ دار تھے اُن کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے، اُن کی حفاظت وترقیات کے اسباب پیدا فرمائے، اور جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ سے نوازے!

آمین یارب العالمین!

///

///

مطبوعات دارالافتاء، جامعہ اکل کوا